ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ہندی ناول
ڈھائی گھر
گری راج کشور

ڈھائی گھر

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیو تشی بھگوان بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں، اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلم بند کر رہا ہے۔ یہ شاید ہندوستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

ناگ ارجن کونڈہ، دوسری صدی عیسوی
بشکریہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ہندی ناول

ڈھائی گھر

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

 0307-2128068

    @Stranger

Dhai Ghar : Urdu translation by Haider Jafri Syed of Giriraj Kishore's Akademi award-winning Hindi novel. Sahitya Akademi, New Delhi (2001), Rs. 200.

پہلا ایڈیشن : ۲۰۰۱ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :
رویندر بھون۔ ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس :
'سواتی' مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :
جیون تارا بھون، ۲۳ اے/۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتہ ۷۰۰۰۵۳
۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگرہالے مارگ، دادر، ممبئی ۴۰۰۰۱۴
سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور ۵۶۰۰۰۱
سی۔ آئی۔ ٹی۔ کیمپس، ٹی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی۔ پوسٹ، تارامنی، چنئی ۶۰۰۰۱۳

قیمت : ۲۰۰ روپے

ISBN 81-260-1020-7

Website : http://www.sahitya-akademi.org

کمپیوٹر کمپوزنگ: محمد سالم ۳۱۶/۴ے ۲ ترلوک پوری، دہلی ۱۱۰۰۹۱

طباعت : کلر پرنٹر، دہلی ۱۱۰۰۳۲

یہ ناول کیوں؟

جب میرے سامنے اشن بھائی کی یہ تجویز آئی کہ میں 'جنگل بندی' جیسا ہی ناول لکھوں تو ایسا نہیں کہ میں یہ نہ سمجھا ہوں کہ اس جملے سے مراد کیا ہے۔ لیکن نہ جانے کیسے وہ جملہ جوں کا توں میرے دماغ میں اتر گیا۔ میرے من میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا "کیا در حقیقت 'جنگل بندی' میں سب کچھ کہا جا چکا؟" اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا؟ تقریباً ایسا ہی سوال تب بھی اٹھا تھا جب 'لوگ' لکھ لینے کے بعد 'جنگل بندی' لکھنے کی بات دماغ میں آئی تھی۔ لیکن تب یہ سوال اتنا واضح نہیں تھا۔ بس بات یہیں تک آکر رک گئی تھی کہ 'لوگ' کے بعد 'جنگل بندی' لکھنا مناسب ہوگا یا نہیں؟ تب اتنے سے جواب سے ہی کام چل گیا تھا کہ 'لوگ' 'جنگل بندی' نہیں ہے۔ 'جنگل بندی' کا لکھا جانا ابھی باقی ہے۔ در اصل 'جنگل بندی' 'لوگ' تھا بھی نہیں۔ اس بار یہ سوال کچھ زیادہ شدت کے ساتھ کئی رنگوں میں سامنے آیا۔ آخر اس ماحول پر کب تک لکھتے رہو گے؟ کیا تمہارے پاس لکھنے کو اور کچھ نہیں؟ میرے کچھ دوستوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو 'جنگل بندی' کا دوسرا حصہ کیوں نہیں لکھ لیتے؟ لیکن میں سچ کہوں کہ ان سوالوں میں مجھے اپنے آپ کو اور زیادہ ٹٹولنے کا موقع دیا۔ مجھے یہ لگا کہ ابھی تو اس ماحول اور معاشرے کے ایسے ایسے بہت سے پہلو باقی ہیں، جن کا سامنے آنا سماج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ ان باتوں کو میں نہیں کہوں گا تو شاید میری نسل کا کوئی ادیب نہ کہے۔ جانی ہوئی زندگی کئی بار اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد ٹکڑوں ٹکڑوں میں کھولنا چاہتی ہے اور ادیب کے لیے چیلنج بنتی جاتی ہے۔ ادیب کو اس

چیلنج کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جب تک اس سب کو کہہ نہیں لیتا تب تک وہ اپنے آپ کو اس تخلیقی دباؤ سے نجات نہیں دلا پاتا۔ ادیب اپنے تجربے محرومیوں اور خوشیوں کو اپنے قارئین کے ساتھ بانٹتا ہے، ان سے حصہ داری کرتا ہے، اس کے علاوہ انھیں دینے کے لیے ادیب کے پاس کچھ اور ہے ہی نہیں۔

اس کے باطن سے دلی باتوں میں اس کے قارئین ہی حصے دار ہوتے ہیں۔ کئی بار وہ باتیں قابل قبول ہوتی ہیں اور کئی بار نہیں ہوتیں اور کئی بار قبولیت یا انکار میں ہی کئی دہائیاں لگ جاتی ہیں۔ جس ماحول میں، جس تہذیب اور جن حالات سے پیدا ہونے والے ان کے چھوٹے بڑے کرداروں کو، ان کی گرہوں، ان کے چھوٹے پن یا بڑپّن کو دیکھا، ان کا ایک بہت بڑا حصہ میرے حافظے میں ابھی باقی ہے۔ جب یہ بات میرے سامنے آئی تو جیسے سب کچھ کھلتا اور پھیلتا چلا گیا۔ میرے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ میں اس ماحول کو دوبارہ جیوں اور اس پر لکھوں۔ کئی بار ادیب اپنی نجات کے لیے بھی لکھتا ہے اور اپنے نئے پرانے سماج کی پہچان کے لیے بھی۔ اس کے دونوں ہی پہلو ہوتے ہیں۔ نقصان بھی اور افادیت بھی۔ ادب میں ہونے والا سب سے بڑا نقصان، تخلیق کار کی تخلیق کو قبول نہ کرنا ہے۔ ادیب کو اس کے لیے ہمیشہ تیار رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ تخلیق کو کارآمد بنانا اس کے قارئین کے ہاتھ میں ہے۔ اس بارے میں ادیب خود کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

ایک بات اور ہے۔ مجھے معاشرے اور انسان، انسان اور انسان، فرد اور ادارے کے بدلتے رشتے ہمیشہ سے متوجہ کرتے رہے ہیں۔ کہانی ہو یا ناٹک یا ناول یا مضمون، میں ان بدلتے رشتوں کو مسلسل سامنے لانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میری خواہش ہمیشہ ان بدلتے رشتوں کا گلوکار بنے رہنے کی رہی ہے۔ ایک وقت اور ایک معاشرے میں جو کچھ بدلتا ہے وہ اگلے معاشرے میں بننے والے رشتوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ 'کوشش' لفظ کا استعمال کرنے کے پیچھے میرا واحد مقصد کوشش ہی ہے، دستیابی نہیں۔ لکھنا کوشش کرنا ہے۔ دستیابی کا میدان سائنس ہے، کاروبار ہے، سیاست وغیرہ ہے۔ ادب تو بہت بعد میں آتا ہے، یہاں ناکامیاں ہی کامیابی کا راستہ دکھاتی ہیں۔ ویسے تو ایسے بھی ادیب ہیں جو اپنی ہر کوشش کو دستیابی میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تخلیق لکھ کر وہ اس وقت تک اس کا پرچار کرتے ہیں جب تک اسے حصولیابی نہ مان لیا جائے۔ لیکن یہ کتنے دن چل پاتا ہے۔ لکھنا تو ایک آوا ہے اس میں

ہزاروں مٹی کے بچے دے سکتے ہیں تو یہ اسی قسم کے بن کر نکلتے ہیں۔ یہ یتیم بچے، پچھڑے ہوئے خیال یا دھوپ کے۔ آدمی سے یہ امید کرنا کہ وہ تخلیق بہترین بن کر نکلے، ناممکن کو تسخیر کرنے کے خواب دیکھنے کی طرح ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تکرار چاہے ماحول کی ہو یا کسی سماج کی یا کرداروں کی، قاری اسے بہت مشکل سے قبول کرتا ہے لیکن رجحان، اعادہ، دوبارہ تکرار اگر یہ سب کسی سماج کو منظم کر کے پیش کرنے اور اس کے بارے میں سمجھداری پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں تو ادیب کے لیے اس خطرے کو اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ اپنی فنکارانہ ذمہ داری پر وہ خود ہی سوالیہ نشان لگاتا ہے۔ کسی اور کے سامنے ذمہ دار ہو یا نہ ہو، اپنے سامنے تو ذمہ دار ہوتا ہی ہے۔ میرے لیے ناول یا کہانی اب تفریح کے ذرائع نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری تخلیقات ادیب کے ساتھ ساتھ قاری پر بھی ایک طرح کا دباؤ بناتی ہیں۔ دباؤ آسانی سے قابل قبول نہیں ہوتا خواہ وہ کسی بھی طرح کا دباؤ کیوں نہ ہو۔ اس لیے وہ عوام میں اتنی رائج نہیں ہو پاتیں۔ میں ناول کو ایک عمرانیاتی مطالعہ بھی مانتا ہوں —— مختلف اقسام کے تعلقات کا، جو رہے ہیں یا ہیں یا آگے بنیں گے —— تشریح کرنے والی انسانی تعدیل۔ میری رائے میں ناول اور کہانیاں، بلکہ ناٹک بھی، زندگی کے بارے میں سائنسی اور غیر سائنسی زاویۂ نگاہ بنانے میں مدد کرتے ہیں اور انہیں ایسا کرنا چاہیے اس نگاہ سے ٹش پال کی تخلیقات کافی اہم ہیں۔ جو ہم آج لکھ رہے ہیں وہی زندگی کے بارے میں نقطۂ نگاہ بنانے میں آنے والی نسل کی مدد کرے گا —— نہ کہ زمانے کو بدلنے والے ادب کے روپ میں —— کھاد کا تعاون بھی کم نہیں ہوتا۔

مجھے یہ ناول ایک ادیبانہ ذمہ داری کی طرح لگا۔ یہ سب باتیں خود کو حق بجانب قرار دینے کی وضاحت کی طرح بھی معلوم ہو سکتی ہیں لیکن اس سے خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ادیب زندگی بھر یہی تو کرتا ہے۔ کبھی اپنے لیے، کبھی سماج اور زندگی کی رائے سے، اپنے آپ کو رات دن ودھسن کر ان نتائج یا حقائق تک پہنچتا ہے، جو اس کے وجود کے ہونے کو صحیح ٹھہراتے ہیں۔

یہ ناول بالکل قصہ گوئی ہے۔ کبھی کبھی لگ سکتا ہے کہ تال میل گڑبڑا گیا۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔ سلسلے اپنے آپ نکلتے اور ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک

بھی انسان والی، کوئی ناول سمجھتا ہے جو ایک سماج سے دوسرے سماج میں بدلتے رشتوں کا خاکہ بناتی ہے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ اس ناول کے بارے میں بشن بھائی کا کیا رد عمل ہوگا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ فقط ان کے کہ اتنا کہنے نے میری یادداشت کی کنڈلنی (یوگا کے ذریعے بیدار کی جانے والی صلاحیت) بیدار کر دی ورنہ پتہ نہیں کب اور کس انداز میں یہ یادیں سامنے آتیں۔ آتیں بھی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے میں ان سے، وہ مجھ سے انجان ہی بنے رہتے۔ بشن جی نے میری ایک اور مدد بھی کی ——— کئی حقیقی رد عمل اور حالات کی معلومات فراہم کر کے مجھے اصلاح کرنے کا موقع دیا۔

میں اس ناول کے بارے میں کافی کشش و پنج میں تھا۔ پہلے میں نے اس کا نام 'گھوڑا یہ سب جانتا ہے' رکھا۔ پھر "گھوڑے" رکھنے کا ارادہ کیا، لیکن بالآخر مجھے 'ڈھائی گھر' ہی مناسب لگا۔ 'ڈھائی گھر' اور 'گھوڑے' کا ویسے بھی گہرا رشتہ ہے۔ شطرنج کا گھوڑا آگے پیچھے سب گھر چلتا ہے۔ نام کے لیے راجندر کا شکریہ ادا کرنا شاید ضروری ہے۔

گری راج کشور

میرا نام بھاسکر رائے ہے۔ میں اترپردیش کے مغربی علاقے کے ایک قدیم کھاتے پیتے رائے خاندان کا آخری رائے ہوں۔ اب میرے بعد کوئی رائے نہ ہوگا۔ میرے بچے ہیں لیکن جس بنیاد پر ہم لوگ رائے ہوا کرتے تھے وہ ایک بڑی زمینداری تھی۔ وہ کبھی کی ختم ہو گئی۔ وراثت اور ریاست دونوں ہی نہیں رہے۔ میں جب تک رائے نام کو نباہ رہا ہوں کیونکہ میں اسی ریاست کا ایک حصہ ہوں۔ پتا ہوا۔ میرے والد یعنی بڑے رائے جن کا نام ہری رائے تھا لگ بھگ تیس سال پہلے سورگ سدھار گئے تھے۔ اس دن دسہرے کا دن تھا۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی پوجا منائی تھی۔ جیسے ہی پوجا کر کے ان کے پاس گئے اور پنڈت جی نے ان کے ماتھے پر ٹیکا لگایا ویسے ہی انھوں نے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ سارے اسلحہ بھرے ہوئے تیار تھے۔ دسہرے کے دن تقریباً بارہ گولیاں داغی جاتی تھیں۔ لیکن دغوانے والا ہی چلا گیا اس لیے اسلحہ جھکا دیے گئے اور توپ خانے میں جمع کر دیے گئے۔ میری یاد میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ دسہرہ پوجن ہو گیا ہو اور گولیاں نہ داغی ہوں۔ لیکن اسی وقت مجھے لگا کہ اب رائے خاندان ختم۔ کچھ لوگ مشعل روشنی ہوتے ہیں۔ جب تک روشنی اس وقت تک سب جیتا جاگتا لگتا ہے۔ جیسے ہی روشنی گل ہوئی سب کچھ ندارد۔ بڑے رائے کے جاتے ہی مجھے اسی احساس نے گھیر لیا۔ مجھے لگا کہ اب مجھے بھی جانا ہے۔ دراصل اب میرے مرنے کا وقت آ گیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کب مروں گا، لیکن جیوں گا بھی کتنا! جتنی جلد چھٹی ہو اتنا اچھا۔ بدبخت زندگی کس کام کی۔ اگر اسے بدلنے کی قوت ہو تب بھی ایک بات ہے۔ اب وہ بھی ختم ہو گئی۔ نہ تو دھکوں کو برداشت کرنے والی وہ لچک ہی بچی اور نہ اس بات کی گنجائش کہ چیلنجوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو سکوں۔ اب میری عمر چوراسی برس کی ہے۔ اسی عمر میں بڑے رائے بھی گئے تھے۔ ان کی وہ عمر تو مجھے نصیب ہو گئی۔ بھلے ہی ان کا سا جاہ و جلال حاصل

نہ کر سکا ہوں۔ حالانکہ آخری دنوں میں ان کی مٹھی سے وہ بھی ریت کی طرح پھسل گیا تھا۔

اب رائے خاندان کی بدحالی کا دور ہے۔ لوگ ہیں لیکن کچھ نہیں۔ میرا بڑا بیٹا رگھوبر ہے۔ اس ہی کو سمجھیے رائے خاندان کی بچی کھچی ناک۔ لیکن وہ کافی دور ہے۔ ہم تک لوٹ نہیں پاتا اور ہم اس تک پہنچ نہیں پاتے۔ دھیان پورا رکھتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے جب میرے آہنی کو لہا لگا اور میں دلّی کے ہسپتال میں پڑا رہا تو اسی نے سب کچھ کیا، لیکن وہ دھیان دھیان ہوتا ہے۔ لگاؤ لگا، لگاؤ تو اب رہا ہی نہیں۔ اسی طرح غائب ہو گیا جیسے آج کل کے گوند سے چپچپاہٹ۔ یا تو چپکتا نہیں اور چپکتا ہے تو بہت کم۔ ہاں، 'گم' ضرور چپکتا ہے۔ لیکن وہ خالص گوند نہیں ہوتا۔ ویسے بھی جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، ویسے ویسے ہمارے اس ماحول کے بارے میں نفرت سے بھرتا گیا تھا۔ خیر! میں بدحالی کی بات کر رہا تھا۔

جب تک میرے والد یعنی بڑے رائے تھے تب تک میں کسی بھگوان کو نہیں مانتا تھا۔ اب میں لینا لینا بھی پوجا کرتا رہتا ہوں جب ہمارے پل ٹوٹنے لگتے ہیں تو انسان آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ پل آسمان سے اترے یا نہ اترے، لیکن لگتا یہی ہے کہ آسمان ہی بچا ہے جہاں سے وہ اتر سکتا ہے۔ حالانکہ پل زمین ہی کی چیز ہوتے ہیں۔ جب تک بڑے رائے رہے وہی میرے بھگوان تھے۔ مجھے ہمیشہ لگا کہ میں تو ان کے پیشاب سے پیدا ہوا ہوں۔ بقول رگھوبر، جاگیردارانہ روایت میں جو پیدا کرے وہی بھگوان، جو کھانا دے وہ بھگوان۔ جب باپ ہی بھگوان ہو تو پھر جانا کہاں۔ اب شاید ایسا نہیں ہوتا اور نہ باپ بھگوان ہوتا ہے اور نہ شاید بھگوان باپ۔

میری پڑھائی لکھائی کم ہوئی تھی۔ زیادہ ہو بھی جاتی لیکن جیسے کیکٹس کا پودا کم پانی پیتا ہے بڑے آدمی کا بچہ کم پڑھتا ہے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں۔ ان کے دماغ میں اس کی بو نہیں ہوتی۔ یہ ہی تب بھی تھا۔ ایسے گھروں کے لڑکے کم پڑھتے تھے۔ پڑھنا غلامی کی نشانی مانا جاتا تھا۔ حالانکہ وہی لوگ سب سے زیادہ غلام ہوتے تھے۔ جب میرے بچے یعنی سونا، رگھوبر، گرور وغیرہ پڑھتے نہیں تھے اور میں انھیں تنبیہ کرتا تھا تو مجھے بڑبڑا کر اپنا زمانہ یاد آجاتا تھا۔ جو بات میرے لیے بے عزتی کی تھی اسی کے لیے میں اپنے بچوں سے کیوں کہتا ہوں۔ حالانکہ بڑے

رائے کو بھی پڑھائی کی اہمیت کا پتہ تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے دسویں کلاس تک انگریزی، فارسی اور اردو پڑھی تھی۔ وہ بھی پڑھنے کے لیے کہتے تھے لیکن ان کا [illegible]۔ شاید اتنے دن رہا ہو ورنہ میں پڑھ گیا ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ اگر میں اس وقت پڑھ لکھ گیا ہوتا تو شاید اپنی اور آگے آنے والی مستقبل کی فکر کرنا سیکھ گیا ہوتا۔ اپنی جہالت کے وزن کے نیچے اس طرح نہ دبا پڑا رہتا۔ اپنے نیم تعلیم یافتہ ہونے اور والد کے رتبے نے مجھے مستقبل کے بارے میں فکر مند کر دیا تھا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ والد کے سہارے کسی کو راستہ نہیں ملتا۔ خود اپنی کوششوں سے راستہ نکالنا ہوتا ہے۔ رگھو بر اس کی مثال ہے۔ اس نے اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی تو نکل آئی۔ گرد و غیرہ میرے اوپر انحصار کرتے رہے وہ آج بھی وہیں ہیں۔ مجھے ان کی ہی فکر ہے۔ میرے بعد ان کا کیا ہوگا؟ رگھو بر کرے گا ضرور لیکن کتنا۔۔۔۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے اگر میں بڑے رائے کی طرح انگریزی جانتا ہوتا تو میں بھی ان کی طرح آنریری مجسٹریٹ ہو گیا ہوتا۔ مقدمے کیا کرتا۔ وہ شروع میں آنریری مجسٹریٹ ہوئے تھے، بعد میں اسسٹینٹ کلکٹر۔ انگریز حکومت بہت چالاک تھی۔ جیسے لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آجائے۔ آنریری مجسٹریٹ بنا کر روپیہ بھی بچاتی تھی، ان سے اپنے لوگوں کے خلاف فیصلے بھی لکھواتی تھی اور ان کے دل میں خاص ہونے کا مغالطہ بھی پیدا کرتی تھی۔ بڑے رائے اپنے آنریری مجسٹریٹ ہونے سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ غلام بنانے کا ایک اور بھی بڑا شوق رہا ہو۔ یہ باتیں اب محسوس ہوتی ہیں جب زمانہ بدل گیا۔ تب مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے دل کی بات بتاؤں تو آپ ہنسیں گے میں بھی سپنوں میں اپنے آپ کو بڑے رائے کی طرح کچہری کرتے، فیصلے سناتے، پولس والوں کی سیلوٹ لیتے دیکھا کرتا تھا۔ اب جب وہ پورا طلسم ٹوٹ گیا تو لگتا ہے جتنا بڑا اعزاز تھوپا جاتا ہے، غلامی کی رسیاں اتنی ہی مضبوط ہوتی ہیں۔ اب کوئی اعزاز نہیں بچا لیکن غلامی کی وہ رسیاں عادتوں کی شکل میں اب بھی جکڑے ہوئے ہیں۔

ویسے مجھے انگریزوں سے ڈر لگتا تھا۔ بڑے رائے ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ میرا ڈر لگنا بھی اور بڑے رائے کا انگریزوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا فخر محسوس کرنا بھی ـــــ دونوں ہی اپنی طرح کی جہالتیں تھیں، یہ میں نے رگھو بر کے رابطے میں آکر سیکھا۔ رگھو بر شروع میں مجھے گستاخ لگا۔ اتنے بڑے لوگوں کے بارے میں وہ جس قسم کا برتاؤ کرتا تھا ہم

لوگ اپنے زمانے میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے تب لگتا تھا، اگر انگریزوں میں سے کسی نے بندر کی طرح گھڑک بھی دیا تو میں اڑ جاؤں گا۔ ہمارے گھر میں انگریزوں کی بہت سی اترنیں تھیں۔ اس اترن کو ہم خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ ہر ایک کو فخر کے ساتھ دکھاتے تھے چاہے چیسٹر ڈرار ہو یا سنگار میز یا صرف فرش۔ یا سجاوٹ کی دوسری چیزیں۔ برتنوں کو چھوڑ کر سب کچھ۔ ہر چیز پر اس انگریز افسر کی چٹ لگی تھی جس سے خریدیں گئی تھی۔ فلاں جج۔۔۔ فلاں کلکٹر۔۔۔ فلاں کمیشنر۔۔۔اوہ سب لوگ ان چیزوں کے توسط سے ہماری زندگی کے جزو لاینفک بن گئے تھے۔ وہ چیزیں اب بھی ہیں لیکن بوسیدہ حالت میں، جسے داری بھی ختم ہو گئی۔ ویسے وہ زندہ ہیں یا مر گئے خدا جانے۔ ہمارے لیے زندہ ہیں۔ ان کا سامان سستا نہیں تھا۔ زیادہ ہی دام دینے پڑتے تھے۔ صاحبوں کا نام جو ان سے وابستہ ہوتا تھا اسے رشوت کہیے یا تنے بیش قیمت تعلقات کا شکرانہ۔

میں یعنی بھاسکر رائے بڑے رائے کا بڑا بیٹا تھا میرا ایک چھوٹا بھائی ارن رائے اور ایک بہن رانی تھی۔ بہن تو اب نہیں ہے چھوٹا بھائی ہے۔ وہ مجھ سے تقریباً بیس سال چھوٹا تھا۔ بار بار 'تھا' کہہ دیتا ہوں ——— ہے۔ جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں۔ بڑے رائے فارسی، انگریزی اور اردو بخوبی جانتے تھے۔ انھوں نے انٹرینس تک پڑھا تھا۔ انگریزوں میں بیٹھتے تھے۔ سوٹ پہنتے تھے لیکن نہ شراب پیتے تھے اور نہ گوشت کھاتے تھے۔ البتہ کلب جاتے تھے۔ برج کھیلتے تھے۔ کسی کا چھوا نہ پانی پیتے تھے اور نہ کھانا کھاتے تھے۔ گاندھی جی سے ان کی ناراضگی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ کبھی جب کلب میں یار دوستوں کے یہاں ڈنر ہوتا تھا تو حلوائی کا بنا دیسی کھانا ایک پنڈت ان کے لیے الگ سے لگا دیتا تھا۔ پینے کا پانی بھی قلعی کے برتنوں میں تولئے سے ڈھک کر الگ میز پر رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ ان سب باتوں کو پورے یقین کے ساتھ مان کر چلتے تھے کہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کلب میں مسلمان بھی نوکر تھے، عیسائی بھی تھے اور دوسری ذاتوں کے بھی تھے۔ لیکن ان کے لیے برہمن زادہ رکھا گیا تھا۔

اس زمانے میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہندوؤں کی خاص آن بان تھی اس کا نتیجہ تھا کہ دوسرے مذاہب اور ذاتوں کے ایسے لوگ جن کا آپس میں کھانا پینا تھا، آگے پیچھے ہنس کر کہتے تھے کہ ہم کیا کریں، بڑی رائے صاحب کو ہم نے تو اچھوت بنایا نہیں، انھوں نے اپنے آپ ہی اپنے کو اچھوت بنالیا۔ بڑے رائے جیسے بہت سے لوگ ایسے تھے جن کی زندگی

میں چھوا چھوت ایک خاص جگہ رکھتی تھی۔ میں بھی اس زمانے میں اس میں یقین کرتا تھا بعد میں جب بچے بڑے ہوئے اور دنیا بدلی تو مجھے اسے چھوڑنا پڑا۔ لیکن چند ایک ذاتوں کا چھوا میرے لیے اب بھی ممنوعہ ہے۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں کہ کیوں؟

بڑے راۓ چونکہ پڑھائی کی اہمیت سے واقف تھے اس لیے انھوں نے بہت کوشش کی کہ میں پڑھ لوں۔ لیکن میں تو بڑے راۓ کا بیٹا تھا۔ پڑھتا کیسے؟ ہمارے شہر میں دو انگریزی اسکول تھے۔ اس زمانے میں ہر ضلع میں ایک آدھ ہی انگریزی اسکول ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک اسکول ہم لوگوں کا تھا۔ اس اسکول کا نام ایڈورڈ اسکول تھا۔ نوکر لوگ عموماً اسے انگریزی اسکول ہی کہتے تھے جو زیادہ پڑھے لکھے ہونے کا احساس دلانا چاہتے وہ ایڈورڈ اسکول کہہ دیتے تھے۔ میں نے پانچویں تک فارسی اور اردو گھر پر ہی پڑھی تھی۔ چھٹی میں مجھے اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اردو اور فارسی والے مولوی صاحب کا گھر پر پڑھانا تب بھی جاری رہا تھا۔ اسکول میں انگریزی پر زور تھا۔ میری انگریزی کمزور تھی۔ انگریزی پڑھانے کے لیے بھابیہ صاحب کو لگایا تھا۔ وہ گھر پڑھانے آتے تھے۔ ان کا وزن دو ڈھائی من سے کم نہیں رہا ہوگا۔ تب تول کے بٹ کھرے من، سیر، چھٹانک ہی تھے۔ بھابیہ سر کو گاڑی لینے جایا کرتی تھی۔ مولوی صاحب لنگڑے تھے۔ لنگڑاتے لنگڑاتے اپنے آپ ہی چلے آتے تھے۔ حالانکہ ان کا گھر نزدیک تھا۔ پھر بھی انگریزی کے ماسٹر صاحب اور مولوی صاحب دونوں کے درمیان کوئی نسبت نہ تھی۔ انگریزی کا ماسٹر تب بھی بڑی چیز مانا جاتا تھا۔ اگر کبھی مولوی صاحب کو گاڑی بیٹھنے کے لیے مل جاتا تھا تو بچوں کی طرح خوش ہو جاتے تھے۔ دعائیں ہی دعائیں دے ڈالتے تھے۔ بھابیہ صاحب 'تھینک یو' کہہ کر گاڑی سے اتر جاتے تھے۔ مولوی صاحب کی دعا سے زیادہ ان کی 'تھینک یو' میں جادو تھا۔ جو بھی سائیس گاڑی پر ہوتا تھا 'تھینک یو' کو جادوئی جملے کی طرح دہراتا تھا۔ سنا جاتا ہے کہ غدر کے دنوں میں چند کشمیری پنڈتوں نے انگریزی جملے بول کر ہی اپنے سینوں پر تنی بندوقوں کو جھکنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ جب وہ بھاگ رہے تھے تو انگریزوں نے انھیں پکڑ لیا۔ جیسے ہی انھوں نے انگریزی میں 'گٹ پٹ' کی، بندوقیں جھک گئیں۔ جس زبان میں ایسا معجزہ ہو اس کے کیا کہنے۔ سنا جاتا ہے کہ پنڈت جی

کے بزرگ بھی ان ہی میں تھے لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب بعد میں پنڈت جی کی حکومت آئی تو انھوں نے بھی اس زبان کا خیال رکھا جس نے ان کے بزرگوں کی جاں بخشی کرائی تھی۔ اس سے مجھے تب بھی ڈر لگتا تھا۔ لیکن بچوں کے لیے میں انگریزی کو بیش قیمت زبان مانتا رہا۔ بچپن میں جب بھاٹیہ صاحب پڑھانے آتے تھے اور جملے بنوایا کرتے تھے تو میں کہیں پر 'ور' اور کہیں پر 'از' لگا دیتا تھا۔ اپنے یہاں بڑوں کے لیے فعل میں جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی کو میں انگریزی میں بھی فٹ کر دیتا تھا۔ بھاٹیہ صاحب کان پکڑے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ میں نے آنکھیں تریر کر کہا ـــ 'ماں صاحب، آج چپت لگایا سو لگایا ـــ آگے لگایا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

اگلے دن سے بھاٹیہ صاحب نے آنا بند کر دیا۔ گاڑی خالی لوٹ آئی بڑے رائے کے نام ایک نوٹ تھا ـــ کچھ ذاتی وجوہ سے پڑھانے نہیں آسکوں گا۔ معافی چاہتا ہوں۔

جہاں تک مولوی صاحب کا سوال تھا ان کا تو میں ہاتھ تک پکڑ لیتا تھا بڑے رائے جب پوچھتے تھے کہ بھاسکر کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے تو میں پیچھے سے انھیں آنکھیں دکھا دیتا تھا۔ وہ کہہ دیتے تھے "ٹھیک چل رہی ہے حضور۔''

لیکن بھاٹیہ صاحب کے رقعہ نے کباڑا کر دیا۔ بڑے رائے نے پوچھا "بھاٹیہ صاحب نے پڑھانا کیوں بند کر دیا؟'' میں کچھ نہیں بولا۔ بڑے رائے نے دوسرا سوال کیا "تم نے کوئی گستاخی تو نہیں کی؟'' میں نے گردن ہلا دی۔ بڑے رائے کی گاڑی تیار تھی۔ وہ بیٹھے اور چلے گئے۔ ان کی تنخواہ گھر بھجوا دی گئی۔ میں خوش تھا، انگریزی کا پھندہ میری گردن سے نکل گیا تھا۔ کچھ دن بعد بڑے رائے نے بلا کر کہا "تمھیں ایڈورڈ اسکول سے نکال کر گورنمنٹ اسکول میں داخل کیا جا رہا ہے۔" میں ہکا بکا رہ گیا۔ پوچھنے کی ہمت تو پڑی نہیں لیکن میں سمجھ گیا کہ بھاٹیہ صاحب نے شکایت کی ہے۔ چنانچہ میرا داخلہ گورنمنٹ اسکول میں کرا دیا گیا۔ وہاں زبردست ڈسپلن تھا۔ لیکن ایک فائدہ تھا۔ اسکول ہمارے گھر سے دور تھا۔ ایڈورڈ اسکول کی طرح وہاں نوکروں کا چکر بار بار نہیں لگ سکتا تھا۔ گاڑی چھوڑ آتی تھی اور اسکول ختم ہونے کے وقت لے آتی تھی۔ لوٹتے وقت میں گاڑی میں بچوں بیچ اس طرح بیٹھتا تھا جیسے میں بادشاہ ہوں اور باقی سب درباری۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کی ہوڑ لگتی تھی۔ جسے میں بٹھا لیتا تھا وہ احسان مند ہو جاتا تھا۔

ایڈورڈ اسکول میں تو بڑے رائے کا دبدبہ تھا۔ اس لیے چھٹی میں پاس ہو گیا تھا لیکن یہاں آکر ساتویں میں فیل ہو گیا۔ بڑے رائے کو کئی دنوں تک تو پتہ ہی نہیں چلا۔ جب چلا تو بڑے رائے نے بلوایا۔ کہا ——— دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ تقریباً گھنٹے بھر میں اسی طرح دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا رہا۔ میں سب کو آنکھیں دکھا سکتا تھا لیکن بڑے رائے کے سامنے گردن اٹھانے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ پسینے سے تربتر تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ گلا سوکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ بڑے رائے اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ وہ دفتر میں بیٹھ کر ہی کام کرتے تھے۔ خواہ مقدموں کا فیصلہ لکھنا ہو یا زمینداری کا کام دیکھنا ہو۔ خطوط بھی اسی دفتر میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ ایسا نہیں کہ کہیں بھی بیٹھے اور تحریر لکھ دی۔ وہ خوش خط تھے۔ ان دنوں ٹائپسٹ کم ہوتے تھے۔ شہر بھر میں ایک ہی ٹائپسٹ تھا۔ نام تھا دیارام ٹائپسٹ۔ کبھی کبھی بڑے رائے اسے بلوایا کرتے تھے البتہ عرضی نویس کافی ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ تقسیم نامے عرضی نویس لکھتے تھے۔ سب فارسی میں۔ بچے تو اتنے ہوشیار ہوتے تھے کہ انھیں پوری کی پوری عبارتیں یاد تھیں۔ تقسیم نامے یا وصیتیں گزوں لمبے کاغذ پر لکھی جاتی تھیں۔ کئی بار بڑی دستاویز تیار کرنے میں مہینوں لگ جاتے تھے۔ کاغذوں میں ان کی بو بس جاتی تھی۔ انگریزی میں لکھنے والے عرضی نویس شاید کاپیر کہلاتے تھے۔ بڑے رائے ایک مضمون کو کئی بار لکھتے تھے۔ تب جا کر ان کا آخری مضمون تیار ہوتا تھا۔ بڑے بڑے موتی جیسے حروف۔ بس سطریں ٹیڑھی ہو جاتی تھیں۔ ان کی گردن بھی ٹیڑھی رہتی تھی۔ ٹوپی بھی ٹیڑھی لگاتے تھے۔ پگڑی بھی ٹیڑھی باندھتے تھے۔ بس گاڑی میں بیٹھ کر نکلتے تھے اور لوگ سلام کرتے تھے تو پہلے سے ٹیڑھی گردن کو اسی طرف ٹیڑھی کر لیتے تھے۔

خیر، میں دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ گھوم کر دیکھوں کہ بڑے رائے کہاں ہیں لیکن ان کی دھمک اتنی تھی کہ گردن گھما کر دیکھنا میرے لیے دشوار تھا۔ قریب ڈیڑھ گھنٹے بعد رائے کی گردن اٹھی اور بولے "یہاں آؤ!" میں ڈرتے ڈرتے ان کے پاس پہنچا۔ اب لوگ اپنے والد سے اتنا نہیں ڈرتے۔ میں پاس آکر کھڑا ہو گیا تو بولے ——— "تمھیں معلوم ہے آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ شاید نہیں، تم لوگ تو نوکروں پر حکومت چلاتے ہو۔ گاڑیوں پر گھومتے ہو۔۔۔ وہ سب کچھ نہیں رہے گا۔ رہے گا تو ان ہی لوگوں کے پاس جو تعلیم یافتہ ہوں گے۔ جب ہم لوگوں کو یہ عیش و عشرت نصیب نہیں ہوئی

تھی، تب پڑھائی لکھائی اس کا معیار نہیں تھا۔ خاندان تھا سوائی جھلکتی تھی، حکومت برطانیہ کی نظر میں خون اور نسل کو ترجیح دی جاتی تھی۔ آنے والا وقت ویسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہتا ہوں، پڑھو، پڑھائی ہی وہ روشنی ہوگی جو تمھیں راستہ دکھائے گی۔ ہمیں بھول کر ان استادوں کو ہی اپنا رہنما بناؤ۔ ہم لوگ تو گئے وقتوں کے ہیں۔ باپ کا کام پرورش کرنا ہے اور استاد ہیرا تراش کر اس میں آب و تاب پیدا کرتا ہے۔

بڑے رائے اتنا بول گئے تھے۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا وہ تو دو چار لفظوں میں ہی بات ختم کر دیتے تھے۔ پھر آگے نہیں بولے۔ گردن جھکائی اور کام میں لگ گئے۔ اب سوچتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ بڑے رائے کو آگے والے زمانے کا اتنا صحیح اندازہ کیسے تھا۔ میں بھی کئی بار رگھوبر اور کرور کو بھی سمجھاتا تھا اس پر میری بات کا کتنا اثر ہوتا تھا یہ کہا نہیں جا سکتا۔ مجھ پر اپنے والد کی بات کا دبدبہ تو تھا لیکن اثر شاید نہ کے برابر تھا۔ شاید ان دنوں لوگوں کے دماغ اس طرح کے بنے ہوئے بھی نہیں ہوتے تھے۔ میری زندگی کا بیش قیمتی حصہ زمینداری کی دیکھ بھال اور کاشت کا انتظام میں گزرا تھا۔ یا پھر بڑے رائے کی چمک دمک کو برقرار رکھنے میں۔ اس کے علاوہ نہ میں نے کچھ کیا اور نہ سوچا۔ اب وہ دور ختم ہوا اور میرا وقت آیا تو ایک اندھیرا سامنے ملا۔ میری اولاد تک اس اندھیرے کی چادر میں لپٹ گئی۔ اب میں کچھ نہیں، ایک طفل شیر خوار کی طرح ہوں جو نہ اپنے آپ اٹھ بیٹھ سکتا ہوں اور نہ اپنے فیصلے خود کر سکتا ہے یا یوں کہیے کہ وقت مجھے کسی رہگزر پر ایک لاوارث کی طرح چھوڑ گیا ہے۔ کبھی کبھی یہ ہی وقت گھوڑے کی طرح قدم سے قدم ملا کر میرے سامنے دوڑا کرتا تھا۔ اب میں اس کی سموں کی چھوٹ سے گھائل یہاں پڑا ہوں۔ غلطی میری ہی ہے۔ میں نے اسے نابدان کے پانی کی طرح بہہ جانے دیا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ وقت کا ایک ایک پاؤں کتنا وزنی ہوتا ہے، ذرا دیر میں کچل دیتا ہے، پھر بھی کوئی اسے دوڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ابھی یہاں تھا، ابھی وہاں۔۔۔۔!

درجہ ہشتم میں فیل ہو جانے کے بعد میرا من اسکول جانے کا نہیں تھا۔ میرے درجے کے لڑکے اگلے درجے میں چلے گئے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک دوسری طرح کی چمک تھی۔ میرے چہرے کی رونق اور چمک کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی مایوسی کو دبنگئی میں بدل لیا تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ میں وہ لنگڑا گھوڑا نہیں ہوں جو دوڑتے

دوڑتے ٹانگ توڑ بیٹھا ہو اور دوڑ میں پیچھے چھوٹ گیا ہو۔ کبھی بھی پچھوں کو دوں ان گھوڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو آگے نکل گئے۔ مجھے اسکول جانا پڑا۔ لیکن ایک بے شرم ہیٹر کی طرح گیا، جیسے مجھے فیل ہونے کی خوشی ہو، پڑھنا میرے لیے بلاوجہ کی چیز ہو۔ پڑھتیں پڑھتیں، نہ پڑھیں تو نہ پڑھیں۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ پڑھنا تب ہماری زمینداری نہیں تھا یہ بات بعد میں سمجھ آئی کہ اس سے بڑی زمینداری دوسری نہیں ہوتی۔ اس وقت تو زمینداری سے بڑی کوئی لگتی نہیں تھی۔ بس یہی لگتا تھا کہ جو کام کر کے کھاتے ہیں یہ پڑھائی جن کا ذریعہ معاش ہے وہ دوئم درجے کے لوگ ہیں۔ ہم لوگ یعنی زمیندار ــــ کسی سے کیا مقابلہ۔ ایسا نہیں کہ یہ میرے اکیلے کی سوچ ہو، میرے جیسے اور بھی بہت سے لڑکے تھے۔ دراصل ہم سب یہی سمجھتے تھے کہ ہمیشہ ایک سا ہی وقت رہے گا حالانکہ وقت بھی تعمیر کا ایک ایسا محل ہوتا ہے کہ ایک اینٹ نکلی پورا محل نیچے۔

اسکول میں ہم لوگوں کا ایک گٹ تھا۔ سب ایک ساتھ آ کر آم کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوتے تھے۔ جہاں جانا ہوتا تھا ایک ساتھ جاتے تھے۔ ہم لوگوں کے کوچوان اسکول کے باہر گاڑیاں لیے ایک قطار میں کھڑے رہتے تھے۔ الاٹین برانڈ کی سگریٹ پیتے اور اپنے اپنے مالکوں کی بات کرتے ہوئے۔ تب الاٹین سگریٹ کی ڈبی دو پیسے میں آتی تھی۔ کوچوانوں میں بھی چھوٹے بڑے کا بھید بھاؤ تھا جتنا بڑا مالک اتنا ہی بڑا کوچوان۔ جن لڑکوں کے یہاں گاڑیاں نہیں تھیں وہ بھی گاڑی والوں میں بٹے ہوتے تھے۔ چند ایک ایسے ہوتے تھے جو پرواہ نہیں کرتے تھے لیکن ایسے کم تھے۔ درجوں میں بھی ہم لوگوں کو صاحب حیثیت مانا جاتا تھا۔ وہاں کچھ اس انداز سے جاتے تھے جیسے وہ ایک باغیچہ ہو اور ہم لوگ وہاں چہل قدمی کے لیے گئے ہوں۔ اب احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی ناسمجھی کی بات تھی، کئی ایک ماسٹر صاحبان تو ہنس کر کہتے تھے ــــ جائیے، جائیے، آپ لوگوں کو کیا ضرورت ــــ آپ چاہیں تو کلاس آپ کے یہاں چل کر پہنچ جائے گی۔ پڑھائی تو بے سہارا اور ضرورت مندوں کی چیز ہے۔ لارڈوں کے لیے اس کی کیا اہمیت۔ ہم لوگ فخر سے مسکراتے تھے، باقی لوگ بھی ہمیں حسرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کتنے خوش نصیب ہیں! سچ پوچھیے تو خوش نصیب وہی تھے جب وقت آگے نکل چکتا ہے تو ہم اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں، تب وہ ریل کے آخری ڈبے کی طرح معدوم ہوتا نظر آتا ہے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو وقت رہتے سمجھ پاتے ہیں کہ یہ

وقت ہے۔

جن بچوں سے میری دوستی تھی وہ سب یا تو میرے جیسے ہی تھے یا پھر وہ لوگ تھے جو ویسا بننا چاہتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ جتنا دبدبہ میرے والد یعنی بڑے رائے کا تھا اتنا کسی کا نہیں تھا اسی لیے زیادہ تر لڑکے میرے ارد گرد رہتے تھے۔ تب میری ماں زندہ تھیں۔ ایک نہایت سیدھی اور منکسر خاتون۔ حتیٰ کہ گنتی بھی نہیں جانتی تھیں۔ تب چاندی اور سونے کے سکے چلتے تھے۔ دیوان خانے سے تو بندھا ہوا جیب خرچ ملتا تھا لیکن ماں سے پیسے جھٹکنا آسان تھا۔ کبھی ایمان داری سے تو کبھی بے ایمانی سے۔ ماں کے پاس اٹھ ماسی ہوتی تھیں۔ وہ مجھے ترانے کے لیے دے دیتی تھیں۔ میں انھیں آدھے پونے دام واپس کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان دنوں ایک اٹھ ماسی کے عوض اٹھارہ کلدار ملتے تھے۔ کلدار معنی چاندی کا روپیہ۔ میں روپے اور اٹھنی ملی جلی لاتا تھا اور انھیں سنبھلوا دیتا۔ تب اٹھنیاں اور چونیاں بھی چاندی کی ہوتی تھیں۔ ماں بس یہی پوچھتی تھیں —— "ارے بھاسکر، تو نے بے ایمانی تو نہیں کی بیٹا؟"

میں فوراً کہتا —— "ماں آپ بھی کیا بات کرتی ہیں، بھلا میں آپ سے بے ایمانی کروں گا، ماں سے بھی بھلا کوئی بے ایمانی کرتا ہے۔" ماں خوش ہو جاتیں۔ دعا دیتیں۔ مجھے دو روپے بھی مل جاتے تھے تو مجھے لگتا تھا کہ میں امیروں کا امیر ہوں۔ دوستوں کو بھی کھلا دیتا اور خود بھی کھاتا تھا۔ تب سونے چاندی کے سکے تھے اب کاغذ کے نوٹ ہیں۔ ماں سے اڑایا ہوا بہت سا پیسہ میں نے دوستوں میں اڑا دیا۔ جب میری ماں مریں تب انھیں کم دکھنے لگا تھا۔ ارن گود میں تھا۔ میری بہن رانی سات آٹھ سال کی رہی ہو گی۔ ان کو رانی اور بھوانی نے ہی پالا۔ بھوانی کی موت ابھی کچھ دن پہلے ہوئی۔ میری گود میں سر رکھ کر جان، جاں آفریں کے سپرد کی لیکن جب بڑے رائے مرے تو انھوں نے اس سے کہا —— "بھوانی، اب میرے پاس کچھ نہیں بچا، لیکن تو نے میری بہت خدمت کی، جو تجھے چاہیے، مجھے بتا —— گھر... زمین..."

بھوانی نے روتے روتے ہاتھ جوڑ دیے تھے —— "بھاسکر بھیا کو دیجیے مالک، میرے لیے تو آپ کی جگہ، اب یہ اور رگھبر بابو ہیں... مجھے کیا کرنا۔"

انھوں نے اس کی طرف دیکھا اور تھوڑی دیر بعد ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ جب بھوانی

نے پران چھوڑے تو میں اتنا بھی کہنے لائق نہیں تھا، جھوٹی ہی ہو!! ــــ ''مجھے معاف کیجئے میں ساتھ چھوڑ کر جا رہا ہوں ــــ بڑے رائے سے میں نے وعدہ کیا تھا'' اور چیتا بنا۔ اس کا کام ہم نے پورے دل سے کیا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں تو تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

بڑے رائے کو عجیب و غریب جھک تھی۔ وہ اپنی بیوی یا میری ماں سے یہ چاہتے تھے کہ جب بھی وہ ان کے سامنے جائیں۔ نئی ساڑی بدل کر جائیں۔ نئی کیا ــــ جو پہلے کبھی نہ پہنی گئی ہو۔ اگر کبھی وہ دھلی ہوئی ساڑی پہنے نظر آجاتی تھیں تو ایسا دہاڑتے تھے کہ ماں بکری کی طرح دبک جاتی تھیں۔ اس زمانے میں محبت کا یہی بانکا ترچھا اظہار تھا۔

''کیا میں مر گیا جو تم یوں پرانے دھرانے کپڑے پہنے گھومتی ہو!''

ماں بھی جواب نہیں دیتی تھیں۔ صرف گردن ہلا دیتیں۔ ان کی آنکھوں سے لگتا جیسے وہ التجا کر رہی ہوں کہ ایسی بات منہ سے نہ نکالیں۔ وہ اپنے آپ ہی پوچھتے ــــ تو پھر یہ ساڑی کیوں پہن رکھی ہے؟'' ماں تب بھی چپ رہتیں۔ وہ فوراً دیوان جی کو بلا کر کہتے ''جاؤ فلاں بزاز کے یہاں سے دھوتی، جوڑے قمیص کے کپڑے وغیرہ لوا لاؤ۔'' تب ایک ہی بزاز تھا۔ پورا کا پورا بزاز دمنگا کر ڈھیر لگا دیتے۔ تب عورتیں بھی کالر اور پوری آستین کی قمیص پہنتی تھیں۔ ماں بس ٹسر ٹسر روتی رہتی تھیں۔ ماں کی آنکھیں آدھی رونے میں گئی تھیں اور آدھی چولہا پھونکنے میں۔ یہ بات سب کو ناگوار محسوس ہوتی تھی کہ ماں چولہا پھونکیں چار چار مستر تھے۔ ایک بناتا تھا دوسرا کھلاتا تھا۔ ایک دوپہر کا کھانا بناتا تھا دوسرا شام کا۔ لیکن جب کبھی بے وقت مہمان آجاتے تھے تب ماں کو خود چولہا پھونکنا پڑتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ مہمان کھانا بغیر سو جائیں۔ چاہے رات کے بارہ بجے ہوں یا دو ــــ کئی بار ماں بنا کر تیار کرتی تھی اور مہمان کھا کر آئے ہوتے تھے۔ دراصل مہمانوں سے یہ پوچھنا خلاف تہذیب سمجھا جاتا تھا کہ وہ کھانا کھائیں گے یا نہیں؟ اسی لیے بڑے رائے کا مستقل حکم تھا کہ مہمانوں کے سامنے کھانا لگا کر آنا چاہیے چاہے وہ کھائیں یا نہ کھائیں۔ ویسے بھی تب لکڑیاں پھونکنی پڑتی تھیں۔ آج جیسی سہولیات نہیں تھیں۔ پھونکیں مارتے مارتے اور آگ سلگاتے سلگاتے ہی ماں کی آنکھوں کی روشنی مدھم پڑتی گئی۔ لیکن ماں نے کبھی اُف نہ کی۔ ان سے کوئی کچھ کہتا بھی تھا تو وہ یہ ہی کہتی تھیں کہ میں گھر کی مالکن ہو کر مہمانوں کے لیے کھانا نہیں بناؤں گی

تو کون بنائے گا۔ آنکھیں جائیں یا جسم۔

ماں جب مریں تو انھیں ارن کی تو جو فکر تھی وہ تو تھی ہی، میری بھی بہت فکر تھی۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ بیٹے کا بیاہ اپنے ہاتھوں کر دیں لیکن تب میں تھا ہی کتنا بڑا۔ بڑے رائے ویسے بھی بچوں کے بیاہ کے خلاف تھے۔ یہ ان پر انگریزوں کی صحبت کا اثر تھا۔ شاردا ایکٹ ان کے لیے پتھر کی لکیر تھی۔ آنریری مجسٹریٹ ہو کر اگر میں اس پر عمل کی تعمیل نہ کروں گا تو کون کرے گا ــــ اسی چکر میں ماں اپنی آرزو اپنے ساتھ لیے چلی گئیں۔ تب میری دادی بھی زندہ تھی۔ وہ ماں کے تین چار ماہ بعد مریں۔ انھوں نے بھی بڑے رائے کو سمجھانا چاہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ میری ماں اور دادی ایک دوسرے کے آگے پیچھے پرلوک سدھار گئیں۔

دادی اور بڑے رائے میں ایک عجیب یکسانیت تھی۔ بڑے رائے دو چھوٹے بھائی اور تھے کرشن رائے اور راگھو رائے۔ دادی کا سب سے زیادہ پیار سب سے چھوٹے بیٹے راگھو رائے سے تھا اس کے بعد کرشن رائے سے۔ بڑے رائے کے ساتھ ان کا رسمی سا ہی معاملہ تھا۔ ویسے دادی کے علاوہ انھیں بڑی کہہ کر کوئی نہیں پکار سکتا تھا۔ جب بڑے رائے اندر حویلی میں کھانا کھانے جاتے تھے تو اپنی ماں کے قدموں میں سر جھکاتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس ہی رہی تھیں۔ ویسے بھی تب سب رائے کے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن ان کا دل اپنے چھوٹے بیٹوں میں ہی رہتا تھا۔ لینا دینا بھی انھیں کے ساتھ تھا۔ جب ماں مریں تو بڑے رائے نے ہی ان کا سنسکار کیا تھا مجھے یہ تو یاد نہیں کہ وہ رائے تھے یا نہیں لیکن میں نے یہ دیکھا کہ ان کی جھبے دار مونچھیں صفاچٹ ہو گئیں۔ سر گھٹ گیا۔ سفید بنیان دھوتی پہنے وہ ننگے پاؤں اپنی ماں کی ارتھی کے پیچھے ایک عام آدمی کی طرح جا رہے تھے۔ اس طرح شاید انھیں پہلے کبھی کسی نے دیکھا ہو۔ چہرہ ایک دم سوکھا اور بے آب تھا حالانکہ لوگوں کی بھیڑ ان کے پیچھے چل رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ میں ناچیز ہو گئے تھے۔ جب لاش کو چتا پر رکھ دیا گیا اور آگے لگانے کا وقت آیا تو انھوں نے ان کے چرنوں میں اسی طرح سر رکھا جیسے کھانا کھانے سے پہلے رکھا کرتے تھے اور بولے ــــ "ماں، تو تو گئی اب مجھے اناؤں جناؤں سے کون

بچ جائے گا۔'' شاید اس وقت رو رہے ہوں۔ اس دن مجھے پہلی بار اپنے اور ان کے درمیان یکسانیت لگی تھی۔ جب میری ماں مریں میں نے سنسکار کیا تھا۔ دھوتی میں لپٹا ننگے پاؤں میں ان کی چتا کی پریکرما کر رہا تھا۔ میرا سر مونڈ دیا گیا تھا۔ میرے بال گھنگھریالے تھے۔ مجھے بہت پسند تھے۔ مجھے ان ہی کے بارے میں سوچ سوچ کر رونا آرہا تھا۔

جب میں بڑا ہو گیا تھا تو میرے ایک دوست بن گئے تھے۔ ان کا نام تھا کشن بھائی۔ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ انھیں میرے گھنگھریالے بال بہت پسند تھے۔ جب میں ان کے پاس جاتا تھا تو ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی تھی۔ مجھے عجیب لگتا تھا۔ میں نے اسے بعد میں پہچانا وہ میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے رہتے تھے۔ میں شروع میں پریشان ہوتا تھا۔ بعد میں ان کا وہ شاندار چوبارہ میرے لیے بندرگاہ کا کام کرنے لگا۔ میں نے ان کی عادتوں کے ساتھ دوستی کرلی۔ میں جب بھی پریشان ہوتا تھا تو ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ میں نے یہ جان لیا تھا کہ کشن بھائی مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ ایک طرح سے میرے عاشق ہیں، وہ مجھ پر سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے دراصل وہ تھے عام آدمی لیکن کسی کی ریاست کے وارث بن کر آئے تھے۔ پیار میں یا تو پیسوں کو دانتوں سے پکڑتا ہے یا پھر وہ اس کے لیے مٹی میں بدل جاتا ہے۔ کشن بابو کے لیے پیسہ دھول ہی تھا۔ انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پیسہ خرچ نہ کر کے پچھلے پیروں سے دھول اڑا رہے ہوں۔ کئی بار میں عمر کا لحاظ کیے بغیر جھڑک دیتا تھا۔ وہ برا نہیں مانتے تھے بلکہ ناز نخرے اٹھانے کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ کئی بار میرے اعضا کو بھی چھوتے تھے۔ اپنے ساتھ لیٹنے کے لیے منت کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے مجھے ان سب باتوں کی عادت پڑ گئی تھی۔

میں گھر سے اسکول کے لیے جاتا تھا لیکن پہنچنا کبھی کبھی ہی ہوتا تھا۔ کبھی کنچے کھیلتا تھا، کبھی پتنگ اڑاتا تھا۔ یا پھر کشن بھائی مل جاتے تھے تو ان ہی کے یہاں مال پانی کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب کام چھوڑ کر میرے پاس چلے آتے تھے۔ ان کے اس برتاؤ نے میری کافی بدنامی کردی تھی۔ ان کا وہ کمرہ جس میں ہم لوگ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے تھے، بہت سجا ہوا تھا۔ ہر وقت عطر کی خوشبو آتی رہتی تھی کھانے کے لیے طرح طرح کی چیزیں منگوا کر ڈھیر لگا دیتے تھے

جیسے مجھے کھانے کی کمی ہو۔ کبھی کبھی تو میں اسے ویسا کا ویسا ہی رکھا چھوڑ دیتا تھا۔ کشن بھائی مایوس ہو جاتے تھے۔ ان کا مایوس ہو جانا نہ جانے مجھے کیوں اچھا لگتا تھا۔ کئی بار تو انھیں ایسا پاگل پن سوجھتا کہ اپنے ہاتھ سے کھلانے لگتے۔ کبھی میں کھالیتا اور کبھی ہاتھ جھٹک دیتا۔ ایک بار جب انھوں نے زبردستی کی تو میں نے لقمہ منہ میں لے کر اسی تشتری میں تھوک دیا۔ وہ خود اسے کھاگئے۔ اس دن مجھے بہت گھن محسوس ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر چل دیا تھا۔ کشن بھائی بہت گڑگڑائے۔ لیکن میں رکا نہیں۔

میں وہاں سے اٹھ کر سیدھا اسکول گیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ایسا ہوگا تو میں کبھی نہ جاتا۔ میری کلاس میں ایک لڑکا تھا جانکی رام وہ شہر کے ایک بہت نامی گرامی پنڈت کا لڑکا تھا۔ اس کا گھر کشن بھائی کے چوبارے کے پاس تھا۔ حالانکہ وہ ہمارے چوکڑی میں نہیں تھا۔ لیکن دعا سلام، ہنسی مذاق چلتا تھا۔ وہ مجھے رائے کہتا تھا میں اسے پنڈت وہ آشیرواد دیتا تھا اور میں 'پائیں' کرتا تھا۔ پھر دونوں ہنستے رہتے تھے۔ اس کے ماتھے پر لمبا چوڑا ٹیکا لگا رہتا تھا۔ چوٹی بھی کافی موٹی تھی۔ رنگ کالا اور قد لمبا۔ پتہ نہیں اس دن سے اسے کیا ہوا۔ دیکھتے ہی بولا ــــــ "بھاسکر، یار کاہے کو رائیوں کو بدنام کرتے ہو۔ ہر وقت چوبارے پر ہی پڑے رہتے ہو۔ ایسا ہی ہے تو کشن کے ساتھ ہی کیوں نہیں رہنے لگتے۔"

مجھے اس طرح کی بات سننے کی ذرا بھی عادت نہیں تھی۔ لڑکوں میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو میری بے عزتی کر کے نکل جائے میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لڑکے میرے رد عمل کا انتظار کر رہے تھے ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی انہونی کے منتظر ہیں۔ بڑا رائے بنا پھرتا ہے دیکھیں کیا کرتا ہے؟ مجھے لگا کہ اسی لمحے کیا گیا فیصلہ مجھے ان سب کی نگاہ میں اٹھا بھی سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے گرا بھی سکتا ہے۔ اگر میں ایک بار نظروں سے گر گیا تو لعنت ہے میرے رائے ہونے پر۔ اس زمانے میں چاقو رکھنے کا چلن تھا۔ چاقو، ٹوپی، رومال اور جوتہ خوش حالی کی نشانیاں تھیں۔ اچھے گھر کے لڑکے ڈاسن کا جوتہ پہنتے تھے۔

میرا چاقو ہاتھی دانت کا اور نسبتاً بڑا تھا۔ اس زمانے میں رائے جس کا چاقو چلتا تھا اس کا پھل بھی مضبوط ہوتا تھا اور دستہ بھی۔ میں نے چاقو نکالا، کھولا، پیشہ وروں کی طرح انگلی سے دھار پرکھی پتہ نہیں کیوں مجھ پر وحشت سی سوار ہو گئی تھی۔ مجھے اپنا چاقو اور جانکی رام کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا ہاتھ ایسے لپکا جیسے باز لپکتا ہے۔ وہ دوڑا بھی لیکن مجھ میں

بجلی کی سی تیزی آگئی تھی۔ وہ ایک ہی وار میں گر گیا اور خون کی دھار چھوٹ نکلی۔ خون دیکھ تو مجھے ہوش آیا۔ یہ کیا کرڈالا؟ بڑے راے کی سرخ اور باہر کی طرف ابلی آنکھیں نظر آنے لگیں۔ مجھے لگا کہ سب کے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں اس وقت بھی میرے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا۔ کچھ دیر تک اسی طرح لیے کھڑا رہا جیسے چھینٹے کا مہورت پنڈت کے لیے نکالا جائے گا وہاں پر کھڑے سب ہی لڑکے مجھے اس خون سے تربتر نظر آرہے تھے۔ پیڑ پودے، اسکول کی عمارت سب خون کے چھینٹوں سے بھیگ گئے تھے۔ میں وہاں سے خراماں خراماں نکلا۔ بھاگا نہیں۔

اس دن میں نے اپنی گاڑی کشن بھائی کے گھر سے ہی واپس کردی تھی۔ پہلے اسکول جانے کا قطعی ارداہ نہیں تھا۔ اسکول میرے لیے اتنا ضروری نہیں تھا۔ ایک لڑکے نے مجھے اپنی گاڑی پر بٹھایا اور کہا جلدی سے نکل جاؤ۔ میں گھر نہ جاکر کشن بھائی کے یہاں اتر گیا۔ اس دن پہلی بار مجھے لگا کہ وہی واحد پناہ گاہ تھی جہاں غلطی کرنے کے بعد بھی میری رسائی تھی۔ چاقو تب بھی میرے پاس تھا کپڑوں سے رگڑ رگڑ کر اس پر لگا خون پونچھ گیا تھا۔ کہیں کہیں خون لگا تھا۔ وہ سوکھ کر بدرنگ ہو گیا تھا۔ اس دن پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ تازہ خون جتنا لال اور لپلپاتا ہوا ہوتا ہے، سوکھا خون اتنا ہی میلا اور بے آب ہو جاتا ہے۔ میں نے چاقو نکال کر کشن بھائی کے سامنے رکھ دیا۔ خون کے دھبوں والا چاقو دیکھ کر وہ چونک گئے۔ یہ کیا ہوا؟ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا لیکن میر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کشن بھائی میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو اٹھے ـــــ "تم کیوں رو رہے ہو؟ بولا کیا ہوا؟ میں تمھیں روتے نہیں دیکھ سکتا۔"

میں نے کہا "تمھارا نام لے کر رام دین مہاراج کے بیٹے نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں نے اس کے چاقو مار دیا!" وہ بڑے ضرور تھے لیکن تعلقات کی وجہ سے میں انھیں تم ہی کہتا تھا۔

کشن بھائی کے ماتھے پر دیکھتے دیکھتے پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ جیسے تحیر زدہ ہو گئے ہوں۔ انھوں نے دو تین بار تھوک نگلا۔ چاقو سامنے پڑا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں لگ بھگ اسی پر تھیں۔ نظر ہٹتے ہی پتہ نہیں وہ کیا کر بیٹھے اس کا پھل جتنا پونچھ گیا تھا اتنا وہ چمک رہا تھا اور جتنے پر خون لگ کر سوکھ گیا تھا، وہ بدرنگ تھا۔

کشن بھائی کافی دیر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ مجھے لگا کہ ان کی زبان سوکھ کر کھنکھر ہو گئی ہے۔ شاید وہ اب کبھی نہ بول سکیں۔ میں نے کہا ـــــ ''تو میں جا رہا ہوں۔ لگتا ہے تم کچھ نہیں کرو گے۔''

وہ بمشکل تمام اپنے تحیر سے واپس آئے اور میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ ''ٹھیک ہے ـــــ جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن تم بڑے رائے کے بڑے بیٹے ہو ـــــ اس کا کیا جواب ہے؟''

میرے سامنے اسی وقت سے بڑے رائے کی تریری ہوئی لال لال آنکھیں گھوم رہی تھیں، جب سے چاقو اپنا کام کر کے میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ جب کشن بھائی نے بڑے رائے کا نام لیا تو مجھے لگا وہ آنکھیں ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' فلم کے ہیرو وی شانتارام کی ایک جوڑی آنکھوں کی طرح سارے میں پھیل گئی ہیں۔ یہ فلم میں نے چند برس پہلے دیکھی تھی اس کی وہ ایک جوڑی آنکھ میں ابھی تک نہیں بھولا۔ بڑے رائے کی آنکھوں میں معافی نہیں تھی۔ غصہ تھا تحقیر تھی۔ لیکن میں ہمت کر کے فوراً بولا ـــ ''تمہیں کچھ کرنا ہے تو کرو ـــ بڑے رائے کا نام مت لو۔ روز میں تم پیار میں آ کر لمبی لمبی باتیں کرتے تھے ـــــ میرے پاس لیٹ کر اپنا دکھاتے تھے جیسے پتہ نہیں میں تمہارا کون ہوں؟ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں ـــــ''

کشن بھائی نے مجھے چھونا چاہا۔ میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ یکایک قابل رحم ہو گئے۔ وہ بولے۔ ''کہاں جاؤ گے؟'' ''تم سے مطلب؟''

اس وقت کشن بھائی سنبھل گئے تھے۔ وہ بولے ''نہیں، تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ یہیں رہو گے۔ میں بڑے رائے کے پاس جاتا ہوں ـــــ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ بڑے رائے میرا آنا پسند نہیں کریں گے۔ میرا ابھی ان کے سامنے جانے کا پہلا موقع ہو گا۔ لیکن ان کے علاوہ کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔''

میں نے انھیں روکنا چاہا لیکن وہ بولے ''پاگل پن مت کرو، اتنے بڑے واقعہ کو اپنے والد سے چھپانا چاہتے ہو۔ ان کے علاوہ کون ہے جو تمہیں بچا سکتا ہے؟ میں بچا نہیں سکتا صرف کچھ دن چھپائے رہ سکتا ہوں۔''

کشن بابو کے پاس ایک معتبر ملازم تھا۔ وہ مجھے اس کے سپرد کر کے بڑے رائے کے پاس چلے گئے۔ بڑے رائے کو تب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کشن بابو کے چوبارے پر

جاتا ہوں۔ کشن بابو حالانکہ باہر سے آئے تھے لیکن اپنی اس قسم کی حرکتوں کے لیے شہر بھر میں بدنام تھے۔ خاص طور سے لڑکوں سے اپنی دوستی کے لیے۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں بڑے رائے ان پر برس نہ پڑیں۔ ان ہی کے ساتھ یہاں آکر میری دھنائی نہ شروع کر دیں۔ میں بار بار ان کے غصے سے تپی آنکھوں میں اس طرح ڈوبنے لگتا تھا جیسے کھد بداتے پانی میں تل چکا ـــــ! میں وہاں اکیلا ضرور تھا لیکن رہ رہ کر مجھے لگ رہا تھا کہ جانکی رام کا خون بہہ بہہ کر میرے نیچے پھیلتا جا رہا ہے۔ میں کبھی اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاتا تھا، کبھی تخت پر۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہاں پر موجود سب لڑکے یہاں بھی اکٹھا ہیں اور خون کے اس بہاؤ میں بہتے ہوئے میری طرف آرہے ہیں۔ میں دوڑتے دوڑتے بے دم ہوا جا رہا ہوں۔

کشن بھائی چاقو اپنے ساتھ لیتے گئے تھے پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ وہ چاقو وہیں پڑا پڑا مسلسل بڑھ رہا ہے۔ کسی بھی لمحے مجھے حلال کر سکتا ہے۔ میں جان رہا تھا کہ پولیس آسکتی ہے اور مجھے پکڑ کر لے جا سکتی ہے۔ دیگر نتائج کا اندازہ نہیں تھا۔ بس ایک ہی سہارا تھا کہ میں بڑے رائے کا بیٹا ہوں لیکن پھر بھی میں بیٹھے بیٹھے چونک اٹھتا تھا۔ جب نتائج واضح نہیں ہوتے تو گھبراہٹ کم ہوتی ہے۔ اگر انسان نتائج سے بالکل انجان ہو تو اسے کچھ نہیں لگتا۔ ان کا کچھ کچھ معلوم ہونا ہی مجھے پریشان کر رہا تھا۔ اوپر سے بڑے رائے اور ان کا غصہ!

بیچ بیچ میں کشن بابو کا نوکر آکر پوچھ جاتا تھا۔ اپنے مالک کی طرح خوشامد سی کرنے لگتا تھا۔ کچھ کھا لو ـــــ

کشن بابو دو تین گھنٹے بعد لوٹے۔ چہرے پر اتنا تناؤ نہیں تھا جتنا وہ لے کر گئے تھے۔ دوسری بات وہ اکیلے تھے۔

جب کشن بابو حویلی پہنچے تو تو بڑے رائے پوجا سے اٹھے تھے۔ تقریباً بارہ بجے ہوں گے۔ وہ پوجا سے اٹھ کر کچھ دیر اپنے کمرے میں پر سکون بیٹھتے تھے۔ کشن بابو جب پہنچے تو وہ وہیں بیٹھے تھے۔ بھوانی انھیں باہر ہی مل گیا تھا۔ اس نے کشن بابو کو یہیں کہہ کر لوٹانے کی کوشش کی لیکن جب انھوں نے کہا بہت ضروری بات ہے اور بھاسکر بابو مصیبت میں ہیں تو بھوانی بھی پریشان ہو اٹھا۔ وہ اندر جا کر بولا ـــــ "کشن سہائے آئے ہیں۔"

"کون کشن سہائے؟"

"پٹورے والے ـــــ مسماۃ دویادیوی کی جائیداد کے وارث۔"

"وہ یہاں کیوں آیا؟" بڑے رائے کی آنکھیں چڑھ گئیں۔

بھوانی کو معلوم تھا کہ میں کشن سہائے کے یہاں جاتا ہوں لیکن اس نے یہ کہہ کر کہ معلوم نہیں مالک، بات کو وہیں ختم کر دیا۔ اتنا ضرور کہا کہ کوئی بے حد ضروری کام ہے۔ فوراً ملنا چاہتے ہیں۔

بڑے رائے پوجا سے اٹھنے کے بعد کھونٹی والی کھڑاؤں پہنے رہتے تھے اور چادر اوڑھے رہتے تھے۔ اس وقت وہ دور سے ہی بات کرتے تھے۔ اپنے کو چھونے نہیں دیتے تھے۔ وہ کمرے سے اسی طرح باہر آئے۔ کشن بابو نے ان کے پیر چھونے چاہے تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ بس ہاتھ اٹھا دیا۔ پھر بولے "کہیے"

کشن بابو کی خود اعتمادی ان کے ایک قدم پیچھے ہونے سے ہی مجروح ہو گئی تھی۔ بڑے رائے نے کہا ـــــ "بیٹھیے!"

"آپ کے سامنے کیسے بیٹھ سکتا ہوں!"

"نہیں،، آپ بیٹھیے۔ میں ابھی پوجا سے اٹھا ہوں ـــــ کپڑے بدلنے ہیں آپ بیٹھیں۔"

بڑے رائے کی آواز میں بٹھا دینے والی طاقت تھی۔ کشن بابو ایک بار بیٹھ گئے۔ پھر فوراً ہی کھڑے ہو گئے ـــــ "مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

"کس بارے میں؟"

ان کی آواز اتنی بھاری تھی کہ انھیں لگا کہ وہ اس کے نیچے دب سے گئے پھر کشن بابو نے اپنے کو تھوڑا سنبھال کر کہا "بھاسکر رائے کے بارے میں۔"

"بھاسکر کے بارے میں!" انھوں نے حیرت اور غصّے سے دیکھا۔ پھر بولے "اس کا تم سے کیا مطلب؟"

"میں اسے جانتا ہوں کہ آپ کا بیٹا ہے۔"

"وہ تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ تم اور کیا جانتے ہو؟"

کشن بابو نے اس بات کا جواب نہ دے کر سیدھے کہا "اسکول میں بھاسکر کا پنڈت

رام دین کے بیٹے سے جھگڑا ہو گیا۔"

"جھگڑا ہو گیا۔" ان کی آواز ٹھہری ہوئی تھی لیکن پہلی بات چیت ختم ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا تھا؟"

وہ اس سوال کا جواب ٹال گئے اور بولے "بھاسکر نے ان کے لڑکے کو چاقو مار دیا۔" ادھ پچھا اور ادھ سنا چاقو نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ایک منٹ اسے دیکھتے رہے۔ بھوانی وہیں کھڑا تھا۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ "یہ تو ان ہی کا ہے۔"

بھوانی تب لڑکا ہی تھا۔ مجھ سے ایک دو سال بڑا۔ جیسے ہی انھوں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا، اس کا پیشاب نکل گیا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے بھاگا۔ اس کی میری دوستی زیادہ تھی بہ نسبت مالک اور نوکر والے رشتے کے۔ موقع ملتے ہی ہم کنچے کھیلتے تھے یا پتنگ اڑاتے تھے۔

بڑے رائے بولے ـــــ "بھاسکر نے یہ چاقو میری عزت پر چلایا ہے" پھر رک کر پوچھا "لیکن تمھیں کیسے پتہ چلا؟ تم ایک ـــــ" وہ شاید بدنام کہنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو روک لیا۔

کشن بابو نے کہا "بڑے رائے، اس وقت آپ بھاسکر کے بارے میں سوچیں تو اچھا ہو۔ آپ کے بغیر کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔ پولس اسے تلاش کرتی ہوئی کہیں حویلی پر نہ آ جائے۔"

بڑے رائے کے چہرے سے لگا دہکتے کوئلے کو یکایک بجھا دیا جائے۔ وہ بولے۔

"اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"میرے گھر پر۔"

ایک لمحے کے لیے رائے کے چہرے پر تلملاہٹ ابھر آئی لیکن فوراً غائب بھی ہو گئی۔ دھیرے سے بولے "اسے وہیں رکھنا۔ جب میں خبر بھیجوں تب نکالنا۔ اس لڑکے نے عزت اور کردار ـــــ لگتا ہے سب کچھ گم کر دیا وہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ کشن بابو کو لگا پیچھے چھٹے الفاظ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہے ہیں۔ بھوانی ڈرتا ڈرتا آیا اور اس نے کشن بابو سے پوچھا "بھیا کو کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں۔"

"انھوں نے کس کو چاقو مار دیا؟"

"تم سے مطلب؟"

"ہم ہی انھیں گاڑی سے چوبارے چھوڑ کر آتے ہیں۔"

کشن بابو نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر غم اور ایک طرح کی بچوں جیسی معصومیت تھی۔ وہ انھیں اچھی لگی۔

"وہ بولے تم اندر کیوں نہیں آتے؟"

تب ہی اندر سے آواز آئی ـــــ "آپ جائیں ـــــ اپنے گھر پر میرے پیغام کا انتظار کریں۔"

کشن بابو رکنا چاہتے تھے یہ بھی چاہتے تھے کہ گواہ بن کر بڑے رائے کے ساتھ رہیں لیکن اس اعلان کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا۔

کشن بابو کے چلتے وقت بھوانی نے کہا ـــــ "بابو ہم بھی چلیں۔" وہ ہنس دیے۔ دھیرے سے بولے "پھر کسی وقت آجانا!"

کشن بابو کو اس بات کی خوشی تھی کہ بڑے رائے سے ان کی ملاقات ہوگئی اور انھوں نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آنے سے پہلے انھیں اسی بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ ان کی بات ہی نہ سنیں اور انھیں باہر نکال دیں۔ ویسے انھوں نے اس کی بے عزتی کی کوشش کی تھی لیکن کشن بابو نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ آپ پہلے بھاسکر کے بارے میں سوچیں یہ ہی بات کافی حد تک کام کر گئی تھی۔

کشن بابو دھیرے دھیرے نارمل ہو گئے تھے۔ ان کا تناؤ کم ہوتا گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے پیار کی باتوں کے موڈ میں آتے جا رہے تھے۔ میں اب بھی اتنے ہی تناؤ میں تھا۔ ان کا یہ سب کہنا مجھے ذرا بھی خوش نہیں کر رہا تھا کہ میرے لیے وہ اپنی جان قربان کر دیں گے۔ ان کی جان! میرے قدموں پر نچھاور ہے لیکن یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ اگر کشن بابو کا چوبارہ نہ ہوتا تو کہاں جاتا! اس لیے میں ان کے ذریعہ پیش کی جا رہی پیار کی کھیر حلق سے نیچے اتارنے کے لیے مجبور تھا۔ جب وہ کچھ زیادہ حرکت کرنے لگتے تھے تو میں انھیں منع بھی کر دیتا تھا۔۔۔ سمجھتے کیوں نہیں؟ موقع محل تو دیکھا کرو۔"

وہ دانت نکال کر ہنس دیتے تھے "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر معاملہ نہیں سمجھا تو تمھاری جگہ میں جیل چلا جاؤں گا۔ میرا جو بھی ہے سب تیرے لیے ہے۔ میں تو بس تیری نظر عنایت چاہتا ہوں" وہ جب آتو ترانش کرنے لگتے تھے تو بے قابو سے ہو جاتے تھے۔ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس وقت وہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

کشن بابو کے جانے کے بعد بڑے رائے کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ اس وقت وہ اکیلے تھے۔ ان کے دونوں بھائی منجھلے اور چھوٹے رائے زمینداری کے دورے پر گئے تھے۔ انھوں نے فوراً ہرکارے کو بلوایا اور اس سے کہا ـــــ "منجھلے رائے اور چھوٹے رائے جہاں بھی ہوں فوراً بلا کر لے آؤ ـــــ ان سے کہنا کہ جس حالت میں بھی ہوں اسی میں چلے آئیں۔" ہرکارے کو بھیج کر وہ خود تیار ہو کر پولس کپتان کے بنگلے چلے گئے پنڈت رام دین کی طرف سے لوگ ان کے بنگلے پر پہلے سے ہی موجود تھے جب بڑے رائے کی گاڑی گھسی تو ان سب نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ بڑی رائے کو پتہ چل گیا۔ وہ بھی آگئے ان میں سے چند ایک تو انھیں دیکھ کر کھسک گئے۔ کچھ ایک دوسرے کے کان میں پھسپھسانے لگے ـــــ بڑی رائے میدان میں اتر آئے۔ اب مشکل ہے۔ پہلے ہو جاتا تو ہو جاتا۔ جب وہ گاڑی سے اترے تو پنڈت رام دین سامنے پڑ گئے انھوں نے جھک کر آداب کیا ـــــ "پائے لاگن پنڈت جی" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر دھیرے سے کہا "آشیرواد!" پولس کپتان انگریز تھا۔ اس کا نام تھاپلی۔ وہ۔ بڑے رائے کمرے میں چلے گئے۔ افسروں کے پرانے بنگلوں میں ایک گول کمرہ ہوتا تھا جس میں مہمان خصوصی بیٹھ کر صاحب سے ملنے کا انتظار کرتے تھے۔ مسٹر وڈ اندر سے نکلے تو بڑے رائے کو دیکھ کر بولے ـــــ "ویل رائے صاحب، کیسے تکلیف کیا؟"

انھوں نے توڑا رک کر کہا "ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں ـــــ آپ کی مدد چاہیے۔"

"وھاٹ ہپنڈ (what happened)؟"

بڑے رائے نے دھیرے سے کہا "بدقسمتی ہی سمجھیے۔" وہ ہنس کر بولے "او یس،

اس کے بنا کوئی ہمارے پاس نہیں آتا۔"

بڑے رائے نے پورا قصہ سنا دیا۔ انھوں نے کچھ چھپایا نہیں۔ مسٹر وڈ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے "یور سن ــــ آپ کا بیٹا ــــ ہیز ڈی انجرڈ اٹ؟"

"شاید نہیں۔"

"وھاٹ اباؤٹ دی ایویڈینس۔"

"ہو سکتا ہے ذات پرستی کا رنگ دیا جائے!"

"اٹ از ٹو بیڈ۔ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتا ہے؟"

جو لوگ باہر کھڑے ہیں سب ایک ہی ذات اور ایک ہی گروہ کے ہیں۔ پنڈت رام دین ساتھ لے کر آئے ہیں۔"

"آپ بیٹھئے ــــ ہم بات کر کے آتا ہے" پھر گھوم کر پوچھا "آپ کا بیٹا کہاں ہے۔"

"ابھی لوٹ کر گھر نہیں آیا۔"

"میں پولس کے ذریعہ تلاش کرتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے آدمیوں کو ہر طرف دوڑا دیا ہے۔ پتہ لگ جائے گا۔" یہ کہہ کر بڑے رائے پولس کپتان کی طرف دیکھنے لگے۔ مسٹر وڈ نے ہنس کر کہا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

ہری رام کبھی اٹھتے تھے کبھی بیٹھتے تھے۔ ان کے دل میں اتھل پتھل تھی۔ انھوں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ کہیں یہ انگریز اس کا فائدہ نہ اٹھانے لگے لیکن حاکم سے جھوٹ بولنا بھی تو ٹھیک نہیں۔ بعد میں پتہ چلے کہ ہری رائے نے جھوٹ کہا تو اس کا اس پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ یہ ہی تو سوچے گا کہ بنتے ہیں ہمارے وفادار اور بولتے ہیں جھوٹ! اب کم از کم یہ الزام تو عائد نہیں ہو گا لیکن اگر یہ پلٹ گیا تو بھاسکر کا کیا ہو گا؟ بھاسکر کو پولس سے تلاش کرانے والی بات تو کہہ رہا تھا؟ کہیں دوسری پارٹی نے پیسہ نہ چڑھا دیا ہو۔ ویسے وہ خود بھی انتظام کر کے گئے تھے۔ یہ ہی ہونا ہی ہے تو یہ ہی سہی! لیکن یہ ہوا کیسے؟ ایسا کیا ہو گیا تھا کہ بھاسکر کو چاقو نکالنا پڑا، وہ بھی پنڈت جی کے بیٹے کے اوپر۔ پنڈت رام دین تو ویسے بھی ہمارے محترم ہیں۔ انھیں بھی براہ راست پولس میں نہیں جانا چاہیے تھا میرے پاس آتے تو بھاسکر سے معافی

مشغول تھا۔ لیکن یہ کشن سہائے کہاں آ ٹپکا —— ایک بدنام اور بدچلن آدمی۔ کہیں اس نے بھاسکر کو بھی تو نہیں پھانس لیا؟ رام دین بھی اسی محلے میں رہتے ہیں۔ کہیں ایسی ویسی بات پر لڑائی تو نہیں ہو گئی؟ مسمات زندہ تھیں تو ادھر بھی جانا ہوتا تھا۔ بڑی دبنگ عورت تھی۔ اکیلی اتنی بڑی جائیداد کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کے کہنے کی پرواہ نہیں کی۔ اپنی جائیداد کو ہمیشہ کتوں سے بچایا۔ لوگوں کی دوسروں کی پرائی تھالی میں منہ مارنے کی عادت ہوتی ہے۔ جب بھی کسی نے اس کی جائیداد کی طرف انگلی اٹھائی —— ان کی ڈیوڑھی دروازے پر آکر ہی لگ جاتی تھی۔ اس نے بارہا کہا —— ”رائے صاحب، آپ میرے شوہر کے دوست ہیں۔ اس جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیجیے۔ آپ سے بڑھ کر خیر خواہ اور کون ہوگا؟ بھاسکر کو گود لینا چاہتی تھی۔ وہ بڑا لڑکا تھا۔ بڑا ایمان کو دو جا سکتا ہے اور نہ دیا جا سکتا ہے۔ وہ مر گئی اور اس کی گدی پر کشن سہائے آ بیٹھا۔ اسی کشن سہائے کے چنگل میں ـــ لگتا ہے ـــ بھاسکر پھنس گیا۔ بھاسکر خود اتنی بڑی جائیداد کا وارث ہے —— پھر وہ کس لالچ میں اس کے پاس جاتا ہے؟ بڑے رائے نے آنکھیں بند کر لیں۔

مسیز وڈ سے بڑے رائے کی اچھی پہچان تھی۔ اچانک وہ گول کمرے میں آ گئیں۔ بڑے رائے کو بیٹھے دیکھ کر وہ بولیں ”ویل مسٹر رائے آپ یہاں اکیلے بیٹھے ہے —— فلپ کہاں ہے؟ ان لوگوں میں ہمیشہ آدھا نام لینے کا رواج ہوتا ہے۔

انھوں نے کھڑے ہو کر سلام کیا پھر باہر کی طرف اشارہ کر دیا باہر گئے ہیں۔

مسیز وڈ نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویل مسٹر رائے —— آپ پریشان لگتا ہے، ہم کچھ مدد کر سکتا؟“

بڑے رائے کی جیسے جان میں جان آ گئی۔ ان کا گلا بھر آیا لیکن انھیں عورت کے سامنے اس طرح جذباتی ہونا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ وہ سنبھل کر بولے —— ”میں مصیبت میں ہوں مسیز وڈ —— میرے نابالغ بیٹے کا اپنے کلاس کے لڑکے سے شاید جھگڑا ہو گیا —— اس نے اسے زخمی کر دیا۔“

”کیسے؟ ہاؤ؟“

انھوں نے لمبی سانس لے کر کہا — ''چاقو ہے!''

''میرِ ییبل!'' ان کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ بڑے رائے بھی اس اظہار سے چونک گئے۔ اس نے پھر کہا ''ہاؤ ہرونڈل —!''

رائے کا رائے پن ابھر آیا۔ وہ جھٹکا کھا کر بولے ''کیا آپ کے ملک کے بچے آپس میں کبھی اس طرح نہیں لڑتے — کیا وہ عیسیٰ مسیح ہی بن کر پیدا ہوتے ہیں؟''

مسیز وڈ نے ان کی طرف دیکھا۔ اس تلخ جواب کے باوجود رائے کا چہرہ نارمل تھا۔ وہ بولیں ''سب لڑتا ہے — بٹ ناٹ بائی نائف — ڈوئیل کرتا ہے۔''

''بچے سب ہی نا سمجھ ہوتے ہیں — میرے لڑکے نے بھی نا سمجھی میں ہی کیا ہوگا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے پاس چاقو تھا۔''

میم نے کہا — ''نائف از مور پینفل!''

بڑے رائے کے منہ پر بات آئی اور پھر لوٹ گئی۔ وہ رک کر بولے — ''میری پریشانی کا سبب میرے بیٹے کا ذہنیت ہے۔''

''ہم کیا کر سکتا ہے مسٹر رائے؟''

''میرے بچے کو بچانے میں مدد۔۔۔''

بڑے رائے نے ایک مخملی تھیلی نکالی اور میز پر رکھی چھوڑ دی۔ مسیز وڈ کی نظر اس پر پڑی لیکن انھوں نے ان دیکھا کر دیا۔ بڑے رائے نے کہا — ''میں مسٹر وڈ کو دیکھ کر آتا ہوں۔'' وہ باہر چلے گئے۔ مسیز وڈ بلی کی طرح دبے پاؤں اس کے پاس گئیں۔ اسے اٹھایا اور تولا۔ پھر اس کی تنیاں کھول کر اندر جھانکا اور اٹھا کر دوسرے کمرے میں ایسے لے گئیں جیسے کہ بھول سے لے جا رہی ہوں۔

بڑے رائے لوٹے تو کمرہ خالی تھا۔ اس کی نظر اس میز پر بھی گئی۔ تھیلی وہاں نہیں تھی۔ بڑے رائے کے چہرے پر ہلکی سی راحت نظر آئی۔ مسیز وڈ برابر والے کمرے میں کسی سے انگریزی میں زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ شاید مسٹر وڈ ہی تھے۔

تھوڑی دیر بعد مسٹر وڈ کمرے میں آئے تو بڑے رائے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ وہ

آتے ہی بولے — ''مسٹر رائے برہمن ایڈامینٹ ہیں — اریسٹ کرنے کے لیے ضد کرتا ہے۔ کورٹ جائے گا۔ بیٹر یو ٹاک ٹو دیم — کیپر وائزر۔''

مسز وڈ اندر سے لپک کر باہر آئیں — ''یہ حماقت ہے — بچے ہیں۔۔۔ کھیل کھیل میں ہو جاتا ہے۔ تم کیسے ایس۔پی ہو بچوں کو جرائم پیشہ بناؤ گے'' وہ انگریزی میں ایک سانس میں کہتی چلی گئیں۔

''نہیں ڈارلنگ، میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں'' بڑے رائے کی طرف دیکھ کر کہا ''آپ مسٹر ڈک۔۔۔ کلکٹر صاحب سے مل لیجیے۔ میں بھی ان بات کروں گا۔ ہو سکے تو کمشنر صاحب کے کان میں ڈال دیجیے!''

''میں کرتی ہوں مسٹر ڈک سے بات۔۔۔'' مسز وڈ بولیں اتنے ذرا سے واقعہ کے لیے اتنا شور شرابہ۔۔۔ جبکہ لڑکا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

یکا یک وڈ نے پوچھا ''چاقو کتنا بڑا تھا؟''

''انھوں نے جیب سے چاقو نکال کر سامنے رکھ دیا۔ مسز وڈ بولیں ''میں سمجھتی تھی ڈیگر ہوگا۔ یہ تو سبزی کاٹنے والا چاقو ہے۔ کیا کوئی اس سے مر سکتا ہے؟''

وڈ نے بڑے رائے سے ہنس کر کہا ''اپنے بیٹے کو ابھی چھپا کر رکھیے۔ کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔۔۔ اس چاقو کو بھی! ہمیں دوسرے بچے کی حالت کا انتظار کرنا ہوگا۔۔۔ اس کی حالت بگڑنی نہیں چاہیے۔ جو ہو سکے گا میں کروں گا۔ جائیے اب آپ آرام کیجیے۔''

بڑے رائے اٹھے اور باہر چلے گئے لیکن اب بھی مطمئن نہیں تھے۔

سارا برہمن طبقہ ایک ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ ہمارے خاندان کے پنڈت اور پروہت بھی ان ہی کی طرف تھے۔ پورے شہر میں ماحول میرے خلاف بن گیا تھا۔

منجھلے رائے اور چھوٹے رائے شام تک لوٹ آئے تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا — منجھلے رائے کا نام کرشن رائے تھا اور چھوٹے رائے کا راگھو رائے تھا۔ ایک بھائی اور تھے گپت رائے ان کا انتقال پہلے ہو گیا تھا۔ کرشن رائے کو بڑے رائے نے تحصیلداری میں نامزد کر دیا تھا لیکن افسر سے جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے وہ تحصیلداری سے استعفیٰ دے کر چلے گئے تھے۔ وہ

یہ ہی بتاتے تھے۔ باس یا مالک سے دو ہی صورتوں میں جھگڑا ہوتا ہے ـــــ ایک تو جب بھر پیٹ سے زیادہ کھایا جاتا ہو، دوسرے جب خودداری اور روٹی کے درمیان رسہ کشی میں خودداری سوا بیٹھے۔ منجھلے رائے کے ساتھ دوسری بات کم اور پہلی بات زیادہ تھی۔ خودداری اور روٹی کے درمیان تو رسہ کشی کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ روٹی زیادہ تھی جہاں تک خودداری کا سوال ہے، غرور زیادہ تھا۔ یہ شاید اس وقت کی جاگیرداری کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ آج کی جاگیرداری زیادہ لوچ دار ہے۔

اس زمانہ کا غرور خود کو اور دوسروں کو نقصان پہنچانے والا تھا لیکن تب یہ جاگیرداری کے ہاتھ میں ہتھیار کا طرح تھا۔ خودداری تو ـــ بس اللہ کا نام لو۔ کمائے بغیر عیش و عشرت کا مطلب غرور۔ خودداری کا مطلب کماؤ اور خود کھاؤ۔ چاہو تو دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ بھیڑ پڑے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ تب خودداری دودھ میں جامن لگانے لائق دہی جتنا بھی نہیں تھا۔ چھوٹے رائے یعنی راگھو رائے کو بھی کبھی لگتا تھا کہ خودداری بھی کوئی چیز ہے لیکن ہے کہاں؟ میرا چھوٹا بھائی ارن رائے، جس کو میری ماں چھوٹا سا ہی چھوڑ کر مر گئی تھی اور جسے ایک طرح سے بھوانی اور میری بہن رانی نے پالا تھا، چھوٹے رائے اور ان کی بیوی کو بہت پسند تھا۔ کرشن رائے لاولد تھے ہی۔ اس لیے تینوں بھائیوں میں، میں تھا جو بڑا تھا۔ جب اس حادثے کا کا پتہ چلا تو کرشن رائے اور راگھو رائے پریشان ہو گئے۔ راگھو رائے تو رونے لگے اب کیا ہوگا؟ گھر کی عزت دھول میں مل جائے گی۔ موتی جیسی آب اتر جائے گی۔ کرشن رائے عملی انسان تھے، وہ بولے "یہ رایوں کے خاندان کا لڑکا ہے۔ گھبراؤ نہیں، اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔"

کرشن رائے نے آتے ہی بڑے رائے سے پوچھا "آپ ڈک صاحب سے ملے یا نہیں؟"

"ہاں ڈک اور روز دونوں کو ہمدردی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ شہر کے سارے برہمن ایک ہو گئے ہیں۔ وہ ضلع حاکموں پر لگاتار دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

"بھاسکر کہاں ہے؟"

"بھاسکر ـــ" وہ ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر بولے "وہ مسمات دریا کی جائیداد پر قابض کشن سہائے کے یہاں ہے۔"

"سنا ہے وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے۔" چھوٹے رائے بولے۔

"ہاں، لیکن وہ وہاں پہنچ گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں سے وہاں منظور رہے گا۔ پنڈت رام دین کوشش کریں گے کہ وہ پولس لے کر حویلی پر آجائیں، جس سے ہماری بے عزتی ہو۔ مسز وڈ نے بھی یہی صلاح دی ہے کہ اسے چھپا کر رکھیں۔"

آپ کہیں تو پنڈتوں میں توڑ پھوڑ کی جائے!" منجھلے رائے نے کچھ کچھ چالبانہ انداز میں کہا۔

"پنڈتوں میں ٹوٹ پھوٹ مشکل ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح یہاں کے زمینداروں کو سبق سکھایا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ پروہتائی کرا کر سب کو اپنی پرجا سمجھتے ہیں۔۔۔"

منجھلے رائے بولے۔ "دیکھئے بڑے بھیا، اگر اس معاملے کو ختم کرنا ہے تو ان میں پھوٹ ڈالنی ہی ہوگی۔ ان کی طرف کے مقدمے کا کمزور پڑنا ضروری ہے۔ وہ اپنی تو لیتے سے رہے۔"

جیسا چاہو کرو، پر اس بات کا دھیان رکھنا کہ پنڈت اس گھر میں ہمیشہ عزت پاتے رہے ہیں۔ یہ تو اس لڑکے نے یہ بیج بو دئے!"

"وہ تو آپ کی طرح نہیں سوچتے!" منجھلے رائے نے دبی زبان میں کہا۔

کرشن رائے نے جم کر برہمنوں میں توڑ پھوڑ کی۔ ان کا گڑھ زیادہ مضبوط تھا انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ زمیندار لوگ بھی ان پنڈتوں کا بائیکاٹ کر دیں لیکن پنڈتوں کی بددعا سے وہ سب ڈرتے تھے۔ پھر بھی منجھلے رائے کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ خاص طور پر تین گواہوں نے یہ بیان دیا کہ ہم موقع پر موجود نہیں تھے۔ پنڈت جی نے آکر بتایا کہ رائے صاحب کے بڑے بیٹے نے ان کے بیٹے کو چاقو سے مارا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ تھی کہ چوٹ کسی عام ہتھیار سے لگی ہے وہ ہتھیار چاہے لوہے کی پتی ہو یا کُھنت چاقو اس سے کسی بھی حالت میں جان نہیں جا سکتی تھی اور نہ اسے قتل کے ارادے سے استعمال ہی کیا جا سکتا تھا۔ پنڈت کا بیٹا جانکی رام بھی میرے خلاف کوئی خاص بات نہیں کہہ سکا۔ پولس کی رپورٹ پہلے ہی موافق لگ چکی تھی۔ ویسے اس معاملے کے لیے خصوصی جج مقرر کی گئی تھی۔ جج کا فیصلہ ہمارے حق

میں ہوا۔ دوسرا فریق بہت بھاگ دوڑ پر بھی کچھ نہیں کر پایا۔ میں باعزت بری ہو گیا۔

اسی بہانے کشن بابو کا بھی ہمارے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس بات سے میں خوش تھا۔ کشن بابو تو خوش تھے۔ لیکن بڑے رائے اندر ہی اندر مغموم تھے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بڑے رائے کو اس بات کا اتنا دکھ کیوں ہے۔ وہ بڑی بڑی باتوں پر بھی یکساں رہتے تھے۔ میں نے بچپن سے ہی دیکھا تھا کہ پانی میں شہتوت کی قمچیاں بھیگی رہتی تھیں۔ پھر انھیں تیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جب آسامی آتے تھے، وصولی میں آنا کانی کرتے تھے تو کیشی یعنی آتو جمعدار اور بدلو چمار ان قمچیوں کو تیل سے نکال کر ان کی پٹائی کرتے تھے۔ چمڑی پھٹ جاتی تھی اور خون بہنے لگتا تھا۔ کئی بار گھر والے کھاٹ پر ڈال کر لے جاتے تھے۔ اگر کوئی جواب دیتا تھا تو اس کی مصیبت آجاتی تھی زیادہ ہوا تو کیشی جی اور بدلو آسامیوں کو زبردستی منہ کھلوا کر پیشاب کر دیتے تھے۔ اسے وہ پیاس بجھانی کہتے تھے۔ بڑے رائے بے تعلق انداز میں اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ وہ اس بات کا دھیان رکھتے تھے کہ کہیں کوئی مر نہ جائے۔

ایک بار کا قصہ مجھے یاد ہے کیدار سیانی کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ منجھلے رائے گھوڑے پر سوار ہو کر زمینداری میں کن کے لیے جا رہے تھے۔ جب کھلیان اٹھتا تھا اور اناج اکٹھا ہوتا تھا تو اس کا کن ہوتا تھا۔ یعنی تلائی چاہے کانٹے سے ہو یا اندازے سے پھر بٹوارہ کیا جاتا تھا۔ خیر، برات دوسرے گاؤں کی تھی۔ وہ گاؤں ہماری زمینداری سے باہر پڑتا تھا۔ منجھلے رائے کو برات میں کوئی پہچانتا تھا منجھلے رائے ادھر سے نکلے تو براتی اور دولہا کھاٹوں پر بیٹھے رہے۔ دولہا کے لیے کھاٹ پر دری اور چادر بچھی تھی۔ منجھلے رائے پہلے تو نکل گئے۔ یکایک انھیں خیال آیا کہ آداب تو در کنار کوئی دیکھ کر کھڑا تک نہیں ہوا وہ لوٹ پڑے اور وہاں پر موجود گاؤں کے دو تین آدمیوں سے کہا کہ ہر براتی کے پانچ پانچ جوتے لگاؤ اور دولہے کا مرغا بنا دو۔ وہ لوگ گردن جھکا کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔

منجھلے رائے کو حکم عدولی پسند نہ تھی۔ وہ بولے ___ تم لوگوں کو گاؤں میں رہنا ہے یا نہیں۔" وہ پھر بھی تیار نہیں ہوئے۔ تھوڑی دوری پر ڈیرا تھا۔ وہاں سے اپنے آدمیوں کو بلوایا۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے شروع سے آخر تک سب کو جوتے لگوائے۔ جنھوں نے حکم عدولی کی تھی انھیں ننگا کرا کر مقعد میں ڈنڈا چڑھوایا۔ تب تک کیدار کو خبر ہوئی وہ دوڑا دوڑا آیا۔ پاؤں پر لیٹ گیا" سرکار ایسا نہ کیجئے، میری بیٹی کی شادی ہے۔۔۔ اس کے ہاتھ پیلے

ہو جائے دیجئے۔ یہ آپ کی گئو ہے۔۔۔ یہ سب مان ہے حضور۔ میری ساری عزت آپ کی جوتیوں میں ہے۔ میری بیٹی کو بیاہ دیجئے۔"

کرشن رائے کے اوپر اس کی بات کا نہ تو اثر پڑا اور نہ پڑنے کی بات ہی تھی۔ کیدار نے اپنی دلہن بیٹی کو لا کر ان کے پیروں میں ڈال دیا ——— "مالک یہ رہی آپ کی پرجا ہے مار دیا گا کو۔"

انھوں نے ایک اٹھ ماسی نکالی اور اس کی طرف ایسے پھینک دی جیسے لاوارث لاش پر پھینک رہے ہوں اور کیدار سے بولے "مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں نہ تیری بیٹی سے ہے۔ مجھے ان حرامزادوں کو سبق سکھانا ہے جو اتنا نہیں سمجھتے کہ جاتے کے زمیندار کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔ زمیندار چاہے یہاں کا ہو یا کہیں کا۔۔۔ زمیندار زمیندار ہوتا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری بے عزتی کر کے اپنے تعلقے کی عزت افزائی کر رہے ہیں۔" منجھلے رائے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چل دیے۔

کیدار کی بیٹی رنچنڈی کی طرح اٹھی اور گھوڑے پر جاتے منجھلے رائے کی پیٹھ پر پوری طاقت سے اٹھ ماسی پھینک ماری منجھلے رائے کچھ دور نکل چکے تھے اس لیے لگی نہیں۔ وہ چلائی "لے جا اس اٹھ ماسی کو۔۔۔ رکھ دینا اپنی اولاد کی ارتھی پر ——— تو زندگی بھر اولاد کا منہ دیکھنے سے ترسے گا۔"

اگلے دن کیدار کی بیٹی کی لاش راج باہے میں ڈوبی تیرتی ملی۔ کیدار پاگل ہو گیا۔

ان سب باتوں کے پس منظر میں مجھے وہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اگر میں نے پنڈت جی کے بیٹے کو چاقو چھوا ہی دیا تو کون سی آفت آگئی یہ لوگ اتنی سی بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہے ہیں؟ کیا اس لیے کہ جانکی رام پنڈت رام دین کا بیٹا ہے اور پنڈت رام دین اپنے کو سب سے اونچا مانتے ہیں لیکن ساری عزت و عظمت اور دھن دولت میں تو ہم بڑے ہیں۔ ہم لوگ ان لوگوں کو دان دیتے ہیں۔ ویسے بھی مار پیٹ کرتے وقت سب برابر ہو جاتے ہیں۔ یہی گھمنڈ مجھے وراثت میں ملا تھا۔

میں اندر ہی اندر تناؤ سے خوفزدہ تھا۔

مجھے اسکول سے ہٹا لیا گیا تھا۔ کچھ دنوں تک میں بے مقصد گھومتا رہا۔ صبح اٹھتا۔ تیل مالش ہوتی، نہانا دھونا ہوتا۔ تیل چیلیل لگتا۔ سجاد تجا جاتا۔ پھر حکم کے بموجب دیوان خانے میں آ بیٹھتا۔ بڑے رائے کے مستقل احکامات تھے کہ کم از کم روز دو گھنٹے دیوان خانے میں بیٹھ کر زمینداری کا پورا کام سمجھوں اور اپنی عقل کو سان پر چڑھاؤں۔ عقل کا استعمال نہ بھی ہو تب بھی وہاں جا کر بیٹھوں ضرور۔

آسامی سویرے سے آنا شروع ہو جاتے تھے۔ کوئی پیسے کا انتظام کر کے لگان کا روپیہ دو روپیہ بھر پاتا تھا بھلے ہی تقاضہ پانچ کا ہو اس کے ان دو روپوں کو، جنھیں وہ اتنے جتن سے ایا ہوتا تھا ایسے پھینک دیتے تھے جیسے چھونے کے لائق نہ ہو۔ روپے چکر گھنی کی طرح گھومتے۔ ان کا گھومنا اور بجنا دھیرے دھیرے کم ہوتا۔ پھر وہ گر جاتے جیسے تھک گئے ہوں۔ آسامی اٹھانے کے لیے جھکتا تو پیچھے سے دو لاتیں لگانے کے لیے مقدم تیار کھڑا رہتا۔ لات لگتے ہی وہ اوندھے منہ زمین پر کتے کی طرح پاؤں سمیت پسر جاتا اور منہ سے خون کی دھار بہنے لگتی۔ کبھی کبھی دانت تک ٹوٹ جاتے۔ کچھ لوگوں کو ڈنڈا ڈولی کر کے لایا جاتا۔ وہ لوگ اتنے خوفزدہ رہتے جیسے انھیں لوک کہانی کے کسی دیو کے کھانے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ یہ لوگ پٹتے بھی اور بڑے دیوان جی کے پاؤں بھی پڑتے اپنی مجبوری بیان کرتے۔ ان کا رحم مانگتے۔ روتے گڑگڑاتے کسی کی فصل بہت زیادہ بارش کے سبب خراب ہو گئی ہوتی۔ کسی کی فصل کو سوکھا نگل ہوتا۔ کسی کا جانور مر جاتا اور کوئی بگڑ جاتی کسی کی بٹیا کی شادی کا کسالا (دکھ، مصیبت، وہ کھٹائی جس میں سنار زیور صاف کرتے ہیں) پھیل جاتا۔ کسی کے یہاں جنیو پڑ جاتا۔ کسی کے باپ سورگباش ہو جاتے اور جو کچھ بچا کھچا ہوتا وہ کریا کرم کی نذر ہو جاتا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن ان سب کی وہاں ترائی ہوتی وہ یہ جانتے ہوئے بھی جاتے تھے کہ توڑے جائیں گے۔ بڑا کاشت کار ہوتا تو دودھ یا گنے کے رس کی بہنگی لدوا کر لاتا تھا یا پھر گڑ، شکر، راب یا پھل پھلانگ لے کر آتا۔ بڑے دیوان جی کے پاس بیٹھنے کی جگہ ملتی۔ جب تک دوسرے لوگ پٹتے رہتے وہ پٹنے والوں کی طرف سے اس طرح بے خبر بنا بیٹھا رہتا جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے یا وہ وہاں موجود نہ ہو کر کہیں اور ہو۔

کئی بار کاشت کار بالکل ہی سامنے پڑ جاتا۔ اس کا بھی کچھ نہیں۔ مشکل تب ہوتی جب جب دیوان جی اپنی زیادتی کی تائید اس سے چاہتے۔ تب اسے اس کا نام لے کر کہنا پڑتا "ارے بھئی۔۔۔ کلوا۔۔۔ وقت پر دے دیا کرو۔ مالک کا پیسہ تو ہاتھ جوڑ کر دینا ہی ہے۔ دیوان جی تو رحم کی مورتی ہیں لیکن وہ بھی تقدیر سے بندھے ہیں۔"

کلوا کہتا "راوتے بھائی، تم تو خود ہی جانتے ہو کہ کتنی برسات ہوئی جانوروں کا چارہ تک گل گیا ـــــ کھیت کھلیانوں میں اس طرح پانی بھر گیا جیسے گنگا جی چڑھ آئی ہوں۔ فصل ہی نہیں تو پیسے کہاں سے لائیں۔

لیکن پٹائی ہونے لگتی تو راگھو بھائی منہ چھپانے لگتے۔ جب سب معاملات نمٹ جاتے تو راگھو بھائی ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا "دیوان جی، فصل تو واقعی برباد ہو گئی۔"

"تم بھی تو راے ہو؟ تمھاری فصل برباد نہیں ہوئی؟؟"

اس کے چہرے پر دبنے والا جذبہ ابھر آتا، ہاتھ جوڑ کر کہتا "ہم تو سدا پہیلیوں میں دینے والے ہیں، مالک! لیکن اس بار انتظام نہیں ہو سکا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے قرض تک نہیں ملا۔ ملے کا ہے پر۔۔۔ فصل کھڑی ہو تو دینے والے کی بھی دھارس بندھی رہتی ہے ـــ آگے پیچھے آ ہی جائے گا۔ جب کچھ بچا ہی نہیں تو دینے والا بھی کا ہے پر دے۔ اب آپ ہی ہمارے مائی باپ ہو۔"

دیوان جی کا رخ ایک دم بدل جاتا۔ گردن ٹیڑھی ہو جاتی۔ اس کا لایا ہوا نذرانہ غائب ہو جاتا "دیکھو راگھو، ہماری بات مت پکڑو پاس بٹھالیا تو دماغ ہی بگڑ گئے!"

وہ پاؤں پکڑتا "عزت بنی رہنے دو دیوان جی، عزت چلی گئی تو بچوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جب تک ہے تب ہی تک عورت کا مرد اور بچوں کا باپ ہوں ـــــ اتر گئی تو کاہے کا مرد، کاہے کا باپ۔ اترے اچار کی طرح بے مزہ ہو کر نالی بھر کا ہو جاؤں گا۔"

دیوان جی گنیش کو پکارتے "ارے گنیشی، اس راگھو کی چول ہل گئی، ذرا بٹھا تو دے۔"

راگھو کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ بالوں کی نوکیں بھیگ جاتیں جیسے تیل نکل آیا ہو۔ تب تک وہ دانتی سے دو چار کلدار نکال کر مٹھی میں لے لیتا۔ گنیشی اپنے ہتھیاروں سے سج دھج کر آتا تو دیوان جی کہتے "لگتا ہے گھر سے پیاسا چل دیا ـــــ اندر تو سب سے چھوٹے رائے بیٹھے ہیں۔ اسے پرلے گھر میں لے جاؤ اور اس کی اچھی طرح پیاس بجھاؤ۔ بدلو کو بھی بلوا

لینا ـــــ وہ بدن دبا دے گا۔ راگھو بابو بڑے کاشتکار ہیں ـــــ ہنڈا ان کا چکمہ بھی بڑا ہے۔"

وہ پاؤں پر لیٹ جاتا "مالک ایسا مت کرو ـــــ اتنا جمع کر لو باقی اگلے مہینے ادا کر دوں گا۔"

"دیکھا، بغیر دبائے تل تیل نہیں دیتے، ویسے بھی جتنی موٹی چڑیا اتنا چھوٹا چھید، تھوڑا بڑا کر دو۔ چھید بڑا کرنے کا اوزار لے آؤ۔"

"نہیں حضور ایسا نہ کرو۔ جیتے جی مر جاؤں گا۔ اتنا بے عزت نہ کراؤ مالک!"

"عزت تو تب ہوتی ہے جب عزت کا کام کرو۔ دینے والے کی وقت پر دیتے رہو، لینے والے سے وقت پر لے لو، اگر دینے والے کو دو نہیں تو عزت کہاں سے ہو گی!"

دیوان جی کی نظر یکایک اس کی لائی ہوئی سوغات پر چلی جاتی تو رک جاتی کہتے "بس، ایک ہفتے کی مہلت مل سکتی ہے۔ آٹھویں دن جانتے ہو کیا ہو گا؟" وہ گہری نظر سے دیکھتے۔ راگھو چلا جاتا۔

دیوان جی کے اشارے پر وہ دونوں بھی جن کے چراغ کی طرح غائب ہو جاتے۔

مجھے ان سب میں مزہ بھی آتا تھا اور عجیب بھی لگتا تھا۔ پھر سوچتا تھا۔ پھر سوچتا تھا ـــ زمینداری چلانے کا شاید یہ ہی قاعدہ ہو۔ جب تک یہ سب سوانگ چلتا تب تک بڑے رائے پوجا میں رہتے۔ نہ وہ اپنی آنکھوں دیکھتے اور نہ کوئی ان تک فریاد ہی پہنچا پاتا۔ جب تک وہ اٹھتے دیوان جی بھی سارے 'کرم کانڈ' سے نمٹ چکے ہوتے۔ بس جیسے ہی بھوانی کو بھوگ کے لیے آواز لگتی میں سمجھ جاتا کہ بڑے رائے کی پوجا ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک گھنٹی بجتی رہتی۔ وہ ٹھاکر جی کی آرتی کرتے ہوئے۔ ان کا ناشتہ ہی بھوگ ہوتا۔ دودھ، چھلے بادام، منقی اور کالی مرچ کی گولی اور اصلی گھی کا ایک پراٹھا۔ بھوگ لگا کر اسی کا ناشتہ کر لیتے۔ پھر وہ تیار ہو کر کچہری میں جا بیٹھتے۔ پہلے زمینداری کے مقدمے پیش ہوتے۔ کسی کی گھر والی کسی کے ساتھ بیٹھ گئی، کسی نے دوسرے کی زمین دبالی یا پانی کاٹ لیا یا جانور کھول لیا یا قرض نہیں دیا وغیرہ وغیرہ۔ جب مقدمے نمٹ جاتے تو سرکاری مقدمے پیش ہوتے۔ انھیں اپنی آنریری مجسٹریٹی کی کچہری گھر پر کرنے کی خاص اجازت حاصل تھی۔ وہ ڈھائی بجے اٹھتے۔

دوپہر کا کھانا وہ 'چوکے' میں ہی کرتے تھے۔ 'چوکے' میں جانے سے پہلے وہ یہ ضرور پوچھتے تھے کہ کوئی آیا گیا کھانے سے تو نہیں رہ گیا۔ جب 'نہیں' ہو جاتی تو وہ کھانا کھانے جاتے۔ ان کے کھانے کے بعد گھر کی عورتیں کھاتیں۔ یہ سلسلہ تا زندگی چلا۔ جب بیمار تھے تب بھی وہ اسی وقت دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ ڈاکٹروں تک نے منع کیا لیکن انھوں نے اپنی عادت نہیں چھوڑی۔ مرنے سے پہلے انھوں نے ایک دن مجھے بلا کر کہا "تم لوگ زندگی بھر یہ کہتے رہے کہ میں دوپہر کو جلدی روٹی کھا لیا کروں ____ تمھیں معلوم ہے کہ میں ایسا کیوں نہیں کرتا تھا؟ پھر بولے اگر میں جلدی کھانا کھا لیتا تو چوکہ 'اٹھ' جاتا اور اگر بعد میں کوئی مہمان آ جاتا تو یا تو دوبارہ چولھا چڑھانا پڑتا یا پھر بازار سے کھانا آتا گھر ہوتے ہوئے کھانا بازار سے آئے تو وہ شرم کی بات ہوتی ہے۔ دوبارہ چولھا چڑھانے میں گھر کی عورتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ تکلیف سے کھلایا گیا کھانا نہ کھانے والے کو لگتا ہے اور نہ کھلانے والے کو اس کا ثواب ملتا ہے۔ بس پیٹ بھر جاتا ہے۔ یہ بات مجھے پہلی بار معلوم ہوئی تھی۔ میں نے اس روایت پر چلنا چاہا تھا لیکن میرے لیے ممکن نہیں ہوا۔ خیر۔

کبھی کبھی منجھلے رائے اور چھوٹے رائے بھی ہوئے تو ان کے ساتھ ہی چوکے میں ایک لباس میں کھانا کھاتے تھے۔ تینوں بھائیوں کی تھالیاں لگ جاتی تھیں۔ زینے پر چڑھتے ہوئے تینوں بھائیوں کی کھڑاؤں کی آواز پوری حویلی میں سناٹے کو گہرا دیتی تھیں۔ کچھ دن میں نے بھی ان کے ساتھ کھانا کھایا لیکن جب بعد میں نبھا نہیں تو میں ان کے کھانے سے پہلے ہی کھا لیتا تھا۔

میں کچھ ہی دنوں دیوان خانے میں بیٹھا تھا دھیرے دھیرے زمینداری کا کام بھی میرے پاس آنے لگا۔ جب میں زمینداری کا کام دیکھتا تو مجھے لگتا کہ میں بھی رایوں کے زمرہ میں آتا جا رہا ہوں۔ یہ احساس مجھے خوشی سے بھر دیتا۔ ان دنوں سائیکل نئی نئی چلی تھی۔ میرے لیے ولایتی سائیکل منگائی گئی۔ میں گھوڑے پر یا گھوڑا گاڑی میں چلنا بند کر کے سائیکل پر ہی چلنا شروع کر دیا۔ جب میں سائیکل پر چلتا تھا تو مجھے لگتا تھا جیسے میں ہرنوں کے رتھ پر سوار ہوں۔ لوگ بھی مجھے اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ دراصل ہمارے خاندان میں ایک صاحب نے

ہر نوں کا رتھ بنوایا تھا۔ اس میں دو ہرن جتتے تھے انھیں بھی ہمارے سائیس کالے نے ہی تعلیم دی تھی۔ رتھ بھی اس نے ڈیزائن کیا تھا بس اس میں زیادہ سے زیادہ دو آدمی بیٹھ پاتے تھے۔ جب ان میں سے ایک ہرن مر گیا تو رتھ بے کار ہو گیا۔ دوسرا ہرن لکھنؤ چڑیا گھر بھیج دیا گیا۔ کچھ ہی دن بعد میں سمجھ گیا کہ یہ کل گاڑی ہے جس میں نہ جانور چاہیے نہ سائیس۔ لوگ بھی اسے کیمیا گری کی کرامات مانتے تھے تب ہر تکنیکی کام کو کیمیا گری کہا جاتا تھا۔ سائیکل کی ایجاد نے شہر کے لوگوں کی انگریزوں کے بارے میں عزت اور زیادہ بلندی پر پہنچا دی تھی۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ سائیکل کے یہ کل پرزے کیسے بنے ہوں گے؟

میں آس پاس کی زمینداری کا دورہ بھی سائیکل سے ہی کرتا تھا۔ سڑکیں پکی تھیں۔ میں دھول سے اٹ جاتا تھا۔ کئی بار گر بھی جاتا تھا لیکن جب لوگ مجھے سائیکل پر آتا جاتا دیکھتے تو راستہ چھوڑ دیتے اور سائیکل کے گھومتے پہیوں کو دیکھنے لگتے تھے۔ اس پر میرے پاؤں ایسے گھومتے تھے جیسے وہ بھی اس سائیکل کا حصہ ہوں۔ جب میں سائیکل کھڑی کرتا تو وہ اسے چھو کر دیکھتے انھیں لگتا کہ سائیکل کے اندر بیٹھا کوئی جاندار سائیکل چلاتا ہے۔ بہت بعد میں لوگ اس بات کو سمجھے کہ اندر کی طاقت کے بجائے اس کے اوپر سوار آدمی کی طاقت سائیکل چلاتی ہے۔ ان کے لیے ایک اور بات باعث حیرت تھی وہ اپنے آپ مڑ کیسے جاتی ہے؟ کیا اس کی بھی آنکھیں ہیں؟ سائیکل چلاتے وقت نہ تو کسی کی نظر ہینڈل پر جاتی تھی اور نہ ہاتھوں کی حرکت۔ میں جانتا ہوں کہ آج کل کے زمانے میں جب سائیکل محلے کی گلی گلی میں بیٹھ کر دھوپ سینکتی کسی بڑھیا کی طرح ہو گئی ہے، میری ان باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ بوڑھی کھوسٹ عورت کبھی جوان اور خوبصورت رہی ہو گی۔

جیسا میں نے کہا کہ میری عمر پورا اسی برس کی ہے۔ میں اب ایک ناکام انسان ہوں اور پہاڑ کی چوٹی سے لڑھک کر رہ گزر پر پڑا پتھر ہوں ہر راہگیر اسے اپنے راستے کے روڑے کی طرح سمجھتا ہے اور موقع ملتے ہی بے وجہ ٹھوکر مار کر دور ہٹانے کی کوشش کرتا ہے بھلے ہی وہ راستے کے اور زیادہ بیچ میں آ جائے۔ میں اپنے زمانے میں ہر سواری پر بیٹھا۔ جب حالت بگڑی تب تو سائیکل ہی میرا ایک واحد سہارا بن گئی۔ تب میں نے اس جادو کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ حالانکہ شروع میں اس نے مجھے کئی بار دھول بھی چٹائی تھی تب لوگ سمجھتے تھے سائیکل میں

بند کسی بالے نے بیچ دیا۔ چھوڑے گی نہیں۔ کسی دن ضرور بدلہ لے گی۔ بولے بغیر پتہ چلتا ہی نہیں۔ ریل کے بارے میں بھی یہی ہوتا تھا۔ جب کہیں لائن بچھتی تھی تو لوگ سمجھتے تھے ضرور کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ دوسرے شہروں کی تمام آفات و بلائیات اس ریل گاڑی میں بیٹھ کر یہاں بھی آجائیں گی۔ انگریز عالم ساری الا ئیں بلا ئیں دیہاتوں میں بھیج رہے ہیں جس سے وہ انھیں تنگ نہ کریں۔ جب ریل گاڑی چلتی تھی تو وہ لوگ اسے کالی کلکتے والی کا اوتار سمجھتے تھے پوجا کرتے تھے۔ زور سے چلاتے تھے 'جے کالی کلکتے والی' ۱۸۵۳ء میں سب سے پہلی لائن کا نزے اور بمبئی کے بیچ بچھی تھی۔ وہ ملک پر انگریزوں کے تکنیکی گرفت کی شروعات تھی۔ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی تھی حالانکہ لوگ شروع میں گاڑی میں بیٹھنا ناپاک مانتے تھے۔ جہاں ناپاک مانتے تھے وہیں اسے کالی کا روپ بھی کہتے تھے۔ ریل میں سفر کرتے ہوئے پانی پینا تک حرام مانا جاتا تھا۔ لوگ کئی کئی دنوں کا پورا سفر بغیر پانی پیے اور منہ جھوٹا کیے کر آتے تھے۔ بڑے رائے انگریزوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ منجھلے رائے بھی تحصیلدار رہے تھے اور چھوٹے رائے پر اصلاح کا بھوت تھا اس لیے ریل یا کسی بھی سواری کے بارے میں ہمارے خاندان میں اس طرح کی ضعیف الاعتقادی نہیں تھی بس بڑے رائے تھوڑا سا خیال کرتے تھے لیکن وہ بھی فرسٹ کلاس یا سیکنڈ کلاس کے ڈبے کو دھلوا پچھوا کر پاک کر لیتے تھے۔ پانی اور کھانا ساتھ چلتا ہی تھا۔ کھانا پکا ہوتا تھا۔ بڑے رائے کبھی کبھی مذاق میں کہا کرتے تھے کہ ریلوے میں یہ چار کلاس انگریزوں نے ہندوؤں کے 'ورن آشرم' کو دھیان میں رکھ کر بنائی ہیں ـــــ فرسٹ کلاس سیکنڈ کلاس۔ انٹر کلاس اور تھرڈ کلاس۔ اس زمانے میں یہ چار کلاسیں ہوتی تھیں۔ بڑے افسران اور تعلقے دار فرسٹ کلاس میں چلتے تھے۔ چھوٹے زمیندار اور حکام سیکنڈ کلاس میں اور اچھے کھاتے پیتے درمیانے درجے کے لوگ انٹر میں اور باقی تھرڈ کلاس میں۔ برابر میں بیٹھے آدمی سے یہ ضرور پوچھتے تھے کہ تم کون ہو بھائی؟ یہ ریل مسافروں کی تہذیب بن گئی تھی اگر چھوٹی ذات کا ہوا تو پہلے تو یہ کوشش کی جاتی تھی کہ وہ وہاں سے چلتا بنے ورنہ لوگ اپنے آپ اپنی سیٹ بدل لیتے تھے اس لیے کچھ لوگ ذات چھپانے بھی لگے تھے۔ ریل کے سفر کے بعد گھر آکر اسی طرح نہانے کا رواج تھا جیسے شمشان سے آکر اشنان کرتے ہیں۔ بڑے اسٹیشنوں پر گاڑیاں سویرے، دوپہر، شام گھنٹہ دو گھنٹہ اسی لیے رکتی تھیں کہ لوگ نہا لیں، اچھے گھی کی پوریاں بکنے کا چلن تھا۔ روٹی بھی بکتی تھی لیکن وہ

مسلمان نانبائی بناکر بیچتے تھے۔

سائکل کی سواری کی بات کرتے کرتے میں کہاں ریل کی داستان لے بیٹھا۔ دراصل کشن بابو کہا کرتے تھے کہ دنیا میں سب سے عمدہ ہوتی ہیں ـــــ ریل کی سواری، آلو کی ترکاری اور پلیگ کی بیماری۔ تب پلیگ بہت ہوتا تھا بس دو چار گھنٹے میں ہی گھر سے رام رام ست کی آواز آنے لگتی تھی۔ میں کاروں کی بات بھی کر سکتا تھا لیکن اس سے فائدہ؟ لب لباب یہ ہے کہ زمینداری کا کام بھی سائکل پر ہی دیکھا کرتا تھا۔ یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اگر میرے پاس سائکل بھی تھی تو اسے چلانا کیسے سیکھا۔ یہ بھی ایک مزے دار واقعہ ہے۔ سب سے پہلے سائکل نام کی چیز کشن بابو نے دیکھی تھی۔ کشن بابو اپنی نئی جائیداد کے سلسلے میں ہوم صاحب یعنی ہوم سکریٹری سے ملنے لکھنؤ گئے تھے وہاں انھوں نے میموں اور صاحبوں کو شام کو حضرت گنج میں سائکل پر گھومتے اور ہلکی پھلکی خریداری کرتے دیکھا تھا۔ انھوں نے آکر مجھ سے کہا۔ میں نے چھوٹے رائے کو بتایا۔ چھوٹے رائے تھے تو چچا لیکن چچا یار۔۔۔ ان سے وہ سب باتیں کہہ لیتا تھا جو بڑے رائے سے کہنے سے ڈر لگتا تھا۔ بڑے رائے کو کسی سلسلے میں لاٹ صاحب سے ملنے لکھنؤ جانا پڑا تو چھوٹے رائے نے ان سے کہا ـــــ بھیا، بھاسکر کے لیے لکھنؤ سے سائکل لیتے آیئے۔ سن کر وہ چپ ہو گئے تھے لیکن جب وہ آئے تو کمپنی کا آدمی لکھنؤ سے یہاں تک سائکل لے کر ساتھ آیا وہ سائکل آج کی سائکل جتنی نفیس نہیں تھی۔ لمبی تھی۔ پہیوں کے گھیرے بڑے بڑے تھے۔ اس آدمی نے ایک ہفتہ رہ کر مجھے سائکل سکھائی تھی میں نے چپ چاپ بھوانی کو بھی سائکل سکھوا دی تھی۔ میرے بعد شہر میں وہ دوسرا شخص تھا جو سائکل چلانا جانتا تھا لیکن اسے اس بات کا ذرا بھی غرور نہیں تھا۔ اس کے بعد تو کئی سائکلیں شہر میں آگئیں۔ رؤساء کے لڑکوں نے تو ترت پھرت منگالی تھیں۔ بعد میں اور لوگوں بھی منگائیں۔ تین چار سال بعد بابو لال اینڈ سنس کے نام سے ریلے سائکل کی پہلی ایجنسی شہر میں کھل گئی۔ پھر تو سائکل بھی چائے کی طرح گھر گھر پھیل گئی۔

بڑے رائے البتہ سائکل کی سواری ناپسند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نہ رتھ نہ گھوڑا گاڑی ـــــ پھر کیا سواری ـــــ وہ اسے اجڑا سواری مانتے تھے لیکن اس لفظ کا استعمال ان جیسا شائستہ شخص بھلا کیسے کر سکتا تھا۔ بس ـــــ وہیں جاکر رک جاتے تھے۔ شام کو سیر و تفریح کے لیے جاتے تو وہ اس بات پر زور دیتے کہ سائکل پر نہ جاؤ۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم لوگ سیر و تفریح کے لیے کمپنی باغ جانا چاہتے تھے۔ دو تین سائیکلوں کا انتظام ہو گیا تھا۔ بڑے رائے کو پتہ چلا تو انھوں نے کہلایا کہ میں ٹم ٹم لے کر جاؤں گا۔ ٹم ٹم بھی گھوڑا گاڑی ہوتی ہے۔ اس میں سامنے دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ پیچھے پائیدان پر سائیس کھڑا ہو جاتا ہے۔ سائیس کو گھوڑا بھی ہانکنا پڑتا ہے اور اپنا توازن بھی برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ پہلے رئیس لوگوں کا من خود گاڑی چلانے ہوتا تو ٹم ٹم جتوا لیتے تھے اور گھوڑے کی راس تھام لیتے تھے اس دن میں، کشن بابو اور باسو کمپنی باغ گئے تھے۔ باسو میرا بچپن کا دوست تھا بعد میں تو وہ پیسے والا ہو گیا تھا۔ کئی بار اس نے قرض بھی لیا۔ ہم نے زمیندار آدمی کو دو انداز سے دیکھتے تھے۔ پیسے والا ہوا تو وقت ضرورت کام آ سکتا ہے یا نہیں، چھوٹا ہوا تو بیگار کرے گا یا نہیں؟ خیر ہم تینوں آگے کی سیٹ پر بیٹھے۔ چونکہ دبلے پتلے تھے اس لیے کسی طرح بھنچ بھنچ کر سما گئے۔ پیچھے کالا سائیس کھڑا ہو کر ٹم ٹم ہانکنے لگا۔ کالا ہر گھوڑا اور ہر گاڑی ہانک لیتا تھا۔ تانگے سے لے کر چوکڑا تک۔ ویسے وہ بڑے رائے کا خاص کوچوان تھا۔ اصطبل کا خاص وزیر بھی۔ وزیر منسٹر یا منتری نہیں۔ گھوڑے نکالنے والے کو بھی وزیر کہتے تھے۔ اس دن وہ خالی تھا اس لیے ہم لوگوں کی پکڑ میں آ گیا تھا۔ جہاں تک کشن بابو کا سوال تھا، جب سے وہ واقعہ ہوا تھا بڑے رائے کا رخ ان کی طرف سے بدل گیا تھا۔ حالانکہ میرے ساتھ ان کا وہی محبت کا برتاؤ تھا۔ میں اب بڑا ہو گیا تھا۔ رگیں پکنے لگی تھیں۔ میں کبھی جھٹک دیتا تھا اور کبھی ٹال جاتا تھا۔ کشن بابو میری اس ناپسندیدگی کو ادا سمجھتے تھے۔

جاتے وقت تو کالا سائیس ہی ٹم ٹم لے کر گیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے ایک بار اتنا ضرور کہا کہ ٹم ٹم کی بم چھوٹی ہیں اور گھوڑا لمبا پڑتا ہے۔ اس کی ٹانگیں ٹم ٹم سے سٹ رہی ہیں لیکن وہ پیار اور پچکار کے ساتھ ہانکتا رہا۔ گھوڑے نے ذرا بھی آنا کانی نہیں کی۔ دلکی چلتا رہا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ وہ سرپٹ نہ دوڑے، تیز تو چلے۔ لیکن کالا سائیس اسے اسی چال سے چلاتا رہا کمپنی باغ پہنچتے ہی گھوڑے کی جوت کھول کر اسے ٹھنڈا کیا ہاتھ پیر چمپی کر تازہ کیا۔ تازہ ہوتے ہی وہ گرگرایا۔ وہ گھوڑا ویلر نسل کا تھا ویلر نسل کے گھوڑے اونچے اور لمبے ہوتے ہیں۔ رنگ مشکی تھا نام سفیدہ اس کی گردن پر ساپین تھی اس ساپین مجبوری کا منہ سوار کی سمت

مخالف میں تھا اس لیے اس کی ذات سے سوار کو کبھی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ویسے بھی ویلر ہمیشہ اپنے ہر مکالمے کا جواب سائیس یا سوار سے چاہتا ہے ورنہ ناراض ہو کر ترچھا ترچھا چلنے لگتا ہے اس لیے چاہیے، وہ گھبرائے یا ٹھوکر کھائے، کالا فوراً تھپتھپاتا تھا یا شاباش کہتا تھا۔ بڑے رائے بال بھوری کی پہچان میں ماہر تھے۔ بہت دور دور کے لوگ گھوڑے پہنچوانے اور علاج کرنے آتے تھے سویرے نہانے سے پہلے ان کا ایک گھنٹہ اسی میں لگتا تھا۔

سیر سپاٹے کے بعد جب ہم وہاں آئے جہاں کالا سائیس گھوڑے کے چھلے ہوئے گھٹنوں پر اسپرٹ لگا رہا تھا۔ میں نے کہا ٹمٹم میں چلا جاؤں گا۔ کالے نے سمجھایا کہ بھیا جی یہ گھوڑا مزاج کا تیز ہے۔ بہت جلد ہی ناراض ہو جاتا ہے۔ بڑے خوشامد سے اتارا ہے ورنہ کافی بگڑا ہوا تھا۔ اگر کہیں ٹمٹم کی چوٹ سے زخمی اور ناراض ہو گیا تو اتنا بے قابو ہو جائے گا کہ میری بھی نہیں سنے گا۔ لیکن میں اتنے بڑے زمیندار کا بیٹا سائیس کی بھلا کیسے سنتا۔ میری ضد بھی حکومتی ضد سے کم نہیں تھی۔ اس بے چارے کی کیا مجال تھی کہ گھوڑے کی راس نہ دیتا۔ میں نے راس تھام لی پہلے تو وہ مزے مزے چلتا رہا۔ بابو بولا ''یار رایوں کے گھوڑوں کو راتب نہیں ملتا کیا ـــــ سنا ہے رایوں کے گھوڑے آگ موتتے تھے۔ یہ تو گدھے سے بھی گیا گزرا ہے۔''

کشن بابو نے ٹوکا بھی ''مزے مزے میں چلنے دو ـــــ''

پتہ نہیں کیا۔ گھوڑے نے سن لیا یا اس کی بات سمجھ لی، چال اپنے آپ ہی تیز ہونے لگی اور تیز ہوتی گئی۔ کالا پیچھے سے چلائے جا رہا تھا ـــــ ''بچو، بھائیوں بچو، گھوڑا بگڑ گیا ہے۔'' میں نے اسے دوسری طرف موڑنا چاہا۔ وہ چنگی کے پاس آ کر کلکٹر صاحب کے بنگلے کی طرف مڑ گیا۔ بڑے رائے اکثر وہاں جاتے تھے۔ دوسرے بڑے رائے نے کئی سال پہلے اس ایک انگریز کلکٹر سے ہی خریدا تھا۔ تب وہ بچہ تھا۔ کلکٹر صاحب کی میم اپنے بنگلے سے چہل قدمی کے لیے نکلی ہی تھیں ہماری ٹمٹم ان کی گاڑی سے بھڑی اور گاڑی الٹ گئی۔ میم صاحب کو چوٹ آئی۔ کیونکہ ہماری ٹمٹم پلٹی نہیں تھی، صرف ہم ہی لوگ گرے تھے اس لیے جلدی جلدی اٹھے اور ٹمٹم گھما کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اندھیرے میں گھوڑے کو دیکھنا مشکل تھا لیکن وہ کافی ناراض معلوم ہو رہا تھا۔ پاؤں ڈنڈا پٹخنے کے اسٹائل میں پٹخ رہا تھا۔ راس کالے سائیس نے لے لی تھی پہلے تو وہ الف ہو گیا لیکن جب کالے نے راس پھٹکار کر اپنی

موجودگی اور پیار جتایا تو وہ چہنے لگا۔ اس بار وہ ڈر رہا تھا جیسے حالات کی نزاکت سے واقف ہو۔ ہم لوگ بری طرح ڈر گئے تھے۔ یہ تو سمجھ میں آ ہی گیا تھا کہ ٹکر کلکٹر صاحب کی گاڑی سے ہوئی ہے اس میں سے گرنے اور چیخنے کی آواز بھی کسی انگریزن کی ہی تھی۔ وہ انگریزی میں کچھ بولی بھی تھی۔

کسی طرح رام رام کا ورد کرتے ہم حویلی پر لوٹ آئے۔ ڈر مسلسل قائم تھا گھوڑ سوار پولس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ آکر محاصرہ کر لے گی اور سب کو حوالات پہنچا دے گی۔ ہم میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ بڑے رائے کے سامنے جاکر صورت حال بیان کردے۔ یہی طے ہوا کہ کالا سائیس ہی جاکر بڑے رائے کو واقعہ کی صحیح صحیح تفصیل بتائے۔ ان کے علاوہ کوئی مدد نہیں کر سکے گا جب انھیں پتہ چلا کہ ہماری ٹمٹم کلکٹر صاحب کی میم کی گاڑی سے ٹکرائی ہے تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ یہ لڑکے کیا غضب کر آئے! ان کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا تو انھوں نے کالے سائیس کے ہاتھ سے چابک لیا اور ساٹ بیٹے بعد دیگرے کئی رسید کردے۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ میرے دل میں سوال اٹھا کہ اس کی کیا خطا ہے؟ خطا تو میری ہے۔ وہ یہ بات کہہ سکتا تھا لیکن اس نے یہ بھی نہیں کہا۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ بھیا نے زبردستی راس لے لی تو شاید اسے اور بھگتنا پڑتا۔ جب وہ پٹ چکا تو بے سہارا بچے کی طرح سبک سبک کر رونے لگا۔ مجھے اس رات ذرا بھی نیند نہیں آئی۔ مجھے یہ ہی نظر آتا رہا کہ کالا سائیس بلا وجہ پٹ رہا ہے اور مجھے پکار رہا ہے — بھیا بچاؤ — اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہیں — لیکن میرے منہ سے بول نہیں پھوٹ رہے ہیں باسو اور کشن بابو رفو چکر ہو چکے ہیں بڑے صاحب سوال پوچھ رہے تھے اور میں پتھر بنا چپ۔

انھوں نے پوچھا "کون ہانک رہا تھا؟"

میں نے تب بھی کچھ نہیں کہا حالانکہ ان کے سوال کا جواب میرے پاس تھا کہوں تو کیسے کہوں۔ کالے سائیس کی حالت میں دیکھ ہی چکا تھا خاموشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

انھوں نے پھر پوچھا "گاڑی میں کون کون تھا؟"

بہت مشکل سے کہہ سکا "کشن بابو اور میں۔۔۔"

"تو تم چاباربے تھے!؟" وہ نتیجے پر خود ہی پہنچ گئے تھے انھوں نے پھر کہا "کالے نے تو تمھیں منع نہیں کیا؟"

میں پھر چپ۔ کیسے منع کر دوں۔ وہ خود ہی بولے "تم کسی دن مجھے ڈبو کر رہو گے؟ اگر کلکٹر کی میم کو چوٹ لگ گئی ہوگی تو پتہ ہے کہ وہ کیا کرے گا ـــــ روساء کا پالا کر دھوپ میں کھڑا کر دے گا اور پوچھے گا بتاؤ کس کی گاڑی تھی؟ اگر گھوڑے کی راس نہیں تھمتی تو زمینداری کی راس کیسے سنبھالو گے؟ اسے پتہ چل گیا کہ ٹکر ہمارے فرزند نے ماری ہے تو وہ ہمارے ساتھ جو کرے گا سو کرے گا ہی تمھیں الٹا لٹکوا کر بیتوں سے پٹوائے گا" رک کر اپنے آپ سے بولے "کچھ بھی ہو سکتا ہے!"

کشن بابو کو بھی بلایا گیا۔ ان پر لتاڑ پڑی "آپ بھی ان لڑکوں کے کہنے پر آگئے۔ آپ تو تجربہ کار شخص تھے!"

کشن بابو نے ایک پل کے لیے سوچا اور فوراً جواب دیا "غلطی میری تھی ـــ میرے ہی منہ سے نکل گیا تھا ـــــ گھوڑے کی راس تھامنا نہیں سیکھو گے تو اتنی بڑی زمینداری کیسے سنبھالو گے؟ کہاں راس ڈھیلی کرنی ہے، کہاں کسنی ہے ـــــ کہاں چلنے دینا ہے ـــــ یہ سب گھوڑا ہانکے بغیر نہیں آتا۔ گھوڑا بگڑ جائے گا یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

بڑے رائے کی کشن کو بابو کو دیکھنے کی نظر فوراً بدل گئی۔ خاموش ہو گئے۔

اس بار کشن بابو کی باری تھی "اب تو آپ کو ہی راستہ نکالنا ہوگا"

انھوں نے ہنکار بھری "ہوں ں ں۔"

بڑے رائے جب لباس تبدیل کر کے باہر آئے تو کالا سائیس گاڑی باہر نکال چکا تھا اور مستعد کھڑا تھا۔ جب کسی افسر کے یہاں جانا ہوتا تھا تو اسے اپنی خاکی برجس، چھوٹا کوٹ اور صافہ باندھنا ہوتا تھا۔ پیر میں بوٹ، پنڈلیوں میں چمڑے کے گول پیڈ بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔ ہو سکتا ہے تب سے سوکھی ہی نہ ہوں۔ پٹائی سے اب بھی ٹیس اٹھ رہی ہو۔ میں پہلے ہی باہر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا "کالے کاکا، یہ سب میری ہی وجہ

سے ہوا ہے ــــ تم مجھے چاہے جو کہہ لو۔"

"آپ دکھ نہ مناؤ۔ جو پالتا ہے وہ کبھی ڈپٹ بھی دیتا ہے ــــ بڑے رائے تو ہمارے خاندان کے باپ ہیں۔"

"پھر تمھاری آنکھیں گیلی کیوں ہو رہی ہیں۔"

گاڑی میں لگی لالٹین کی روشنی میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اس کی آنکھیں تو عادتاً کچی رہتی تھیں۔ مجھے گرنی پڑیں۔ وہ بولا دھرتی گیلی ہو جاتی ہے تو پاؤ ڈال کر سکھا دیتے ہیں آنکھیں بہنا شروع ہوتی ہیں تو انھیں سکھانا مشکل ہوتا ہے۔ ہاں خود ہی سوکھ جائیں تو سوکھ جائیں۔

میں سوچنے لگا کہ اس کے من میں یہ بات کہاں سے آئی؟ اپنے دکھ سے؟۔۔۔

بڑے رائے اندر سے نکل کر گاڑی تک آئے۔ ان کی پرچھائیں ان سے کٹی ہوئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ان کا پائیدان پر رکھا پاؤں یکایک نیچے اتر آیا۔ وہ کالے کے پاس گئے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ ایک دو بار تھپتھپایا۔ مجھے لگا کہ وہ کالے سائیس سے معافی نہ مانگ کر بھی معافی مانگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی اس طرح کے لوگ اپنے آپ کو اپنی انانیت سے اتنا باندھ لیتے ہیں کہ سچ بات بھی ان کے نیچے دبی رہ جاتی ہے۔ حالانکہ تمام حجام وہی سب کرتے ہیں۔ بس، انھیں کہنا نہ پڑے دوسرا سمجھ جائے۔ اس نے ان کے پاؤں پکڑ لیے "نہیں مالک، میں تو آپ کی جوتی سے بھی گیا بیتا ہوں" وہ گاڑی پر جا بیٹھے اور کالا کوچ باکس پر چڑھ گیا۔ اسے بار بار دھندلا نظر آنے لگتا تھا۔ آنکھیں صافے سے پونچھنی پڑتی تھیں۔

بڑے رائے نے مجھے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ میں بڑے رائے کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بنو گاڑی کے پیچھے چوبری لے کر پٹرے پر کھڑا ہو گیا۔ بنو پہلے جڑ کٹا تھا۔ اب اس کا عہدہ بڑھ گیا تھا۔ پہلے دو روپے ماہانہ ملتے تھے اب تین روپے ملنے لگے تھے۔ سب سے زیادہ تنخواہ کالے کو ملتی تھی، سات روپے۔ تنخواہ سال میں دو بار بنتی تھی، فصل پر۔ چھوٹے لوگوں کو سہ ماہی دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ گڑ، لکڑی، موٹا اناج وغیرہ بھی سال میں ایک بار دیا جاتا تھا۔ کالو کو گندم بھی ملتا تھا۔ شادی بیاہ کے وقت لکڑی اور اناج وغیرہ اس کے علاوہ ملتا تھا۔

سائیسوں کو اوپر کی آمدنی بھی تھی۔ بیاہ شادیوں پر گاڑیاں بھی مانگی جاتی تھیں لڑکے والے سائیس کو پندرہ اور بیس روپے ایک جوڑا یا صافہ اور پانچ پانچ پروسے دیتے تھے۔ چھوٹے سائیس کو بیس روپے اور دو پروسے ملتے تھے۔ سائے کے دنوں میں ان کا سال بھر خرچ نکل آتا تھا۔ مٹھائی اور پکوڑی سکھاکر مہینوں کھاتے تھے۔ اصلی گھی کا مال ہوتا تھا، خراب کم ہوتا تھا۔ کئی بار تو یہ لوگ اپنی تنخواہ جمع کرتے رہتے تھے۔ جب دیس جاتے تھے یا بیاہ شادی ہوتی تھی تب اٹھاتے تھے۔

بنو پیچھے کھڑا ہوا چوہری سے مچھر اڑا رہا تھا۔ ایک چوہری سائیس کے پاس رہتی تھی وہ اس سے گھوڑے کی مکھیاں اڑاتا تھا۔ گاڑی چل رہی تھی۔ میں چپ چاپ بیٹھا بڑے رائے کو دیکھ رہا تھا۔ بڑے رائے تناؤ میں تھے۔ ان کی بھویں کبھی تن جاتی تھیں، کبھی ماتھے پر سلوٹیں پڑ جاتی تھیں۔ میں ڈرا ہوا بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو؟ کافی گھنا اندھیرا تھا۔ بیچ بیچ میں کالا سائیس پیر گھنٹی بجاتا تھا تو لگتا تھا کہ اندھیرا تھوڑ تک چاک ہو گیا۔ دونوں طرف کے اندھیرے اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ رات مجھے کافی جادو بھری لگتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں کہاں کیا ہو رہا ہو۔ مکان، گھر حویلیاں، محل دو محلے، آتے جاتے راہگیر، دوکاندار سب اندھیرے سے ایسے بندھ جاتے ہیں کہ کوئی آزاد نہیں رہتا۔ سب سے بڑی رات اور اس کا اندھیرا۔ ہاں روشنی کے ساتھ چلتے لوگ ضرور پہچان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہماری گاڑی چلتی جا رہی تھی۔ جیسے چلنے والے بس ہم لوگ ہی ہوں باقی سب جہاں ہیں وہیں رکے بیٹھے ہوں۔ یہ احساس بڑا عجیب و غریب احساس ہوتا ہے۔ سب رکے ہوں اور آپ چل رہے ہوں۔ بڑے رائے کہیں اور تھے۔ وہاں نہیں جہاں بیٹھے تھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے ہم دونوں کے حالات مختلف تھے۔ مجھ پر ایک ڈر مسلط تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا تو میں کیا کروں گا؟ بڑے رائے کہیں صاحبوں کو خوش کرنے کے لیے دوسری طرح نہ پیش آنے لگیں۔ میرا وہاں کون ہوگا؟ یہ سب سوچ کر میرے دونوں پاؤں نیچے ٹکے ہونے کے باوجود کانپتے ہوئے محسوس ہونے لگتے تھے۔ بڑے رائے جیسے بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہاتھ تک نہیں ہلایا تھا۔ تب سڑکوں پر بجلی نہیں تھی۔ اب اس بات کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ سڑکوں پر مٹی کے تیل کی لالٹینیں یا لیمپ پوسٹ جلتے رہتے تھے۔ ان کی روشنی جیسے سمندر میں ڈھیلے، گھیرے بھلے ہی بنالیں لیکن کہاں تک بنائیں گے جب وہ

دھندلا نے لگتی تھیں تو اور منفیت ہو جاتی تھی۔ چمنیاں کالی پڑ جاتی تھیں۔ روشنی جیسے اندر گھٹ گئی ہو۔ کہیں سے جھانک لے تو بجھے ہی جھانک لے ـــــ سوئی کی نوک کی طرح تیکھا پن لیے۔ ویسے جہاں کالک ہوتی ہے وہاں روشنی ہو کر بھی نہیں رہتی۔ شہر کے نکلنے کے بعد تو بے جان اندھیرے کی ایک لمبی سرنگ بن گئی تھی۔

جہاں سے گاڑی نکل رہی تھی وہاں کا تاریک سناٹا گھوڑے کی ٹاپ سے تھوڑا بہت منتشر ہو جاتا تھا اور اگلی ٹاپ پڑنے تک پھر پہلے جیسا ہو جاتا تھا۔ کبھی مجھے لگتا کہ یہ گھن اندھیرا روشنی سے ٹوٹتا ہے اور کبھی لگتا آواز سے ٹوٹتا ہے۔ کئی بار لگتا تھا اندھیرا سڑک بن گیا ہے اور گھوڑے کی ٹاپ اسی پر بج رہی ہے۔ گاڑی کلکٹر صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچی تو مجھے لگا کہ اب وہ لمحہ آ گیا ہے جب میں اکیلا ہو جاؤں گا اور بڑے رائے سمیت وہ سب لوگ دوسری طرف کھڑے ہوں گے۔ میں اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ اندھیرے کی اس کیچڑ میں کیڑے کی طرح سِل بِل کرتا۔ گھوڑا کسی مہابلی کی طرح دونوں نتھنوں سے آگ اگلتا ہوا رات کو چیرتا ہوا کلکٹر صاحب کے بنگلے میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ کالا اور بھوا اس میں گم ہو گئے تھے۔ صرف بڑے رائے تھے جن کی آنکھیں اس اندھیرے کو چیر ڈالنے کی جستجو میں تھیں۔ اندھیرا انھیں بار بار دھکیل دیتا تھا۔ انسان اور قدرت میں یہی فرق ہوتا ہے۔

گاڑی اندر گھسی۔ میرے پیٹ میں ایک طرح کی کھدبداہٹ شروع ہو گئی تھی ـــ وہی اکیلے ہو جانے کا خوف۔ مجھے لگا کہ کپڑے نہ خراب ہو جائیں لیکن ہوئے نہیں۔ گاڑی رکی تو بڑے رائے جیسے اپنے اندر سے باہر آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اٹھنے لگا تو انھوں نے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے بڑے رائے کا یہ روکنا اچھا لگا۔ جو سانس رک گئی تھی وہ باہر آئی۔ پیٹ کی ہلچل بھی ختم گئی۔

بڑے رائے بنگلے کے برآمدے تک گئے۔ لال چپراس باندھے جمعدار نے سلام کیا۔ بڑے رائے نے جیب سے چاندی کے دو روپے نکالے اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ اس نے ان کی آواز تک مٹھی سے باہر نہیں آنے دی۔ "صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے اندر کی طرف اشارہ کر دیا پھر پھسپھسا کر کہا "میم صاحب کی بگھی کسی کی

گاڑی سے ٹکرا گئی۔ میم صاحب گر گئیں چوٹ لگی ہے ـــــ ڈاکٹر بیٹھا ہے۔ ایس۔پی صاحب کو بلایا ہے۔"

"کافی چوٹ آئی ہے؟"

"بہت زیادہ نہیں ـــــ بڑے آدمیوں کی چوٹ ہے، پتہ نہیں چلتا۔"

"کسی نے جان بوجھ کر تو نہیں مارا؟"

"گھوڑا بگڑ گیا تھا ـــــ سائیس چلاتا جا رہا تھا ـــــ بچو، بچو۔۔۔ بس جیسے ہی بگھی باہر نکلی ادھر سے گھوڑا آیا ـــــ ٹکر ماردی۔ وہ تو گاڑی الٹ گئی تو چوٹ کم آئی۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا۔" گاڑی الٹنے کی بات بڑے رائے کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کہاں ٹمٹم اور کہاں چوپہیہ گاڑی۔ پھر بھی الٹی تو تھی ہی۔

"کس کی گاڑی تھی؟"

"اندھیرے میں پتہ نہیں چلا، کسی رئیس کی ہی رہی ہوگی۔"

بڑے رائے کی جان میں جان آئی۔ پھر پوچھا۔ "سائیس کون تھا؟"

"رحمت اللہ تھا حضور۔" اس بات سے انھیں بھی سکون ملا۔ کچھ سوچ کر بولے "ذرا صاحب کو سلام دو۔"

"اس وقت تو صاحب میم صاحب کے پاس ہیں۔ بڑا ڈاکٹر دیکھ رہا ہے۔ وہاں جانا مشکل ہوگا۔"

"جب پتہ چل گیا تو مسز ڈک کو دیکھے بغیر کیسے جاؤں؟ ہو سکے تو تم خبر کر دو" رک کر بولے "ذرا رحمت اللہ کو بھی بھیج دینا اس سے ہی پتہ لگے گا۔ کیسے چوٹ آئی؟"

جمعدار اندر چلا گیا۔ رحمت اللہ اصطبل کی طرف سے آرہا تھا۔ بڑے رائے کو دیکھا تو جھک کر سلام کیا۔ رحمت اللہ رایوں کے اصطبل کے سب جانوروں کو پہچانتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ آہستہ سے بولا "سرکار، آج تو غضب ہو جاتا"

"میں جانتا ہوں۔۔۔ تم نے ـــــ؟"

وہ بیچ میں ہی بولا "حضور کا نمک کھایا ہے۔ زبان کٹ جائے گی لیکن رایوں کا نقصان اس زبان سے نہیں ہوگا۔"

"پولس ـــــ"

"میرے علاوہ نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ کوئی آپ کے 'سفید ڈاکو' کو پہچانتا ہے۔

بڑے رائے جیب سے نکال کر دو روپے دینے لگے تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا ــ "حضور سے ہی سیکھا ایمان دین سے بڑا ہوتا ہے۔ ایمان قائم رہے تو شکر ہے۔"

بڑے رائے نے رحمت اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے سلام کیا اور بولا۔ "اس وقت مجھے اجازت دیں۔۔۔" وہ چلا گیا۔

بڑے رائے وہیں ٹہلنے لگے۔ رحمت اللہ انھیں مسلسل تنگ کر رہا تھا۔ رحمت اللہ نے انھیں چھوٹا کر دیا۔ وہ تو آئے ہی تھے اپنی غلطی قبول کر کے، معافی مانگنے پر رحمت اللہ نے انھیں کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ایمان بھی کوئی چیز ہے ـــ کوئی کیسے استعمال کرتا ہے کوئی کیسے۔ میں اپنے بیٹے کی غلطی معاف کرانے آیا ہوں ـــ میرے بیٹے کی غلطی چھپا کر بعد میں حاکم کی ہونے والی ناراضگی اوڑھنے کے لیے تیار ہے۔

چپراسی آیا تو انھیں پتہ نہ چلا۔ وہ آ کر بولا ـــ "صاحب نے سلام کہا ہے۔۔۔ اور کہا ہے اگر بہت ضروری نہ ہو سویرے تشریف لائیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں۔"

بڑے رائے کو لگا، کیا ان کی اہمیت ایک ڈاکٹر جتنی بھی نہیں؟ پھر سوچا شاید پردہ داری کے سبب انھوں نے ایسا کیا ہو ورنہ ان کے آنے پر ڈک صاحب کبھی ایسا نہیں کہتے۔ مسز ڈک بھی کافی عزت کرتی ہیں۔ جب کبھی ڈک اور مسز ڈک کی رائے میں نااتفاقی ہوتی ہے تو کئی بار وہ ان ہی کو ثالث بناتے ہیں لیکن پھر انھوں نے رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچا شاید یہی ایشور کو منظور ہو۔ اس کی رائے بھی رحمت اللہ کی رائے سے میل کھا رہی ہو۔

وہ کچھ کہے بغیر باہر آ گئے۔

گاڑی کے پاس رحمت اللہ اور سائیس آڑ میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ رحمت اللہ کی نظر پہلے پڑی۔ اس نے پھر جھک کر سلام کیا۔ مسلمان بڑوں کی عزت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اگر دس بار ملاقات ہو تو دس بار سلام کرتے ہیں۔ پاس آ کر بولا ـــ "حضور آپ نے ناحق زحمت اٹھائی۔ رحمت اللہ خون کے آخری قطرے تک

نمک کی قیمت چکائے گا۔ آپ کچھ دن سفیدے کو ٹمک میں نہ جتوائیں۔ اتنا نایاب گھوڑا ہے اگر بہت بیٹھ گئی تو خراب ہو جائے گا۔ جس سواری میں جت کر گھوڑا چوٹ کھا جاتا ہے پھر وہ اس سے بچنے لگتا ہے۔ اگر پھر اسی طرح سواری میں جوتا جائے تو اڑیل ہو جاتا ہے۔ آدمی کی طرح گھوڑا بھی خواہش کے خلاف کام نہیں کرنا چاہتا" پھر رک کر بولا ــــ "ہو سکے تو آپ سفیدے کو زمینداری میں بھیج دیں۔ تھوڑا اس کا من بھی بدل جائے گا اور پہچانے جانے سے بھی بچ جائے گا۔ اتنا قد آور گھوڑا شہر میں دوسرا نہیں۔ کہیں میم صاحب کی نظر پڑ گئی تو پہچان نہ لیں۔۔۔"

وہ بہت دھیمے بول رہا تھا۔ میں خاموش اندر بیٹھا تھا۔ مجھے گوروں کے ڈر نے بے پناہ گھیرا ہوا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میری گردن اور پیٹھ بری طرح درد کرنے لگے تھے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا ڈک اور اس کی میم میری پیٹھ اور سر پر پاؤں رکھے کھڑے ہیں اور مسلسل دبا رہے ہیں۔ بڑے رائے جواب میں بولے تو کچھ نہیں تھے ہو سکتا ہے گردن ہلا کر 'ہاں' کی ہو۔ مجھے پتہ نہیں چلا۔ بڑے رائے گاڑی میں آبیٹھے۔ مجھے ایک دوسرے خوف نے گرفت میں لے لیا۔ اب بڑے رائے ضرور مجھ سے کچھ کہیں گے۔ ہو سکتا ہے یہ بتائیں کہ گوروں سے کس طرح بات کرنی چاہیے اور کیا کہنا چاہیے لیکن وہ کچھ نہ بولے۔

رحمت اللہ نے آکر پھر سلام کیا اور مجھے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا دی "اب تو بھیا جوان ہو گئے۔۔۔ میں نے ہی انھیں گھوڑے پر چڑھنا سکھایا تھا۔ یہ گھوڑے پر چلتے تھے، میں پیچھے دوڑا کرتا تھا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا! خدا عمر دراز کرے۔"

اس کی جوانی والی بات مجھ ایسی لگی جیسے اس واقعہ کے بارے میں وہ مجھ پر طنز کر رہا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ پیروں پر نظر ڈالی۔ پھر ٹٹول کر دیکھا۔ اچھے خاصے لمبے چوڑے ہو گئے تھے۔ مچھلیاں ابھر آئی تھیں۔ جوان لفظ سن کر دوسرے اعضا میں جوان ہونے کا احساس کرنٹ کی طرح دوڑ گیا تھا۔ بڑے رائے نے گاڑی ہانکنے کو کہا۔ جیسے گاڑی چلی ویسے ہی رحمت اللہ نے آخری سلام کیا۔ بڑے رائے نے آواز کو اتنا ہی اٹھایا جتنے میں وہ سنے "رحمت اللہ تمھاری اس وضعداری کو کبھی نہ بھولوں گا۔"

گاڑی کوٹھی سے باہر نکل رہی تھی۔ ایس۔ پی۔ وہ اندر آ رہے تھے۔ سنتری نے ہماری گاڑی روک دی۔ پولس کپتان کا گھوڑا پاس آ کر رک گیا۔ ان کے پیچھے دو گھوڑوں پر شاید دو داروغہ تھے۔ ایک داروغہ نے آگے بڑھ کر پوچھا "کس کی گاڑی ہے؟"

بڑے رائے گاڑی سے اتر گئے "گڈ ایوننگ مسٹر وڈ"

"گڈ ایوننگ۔۔۔ آپ یہاں کیسے آیا؟"

"سوچا تھا مسٹر ڈِک کے ساتھ برج کھیلا جائے گا۔۔۔ یہاں پتہ چلا کہ وہ گاڑی سے گر گئیں۔۔۔ انھیں چوٹ آ گئی ہے۔ سول سرجن دیکھ رہے ہیں۔۔۔ شاید مل نہیں رہیں۔"

مسٹر وڈ ہنسے "سو یور برج از ڈسٹربڈ — ڈِک از گیٹنگ ان روڈی" آخری جملہ انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔ بڑے رائے کچھ نہیں بولے۔ گڈ نائٹ کر کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے مسٹر وڈ کی جھلک ہی دیکھی تھی۔ اس کا گورا چہرہ اندھیرے میں ہنڈے کی طرح روشن تھا۔

منجھلے رائے اور چھوٹے رائے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ منجھلے رائے یعنی کشن رائے اور چھوٹے رائے عرف راگھو رائے دونوں میں دو سال کی چھوٹ بڑائی تھی۔ میرٹھ کالج میں بھی ساتھ ہی ساتھ پڑھتے تھے۔ مغربی اتر پردیش میں اس وقت دو ہی بڑے کالج تھے۔ ایک شاید آگرہ کالج اور دوسرا میرٹھ کالج۔ میرٹھ آگرہ کے سینٹ جانسن سے بھی پرانے کالجوں میں ہے۔ پوری کمشنری کے لڑکے میرٹھ ہی پڑھنے جاتے تھے۔ تب میرٹھ کالج انٹر تک تھا۔ لیکن تھا کافی بڑا۔ دونوں ہاسٹل میں رہتے تھے۔ ایک کھانا بنانے والا رسوئیا اور ایک خدمت گار رکھا ہوا تھا۔ ایک گھوڑا تانگہ اور سائیس۔ سائیس ہی ہانکنے کا کام بھی کرتا تھا اور چارے کا بھی۔ تانگے گھوڑے کے لیے ہاسٹل کے پاس ہی ایک اصطبل ٹائپ کا باڑہ دو روپیے ماہانہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ہاسٹل کے ایک کمرے میں دونوں بھائی سوتے تھے۔ دوسرے کمرے میں کھانا پکتا تھا۔ ویسے ایسے ایسے بھی رئیس زادے تھے جو کوٹھیاں کرائے پر لے کر رہتے تھے،

عیش و عشرت کا پورا انتظام ہوتا تھا۔ سونے کا کمرہ، کھانے کا کمرہ، مہمانوں کا کمرہ، نشست گاہ ۔۔۔ سواریاں تو تھی ہی۔ ان میں پڑھ کتنے پاتے تھے یہ کہنا کٹھن ہے۔ منجھلے رائے میں رعونت کی بو زیادہ تھی۔ ان کی دوستی بھی ایسے ہی لوگوں سے زیادہ تھی۔ چھوٹے رائے زیادہ بے تکلف اور مست تھے سب سے ملتے تھے، بولتے تھے اور سب کے ساتھ کھیلتے تھے چاہے انگریز ٹیچرس ہوں یا ساتھی لڑکے۔ منجھلے رائے انھیں اس عادت کے لیے ٹوکتے تھے۔ آدمیوں کو اپنے ساتھیوں سے جانا جاتا ہے۔ چھوٹے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے چھوٹا سمجھا جانے لگتا ہے۔

دونوں بھائیوں کی شادی دسویں کلاس میں ہو چکی تھی لیکن بچے نہیں تھے۔ منجھلے رائے کی طبیعت کالج میں کم لگتی تھی۔ وہ اکثر حویلی پر ہی موجود رہتے تھے۔ انھیں مسلسل ایک ہفتہ گھر سے باہر رہنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ منجھلی چاچی اپنے زمانے کی حسین خواتین میں سے تھیں۔ خوبصورت تو چھوٹی چاچی بھی تھیں اور چھوٹے رائے ان سے محبت بھی کم نہیں کرتے تھے لیکن وہ چھٹیوں میں ہی گھر آتے تھے۔ زیادہ ہوا سنیچر کی شام کو آگئے اور سوموار کی صبح چلے گئے۔ تب پرائیویٹ اری چونا شروع ہی ہوئی تھی۔ جس کو تب اری کہا جاتا تھا۔ تین گھنٹے میں پہنچا دیتی تھیں۔ اس بات سے چھوٹی چاچی ناراض بھی رہتی تھی۔ ان سے اکثر پوچھا کرتی تھیں کہ منجھلے جیٹھ جی تو روز حویلی پر موجود رہتے ہیں، آپ کی کیا کچھ خاص پڑھائی ہے؟ یا کوئی اور دیکھ لی؟ چھوٹے رائے کہہ دیتے تھے۔۔۔ بس ایک ہی بہت ہے ان کی دلچسپی ٹینس میں بھی اتنی ہی تھی جتنی گھر میں۔ کبھی کبھی ہاکی بھی کھیل لیتے تھے۔ منجھلے رائے کو بھاگ دوڑ کھیل کود سے بہت چڑ تھی وہ جب بھی کمرے سے نکلتے تھے بچ دھج کر ہی نکلتے تھے۔

ان دنوں زیادہ تر ٹیچر انگریز ہوتے تھے۔ انگریز ماسٹر اپنے طلبا سے کافی ربط ضبط رکھتے تھے۔ پوول پرائس تاریخ کے ماسٹر تھے۔ پوول پرائس اور چھوٹے رائے ٹینس میں اکثر پارٹنر رہتے تھے۔ پوول پرائس شادی شدہ تو تھا لیکن اب تک اس کی میم ہندوستان نہیں آئی تھی تب تک چھوٹے رائے کو اپنی میم کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی بیوی کے برابر دنیا میں کسی کی بیوی نہیں۔ وہی اکیلی بیوی بن کر پیدا ہوئی ہے باقی سب تو عورتیں ہیں۔ عورت اور بیوی میں فرق ہوتا ہے۔ پھر وہ کہتا تھا ـــــ جب ہماری میم آئے گی تو ہم تم کو اس

سے ملوائے گا۔ شی از وینی چارمنگ" پھر پوچھتا تم ہمیں اپنی بیوی سے ملوائے گا؟" پوول پرائس انگریزی جانتا تھا۔ جب بھی وہ زیادہ بک بک کرنے لگتا تھا تو چھوٹے رائے ہندی میں بولنا شروع کر دیتے تھے —— "سالا اُلو ہے... اب ہمارے گھر کی عورتیں تمہاری عورتوں کی طرح ناچیں اور سر ننگے پرائے مردوں کے سامنے نہیں جاتیں۔"

وہ انگریزی میں پھر پوچھتا —— "ویل، تم نے کیا کہا؟"

چھوٹے رائے اسے انگریزی سمجھانا شروع کر دیتے "میں نے کہا مجھے آپ کی ہم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہوئی۔ لیکن ہم لوگ بہت پچھڑے ہوئے ہیں... ہماری عورتیں پردہ نشین ہیں۔ وہ کہتا ہے ہم تمہارے دوست ہیں۔"

چھوٹے رائے پھر ہندی میں شروع ہو جاتے "دوست بن کر ہی تم ملک میں گھسے اور دوست بن کر ہی گھر میں بھی گھسنا چاہتے ہو، جس سے نہ گھر کے رہیں نہ گھاٹ کے۔ سب کچھ تو چوس ڈالا اب بچا ہی کیا ہے... " کبھی کبھی گالی بھی بک دیتے۔

جب وہ پھر پوچھتے کہ تم کیا کہہ رہے ہو تو وہ ہنس کر کہتے "سر، آپ دوست کہاں ہیں —— استاد ہیں۔ ہمارے یہاں استاد کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔"

وہ ایک شرابی کی طرح کہتا —— "نہیں، ہم تمہارے دوست ہیں۔"

"ابے پھر لیا دوست کا نام —— سالا دشمن کہیں کا" لڑکے ہوتے تو ان کی ہنسی بھی چھوٹنے لگتی۔ ضبط کرنی پڑتی۔

وہ پوچھتا "تم بیچ بیچ میں کیا بولنے لگتے ہو؟"

"ہم تعریف اپنی زبان میں کرتے ہیں۔ لڑائی، محبت اور تعریف کرنے کے لیے اپنی مادری زبان سے اچھی دوسری زبان نہیں ہوتی" وہ گردن ہلا ہلا کر ان کی اس بات کی تعریف کرنے لگتا۔ چھوٹے رائے انگریزی ہی میں کہتے "آپ انگریز ہو کر بھی کتنے بھولے اور اچھے انسان ہیں۔"

وہ خوش ہو کر اپنی گردن ہلانے لگتا۔

چھوٹے رائے کے پاس پوول پرائس کے بہت سے قصے تھے۔ ایک دن چھوٹے رائے اور ان

کے دوستوں نے پوول پرائس کو یہ سوچ کر بے وقوف بنانے کا منصوبہ بنایا کہ دیکھیں ہم لوگ بھی انھیں بے وقوف بنا سکتے ہیں یا نہیں یا یہ ہی لوگ ہمیں احمق بناتے رہیں گے؟ منجھلے رائے ان کے اس رخ سے متفق نہیں تھے۔ ہمیشہ انگریز ماسٹروں کو اس طرح جھک کر سلام کیا کرتے تھے جیسے وہ ان کے افسر ہوں۔ استاد والے احترام کے جذبے کی جگہ ان کے من میں ایک دہشت سی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ حاکم ذات کا آدمی چاہے ماسٹر ہو یا کوئی اور، وہ بنیادی طور پر حاکم ہی ہوتا ہے اس کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔ معلوم نہیں کب لات مار دے۔ حاکم ناراض ہوا، قہر نازل ہوا۔ پھر وہ کچھ نہیں دیکھتا۔ ہاتھ پیر اکٹھا کر کے ردی کی ٹوکری میں پھنکوا دیتا ہے۔ ردی کی ٹوکری ہی اس کا ڈیرہ ہوتا ہے۔ چھوٹے رائے ان کی اس رائے سے کبھی متفق نہیں ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دہشت کو برداشت کرنے والا ہی اسے ہمیشہ بڑھاوا دیتا ہے۔ جتنا وہ اس سے خوفزدہ ہوتا ہے اتنا ہی دہشت زدہ کرنے والا خوفزدہ کرتا ہے۔ اس کی خطا اتنی نہیں ہوتی جتنی دہشت زدہ ہونے والے کی ہوتی ہے۔ وہ جان جاتا ہے کہ دوسرے میں مخالفت کرنے کی طاقت ہی نہیں۔ منجھلے رائے نے پوول پرائس والے معاملے میں جم کر مخالفت کی۔ ایک تو پروفیسر دوسرے انگریز۔ اس نسل کے انسان بے وقوف بننے کے لیے پیدا نہیں ہوتے ــــــ! چھوٹے رائے نے انھیں بہت سمجھایا کہ وہ اسے صرف ہنسی مذاق ہی سمجھیں۔ اگر ایسا ہی ہوگا تو ہم معافی مانگ لیں گے۔ ہم تو اسے صرف پان کھلائیں گے۔ پان ہماری تہذیب کی علامت ہے۔ وہ تو کبھی انکار نہیں کرے گا۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ پان کھا کر کیسا لگتا ہے۔ آدمی یا بندر!

چھوٹے رائے کے ایک دوست تھے، مہاویر جین، سب انھیں کن کٹا صاحب کہتے تھے۔ ان کے کان کا کونا کٹا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ ٹپ ٹاپ رہتے تھے جب بھی کمرے سے باہر نکلتے ٹائی لگائے اور ٹیل سوٹ پہنے رہتے۔ وہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ باپ کے پاس ایک ریاست کی دیوانی تھی اور اس دیوانی کے سہارے بنی لمبی چوڑی جائیداد تھی۔ وہ ساری کی ساری کن کٹے صاحب کے لیے ہی تھی۔ ایک اور صفت بھی تھی۔ ناک سے بولتے تھے۔ کوئی انھیں نک کٹا صاحب بھی کہتا تھا۔ انگریزی ہی ان کی زبان تھی۔ آپ ہندی میں بولیں وہ

انگریزی میں جواب دیں گے۔ وہ بھی اپنے اسی تام جھام کے ساتھ رہتے تھے۔ انھوں نے تانگے یا گاڑی کے بجائے تنگ رکھی ہوئی تھی تاکہ کوئی چپڑ قناتیہ ان کے برابر میں نہ بیٹھے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ ہندوستانی بیت الخلا میں فراغت کے لیے نہیں جاتے۔ کموڈ پر جاتے ہیں۔ نہاتے نہیں، غسل کرتے ہیں وہ پیشاب بھی تام چینی کے 'باؤل' میں کرتے تھے۔ جمعدار بلا کسی تاخیر کے صاف کرتا تھا۔ کبھی کسی نے انھیں عام آدمیوں کی طرح ایری غیری جگہ موتتے نہیں دیکھا تھا اور نہ گندے پاخانے میں پاخانہ کرتے۔ البتہ ایک قصہ ضرور مشہور تھا کہ تک تک صاحب سویرے ٹہلنے جارہے تھے۔ انھیں یکایک بہت شدید حاجت محسوس ہوئی۔ انھوں نے اودھر ادھر دیکھا۔ نیم اندھیرا تھا پہلے سڑکوں کے برابر قدرتی قسم کے بڑے بڑے برساتی نالے ہوتے تھے ویسے ان میں گھاس اگی رہتی تھی، برسات میں خوب بھر کر چلتے تھے۔ تک تک صاحب نے کافی کوشش کی کہ کسی طرح اپنے کمرے پر پہنچ جائیں لیکن دباؤ شدید تھا۔ مجبوراً انھیں نالے میں گھسنا پڑا۔ حاجت تو رفع ہو گئی اور سکون بھی بہت ملا لیکن آبدست لینے کا سوال آیا۔ پہلے تو انھوں نے ڈھیلے سے صاف کیا۔ جب نہیں ہوا تو عطر میں بسے ہوئے رومال سے پونچھ کر پھینکنا پڑا۔ ان دنوں 'ایو تک' ان پیرس بہت مقبول تھا۔ لیکن ان کے کسی دوست نے انھیں فارغ ہوتے ہوئے دیکھ لیا جب تک وہ کالج میں پڑھا تب تک وہ ان سے روزانہ ایک گلاس دودھ اور پاؤ بھر قلاقند اس لیے وصول کرتا رہا کہ کہیں وہ کسی سے کہہ نہ دے اور ان کے صاحب پن میں فرق آجائے۔

مہاویر جین اپنے کو انگریز ماننے کے علاوہ انگریزوں کے بہت نزدیک بھی سمجھتے تھے۔ چھوٹے رائے انھیں ہی پٹایا اور ان کے ساتھ مل کر انھوں نے پوول پرائس کو پان کھلانے کا منصوبہ بنایا۱۱۔ اسی کے کمرے میں پان کھلانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس نے اس بات کو بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ منجھلے رائے سے یہ سب برداشت نہیں ہوا تو وہ گھر چلے گئے۔ ویسے بھی انھیں گھر جانا تھا۔

بوڑھانے دروازے پر ایک مشہور پان والا تھا۔ وہ اس زمانے میں سو سو روپے کا کشتے والا پان بناتا تھا۔ روساء اپنی عیاشی کو صحیح سلامت رکھنے کے لیے اس کا پان کھتے تھے۔ چھوٹے رائے

نے اس پان میں جاوتری، دال چینی، الائچی، لونگ وغیرہ کئی چیزیں ڈلوائیں۔ چھوٹے رائے کا چاندی کا اپنا پن ڈبہ ساتھ رہتا تھا۔ شام کو ٹینس کھیل کر لوٹتے ہوئے پوول پرائس اکثر ان کے ساتھ کمرے میں آجاتے تھے۔ انگریز اچھے کھلاڑی کی عزت کرتے تھے اور اگر وہ ان کا اپنا پارٹنر ہو تو کیا ہی کہنے۔ اس دن یہ اسے اپنے کمرے پر نہ لے جا کر مہاویر جین کے کمرے پر لے گئے۔ مہاویر جین نے اپنے کمرے میں قالین والین بچھا کر مسند وغیرہ لگوا رکھی تھی۔ کسی کے یہاں سے اخروٹ کی لکڑی اور ہاتھی دانت کی نقاشی دار چار کرسیاں بھی منگوالی تھیں، ان پر سرخ مخمل کی گدیاں جڑی تھیں۔

پوول پرائس نے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور بیٹھ گیا مہاویر کے پاس حالانکہ تاریخ کا مضمون نہیں تھا پھر بھی پوول پرائس اسے چھوٹے رائے کی دوست کی حیثیت سے جانتا تھا، چھوٹے رائے نے انگریزی میں پوچھا "سر، آپ نے کبھی پان کھایا؟"

انھوں نے جواب دیا "نو، وہ پتہ ہی تو ہوتا ہے۔۔۔ اس سے ہونٹ کیسے لال ہو جاتے ہیں؟"

"آج کھا کر دیکھیے!"

"نو، اس ملک میں پتیاں زہریلی ہوتی ہیں۔"

"اوہ، نو سر، پان تو بہت پاک چیز ہے۔۔۔ ہندوستانی تہذیب کی علامت ہے"

چھوٹے رائے ہندی میں بولے "ابے بندر، کھا کر تو دیکھ!"

"اس میں ایسی کون سی خوبی ہے۔۔۔ لوگ کیوں کھاتے ہیں؟"

"تم الو کی دم ہو۔۔۔"

"وہاٹ؟"

"میں کہہ رہا ہوں سر، یہ مردانہ قوت کا سرچشمہ ہے، منہ صاف کرتا ہے، آدمی کو جاڑے میں پسینہ لانے کی طاقت رکھتا ہے۔۔۔"

وہ سوچنے لگا۔ چھوٹے رائے نے مہابیر جین کی طرف اشارہ کر کے کہا "ابے کچھ تو بول!"

وہ ایک ہی جملہ بولے "سر، کھا کر دیکھیے تو۔۔۔!"

وہ پھر بھی چپ چاپ سوچتا رہا چھوٹے رائے ہندی میں کچھ کچھ بولتے رہے۔

"اب کھاتا ہے یا نہیں ــــ یا سوڑ دوں تیرے منہ میں ایک روپے کا پان ہے۔ کبھی دیکھا ہے ایک روپیہ کا پان!"

مہابیر جین بولے "سر، کھائیے نا!"

پوول پرائس نے پوچھا "راگھورائے بیچ بیچ میں کیا بولتا ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں، اگر آپ پان نہیں کھائیں گے تو آپ کا ہندوستان آنا بیکار ہو جائے گا، ویسے بھی ہندوستانی تاریخ میں راجاؤں اور رانیوں کے لیے پان کھانا ضروری تھا۔ پان کے بارے میں معلومات کے بغیر اور اسے کھائے بغیر ہندوستانی تاریخ سمجھنا مشکل ہوگا۔"

"اچھا تو ہم کھائے گا۔"

مہابیر جین سونے چاندی کی طشتری میں پان کا بیڑا لاکر رکھے ہوئے تھے۔ چھوٹے رائے نے اس کی نظر بچا کر اس بیڑے کو اپنے سونے کے ورق والے بیڑے سے بدل دیا۔ پوول پرائس بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔ "یہ تو سنہرا ہے۔"

"یہ ورق اصلی سونے کا بنا ہے۔"

وہ اسے گھما پھرا کر دیکھتے۔ چھوٹے رائے مسکراتے رہے "سالا بندر ــــ" جب اطمینان ہو گیا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے تو گپ سے منہ میں رکھ لیا۔ چھوٹے رائے نے مہابیر جین سے اس کا آئینہ سویرے ہی منگا لیا تھا تاکہ چہرہ نہ دیکھ سکے۔ پہلے تو گول گول منہ چلا کر پان کو دھیرے دھیرے چبایا۔ آنکھوں میں جذبہ کچھ ایسا تھا جیسے اس مزے کو دیکھنے کے لیے بھی کوشش کر رہا ہو۔ یکایک آنکھوں سے آنسو بہنے لگا اور ہونٹوں کے کونوں سے پیک بہہ آئی۔ منہ بھرا تھا اور وہ بولنا چاہ رہا تھا۔ منہ کھولتا تو پیک گرنے لگتی تھی۔ وہ ایک بار پیک پی گیا اور بولا "یہ تو بہت 'ہاٹ' ہے لیکن خوشبودار ہے۔"

چھوٹے رائے دھیرے سے بولے "بندر تو بن گیا ــــ اب جنجیری بنا بھی گھومے گا۔ ذرا رچنے تو دے۔"

جب بھی چھوٹے رائے اپنی زبان میں بولتے تھے تو وہ فوراً پوچھتا تھا "تم نے کیا کہا؟" اس حالت میں اس نے یہ ہی پوچھا۔

مہابیر جین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کا پان کھا کر پوول پرائس کی یہ حالت

کیسے ہو گئی؟ ایک دم سادہ پان تھا؟ سر کیا سوچیں گے؟ چھوٹے رائے نے ان کے کہنی ماری۔ ان کا اشارہ تھا کچھ تو کہو۔ وہ مک مکی آواز میں بولے "سر، آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔"

منہ بھرا تھا۔ اس نے گردن گھما کر شکریہ ادا کیا۔ کپڑے پیک سے رنگے تھے۔ بلا گھماتا ہوا تیزی سے دوڑتا ہوا بنگلے چلا گیا۔ راستے میں لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں کو دیکھ کر ان کے منہ پر ہنسنا تو مشکل تھا، سب منہ گھما کر ہنس رہے تھے۔ وہ فکر کیے بغیر بلا گھماتا اڑا چلا جا رہا تھا۔

بعد میں منجھلے رائے نے پورے قصے کا خوب مزہ لیا لیکن انھوں نے اس بات کی بھی تاکید کی آئندہ کبھی ایسا مت کرنا۔ اگر وہ سمجھ جاتا کہ تم نے بدمعاشی کی ہے تو کالج سے نکال دیے جاتے۔ منجھلے رائے اس واقعے کے بارے میں کن کٹے صاحب سے بے حد ناراض ہو گئے تھے۔ انھیں ان جیسے انگریز پرست سے یہ امید نہ تھی منجھلے رائے کے ویسے ہی دوست بہت کم تھے۔ کن کٹے صاحب سے ناراض انھوں نے اسے بھی اپنے دوستوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ جو کچھ بھی بات چیت تھی وہ چھوٹے رائے کے ساتھ ہی تھی۔ دراصل وہ سوچتے تھے کہ بڑے گھروں کے بچے چھوٹے لوگوں سے جتنا کم ملتے ہیں اتنا ہی بڑے بنے رہتے ہیں۔ وہ رانگھو کو بھی اسی بات کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ مذاق کرنے اور برابر کے تعلقات بنا کر رکھنے کی بات تو انھیں پہلے ہی ناپسند تھی۔ وہ سوچتے تھے بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے اور رعایا رعایا۔ اگر ہمارے ماتحت لوگ ہم سے برابری کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں کیسا لگے گا۔ ایسا ہی انگریزوں کو بھی لگتا ہوگا۔ کہاں وہ کہاں ہم۔ منجھلے رائے سمجھ رہے تھے کہ اس دن کے پان والے واقعہ سے اگر پوول پرائس ناراض ہو گیا ہوتا ـــــ تو وہ چھوٹے رائے کو آڑے ہاتھوں لیں گے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔

پوول پرائس الٹے ان سے اور زیادہ خوش تھا۔ وہ روز ان سے پان کھلانے کو کہتا۔ اس وقت تک اس کی میم بھی آ چکی تھی۔ وہ ایک پان اس کے لیے بھی لے جاتا تھا۔ ایک اور بات اس کے دماغ میں گھر کر گئی تھی کہ پان ازدواجی تعلقات میں زیادہ اپنائیت پیدا کرتا ہے۔

پوول پرائس اور چھوٹے رائے کی اتنی گہری دوستی ہو گئی تھی کہ پوول پرائس کے انگریز ساتھی

انھیں اا ابجاد دینے لگے تھے ان کا کہنا تھا ـــــ تم ان ہندوستانیوں سے کیوں دوستی رکھتے ہو۔ وہ ٹیوز اینڈ تھرڈ کے علاوہ اور کسی لائق نہیں۔ پوول پر اس ان سے لڑ بیٹھتا تھا ـــــ تم ان کے نزدیک آئے بغیر انھیں کیسے سمجھ سکتے ہو؟ ان کا تہذیبی سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ کئی بار وہ پلٹ کر انگریزوں پر ہی تنقید شروع کر دیتا تھا۔ تاریخی تناظر کو سمجھے بغیر آپ ان لوگوں کو نہیں جان سکتے۔ آپ لوگ ہندوستانی تاریخ پڑھیے۔ ہم لوگ دنیا کی سب سے خود غرض قوم ہیں۔ ہم لوگ اپنے اور اپنے ملک کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا ہی نہیں جانتے۔ ہمارے پاس کھیتی کے لیے زمین نہیں تھی تو ہم نے اپنے ملک کی صنعت کاری کرلی۔ کچا مال خریدنے اور تیار مال بیچنے کے لیے دوسرے بازار مطلوب تھے تو ہم نے دنیا بھر میں اپنی نو آبادیات بناڈالیں۔ ان کی ترقی کے راستے بند کر دیے۔ وہ نو آبادیات ہمارے لیے خام مال اور مزدوروں کی کان ثابت ہوئے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا ہوتا تو ہم کہاں جاتے؟ ہمارے پاس نہ اتنی پرانی یادیں ہیں اور نہ تہذیب جتنی ہندوستان، یونان، مصر، روم وغیرہ ملکوں کے پاس ہے۔ ہمارے پاس طاقت کے بل بوتے پر تعلقات بنا کر اس کا استحصال کرنے کی لاجواب صلاحیت ہے۔ یہ ہی سب باتیں وہ کلاس میں پڑھاتے تھے۔ لڑکوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ایک انگریز اپنے ملک و قوم کے بارے میں یہ باتیں کیسے کہتا ہے۔ منجھلے رائے اور چھوٹے رائے گھر جا کر بھی یہ سب باتیں بتایا کرتے تھے۔ بڑے رائے کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن انھیں بھی تعجب ہوتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ کہیں ان کا بھی وقت تو نہیں آگیا؟ جب اپنی ہی قوم کے بارے میں اسی قوم کے لوگ یہ سب سوچنا شروع کر دیں تو وہ قوم ڈوب جاتی ہے۔

کالج کے پرنسپل ڈانل صاحب سے بھی دوسرے انگریز ماسٹروں نے پوول پر اس کی شکایت کی تھی۔ ڈانل نے اس کی بات دھیان سے سنی تھی سن کر پوچھا "پوول حقائق کو توڑتا مروڑتا ہے یا ان کی تشریح اپنے نقطہ نگاہ سے کرتا ہے؟"

وہ لوگ اس بات پر چپ رہے تھے۔ ڈانل صاحب دراصل آئرش تھے۔ ان کا نظریہ انگریز ماسٹروں سے مختلف تھا۔ منجھلے رائے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے ـــــ آئرش انگریزوں کی جڑ کاٹتے ہیں پھر بھی وہ انھیں گلے لگاتے ہیں۔ اونچے اونچے عہدوں پر فائز کرتے ہیں۔ خیر ڈانل صاحب نے انھیں ایسا لیکچر دے ڈالا ـــــ "اگر کوئی ماسٹر غلط پڑھاتا

ہے۔ حقائق کو اپنے حساب سے توڑتا مروڑتا ہے اور اس توڑ مروڑ کے پیچھے اس کی کوئی اطمینان بخش دلیل نہیں ہوتی تو وہ اس کے لیے جواب دہ ہوتا ہے۔ اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ لیکن اگر وہ حقائق کی منطقی انداز میں کوئی نئی تشریح کرتا ہے، چاہے وہ کسی کو پسند ہو یا نہ ہو تو یہ اس کا اختیار ہے۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ تاریخ مذہب نہیں ہے۔ ویسے تو مذہب کی بھی آزادانہ تشریح ہوتی ہے وہ تشریح بھی بڑے سے بڑا خطرہ اٹھا کر ماسٹر ہی کرتے ہیں۔ انتظامیہ میں ہی تاج سب سے اعلیٰ ہو لیکن کلاس میں ماسٹر سے بڑا کوئی نہیں ہوتا۔ میں اکثر اچھے گلوکار اور اچھے ماسٹر کو برابری پر رکھ کر دیکھتا ہوں۔ سنگیت کی گرامر ایک ہی ہے لیکن موسیقار اس کا استعمال اپنی طرح کرتا ہے۔ اس میں اس کی آزاد حکمرانی ہوتی ہے۔ استاد بھی گلوکار ہی ہوتا ہے۔ اس کی آزادی اور لگن گلوکار سے کبھی کم نہیں ہوتی" ڈانل کی تقریر سن کر ساری انگریز ماسٹر چپ ہو گئے۔

منجھلے رائے پوول سے اتنے ناراض ہو گئے تھے کہ انھوں نے ان کا مضمون ہی چھوڑ دیا۔ انگریز ہو کر اپنی قوم کی مخالفت چھوٹے رائے نے ہلکی سی چٹکی لی تھی۔ ہم لوگ بھی کیا کرتے رہے ہیں؟ اس بات سے وہ کافی جذباتی ہو گئے تھے۔ ہماری اور ان کی کیا برابری! چھوٹے رائے ہنس دیئے تھے۔ منجھلے رائے کا خیال تھا کہ ساری دنیا انگریزوں کے چلائے چل رہی ہے۔ ساری سائنسی ترقی ۔۔۔ چاہے ریل ہو، موٹر کار ہو، غیر ملکی کپڑے ہوں، چور تی ہو، جہاز ہو ۔۔۔ سب ان ہی کی عقل کا چمتکار ہے۔ ورنہ ہم لوگوں کے پاس کیا تھا؟ بڑے رائے کا بھی یہ ہی خیال تھا۔ وہ منجھلے رائے سے بھی دو قدم آگے تھے وہ کہتے تھے انصاف بھی ان ہی کی عنایت کا نتیجہ ہے ورنہ ہم نے ایک دوسرے کی گردن کاٹ کر خون کی ندیاں بہادی ہوتیں۔ چھوٹے رائے بڑے رائے کی بات چپ چاپ سن لیتے تھے۔ ہاں، جب یہ بات منجھلے رائے کہتے تھے تو ٹوک دیتے تھے ـــــ "منجھلے بھائی، آپ ہمیشہ یہ کیا کہتے رہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انگریز قوم باہمت بھی ہے اور عقلمند بھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اتنا چھوٹا ہوتے ہوئے بھی ان کے ملک نے دنیا بھر کی حکومت اپنی گٹھری میں باندھ رکھی ہے۔ لیکن ہم کیا کر رہے ہیں ـــــ ہم اتنا بڑا ملک ہو کر لوہے کے اسٹار کی طرح ان کے جوتے کی ایڑی اور ٹوپ میں جڑے رہ کر، ان کی ٹھوکر مارنے کی طاقت کو بڑھا رہے ہیں۔ ہم دوسروں کو بڑا مان کر اپنے کو کب تک اس طرح گراتے رہیں گے؟"

منجھلے رائے یہ دراصل کم ہی سمجھتے تھے لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا چھوٹا بھائی حکومت کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس بات کی شکایت بڑے رائے کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ اس سلسلے میں فکرمند تھے۔ اگر یہ بات باہر پھیل گئی اور سرکار کو پتہ چلا تو خاندان کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔ کئی صدیوں سے یہ خاندان انگریزوں کی مہربانی سے ہی عزت یافتہ بنا ہوا ہے۔ جب چھوٹے رائے چھٹی میں آئے تو انھوں نے انھیں بلا کر پوچھا ـــــ "راگھو، کیا تم سوراجیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگے؟"

چھوٹے رائے کو تعجب ہوا "نہیں بھیا! آپ سے کس نے کہا؟"

پہلے چپ رہے پھر بولے "تم کرشنا سے انگریزوں کی برائی کر رہے تھے؟ تمھیں معلوم ہے انگریزوں کی وجہ سے ہم لوگ عزت اور سکون سے رہتے ہیں۔ اگر وہ ناراض ہو گئے اور ہمیں غدار سمجھ بیٹھے تو یہ تمام جاہ و حشم خاک ہو جائے گا۔ حکومت راجہ کی بات اور اس کے دبدبے سے ہی چلتی ہے۔ غریبوں کے درمیان گھومنے، انھیں سرکار کے خلاف بھڑکانے اور اس کے خلاف بے تکی باتیں کرنے سے کام نہیں چلتا اور نہ حکومت چلتی ہے۔ وہ لوگ کیا جانیں حکومت کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے۔

راگھو کے دل میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا ـــــ اگر میں آزادی سے بات کرتا، سوراجیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے تو یہ ہی سہی لیکن بڑے رائے کے سامنے ان کا منہ نہیں کھل سکا تھا۔ اپنے کو سنبھالتے ہوئے بولے ـــــ "بھیا، سوراجیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے بیٹھنے کے لیے ہمت چاہیے۔ وہ ہم زمینداروں کے بچوں میں کہاں؟ ملک کی آزادی کو اپنی زندگی کا نصب العین وہی لوگ بنا سکتے ہیں جنھیں نہ زمین چاہیے اور نہ اس سے وابستہ دولت اور عزت۔ میری پرورش تو غلامی کے عوض میں ملنے والی مراعات اور سہولیات میں ہوئی ہے۔ ہمیں تو وہی غلامی پیاری ہے جو ہمارے لیے عیش و عشرت فراہم کرے۔ منجھلے بھیا غلط سمجھ گئے۔ میں نے تو انگریزی کی تعریف کی تھی۔ اتنی سے بات سے وہ ناراض ہو گئے۔ انھوں نے پوول پرائس سے پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔"

بڑے رائے چھوٹے رائے کی بات بغور سن رہے تھے۔ جب چھوٹے رائے کہہ چکے تو انھوں نے ان کی طرف متلاشی نظر سے دیکھا ـــــ دیکھو راگھو، جتنا میں تمھیں سمجھتا ہوں اس سے مجھے لگتا ہے کہ تم پوول پرائس کی بات ہو یا ڈک کی ـــــ تمھارے دماغ میں

انگریزوں کی مخالفت کے بیج کلبلا رہے ہیں ___ اگر تم نہیں مانو گے تو مجھے تمھیں بیچ میں ہی واپس بلانا ہوگا۔"

چھوٹے رائے نے گردن نیچی کی اور چپ چاپ اٹھ کر چلے گئے۔

رات میں جب لیٹے تو چھوٹے رائے بڑے رائے سے ہوئی بات چیت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ چھوٹی چاچی نے پوچھا۔

"نہیں، میں دوسری بات سوچ رہا ہوں۔ ایسا کیسے چلے گا ___ زمانہ بدل جائے گا اور کیا ہم وہیں کے وہیں کھڑے رہیں گے؟ جو وقت کے ساتھ چلتے ہیں وقت ان کے ساتھ چلتا ہے۔ جو چٹان کی طرح ہلتے ہیں نہ ڈلتے ہیں ___ یا تو انھیں بارود سے اڑا دیا جاتا ہے یا زلزلہ گرا دیتا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو تم سن رہی ہو! مجھے ڈر بھی لگتا ہے اور ایک روشنی بھی نظر آتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"سمجھو گی بھی نہیں۔ اس خاندان کے آدمی ہی نہیں سمجھنا چاہتے تو عورتوں کو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں کی عورتوں کو تو سورج کی روشنی بھی کبھی کبھی دکھائی دیتی ہے۔"

چاچی چپ ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد بولیں "آپ نے کہا تھا کہ اگلی بار آپ مجھے میرٹھ لے کر چلیں گے۔ میم کو دکھائیں گے، منجھلے جی تو منجھلی بھابی کو پیہر لے جانے کے بہانے دکھا بھی لائے" چھوٹے ہنسے اور بولے "ہم جیسے غلام پیدا کر کے کیا کرو گی۔ ہم سب تو مینڈکوں کی اولاد ہیں۔"

چھوٹی چاچی چونکیں "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی جو مجھے محسوس ہوتا ہے!"

چاچی سمجھی نہیں تھیں۔ وہ بولیں "چوہے کا بچہ بھی پیدا ہو جائے تب بھی میں

سمجھوں گی کہ میری زندگی کامیاب ہو گئی۔ لوگ یہ تو نہیں کہیں گے کہ میں بانجھ ہوں۔"
چھوٹے رائے ہنس دیے "ارے۔۔۔ بے۔۔۔ بے۔۔۔ اگر چوبے کے بیٹے سے کام چل جائے تو اتنی تکلیف اٹھانے کی ضرورت۔ جتنے ہوا گر تمھارے بستر پہ چھوڑ دوں ـــ لوک کتھاؤں کی رانیاں بھی یہی کیا کرتی تھیں۔"

چاچی یکایک رونے لگیں۔ شاید مذاق کافی بھاری پڑ گیا تھا۔ چھوٹے رائے اگلے دن بہت مغموم دل سے کالج واپس چلے گئے۔ ان کا ارادہ چھوٹی چاچی کو دکھی کرنے کا قطعی نہیں تھا۔

چھوٹے رائے کے مہاویر جین عرف ننکا صاحب تو دوست تھے ہی، راج ونش بھی دوست تھے۔ راج ونش ایک چھوٹی موٹی ریاست کا شہزادہ تھا لیکن تھا کنجوس۔ جو نوکر چاکر ان کے ساتھ رہتے تھے ان میں سے کسی کو بھی ان کے باورچی خانے سے کھانا نہیں ملتا تھا۔ سب اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ اگر ان کے پاس کھانے کو نہیں ہوتا تھا تو وہ یا تو بھوکے سو جاتے تھے یا ہاسٹل کے کسی میس میں جا کر بچا کھچا کھا لیتے تھے۔ لیکن یہ ہمیشہ ممکن نہیں تھا ایک طرح سے وہ سب غلام ہی تھے راج ونش کے ساتھ بھی یہی تھا۔ کبھی مہاویر کے یہاں آ کر کھانا کھا جاتا تھا اور کبھی دوسروں کے کچن میں حصہ بانٹ کر لیتا تھا۔ یعنی مہینے میں دس بارہ دن تو ان کے یہاں رسوئی ہی نہیں بنتی تھی۔ وہ منجھلے رائے کا بھی اچھا دوست تھا۔ منجھلے رائے اس کو کھلانے پر بھی اعتراض نہیں کرتے تھے بلکہ خوش ہوتے تھے۔ چھوٹے رائے اگر کسی اور کو کھانے پر مدعو کر لیتے تھے تو ان کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ وہ کسی کو ادھار بھی نہیں دیتے تھے جبکہ چھوٹے رائے کے پاس پیسہ رہتا ہی نہیں تھا سب دوستوں کے پاس پڑا رہتا تھا لیکن ان کا کام بھی نہیں رکتا تھا۔

راج ونش کے ہر دوست کو یہ شکایت تھی کہ وہ کھاتا تو سب کا جاتا ہے اور کھلاتا کسی کو نہیں۔ کچھ لوگ تو دبی زبان سے یہ بھی کہتے تھے کہ کا ہے کی ریاست سالا جمعدار لگتا ہے۔ جمعدار! مہاویر جین عرف ننکا صاحب زیادہ ہی خوفزدہ تھے۔ تقریباً ہر ایک اسے سبق سکھانا چاہتا تھا لیکن وہ ہتھے نہیں چڑھ رہا تھا۔ راج ونش روزانہ شام کو توپ خانے والے مزار پہ

چراغ جلانے جاتا تھا۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر پیر کی نظر عنایت ہو گئی تو پاس بھی ہو جاؤ گے اور گدی بھی جلدی مل جائے گی۔ اس کے والد یا راجہ صاحب عیاش تو تھے ہی بیمار بھی رہتے تھے۔ رانی صاحبہ سوتیلی ماں تھیں اس لیے وہ گھر کم ہی جاتا تھا جب بھی کوئی کہتا تھا کنور صاحب کبھی تو دوستوں کو کھلایا پلایا کرو تو وہ یہ ہی جواب دیتا تھا کہ ایک بار ریاست ہاتھ آنے دو پھر دیکھنا کیا ٹھاٹ باندھتا ہوں۔

ایک دن چھوٹے رائے اور مہادیو راج ونش کے یہاں گئے تو پتہ چلا کہ وہ مزار پر چراغ جلانے گیا ہے۔ دونوں لوگ جلدی جلدی دوسرے راستے سے مزار پر پہنچ گئے۔ اسی کے کمرے سے سفید چادر بھی لیتے گئے۔ جاکر پیپل کے پیڑ کے پیچھے چھپ گئے۔ جیسے ہی راج ونش چراغ روشن کر کے مڑا تو آواز آئی ـــــ "تو روز خالی ہاتھ چراغ جلانے آجاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ریاست کا مالک بن جائے۔۔۔" آواز کے ساتھ ساتھ پیپل کے پیڑ کے پیچھے سے سفید چادر میں لپٹا ایک ہیولہ اٹھتا چلا آرہا تھا۔ راج ونش نے ہمت کر کے گھبرائی آواز میں پوچھا ـــــ "آپ کون ہیں؟"

وہ ہیولہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ ڈر گیا۔ پھر آواز آئی "جس کی منت کرنے تو ہر جمعرات کو آتا ہے۔"

راج ونش کی گھگھی بندھ گئی۔ بہت مشکل سے بول سکا "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

ہر جمعرات کو ایک سیر قلاقند چڑھایا کر ورنہ تیرے سارے منصوبے ملیامیٹ کر دوں گا" دھیرے دھیرے وہ ہیولہ بیٹھتا گیا اور پھر غائب ہو گیا۔

راج ونش سیدھے چھوٹے رائے کے پاس گیا۔ چھوٹے رائے اور تنک نکے صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔ جب وہ پہنچا تو وہ کسی بات پر ہنس رہے تھے لیکن راج ونش کے منہ سے آواز نکل نہیں رہی تھی۔ پسینے سے شرابور تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر سنجیدگی کی اداکاری کرنے لگے۔ ہنسی بمشکل روکتے ہوئے چھوٹے رائے نے پوچھا "ارے تم اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

وہ مشکل سے کہہ پایا "بڑی مشکل سے جان بچی ـــــ پیپل پر سے پیر اتر آئے تھے۔"

چھوٹے رائے ور مہادیو کو ہنسنے کا موقع مل گیا۔ چھوٹے رائے زور سے ہنستے

ہوئے بولے ”تم پاگل ہو ـــــ پیر ویر کچھ نہیں ہوتا۔ کسی نے یہ مذاق کی ہوگی۔“

مہاویر جین بولا ـــــ ”دراصل یہ تیرے دل کا وہم ہے۔ تو سوچتا ہے نا۔ پڑھے بغیر تجھے پیر پاس کردے گا ـــــ باپ کے ہوتے ہوئے تو گدی پر بیٹھ جائے گا ـــــ تیرا انحصار پیر پر ہے اور کرشن رائے کا انگریزوں کی مہربانی پر۔“

”نہیں، تم سمجھتے نہیں ـــــ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اتنا اونچا تھا جتنا اونچا یہ سر دال (دروازے کی چوکھٹ کا بازو)

”ارے کسی نے مذاق کیا ہوگا ـــــ ”چھوٹے رائے نے پھر اپنی بات دہرائی

مہاویر جین نے پوچھا ”دکھائی تھا یا کچھ کہا بھی تھا؟“

”کہہ رہا تھا کہ ہر جمعرات کو ایک سیر قلاقند چڑھایا کر، ورنہ تیرے منصوبے ملیامیٹ کردوں گا۔“

چھوٹے رائے بولے ”ارے یار چھوڑ ـــــ پیر تھوڑے ہی کھانے آئے گا ـــــ تو مٹھائی ہم لوگوں کو کھلادے ـــــ ہم پیر سے اپنے آپ نمٹ لیں گے۔“

”نہیں، پیر نے مانگی ہے تو ضرور چڑھایا کروں گا۔ پیر ناراض ہو گیا اور مجھے فیل کردیا، گدی نشینی لٹک گئی تو کیا ہوگا؟“

”گدی تو تجھے ملنی ہی ہے۔ آخر اکیلا وارث ہے۔ تیرے علاوہ کون ہے جو گدی پر بیٹھ سکتا ہے؟“

”بڑے راجہ اتنے دن سے بیمار پڑے ہیں۔ پتہ نہیں کب تک پڑے رہیں گے اور پھر چھوٹی ماں ـــــ“

”اچھا تو، تو چاہتا ہے کہ بڑے راجہ جلدی سے چلتے بنیں ـــــ تو پھر میکبیتھ کیوں نہیں بن جاتا؟! انگریزی والے پروفیسر بلّن کے پاس پہنچ جا۔“

”نہیں یار، یہ بات نہیں۔ وہ بہت خرچیلے ہیں، ریاست لٹی جارہی ہے۔ اگر کہیں چار چھ سال اور رہ گئے تو سب ٹھکانے لگ جائے گی۔“

چھوٹے رائے کچھ گمبھیر ہو گئے، بولے ”کیا ریاست باپ اور بھائی سے بڑی ہے؟“

”نہیں، نہیں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ریاست بچی رہے۔“

کن کنا صاحب بولا ”پھر تو تمھیں مٹھائی چڑھانی ہی پڑے گی ـــــ بہت زیادہ

جلد ہی ہو تو دگنی کر دو۔"

"پیر صاحب اتنی کھا پائیں گے؟"

ان کے بھی لگوے بھگوے ہوں گے۔ جتنی کھائی جائے گی اتنی خود کھالیں گے۔ بچی ہوئی باقی سب بانٹ دیں گے۔"

پہلے سوچتا رہا پھر اپنے آپ ہی اٹھ کھڑا ہوا "اچھا تو چلتا ہوں۔"

چھوٹے رائے نے کہا "تو تم اگلی جمعرات سے چڑھا ہی دیا کرو۔"

وہ بولا "نہیں۔"

اگلی جمعرات کو راج ونش مٹھائی لے کر گیا۔ چھوٹے رائے اور کُن کتا صاحب پہلے سے ہی پہنچ گئے تھے۔ وہ چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ راج ونش مٹھائی چڑھا کر بولا "پیر بادشاہ ایک سیر مٹھائی تو بہت دام کی آتی ہے ـــــ بڑے راجہ ریاست لٹائے دے رہے ہیں۔ میں آدھا سیر ہی لایا ہوں۔" آواز آئی تیری یہ جرأت ـــــ اگلی جمعرات کو آدھا سیر امرتی اور لانی ہوگی۔"

"نہیں، نہیں، میں کو ایک سیر قلاقند ہی لایا کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، جا معاف کیا۔"

وہ چلا گیا۔ وہ دونوں نکلے۔ دونہ اٹھایا ہاسٹل میں دو چار دوستوں کو اکٹھا کیا اور مزے سے قلاقند اڑانے لگے۔

کچھ دن بعد راج ونش کو پتہ چل گیا۔ اسے شاید اپنے اوپر شرم آئی اور وہ پڑھائی ادھوری چھوڑ کر لوٹ گیا۔

ان ہی دنوں شہر میں فساد ہو گیا۔ آندولن کا زمانہ تھا۔ انگریزوں نے دو آندولن کرنے والوں کو گولی سے بھون دیا تھا۔ کئی زخمی ہو گئے تھے۔ کالج کے لڑکے مشتعل تھے۔ کسی انگریز افسر کی بیٹی خود کار چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ لڑکوں نے اسے روک لیا۔ لڑکوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اس نے انھیں دیکھا، وہ چلائی اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر اسے ہوش ہی نہیں آیا۔ گوری لڑکی کی موت نے سارے گورے اقتدار کو ہلا دیا تھا۔ دراصل

لڑکوں کو ارادہ صرف اتنا ہی تھا کہ ان کا یہ پیغام انگریزوں تک پہنچ جائے کہ ہندوستانی اب ہر طرح سے تیار ہیں۔ وہ اسے تنگ کر کے چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی لڑکے سکتے میں آ گئے تھے۔ انھیں اس وقت تک ایک ہی راستہ سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے پرنسپل ڈانل کے پاس جا کر صحیح قصہ بیان کر دیں۔

شام کا وقت تھا۔ ڈانل اپنی بیگم کے ساتھ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ اتنے لڑکوں کو بنگلے کے گیٹ پر اکٹھا دیکھ کر ڈانل صاحب اٹھ کر باہر آئے۔ انھوں نے کہا "ہو میرے بچو، میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ کوئی پریشانی؟"

پہلے تو لڑکے خاموش رہ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر انھوں نے ہمت کر کے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ کیسے اس لڑکی کا اس دن پیچھا کیا، ڈرایا، کیسے وہ پیچھے چلا کر ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہے۔ پھر پوچھا "تم جو کہہ رہے ہو، کیا وہ سچ ہے؟"

"جی ہاں ہم قسم کھاتے ہیں۔"

انھوں نے تمام لڑکوں کی طرف باری باری دیکھا کہ صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط۔ پھر پوچھا "کہاں ہے لاش؟"

"بیم برج کے پیچھے والے جنگل میں۔ تب وہاں جنگل تھا۔

انھوں نے اپنی کار نکالی۔ چھوٹے رائے بھی اسی ہجوم میں شامل تھے۔ وہ ٹینس کے ایک اچھے کھلاڑی کے ناتے انھیں پہچانتے تھے۔ اشارے سے چھوٹے رائے اور ایک لڑکے کو بٹھایا اور چل دیے۔ باقی لڑکوں سے کہہ گئے کہ وہ بنگلے پر ہی رہیں اور لوٹنے کا انتظار کریں۔ وہ جنگل نالے کے کنارے کنارے دور تک چلا گیا تھا۔ چھوٹے رائے راستے بھر ڈرتے رہے کہ کہیں انھیں پولس کے حوالے نہ کر دیں۔ بڑے رائے کیا کہیں گے؟ ہو سکتا ہے جنگل میں لے جا کر گولی مار دیں۔ ایک انگریز لڑکی کی موت کے بدلے دو ہندوستانیوں کی جان لے لیں۔

ڈانل صاحب پورے راستے کار بہت محتاط ہو کر یکسوئی سے چلا رہے تھے۔ ان کی بھوری گھنی مونچھوں کے بال برابری سے ہل رہے تھے۔ انھوں نے جنگل میں گھس کر پوچھا "اس لڑکی کے ساتھ کسی نے زنا بالجبر تو نہیں کیا؟"

دوسرا لڑکا تو چپ رہا، چھوٹے رائے نے وثوق سے کہا۔ ''نہیں سر، وہ تو یکا یک بے ہوش ہو گئی، پھر ہوش میں نہیں آئی۔ ہم لوگوں نے پانی کے چھینٹے بھی مارے۔''

''ہو سکتا ہے ایسا کرتے۔۔۔؟''

''میں ایسا نہیں سوچتا۔۔۔ ہم لوگوں تو صرف خوف پیدا کرنے کے لیے اسے روکا تھا۔''

کار کو اس جگہ لے جا کر انھوں نے روک دیا جہاں لڑکوں نے پتوں سے ڈھک کر اس کار کو چھپایا ہوا تھا۔ لڑکی کی لاش اب بھی کار میں ہی پڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کار کے باہر لٹکا ہوا تھا۔ ڈانل صاحب اس کی لاش کو دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ ان کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک گیا۔ انھوں نے دونوں لڑکوں کو اشارہ کیا۔ چھوٹے رائے اسے سر کی طرف سے اٹھایا دوسرے لڑکے نے پیروں کی طرف سے اور ڈانل صاحب نے پیٹھ کے نیچے ہاتھ لگایا، اور لا کر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

وہ ذہنی طور پر کافی پریشان ہو گئے تھے اور کار کافی تیزی سے چلا رہے تھے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ سڑک پر تب بھی شام کو سناٹا ہو جاتا تھا بہت کم لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اب تو لوگ دیر تک ٹہلتے ہیں۔ سر شام گھروں میں گھس جاتے تھے۔ جو بڑے لوگ ہوتے تھے وہ کلبوں میں ناچ گانا سننے چلے جاتے تھے۔

ڈانل نے راستے میں صرف ایک جملہ بولا ''یہ تو ایلیسا ہے۔۔۔ میرے دوست کرنل ہربرٹ کی بیٹی۔ میں نے اسے گودوں میں کھلایا ہے۔ میرے بچوں نے یہ کیا کیا۔۔۔''

ان کی آواز بھر آگئی۔

جب بنگلے پر پہنچے تو لڑکے چپ چاپ بیٹھے ہم لوگوں کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب نے مل کر ایلیس کی لاش کو ان کی کار سے بہت احترام کے ساتھ اتارا۔ کچھ لڑکوں کی تو آنکھیں بھر آئیں۔ ایک حسین لڑکی کا یہ انجام! لاش پیچھے باغیچے میں لے جائی گئی۔ ڈانل اپنی

بیوی کو لے کر اندر چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک اندر سے تیز باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر سسکیاں سنائی دیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ دونوں باہر نکلے تو کافی سنبھلے ہوئے تھے۔ مسز ڈانل نے ایلس کی میت کو نہلایا۔ کپڑے بدلے۔ مسز ڈانل کی شادی کے وقت کا لباس تھا انھوں نے وہی لڑکی کو پہنا دیا۔ وہ اپنے آنسو روکنے کی مستقل کوشش کر رہی تھیں۔ سارے وقت ہونٹوں کو دانتوں تلے دبائے رہے۔ ڈانل نے بائبل کے کچھ حصے پڑھے۔ تابوت منگوا کر میت اس میں رکھی گئی۔ سب لڑکوں نے مل کر گڑھا کھودا اور تابوت کو دھیرے دھیرے رسیوں کے سہارے اس میں اتار دیا۔ ایلس کو دفن کرتے ہوئے ڈانل اور ان کی میم صاحب بچوں کی طرح بلک پڑے۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے بدبدا رہی تھیں۔۔۔ ہم دوسرے کی بچی کو کیسے دفنا رہے ہیں ـــــ عیسیٰ مسیح ہمارے گناہوں کو معاف کرنا۔ ڈانل صاحب ایک دم خاموش تھے۔ مسز ڈانل کو بار بار سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھیں۔ جب دفن ختم ہوا تو انھوں نے اس جگہ پر گملے رکھوا دیے پھر بولے "میرے بچو، میں جانتا ہوں تمھاری آزادی کی جنگ ہے۔ ہم لوگ تمھاری آزادی کو اپنے پیروں کے نیچے دبائے اس کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ پھر بھی یہ ٹھیک نہیں ہوا۔۔۔ انسان کی زندگی کی سلامتی آزادی کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔۔۔ بے گناہ انسان کی موت غلامی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔۔۔ وہ کسی بھی قوم یا ملک کا رہنے والا کیوں نہ ہو لیکن اس اصول کی پابندی خود ہم نے نہیں کی۔۔۔ اس لیے تمھیں کچھ کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے کسی بھی وجہ سے کسی کا قتل کبھی نہ معاف کرنے والا ایسا جرم ہے جس کی معافی خدا کے ہاتھ میں بھی نہیں۔ ایک شریف اور ہونہار بچی کا یہ انجام۔۔۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس ایک بچی کے لیے میرے ہزاروں بچوں پر موت کا سایہ منڈلانے لگے۔ اس لیے میں نے یہ گناہ کیا۔۔۔ اس بچی کے والدین کو اس کے آخری دیدار سے بھی محروم کر دیا۔ لیکن تم لوگ بھی اس گناہ کے اتنے ہی حصے دار ہو جتنا کہ میں۔ تمھاری بات میں سچائی دیکھ کر میں نے ایسا کیا ـــــ خدا تم پر اور ہم پر دونوں پر رحم کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ ابھی یہ راز ہی رہے۔"

سب لڑکے چلے گئے۔ سب ہی لڑکوں کے اوپر اس واقعہ کا اتنا اثر تھا کہ اس رات سب نے کھانا نہیں کھایا اور نہ آپس میں بات کی۔ سب کا منہ بند تھا۔ ڈانل صاحب نے اگلے ہفتے اپنی بیوی کو ولایت بھیج دیا۔

سارے شہر میں ایلس کی تلاش ہو رہی تھی۔ پکڑ دھکڑ بھی شروع ہو گئی تھی۔ انتظامیہ کا خیال تھا کہ سیاسی معاملہ ہے۔ کئی سیاسی لوگوں کو پریشان کیا جا رہا تھا۔ ایلس ڈانل کے دوست کی لڑکی تھی اس لیے آدمی ان کے یہاں بھی پوچھنے آیا کہ مسّی بابا ان کے یہاں تو نہیں آ ئیں۔ جب وہ آدمی پوچھنے آیا تو ڈانل اس جگہ موم بتی جلا کر لوٹ رہے تھے جہاں اسے دفنایا گیا تھا۔ وہ جواب نہ دے سکے، نہ انھوں نے یہ ہی پوچھا کہ ایلس کو کیا ہوا؟ انھوں نے سر ہلا دیا اور وہ چلا گیا۔

پولس کو یہ بھی شک تھا کہ کالج کے لڑکوں نے ایلس کو قتل کر دیا۔ کار بر آمد ہو چکی تھی لیکن نہ کہیں خون کے دھبے اور نہ توڑ پھوڑ کے نشان۔ بس ایسا لگتا تھا کہ کوئی اور کار آئی اور وہیں سے لوٹ گئی۔ یہ پتہ چل رہا تھا کہ دن میں چار بجے لڑکوں کا ہجوم ادھر ہی گیا تھا اور انھوں نے کار کو گھیر لیا تھا۔ ڈانل نے لڑکوں کو واضح ہدایت دے دی تھی کہ جب تک شہر میں تناؤ ہے، نہ کوئی لڑکا ہاسٹل سے نکلے گا نہ کالج سے باہر جائے گا۔ کالج بند کر دیا گیا تھا۔ ڈانل صاحب سے ضلع انتظامیہ کی جانب سے بار بار کہا جا رہا تھا کہ ان کے کالج کے لڑکوں نے ایلس کو غائب کیا ہے۔ ڈانل صاحب کا واضح کہنا تھا کہ جب تک کوئی ثبوت نہ ہو پولس میرے لڑکوں کو پریشان نہیں کر سکتی۔ ویسے ڈانل ملٹری کے ریٹائرڈ کرنل تھے۔ اس لیے ان کے سامنے پولس افسران کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی انھوں نے پولس کپتان سے بھی کہہ دیا تھا ـــــ ایلس میرے دوست کی بیٹی ہے۔ جتنا پولس پریشان ہے۔ اس سے زیادہ میں مغموم ہوں۔ یہ میرا ذاتی نقصان ہے۔ یہ کہتے وقت ان کی آواز بھر بھرا جاتی تھی۔ پولس کپتان کے پاس سیلیوٹ کر کے واپس چلے جانے کے علاوہ دوسرا راستہ نہیں بچتا تھا۔

پولس آتی تھی اور لوٹ جاتی تھی۔ ڈانل چٹان کی طرح غیر متزلزل لیکن اندر ہی اندر مجروح تھے۔ تنہائی میں وہ ایلس ایلس کہہ کر اس سے معافی مانگتے تھے۔ وہ گھنٹوں اس کی قبر کے پاس گھٹنوں کے بل چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ کالج غیر معینہ مدت کے لیے بند ہو جانے کی وجہ سے چھوٹے رائے گھر آئے تھے، کئی دنوں تک وہ گم صم بنے رہے۔ ان کی ہنسی غائب ہو گئی تھی۔ وہ گھر میں چپ چاپ پڑے رہتے تھے۔ چاچی کے من میں کو طرح طرح کی باتیں اٹھتی تھیں وہ بار بار پوچھتی تھیں۔ آپ کو کیا ہو گیا؟ ان سے کچھ کہتے نہیں بنتا تھا۔ کیا کہیں؟ ان لوگوں کے لیے ڈانل صاحب نے خطرہ مول لیا تھا۔ اس کے بارے میں

لب کشائی کر کے وہ وعدہ خلافی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آنکھوں کے سامنے وہ خوبصورت ایلس گھوم جاتی تھی جس کی ایک چیخ نکلی تھی اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ دراصل وہ تین لڑکوں نے اسے کار سے باہر کھینچنا چاہا تھا۔ یہ بات ڈائل سے کسی نے نہیں بتائی۔ لیکن اس کا کار سے باہر نکلا ہاتھ اور اس پر خراشوں کے نشان دیکھ کر وہ سمجھ گئے تھے۔ پھر انھیں اپنے پرنسپل کی ڈبڈبائی آنکھیں نظر آنے لگی تھیں۔ تابوت کو زمین میں اتارتے ہوئے وہ دونوں بچوں کی طرح بلک پڑے تھے۔

ایلس کے غائب ہو جانے کی خبر اخباروں میں آچکی تھی۔ چاروں طرف سے اس واقعہ کی مذمت کی جا رہی تھی۔ ڈائل صاحب کا کسی طرح کا نہ کوئی بیان آیا تھا اور نہ ان کے نام کا کسی اخبار میں ذکر ہی تھا۔ انگریز چڑ گئے تھے۔ موقع ملتے ہی ہندوستانیوں سے بدلہ لینے کی کوشش میں تھے۔ کئی جگہ گھروں میں گھس کر بہو بیٹیوں کو بھی تنگ کیا تھا۔ لوگ چھوٹے رائے سے بھی پوچھتے تھے ـــــ کیا یہ بات صحیح ہے؟ وہ چپ رہتے تھے۔ پوری کوشش کے باوجود پولس کو ایلس کو آخر تک سراغ نہیں ملا۔

منجھلی چاچی کو دیکھ کر میم نے یہ ہی بتایا تھا کہ ان میں کوئی کمی نہیں۔ انھوں نے منجھلے رائے کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا معائنہ کرائیں مرد یہ مان کر چلتے ہیں کہ ان میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ تب تو خاص طور سے ایسا ہی ہوتا تھا۔ منجھلے رائے میم کی اس بات سے بہت ناراض ہو گئے تھے۔ یہ ہی نہیں انھیں میم کی بے شرمی پر بہت تعجب ہوا تھا۔ اس نے عورت ہو کر یہ بات ان سے کہی کیسے؟ لیکن سن کو چپ چاپ چلے آئے۔ اگر انگریز نہ ہوتی تو اسے ضرور جلی کٹی سنا کر آتے بس وہ اتنا ہی کہہ سکے "میڈم یہ ہندوستان ہے، ولایت نہیں۔" جیسے ولایت میں مرد نامرد نہ ہوتے ہوں۔

اس کے بعد منجھلے رائے منجھلی چاچی سے کھنچے کھنچے رہنے لگے حتیٰ کہ انھوں نے ان سے بولنا تک بند کر دیا۔ کہاں تو منجھلی چاچی سے ملنے کے لیے کالج سے بھاگ بھاگ کر آتے تھے۔ وہیں وہ منجھلی چاچی سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ چاچی نے ان کے پاؤں تک پکڑے تھے۔ ان سے رو رو کر پوچھا تھا ـــــ میری خطا تو بتایئے، میں نے ایسا کون سا پاپ کیا، وہ کبھی ان کی

طرف سے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیتے تھے، کبھی دھکیل دیتے تھے اور ایک بار تو انھوں نے تھوک دیا تھا۔ ان کا کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھیں کہاں وہ اتنی خوبصورت تھیں کہ چہرہ چم چم کرتا تھا اور کہاں گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ دن بہ دن ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ کسی چھوڑی ہوئی کچی جھونپڑی کی منہدم ہوتی دیوار کی طرح کھڑی بھر تھیں۔ گھر میں بس چھوٹی چاچی تھیں جن سے وہ بات کرتی تھیں یا کر سکتی تھیں۔ چھوٹی چاچی کچھ پوچھتی تھیں تو وہ رونا شروع کر دیتی تھیں۔ ایک دن چھوٹی چاچی نے ان کا من بہلانے کے لیے کہا" دیدی آپ تو میم کے پاس ہو آئیں۔ ہمیں بھی تو بتاؤ میم کیسے دیکھتی ہے؟ میں بھی ان سے کہتی ہوں کہ مجھے بھی دکھلاؤ۔۔۔

وہ سراسیمہ سی ہو کر بولیں "نہ، ایسا مت کرنا۔۔۔ ندی میں ڈوب مرنا لیکن میم کے پاس نہ جانا۔ میم کا ہی تو کیا دھرا ہے۔ پتہ نہیں ان سے میم نے کیا کہہ دیا کہ سب کچھ الٹا ہو گیا۔ اگر جٹھانی جی ہو تیں تو۔۔۔ تو شاید یہ بری حالت نہ ہوتی۔ نہ کہتے بنتا ہے اور نہ چپ رہتے۔ جیٹھ جی بے چارے کیا کریں گے مجھے ہی لگی تھی کہ میم کو دکھلاؤ۔۔۔ اگر میم نے کہہ دیا کہ میں بانجھ ہوں تو دوسرا بیاہ کر لیں۔۔۔ میں اس کی خدمت کر لوں گی۔۔۔ سیدھے منہ بات تو کریں۔ ایک بار اتنا ہی پوچھ لیا کریں کہ مرتی ہے یا جیتی۔۔۔ مجھے جیتی جی تڑپا میں تو نہیں۔" پھر وہ بول نہ سکیں۔

منجھلی چاچی کی باتیں سن کر چھوٹی چاچی کو اپنی مصیبت یاد آ جاتی تھی۔ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو؟ سب ہی عورتیں قریب قریب ایک سی قسمت لکھوا کر آتی ہیں۔ بچے ہوئے تو شوہر کا سکھ نہیں دیکھا ___ شوہر کا سکھ ہوا تو کچھ اور ہو گیا۔ بڑی جٹھانی کے سب کچھ تھا ___ اولاد بھی ___ اتنے بڑے شوہر تھے لیکن شوہر سے اس طرح ڈرتی رہیں جیسے گائے قصائی سے ڈرتی ہے۔ اتنے نوکروں چاکروں کے ہوتے ہوئے رات بے رات چولہا پھونکتے پھونکتے آنکھیں گنوا دیں ___ پھر ہاتھ پسارے چلی گئیں۔ لیکن پھر بھی انھیں لگتا چاہے اولاد ہو یا نہ ہو، چھوٹے رائے ایسا نہیں کریں گے۔ انھوں نے تو ویسے بھی من سے ارن کو اپنا بیٹا مانا ہوا ہے ___ کوئی مانے یا جنے کیا فرق پڑتا ہے۔ جنے کو ماننے میں کوئی تذبذب نہیں

ہوتا ـــ ماں کو ماننے میں پہاڑ اٹھانے پڑتے ہیں۔ لیکن منجھلے رائے کا وہ حسین آپ تو ٹھنڈی پڑ جاتیں۔ جو بیوی کے حسن پہ اپنی جان قربان کرتے تھے، وہی اب اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ آدمی کا من بدلتے دیر تھوڑے ہی لگتی ہے۔۔۔ بہانہ چاہیے۔

چھوٹی چاچی سے ڈرتے ڈرتے منجھلی چاچی کا حال بتایا۔ بتانے سے پہلے وہ کئی بار سوچ چکی تھیں ـــ پتہ نہیں وہ کیا سوچیں، کیا سمجھیں؟ لیکن بعد میں من پکا کر کے انھوں نے کہہ ڈالا ـــ منجھلی جٹھانی سے منجھلے جیٹھ بات تک نہیں کرتے۔ جب سے میم کو دکھا کر لائے ہیں تب سے ان کا دل منجھلی جٹھانی کی طرف سے بدل گیا۔ انھوں نے اپنے کو بہت روکا لیکن ان کے اندر منڈلاتا گھمنڈلاتا سوال باہر آ گیا ـــ کہیں آپ کا دل بھی میری طرف سے اسی طرح تو نہیں بدل جائے گا ـــ؟ چھوٹے رائے نے پیار سے دیکھا ـــ تم پاگل ہو گئی ہو؟"

"میں بھی تو اولاد سے محروم ہوں۔"

"تم ایسا کیوں کہتی ہو۔۔۔ اولاد ہے، بھاسکر ہے" پھر ہنس کر بولے "میں ہوں۔۔۔ شوہر بھی ایک نقطے پر پہنچ کر بیٹا ہو جاتا ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔" وہ شرمائی۔ پھر بولی "وہ تو تمھارے بیٹے ہیں ہی۔۔۔ لیکن کبھی کبھی ڈر لگتا ہے!"

"کاہے کا ڈر۔۔۔ تم سمجھتی ہو میں بدل جاؤں گا؟ اگر تم نے بچہ پیدا کر دیئے اور وہ نہ رہے۔"

اس جملے سے وہ یکایک کانپ سی گئیں جیسے بہت بڑی بد شگونی ہو گئی ہو۔ پھر اپنے آپ ہی سنبھل کر بولیں "عورت کا دل ماں کا ہی ہوتا ہے۔۔۔ وہ کسی کو اپنا بنائے بغیر بچے ہوں یا نہ ہوں، رہ نہیں سکتی۔ سب کی خیر مانگتی رہتی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی تھی۔ میں دوسری بات کہہ رہی تھی ـــ ہاتھی ڈولے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں (نام)!"

چھوٹے رائے خاموش ہو کر انھیں دیکھنے لگے۔ پھر ہنس کر پوچھا ـــ "کیا تم عورتوں کے لیے اپنی کوکھ سے پیدا بچہ ہی بچہ ہوتا ہے، دوسرے کی کوکھ سے پیدا بچے کا تمھاری گود میں کوئی مقام نہیں؟"

"ہے کیوں نہیں۔۔۔ پہلے عورت اپنے بچے کی ماں بنتی ہے پھر دنیا کی۔ جو پیدا کر کے اپنی عمارت کھڑی کرتی ہے، وہی اس کی اپنی تعمیر ہوتی ہے ـــــ اگر نہیں ہوتی تو۔۔۔ اس کے پاس دوسروں کی تخلیق کو اپنامان کر دل بہلانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہتا۔!"

"لگتا ہے تم ہر وقت اسی بارے میں سوچتی رہتی ہو؟ تمھیں کالی میم کے یہاں لے کر چلنا ہی ہوگا؟"

"کالی میم!" منجھلی چاچی کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔

"ہاں، کیوں؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟"

کیوں کیا لوگوں کے ہاں بچے نہیں ہوتے؟ کیا انھیں ڈاکٹر یا دائی کو دکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی؟"

"اگر میم نے منع کر دیا تو کیا تم منہ پھیر لو گے؟"

"نہیں تم ہی ضد کر رہی ہو۔ میں تو تمھیں چاہتا ہوں ـــــ بڑے بھائی کے بچے ہمارے ہی ہیں ـــــ زیادہ ہوگا ان کو گود لے لیں گے۔"

دو ست ہو گئیں ـــــ "جیسی تمھاری مرضی!"

پھر رک کر کہا "میں نے سنا ہے کالی میم تو بھوتنیوں کی ڈاکٹر ہے جس کے چاہتی ہے بچہ الا کر لٹا دیتی ہے، جس کے نہیں چاہتی ہے اس کا ہوا ہوا بچہ اڑا کر نپوتی (اولاد سے محروم) بنا دیتی ہے۔

چھوٹے رائے زور سے ہنسے ـــــ پھر تو وہ ہیڈمبا (بھیم کے ہاتھوں ماری گئی راکششی) ہو گئی۔

کالی میم کے بارے میں کئی قصے مشہور تھے۔ ایک قصہ تو بچہ بچہ جانتا تھا۔ ایک رات دو تین انگریز موٹر لے کر آئے۔ موٹریں تب چلی ہی تھیں۔ لاکھوں میں کسی ایک کے پاس ہوتی تھی۔ اس میں ٹرام والی گھنٹی لگی ہوتی تھی جو تار کھینچنے پر ٹرن ٹرن بولتی تھیں۔ انھوں نے کالی میم کے گھر کے آگے وہی ٹرن ٹرن والی گھنٹی کا ہارن بجایا۔ موٹر گاڑی دیکھ کر لوگ ہوش و

تو اسی چھوڑ دیتے تھے۔ ڈر کے مارے گھروں میں گھس جاتے تھے۔ پتہ نہیں یہ کیا بلا ہے جو بغیر ہاتھی گھوڑا اور آدمی کے چلتی ہے۔ یا چھپ کر دیکھنے لگتے تھے کہیں وہ انھیں دیکھ نہ لے۔ ان انگریزوں نے کالی میم سے کہا "چل کر میم کے بچہ پیدا کرا دو۔" اس زمانے کا ماحول پوری طرح نڈر تھا۔ وہ کار میں بیٹھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر کالی میم کو بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ گاڑی چل رہی ہے۔ اسے لگ رہا تھا ویسی کی ویسی ہی کھڑی ہے۔ وہ گورے بھی چپ چاپ سیدھے بیٹھے تھے۔ بس ایک آدمی کے ہاتھ ہینڈل پہ گھوم رہے تھے۔ وہ گھنٹی والا ہارن بھی بیچ بیچ میں بج جاتا تھا۔ کالی میم نے جھانک کر دیکھا تو اسے نظر آیا کار کھڑی ہے اور سڑک چکی کے پاٹ کی طرح گھوم رہی ہے۔ اسے ڈر تو بہت لگا لیکن وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ گاڑی ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ وہ ایک کھنڈر تھا —— ایک ٹوٹا پھوٹا بنگلہ۔ اسے ڈر بھی لگا لیکن ان گوروں نے اس کا بکس اٹھایا اور آگے آگے چل دیے۔ انھیں چلتے دیکھ کر بھی اسے لگا کہ وہ چل نہیں رہے ہیں، اڑ رہے ہیں۔ وہ اور بھی خوفزدہ ہو گئی لیکن ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اندر ایک عورت درد سے تڑپ رہی تھی۔ اس نے اس کی ڈلیوری کرائی۔ بچہ عجیب سا تھا۔ آنکھیں اور منہ کھلا تھا۔ کچھ ہی دیر میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ نظر آنے لگے۔ پھر دانت نکل آئے۔ تھوڑی دیر بعد بچہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عورت بھی اٹھ بیٹھی۔ وہ ایسی نظر آ رہی تھی جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ جلدی جلدی کام ختم کر کے باہر آئی۔ انھوں نے اسے ایک ٹوکری دی اور اسے سنائی دیا کہ ان میں سے کوئی کہہ رہا ہے کہ دائی کو چھوڑ آؤ۔ پھر اسی آواز نے اس سے کہا —— سیدھے جانا، مڑ کر مت دیکھنا —— اگر دیکھا تو اس ٹوکری کی ساری اشرفیاں کوئلہ بن جائیں گی!"

اس نے چپکے سے دیکھا۔ واقعی وہ ٹوکری اشرفیوں سے بھری تھی۔ وہ مشکل سے اسے اٹھا کر لے چل رہی تھی۔ اسے پہلے تو بوجھ معلوم ہوا پھر لگا کہ جیسے اس ٹوکری کو کسی نے ہوا میں ہی تھام لیا ہے۔ اسے لگا کہ کہیں کوئی اس کا محتانہ لے کر چلتا نہ بنے۔ اب تھکان بھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسے محسوس ہوتا کہ وہ جنگل میں اکیلے چل رہی ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ گھوم کر دیکھے۔ پھر سوچتی کہیں اس کی اشرفیاں کوئلہ نہ ہو جائیں۔ کبھی اسے اس عجیب و غریب بچے کا خیال آ جاتا۔ وہ اب تک ضرور مر گیا ہوگا۔ ایسے بچے زیادہ نہیں جیتے۔ وہ چل بھی رہی تھی اور ڈر بھی رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسے کسی بچے کے کلمک کر

دوڑنے کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن اپنے گھر کے باہر پہنچ کر اس نے سوچا کہ اب تو گھر میں پہنچ ہی گئی ہوں، اب میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے ـــــ ذرا مڑ کر تو دیکھوں اس نے مڑ کر دیکھا تو وہی عورت اور وہی بچہ اس کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ بچہ بڑھ کر پورا آدمی ہو گیا تھا جیسے ہی اس نے دیکھا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی ـــــ ٹوکری ہاتھ سے چھوٹ گئی ـــــ اشرفیاں کوئلہ ہو گئی تھیں۔

اگلے دن جب لوگوں نے وہاں جا کر دیکھا جہاں کالی میم لے جائی گئی تھی تو وہاں نہ کھنڈر تھے اور نہ کوئی شکستہ بنگلہ۔ چند نیم عریاں درخت تھے اور ایک نالہ تھا۔

چھوٹے رائے نے اس قصے کو کبھی سچا نہیں مانا۔ وہ اسے ہمیشہ من گھڑنت کہتے رہے۔ اس طرح کی باتوں کے سبب لوگ انھیں دہریہ ماننے لگے تھے۔ لوگ انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ بھوت پریتوں کے بھی ہمارے آپ کے جیسے ہی گھر ہوتے ہیں، خاندان ہوتا ہے، وہ بھی ہماری طرح خاندان بناتے ہیں ـــــ ان کے یہاں بھی بچے پیدا ہوتے ہیں ـــــ جوتنیاں زچگی بھی کراتی ہیں۔ چھوٹے رائے کو ان کی باتوں پر اور بھی مزہ آتا تھا۔ وہ پوچھتے ـــــ پھر تو ان کی مردم شماری بھی ہوتی ہوگی۔ ظاہر ہے یہ ہم لوگوں سے زیادہ ہوں گے۔ لاکھوں برسوں سے آدمی کا بھوت بنتا چلا آرہا ہے ہو سکتا ہے کچھ دنوں میں ہم رہیں ہی نہیں، وہی سب جگہ چھا جائیں۔''

لوگ ان کے اس طرح کے دلائل کے جواب نہ دے پاتے لیکن یہ مان لیتے کہ چھوٹے رائے کو دھرم میں وشواس نہیں رہا۔ چھوٹے رائے کی سمجھ میں یہ کبھی نہ آتا کہ بھوت پریت کا دھرم سے کیا واسطہ؟ کالا سائیس سیانا یعنی اوجھا بھی تھا، وہ جھاڑ پھونک بھی کرتا تھا اور بھوت پریت کو بھی مانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جیسے کسی محلے میں یا بڑے کے پاس محلے کے بچے کھیلتے رہتے ہیں اسی طرح اس کے پاس بھی بھوت پریت کھیلنے آتے ہیں۔ جب وہ اس کے پاس کھیلتے ہوتے تھے تو وہ کسی کو اپنے پاس نہ آنے دیتا تھا۔ وہ گھوڑوں کی پچھاڑی باندھنے کی رسی بانٹتا رہتا تھا اور ان سے گپ مارتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بانس کی پھچیوں کے پنجرے بناتا تھا اور ان سے کچھ کچھ پوچھتا رہتا۔ تم نے کھانا کھایا؟ اب تم کہاں جاؤ گے؟ کہاں

سے آئے ہو؟ تمھارے کتنے بال بچے ہیں؟ جواب وہی سن پاتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ شیطانی کرتے تو کہتے تمھیں باندھ کر بٹھا دوں گا۔ جب کوئی نہیں مانتا تو پنجرے میں بند کر کے کھونٹی پر ٹانگ دیتا۔ رات بھر ہنکارتا رہتا۔ اگلے دن جب معافی مانگتا تو چھوڑ دیتا۔ اس نے منجھلی اور چھوٹی چاچیوں کی برسوں تک جھاڑ پھونک کی تھی۔ چھوٹی چاچی تو ایک بار امید سے ہوئی تھی لیکن چند ماہ بعد اسقاط ہو گیا۔ چھوٹی چاچی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھیں کہ حمل کی بات درست تھی اس نے ضرور کوئی الا بلا ان کے رحم میں داخل کر دی تھی۔ گرفت ڈھیلی ہوتے ہی بھاگ نکلی۔ ورنہ ایسا پھر نہ ہوا کہ ان کا پیٹ گر جاتا۔

چھوٹے راے ان کی ان باتوں سے پریشان ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کہیں بھوت پریتوں کی بات کرتے کرتے ہم لوگ بھی بھوت پریت نہ ہو جائیں۔ چھوٹی چاچی ان کی ان باتوں سے بہت دکھی ہوتی تھیں۔ اگر اس طرح ہم ان کی بے عزتی کریں گے تو وہ بھی ہم لوگوں کو معاف نہیں کریں گے۔ وہ جھٹ کہہ دیتے تھے ـــــ نہ کریں نہ کریں گے تو۔

چھوٹے راے ڈپٹ دیتے تھے۔ ان بے سرو پا باتوں کی ہی وجہ سے تمھاری جہالت تمھیں بے چین رکھتی ہے۔

چھوٹی چاچی منجھلی چاچی والے واقعے سے اتنی ڈر گئیں کہ کالی میم کو دکھانے نہیں گئیں۔ چھوٹے راے جھاڑ پھونک اور سیانپن کو تیار نہیں ہوئے۔

منجھلے راے کی زندگی میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اب زیادہ تر میرٹھ میں ہی رہنے لگے تھے۔ پڑھنے لکھنے میں ان کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان کے گھر میں بچہ ہونا مشکل ہے۔ میم نے جھوٹ بولا ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے منجھلی چاچی نے اسے چپ چاپ کچھ دے دیا ہو۔ انھیں اس بات کا کوئی خاص ملال نہیں تھا۔ دکھ اس بات کا تھا جو میم نے اس سے کہی تھی۔ انھوں نے میم کی بات کو چیلنج کے طور پر قبول کر لیا تھا دوسری شادی کروں گا اور بچے پیدا کر کے دکھاؤں گا۔ تب پوچھوں گا اب بتا کہ میں مرد ہوں یا نہیں؟ رہے گی میرے ساتھ؟ وہ الل ٹپ سوچنا شروع کر دیتے تھے۔ جیسے واقعی اس سے جا کر کہہ دیں گے۔

دوسری شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ بڑے رائے تھے۔ یہ کوشش ان سے کیسے پوشیدہ رکھی جائے؟ پتہ نہیں مجھیں گے بھی یا نہیں؟ ایک تو ان کے بچے، دوسرے انھوں نے بھابھی کے مرنے کے بعد بھی شادی نہیں کی۔ اس سب کے باوجود منجھلے رائے نے اپنی شادی کا جگاڑ بنانا شروع کر دیا۔ انھیں ذات برادری کا بھی کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ وہ یہ سارے کام خاموشی سے کر رہے تھے۔ چھوٹے رائے کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ منجھلے رائے اور چھوٹے رائے کے کئی دوست مشترک تھے۔ اس لیے چھنتی چھناتی ان تک پہنچ جاتی تھی۔ چھوٹے رائے کے سامنے بھی یہ ہی الجھن تھی کہ منجھلے بھائی کے خلاف یہ بات بڑے بھائی سے کیسے کہیں؟ وہ جانتے تھے کہ منجھلے رائے بہت جلدی توازن گم کر بیٹھتے ہیں۔

ایک دن رات کو جب دونوں بستر میں لیٹ گئے۔ لیمپوں کی بتیاں گل کر دیں صرف ایک لیمپ مدھم سا جلتا رہ گیا تو چھوٹے رائے نے پوچھا ــــ "منجھلے بھیا، آج کل آپ گھر پر بہت کم آتے ہیں ــــ کہیں آپ میں اور بھابی میں کہا سنی تو نہیں ہو گئی؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" منجھلے رائے اچکے۔

"میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا ــــ اس بار منجھلی چاچی کافی کمزور لگیں۔ تو خواہ مخواہ پریشان ہے۔"

"خیر تم میرے بھائی ہو، وہ میری بھابی ہیں۔"

"رشتہ اس سے ہوتا ہے جو خاندان کو آگے لے جانے میں مدد کرتا ہے ــــ جو اسے ایک جگہ منجمد کرے اس سے کیا رشتہ؟"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟"

"ڈاکٹر نے!"

"کس ڈاکٹر نے؟"

"تجھے مطلب؟"

چھوٹے رائے برجستہ کچھ نہیں بولے۔ کچھ سوچ کر کہا ــــ "بھیا، مطلب تو سب کا سب سے ہے۔ بغیر مطلب رکھے نہ کوئی جی سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہے! ویسے ہم لوگ

عورتوں کو ہی مورد الزام ٹھہراتے آئے ہیں۔ کمی تو کہیں بھی ہو سکتی ہے۔

منجھلے رائے لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے۔ انھوں نے مدھم کیا ہوا سرہانے رکھا لیمپ تیز کر دیا۔ وہ دھواں دینے لگا۔ چھوٹے رائے ہاتھ بڑھا کر اسے کم کیا۔ منجھلے رائے گرجتے ہوئے بولے ''تمھاری ہمت کیسے ہوئی میرے سامنے یہ سب باتیں کہنے کی۔ بتاؤ، مجھ میں کیا کمی ہے۔'' انھوں نے تہمد اتار کر پھینک دیا۔

چھوٹے رائے نے انھیں پکڑ کر بٹھایا۔ اس نے معافی مانگی اور بولے ''میری منشا آپ کے دل کو چوٹ پہنچانے کی قطعی نہ تھی۔ پوول پرائس بتا رہے تھے کہ ولایت میں اس طرح کے ڈاکٹر ہیں جو ازدواجی تعلقات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور مشورہ بھی دیتے ہیں۔ کئی بار نفسیاتی اسباب سے مردوں میں کمزوری آجاتی ہے۔ ہمیشہ عورتوں کا قصور نہیں ہوتا۔ تھوڑے بہت علاج سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''تم کیوں نہیں کرا لیتے وہ۔۔۔ تھوڑا بہت علاج!''

چھوٹے رائے آگے نہیں بولے۔ وہ شادی والی بات ٹال گئے حالانکہ انھیں پتہ چل گیا تھا کہ منجھلے رائے اپنی شادی کی بات قریب قریب طے کر چکے ہیں۔ اس بات پر انھیں غصہ بھی تھا۔ پھر بھی انھوں نے کہا ''جہاں تک میری بات ہے، میں تو آپ کے پیچھے ہوں'' اور ہنس دیے۔ چھوٹے رائے نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ مدھم کر دیا اور لیٹ گئے۔ منجھلے رائے بیٹھے رہے۔ ان کی سانس کی آواز ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ کہیں سے دوڑ لگا کر آئے ہوں۔

کچھ دن کا وقفہ دے کر چھوٹے رائے نے منجھلے رائے کو پھر پکڑا ''میں نے سنا ہے کہ آپ دوسری شادی کرنے کی سوچ رہے ہیں؟''

''تم سے کس نے کہا؟''

''کسی نے بھی کہا ہو لیکن بھابھی کے ہوتے ہوئے ایسا کرنا مناسب نہیں۔ ہمارے خاندان میں کسی نے نہیں کیا۔''

''مان لو کہ میں کر بھی رہا ہوں تو کسی کا کیا جاتا ہے؟''

"جاتا کسی کا نہیں؟ جس بیوی کے لیے روز دوڑ دوڑ کر گھر جاتے تھے ـــــ وہ اب آپ کے لیے کچھ نہیں رہی۔ آپ اس وقت دوسرے نمبر کے رائے ہیں، خاندان کی عزت ہیں۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"اگر شادی ذاتی معاملہ ہوتی تو ایسے موقعوں پر اتنے لوگ جمع کرنے کا رواج نہ بنا ہوتا۔ جتنا وہ شخصی تعلق ہے اس سے زیادہ سماجی فرض بھی ہے۔ یہ معاملہ بھلے ہی آپ کا ذاتی ہو لیکن اس سب سے ہم سب بھی اتنے ہی وابستہ ہیں جتنے آپ خود اس سے وابستہ ہیں۔ خاص طور سے منجھلی بھابی۔۔۔"

"کیا میں اس کے لیے جان دے دوں؟"

اگر آپ ان کے لیے جان نہیں دے سکتے تو آخر ان کی جان کیوں لینا چاہتے ہیں؟"

"تم مجھ سے بحث کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

"میں بھلے کوئی نہ ہوؤں ـــــ لیکن بڑے بھیا کے بارے میں سوچیے، آپ نے ان سے بات کی؟ انھوں نے ہمیں باپ کی طرح پالا ہے۔ جب سب سے بڑے رائے مرے تو ہم چھوٹے چھوٹے تھے، وہ چاہتے تو ہمیں کٹوا کر زمین میں دبوا دیتے!"

"جب دبوا دیتے تب دیکھا جاتا۔ ابھی تو ہم زندہ ہیں ـــــ ہم زندہ رہے ہمارا اپنا حق ہے۔ جب بڑی بھابی مریں تو کیا بڑے بھیا نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی شادی رچالیں؟"

"منجھلی بھابی تو ابھی زندہ ہیں۔"

"میری طرف سے مر چکیں ـــــ اب میرے اور خاندان کے زندہ رہنے کا سوال ہے۔ بڑے رائے نے بھی بڑی بھابی کے مرنے کے بعد یہی سوچا اور کہا تھا۔"

"انھیں بھی آپ کے سالے نے بہکا دیا تھا۔ لڑکی بھی طے کر دی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ واویلا آپ نے ہی مچایا تھا۔ ہم دونوں نے مل ہی طے کیا تھا کہ منجھلی بھابی اور میری بیوی بڑے بھیا سے جا کر کہیں کہ آپ شادی کریں گے تو گھر برباد ہو جائے گا۔ دونوں نے کواڑ کے پیچھے کھڑے ہو کر بڑے بھیا کو رانی سے بلوایا تھا ـــــ ان کی بات سن کر بڑے بھیا گردن نیچی کر کے کھڑے ہو گئے تھے ـــــ تم دونوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ وہ تو

دکانے پر جٹ گئے تھے لیکن آپ تو جاگے ہوئے بھی نہیں جاگ رہے ہیں۔"

منجھلے رائے کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ چھوٹے رائے نے جان کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ کچھ دیر بعد بولے ــــ "میرا خاندان کون چلائے گا؟ میرے حصے کی جائیداد کا وارث کون ہوگا؟"

"آدمی کا ایک ہی خاندان ہوتا ہے ـــ انسانی خاندان۔ اس کا وارث ہر وہ انسان ہے جو اس دھرتی پر رہ کر ایمانداری کی زندگی جیتا ہے۔"

"تم ہوائی باتیں کر رہے ہو۔"

"تو کیا تم جائیداد ہو جاؤ گے؟"

"تم بھی وہی کروگے، جیسے ابھی تم بڑی چوڑی باتیں کر رہے ہو۔ ہر انسان کو کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنا کرتہ ٹانگنے کے لیے اپنی ایک کھونٹی چاہیے۔ میں بھیا کے بچوں کے کھانے اڑانے کے لیے اپنی جائیداد چھوڑ کر نہیں مرنا چاہتا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھوگے بھی نہیں ــــ ان باتوں کو زمین پر رہ کر سمجھا جا سکتا ہے آسمان پر اڑ کر نہیں۔ بڑے بھیا چاہتے ہیں کہ ساری جائیداد ایک جگہ رہے۔"

"منجھلے بھیا تمہیں کیا ہو گیا؟"

"ہمارے والد نے اپنے چھوٹے بھائی کی جائیداد نہیں ہتھیالی تھی! وہ سیدھے اور کمزور دماغ کے آدمی تھے۔ بچے ہوئے لیکن زندہ نہیں رہے۔ کیوں نہیں رہے یہ ایشور جانے، بس ایک بیٹی بچی تھی ــــ وہ نانی کے یہاں پیدا ہوئی اور نانی کے یہاں پلی۔ ان بے چاروں کو پاگل قرار دے دیا گیا۔ ان کی ساری جائیداد کے مالک اب ہم لوگ ہیں۔ کیا ہم اپنی اس تاریخ کو نظر انداز کر دیں ــــ کیا اسے پھر سے نہیں دہرایا جا سکتا؟"

"تو آپ اس حالت کو پہنچ چکے ہیں؟ ـــ آپ بڑے بھیا کے بارے میں اتنا گر کر سوچ سکتے ہیں؟"

"گھبراؤ نہیں، تم بھی سوچوگے۔ نہیں سوچوگے تو ان ہی میں کھو جاؤ گے۔"

چھوٹے رائے کے پاس منجھلے رائے کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آ رہی تھی کہ منجھلے بھائی کا یہ میلا دل کیسے بدلیں!

چھوٹے رائے، منجھلے رائے سے اسی طرح کبھی الجھتے رہتے تھے لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ان کا رخ منجھلی بھابی کی طرف سے بدتر ہوتا جارہا تھا، حتیٰ کہ وہ کھانا لگا کر لاتی تھیں تو منجھلے رائے تھالی اٹھا کر پھینک دیا کرتے تھے۔ اس لیے وہ کھانا رانی سے بھجواتی تھیں۔ رانی کو ان کو بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ ایک دن جب منجھلے رائے کھانا کھا کر اٹھے تو منجھلی چاچی نے ان کے پاؤں پکڑ لیے ـــــ "مجھے بتائیے کہ میں کہاں جاؤں، کیا کروں؟ میں تو یہاں آپکے سہارے آئی تھی ـــــ آپ ہی منہ پھیر لیں گے تو میں کہاں جاؤں گی؟ میرا کون بیٹھا ہے۔ دریا میں بہتے تنکے کو بھی آسرا ہوتا ہے کہ کبھی تو کنارے لگے گا ـــــ لیکن میرا تو کبھی سہارا نہیں بچا۔ مجھ سے نفرت نہ کیجئے ـــــ مجھے مار ڈالیے ـــــ اپ کی نفرت مجھے جلائے ڈال رہی ہے اور میری محبت بھی مجھے کھائے جارہی ہے۔"

"مجھے بچہ چاہیے!"

"آپ مجھ سے اتنی نفرت کریں گے تو بچہ کہاں سے آئے گا؟ بچے تو میاں بیوی کی محبت سے پیدا ہوتے ہیں۔"

وہ زور سے ہنسے "تم اتنی عقلمند کب سے ہو گئیں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں تم پر محبت کی ندیاں بھی انڈیل دوں تو تم بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔"

"نہیں میں جن سکتی ہوں ـــــ مجھ پر الزام نہ لگائیے۔"

"اصلی باپ کی ہو تو جن کر دکھاؤ۔"

"تمھارے بغیر؟"

"ہاں، ہاں، میرے بغیر۔"

منجھلی چاچی کانپ گئیں۔ خون جیسے ٹھنڈا پڑتے پڑتے پیروں میں اکٹھا ہو کر جم گیا۔ انھوں نے ایک ہی بات کہی ـــــ "یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ شوہر ہو کر عصمت و عفت کا دامن داغدار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں!"

"ہاں میں دیکھوں گا کہ وہ میم جس کا تم نے پیٹ بھرا ہے ـــــ تب کیا کہے گی جب عصمت و عفت گنوا کر بھی بچہ پیدا نہ کر سکو گی؟"

منجھلے رائے انھیں پیر سے ایک طرف ہٹا کر چلے گئے۔ منجھلی چاچی کئی دن تک لگاتار روتی رہیں۔ بعد میں انھوں نے رونا بند کر دیا۔ دھیرے دھیرے وہ پتھر ہونے لگیں۔

چھوٹی چاچی نے انھیں بہت سمجھایا لیکن ان پر کسی طرح کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ منجھلی چاچی کی آنکھوں میں نہ کوئی جذبہ تھا اور نہ منہ میں بول۔

اس سال منجھلے رائے فیل ہو گئے۔ وہ چھوٹے رائے سے ایک سال آگے تھے۔ منجھلے رائے نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ بڑے رائے نے بہت سمجھایا کہ بارھویں پاس کر لو لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس زمانے میں اتر پردیش کا نام متحدہ صوبہ آگرہ و اودھ تھا۔

صوبے کے ہوم سکریٹری مسٹر مر ے بڑے رائے کے دوستوں میں تھے۔ انھوں نے انھیں خط لکھ کر منجھلے رائے کو نائب تحصیلداری کے لیے نامزد کر دیا۔ اس زمانے میں بڑے زمینداروں کے بچے مختلف عہدوں پر نامزد ہو جاتے تھے۔ اگر بی اے پاس ہوتے تو ڈپٹی کلکٹر میں نامزد ہو گئے ہوتے۔

منجھلے رائے جب نوکری پر گئے تو منجھلی چاچی کو حویلی پر ہی چھوڑ گئے بلکہ ان سے ملے تک نہیں۔ منجھلی چاچی نے سنگیت سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک استاد آتے تھے اور پردے کے پیچھے سے سکھاتے تھے۔ بزرگ ہوتے تو شاید پردے کی ضرورت بھی نہ پڑی ہوتی حالانکہ یہ تعجب کی بات تھی کہ بڑے رائے نے کسی مرد کو زنانخانے میں جا کر گھر کی بہو کو سنگیت سکھانے کے لیے اجازت دے دی تھی۔ ہو سکتا ہے اس میں کہیں نہ کہیں چھوٹے رائے کا بھی ہاتھ رہا ہو لیکن منجھلی چاچی اندر ہی اندر بیمار ہوتی جا رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے وہ کھاٹ سے لگ گئیں۔ وہ لیٹے لیٹے بڑبڑانے لگتی تھیں ـــــ میرا بچہ ـــــ ! منجھلے رائے کو خبر بھیجی گئی تو وہ ملے تک نہیں۔ آدمی بھیجا گیا۔ تب بھی وہ نہیں آئے۔ تب چھوٹے رائے نے پورا قصہ بڑے رائے کو سنایا۔ وہ سن رہ گئے۔ گھر میں اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے پتہ تک نہیں چلا! اس دن پہلی بار اس کے منہ پر میری ماں کا نام آیا ـــــ اگر تمھاری بھابی ہوتی تو کیا مجھے پتہ نہ چلتا۔ میں اجنبی کی طرح رہتا رہا اور یہ سب ہو گیا! میرے بھائی کی بہو میری ہی حویلی میں اتنی تکلیف میں مبتلا رہی۔۔۔!

وہ منجھلی بہو کے حصے میں گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر بولے "بہو تم یہ سب جھیلتی رہیں اور مجھے بتایا تک نہیں؟ تم نے میرے منہ پر کالک پوت دی۔ میں جانتا ہوں کہ

کرشن بہت ضدی ہے۔ لیکن ایسی بھی کیا ضد کہ اپنی شریک حیات کو بھلا بیٹھا ــــ میں خود جا کر اسے لے کر آتا ہوں۔" منجھلی بہو نے منع کر دیا۔ "نہیں، اب تو کھیل ختم ہو چکا ــــ میرے جانے کا وقت نزدیک ہے۔ آپ میرے والد جیسے ہیں۔ بس، میں ایک ہی بات کہنا چاہتی ہوں کہ میرے اندر کوئی کمی نہیں ــــ میں ماں بن سکتی ہوں ــــ ہر عورت اپنی خوبیاں اور خامیاں سمجھ سکتی ہے۔ آپ کے بھائی نے مجھے وہ سمجھ کر چھوڑا جو میں نہیں ہوں" ــــ وہ بلک کر رو پڑی۔

چاچی چوتھے دن چلی گئیں۔ ان کا کریا کرم مجھے ہی کرنا پڑا۔ جب عورتیں انھیں نہلا رہی تھیں تو ان میں سے کسی نے چھوٹی چاچی کے کان میں کہا ــــ "لگتا ہے منجھلی بہو کو تیسرا مہینہ چڑھا تھا۔ چھوٹی چاچی سن رہ گئیں۔

منجھلے رائے ان کی موت پر نہیں آئے۔

اس واقعہ کے بعد سارا گھر جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ چھوٹی چاچی اکیلی پڑ گئی تھیں بس رانی کا ہی سہارا تھا پھر وہ ارن سے چپکی رہتی تھیں۔ سمجھ سب رہے تھے لیکن کہہ کوئی نہیں رہا تھا۔ چھوٹے رائے ابھی ایک سال اور باقی تھا۔ بڑے رائے اپنا زیادہ وقت کچہری کو ہی دیتے تھے۔ وہ ہر کیس کی چھان بین میں اتنا وقت صرف کرنے لگے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ اسسٹنٹ کلکٹر کے ناتے ان دنوں انھیں دیوانی کے مقدمے بھی کرنے پڑتے تھے۔

بڑے رائے کے سامنے ایک مقدمہ پیش تھا۔ ایک بڑے زمیندار نے چھوٹے کاشتکار کی زمین دبالی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ زمین کاشتکار کی ہے یا زمیندار کی۔ زمیندار نے کئی ایک گواہ پیش کیے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ زمیندار کے دخل میں ہے۔ ایک زمانے سے ان میں ان ہی کی کھیتی ہوتی ہے۔ کاشتکار کے پاس ایسا کوئی گواہ نہیں تھا۔ بڑے رائے حالانکہ خود زمیندار تھے لیکن انھیں زمینداروں کی گواہی قطعی اطمینان بخش معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ زمین زمیندار کی ہے اور کاشتکار اس پر اپنا دعویٰ پیش کرے یہ بات ان کے گلے سے نہیں اتر رہی تھی۔ قصائی کا کھیت بکرا چر جائے یہ کیسے ممکن ہے؟

پہلے تو بڑے رائے نے صلح کرنے کی کوشش کی۔ دونوں سے الگ الگ بات کی پھر پوچھا کہ آپ لوگ زمین کی ایسی نشانی بتا سکتے ہیں جو صرف آپ ہی جانتے ہوں۔

زمیندار نے تو زمینداری والی بات کہی" آپ تو خود بڑے زمیندار ہیں، زمین کی

بھی کوئی پہچان ہوتی ہے ـــــ زمین زمین سب ایک سی ـــــ اور پھر زمین کی اصل پہچان تو قبضہ ہوتا ہے ـــــ جس کا قبضہ اسی کی زمین۔"

کاشتکار نے بتایا ـــــ "حضور زمین تو سب زمیندار کی ہوگی ـــــ پٹواری بھی ملا ہے اور قانون کو بھی ـــــ کہتے ہیں کہ ان کا کاغذ ہی زمین کی پہچان ہے۔" پھر بولا "میرے کھیت کے دکھن کی کھونٹ میں ایک پتھر ہے جو میرے باپ نے اگایا تھا ـــــ اس کے نیچے ایک کنڈی گڑی ہے میرا باپ جمع پونجی اسی میں رکھتا تھا ـــــ انھیں کبھی دھوکا نہیں ہوا۔"

بڑے رائے نے دونوں کے بیان نوٹ کر لیے۔ کچھ دن کا وقفہ دے کر وہ گھوڑے پر چلے اور اکیلے گاؤں میں پہنچ گئے جہاں زمین تھی۔ پہلے تو گاؤں والوں سے پوچھتے پاچھتے رہے کہ کون سی زمین کس کی ہے ـــــ گاؤں والوں نے یہ سمجھے بغیر کہ وہ کون ہیں ساری باتیں سچ سچ بتادیں۔ اس دن تو وہ لوٹ گئے۔ پھر ایک اور دن وہ وہاں پہنچ گئے۔ گاؤں کے چار چھ معزز حضرات کو بلایا کھیت کی ناپ تول کرائی۔ پھر اسی طرف کی مٹی ہٹوائی جہاں کاشتکار نے پتھر گڑے ہونے کی بات کہی تھی۔ وہاں واقعی ایک پتھر گڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے وہی کنڈی تھی۔ اس کنڈی میں ایک سانپ بیٹھا تھا۔ گھوڑا پچھاڑ سانپ کی طرح وہ وہ تڑپ کر اچھلا اور کھائی میں چلا گیا۔ جب تک لوگ سنبھلیں اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

گاؤں والوں نے کہا "حضور یہ اسی کا باپ ہے۔ اس کھیت سے اسے بہت محبت تھی۔ یہ اس کی ملک تھی۔ اس میں وہ اپنا مال و متاع رکھتا تھا۔ بس، گھر بار چھوڑ کر رات دن اسی مچان پر پڑا رہتا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی وہ مرا ہے۔ وہی اس کھیت کی رکھوالی کرنے کے لیے سانپ بن کر اسی کنڈی میں بیٹھا رہتا ہے۔ زمیندار کے آدمیوں نے اس کھیت کو جوتنے کی کئی بار کوشش کی لیکن جب وہ آتے ہیں جگہ جگہ سانپ پھیل جاتے ہیں۔ کسی کو لگتا ہے کہ سانپ ہل سے لپٹا ہے، کسی کے پیروں میں بیل کی طرح لپٹ جاتا ہے، کوئی بیل کی پونچھ پر چڑھ آتا ہے۔ ہلواہوں نے آنا ہی بند کر دیا۔

بڑے رائے اس واقعہ کے کئی دن بعد تک کشمکش و پیچ میں پڑے رہے کہ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی کسان مرنے کے بعد سانپ بن جائے اور اپنے کھیتوں کی اس طرح حفاظت کرے،

اگر کل انگریز چلا جائے اور سوراجی آگئے تو کیا یہ زمیندار لوگ بھی سانپ بن کر اپنی اپنی زمینوں کے ارد گرد گھوما کریں گے؟ انھیں اپنی بات پر خود ہنسی بھی آئی۔

اس پوری بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے فیصلہ کاشتکار کے حق میں اور زمیندار کے خلاف دیا۔ ان کی دو دلیلیں تھیں۔ ایک یہ کہ کاشتکار کی کبھی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ زمیندار کی زمین پر دعویٰ پیش کرے۔ دوسری تھی کہ کاشتکار کی بتائی ہوئی شناخت اتنی ذاتی تھی کہ وہ اسی کو معلوم ہو سکتی تھی جو اسے جوتتا بوتا ہے یا اس کا اس سے قریبی تعلق ہے۔ زمیندار کے پاس ایسی کوئی شناخت نہیں تھی کہ زمین پر ان کا حق ثابت ہو۔

اس واقعہ کے ایک دن بعد کلب میں کلکٹر ڈک نے بڑے رائے سے ہنس کر کہا "مسٹر ہری رائے آپ زمیندار ہو کر زمینداروں کی حق تلفی کرتے ہیں؟"

بڑے رائے فوراً بولے "نہیں، مسٹر ڈک، زمینداروں کی حق تلفی نہیں، اپنے ایمان اور آپ کے انصاف کی حفاظت ضرور کرتا ہوں ـــــ اسے آپ حق تلفی کہنا چاہیں تو ضرور کہیں۔"

کلکٹر صاحب چپ رہ گئے۔

بڑے رائے کے دماغ میں ان سوالوں کے بارے میں کچھ الجھن سی رہنے لگی تھی۔ منجھلے رائے ان کے لیے باعثِ تشویش بنتے جا رہے تھے۔ منجھلی چاچی کی موت کو وہ اپنے اندر جذب نہیں کر پا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کرشن کیا چاہتا ہے؟ اس نے منجھلی بہو کے ساتھ اتنا وحشیانہ برتاؤ کیوں کیا؟ وہ اس سلسلے میں منجھلے رائے سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے من میں ایک ہی ہچک تھی کہ یا تو وہ پتھر بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور اگر زیادہ ہوا تو کوئی الٹی سیدھی بات کہہ کر رشتہ بگاڑ لیں گے۔ چھوٹے رائے بھی بات کرنے سے بچ رہے تھے۔ آخر بڑے رائے نے فیصلہ کیا کہ وہ اور چھوٹے رائے منجھلے رائے کے پاس جائیں اور پتہ لگا کر آئیں کہ ان کا منشا کیا ہے؟ حالانکہ چھوٹے رائے نے دبی زبان سے جواب دیا کہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن بڑے رائے نے ان کی اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ بولے "میں یہ نہیں چاہتا کہ بات چیت نہ ہونے سے کسی طرح کی غلط فہمی پیدا ہو۔ کرشن منجھلی بہو کے

مرنے پر بھی نہیں آیا؟ برادری اور سماج کے سامنے میری عزت پتلی ہو گئی۔ منجھلی بہو کے پیٹ کے بچے کا بھی اسے خیال نہیں آیا؟ کسی غیر کا تو بچہ نہیں تھا۔ ان دونوں کے درمیان کتنا پیار تھا ـــــ پیار بانٹنے میں بھرا پانی تو نہیں ہوتا کہ رات کو رکھا اور سویرے پھینک دیا۔ بھاسکر کی ماں ہمیشہ ان دونوں سے اسی بات کے بارے میں ٹھٹھولی کیا کرتی تھی ـــــ لیکن پتہ نہیں یہ قہر کیسے ٹوٹ پڑا!"

چھوٹے رائے نے پہلی بار منہ کھولا" بڑے بھیا، منجھلے بھیا پگلا گئے ہیں انھیں اپنی عزت کا خیال ہے اور نہ گھر کی عزت کا۔ وہ بھابی کو میرٹھ میں کسی میم کو دکھا کر لائے تھے ـــــ تب ہی سے بھابی کی طرف سے ان کا من بھر گیا تھا، وہ چاہتے تھے کہ منجھلی چاچی سے بچہ ہو جس سے ان کی نسل چلے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بھابی میں کمی ہے ـــــ وہ بچے کو جنم نہیں دے سکتیں۔ اپنی زندگی کے آخری سال منجھلی بھابی نے رو رو کر کاٹے لیکن انھوں نے ہی کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ کس اذیت سے گزر رہی ہیں۔"

"یہ بات تھی تو مجھ سے کیوں چھپائی گئی؟"

"آپ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے ان سے بات کی تھی۔ وہ دوسری شادی کر کے یہ بات ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کمی ان میں نہیں بھابی میں ہے لیکن بھابی نے ثابت کر دیا کہ کمی ان میں نہیں تھی۔ ایسے میں اگر آپ کچھ کہتے تو وہ یہی سمجھتے کہ آپ انھیں شادی کرنے سے اس لیے روک رہے ہیں کہ ان کا حصہ اپنے بچوں کے لیے مختص کرنا چاہتے ہیں۔"

بڑے رائے سن رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنے ہوش و حواس میں آئے تو دھیرے سے پوچھا "کیا کرشن نے میرے لیے ایسا کہا تھا ـــــ اور وہ بچہ؟"

چھوٹے رائے نے بات چیت کا موضوع بدل دیا۔ "نہیں پھر بھی ان کی سوچ کافی بگڑ گئی تھی۔"

بڑے رائے تڑپ اٹھے "میں ٹیلے پر بیٹھے گڈریے کی طرح یہی سوچتا رہا کہ سب بھیڑیں چر رہی ہیں اور محفوظ ہیں لیکن وہاں تو بھیڑیا گھسا ہوا تھا۔ دل میں گھسے چور سے زیادہ خطرناک بھیڑیا ہوتا ہے۔ پھر رک کر بولے "ایسا ہی تھا تو مجھ سے پوچھ لیتا۔ میں اسے اپنی مثال دے کر سمجھا دیتا کہ بیوی کے بغیر آدمی کتنا اندھا اور ادھورا ہوتا ہے۔ اس کی اندر کھلنے والی

آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔" وہ کچھ دیر اسی طرح چپ بیٹھے رہے۔ پھر بولے "تم دونوں چلے ہی جاؤ کر شن سے کہنا کہ تجھے بڑے بھیا نے بلایا ہے۔ نہیں جاؤ گے تو شاید پھر کبھی ان سے مل نہ سکو۔" بیچ کی بات انھوں نے بالکل گول کر دی اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

چھوٹے رائے فوراً بولے "ایسا کیوں کہتے ہیں؟"

جب کسی عمارت کی اینٹ کھلنی شروع ہو جاتی ہے تو اس کا بہت دن تک قائم رہنا مشکل ہوتا ہے۔ گھر، سماج، ملک سب عمارتیں ہی تو ہیں۔"

چھوٹے رائے نے آگے کچھ نہیں کہا۔

جب ہم پہنچے منجھلے رائے گھر پر نہیں تھے۔ نوکر چاکر تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمیں نہیں پہچانتا تھا۔ انھوں نے ہم دونوں کو باہر بٹھا دیا تھا۔ جب تک منجھلے رائے لوٹے ہم اپنا سامان رکھ کر برامدے میں ہی بیٹھے رہے۔ منجھلے رائے آئے اور ہمیں اس طرح مع سامان برامدے میں ہی بیٹھا دیکھ کر ملازمین پر بگڑنے لگے۔ چھوٹے رائے کو بیچ میں ہی بولنا پڑا کہ انھیں ہم نے ہی نہیں بتایا کہ ہم کون ہیں اور تحصیلدار صاحب سے کیا رشتہ ہے؟ حالانکہ ہم نے اتنا تو کچھ بتا ہی دیا تھا کہ ہم ان کے گھر سے آئے ہیں لیکن یہ تب بھی تھا اب بھی ہے کہ نوکر یہ مان کر چلتے ہیں کہ ان کا حاکم سچا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ جب وہ حاکم نہیں رہتا تو وہ بھی اوروں کی طرح ہو جاتا ہے۔ چھوٹے رائے کی بات سن کر ان ملازمین پر اچھا اثر پڑا۔ وہ حیرت سے دیکھنے لگے۔ منجھلے رائے ان کے سامنے ہی ڈانٹنے ہی لگے "تمھیں بتانا چاہیے تھا ـــــ میری کیا عزت رہ گئی ـــــ میں بڑے بھیا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میرا بھائی اور بھتیجہ چپراسیوں اور اہلکاروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہا۔"

چھوٹے رائے نے کہا "چلیے اندر چلیے، جو خاطر مدارات کرنی ہو وہ کر لیجیے یہاں کھڑے اسی طرح ڈانٹتے رہیں گے۔"

ان کی بات پر منجھلے رائے کو ہنسی آ گئی لیکن وہ ہنسے نہیں بلکہ ہلکا سا مسکرا دیے۔ ہم لوگوں کو اندر لے جایا گیا۔ ان کا وہ گھر تحصیل کے علاقے میں ہی تھا۔ پوری تحصیل لکھوری اینٹوں سے بنی تھی۔ جہاں جہاں سے چونا اتر گیا تھا۔ وہیں وہیں چھوٹی چھوٹی اینٹیں قرینے سے

چنی ہوئی نظر آتی تھیں۔ تحصیل کے سارے ملازمین تحصیل دار کی خدمت میں رہتے تھے۔ ان دنوں کے ابتدائی تحصیلدار تھے۔ خدمت تحصیلدار صاحب کی اور کام اپنا ویسے بھی تحصیلدار کے پاس چھوٹے سے لے کر اونچے سے اونچے افسر کے ذمہ ہوتا ہے۔ جہاں کسی کو بھی ضرورت ہے بس تحصیل میں کہلا دو۔ چاہے آدمی ہو سامان۔ پولس محکمے میں یہی کام تھانہ کرتا ہے۔ گرہستن کے بغیر گھر بھوتوں کا ڈیرہ۔ خیال آیا کہ کاش بھابی ہوتیں۔ منجھلے رائے کچھ زیادہ ہی محتاط تھے۔ وہ کافی مستعدی سے دیکھ بھال اور پوچھ تاچھ کر رہے تھے۔ انھوں نے بڑے رائے، چھوٹی چاچی، رانی، ارن، ملازمین وغیرہ سب کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی سمجھ رہے تھے اور ہم تو سمجھ ہی رہے تھے۔ منجھلے رائے خاطر مدارات کا پورا پورا انتظام کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم کو منجھلی چاچی کی کمی محسوس ہو۔ لیکن کیا ان کا یہ انتظام ان کی کمی کو پورا کر سکتا تھا؟

شام کو جنٹ صاحب کی کوٹھی پر سلام کرنے کے لیے لے جایا گیا جنٹ صاحب بالکل نوجوان تھے۔ ولایت سے آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کر کے نئے نئے آئے تھے۔ رہنے والے ہماری ہی طرف کے تھے۔ منجھلے چاچا نے ہی بتایا تھا کہ وہ بڑے رائے کے دوست کھیم راج سنگھ کے بیٹے ہیں۔ ان کا خاندان اس علاقے کے مشہور خاندانوں میں سے تھا۔ وہ وجیا والوں کے نام سے مشہور تھا۔ جنٹ ہم لوگوں سے بڑی اپنائیت سے ملے۔ گھر کے لوگوں کی طرح پیش آئے۔ حالانکہ اس زمانے کے افسروں کو دوری رکھنے کا سبق سکھایا جاتا تھا۔ چاہے چپراسی ہو یا اپنا سگا رشتہ دار۔ یہ روایت مضبوط ہی ہوئی ہے مجھے تو خاص طور سے گھر کے لڑکے کی ہی طرح سمجھا گیا۔ جنٹ صاحب نے مجھے اندر زنان خانے میں بھجوادیا اور کہلایا کہ یہ سلیم پور والے رائے چاچا کے صاحبزادے ہیں۔ بالکل ہمارے چھوٹے بھائی! ہم لوگ ڈالی لے کر گئے تھے۔ اس زمانے میں افسران کے یہاں جاتے وقت ڈالی لے جانے چلن تھا۔ منجھلے چاچا نے ڈالی میرے ہاتھ سے ہی دلوائی۔ میں نے اندر جا کر ڈالی جنٹنی صاحبہ کو دے دی وہ ناراض بھی ہو گئیں۔

جنتی بہت خوبصورت تھیں۔ منجھلی چاچی سے بھی اکیس پڑتی تھیں۔ بچپن میں کسی نہ کسی کے بارے میں خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک معیار ہر بچہ مقرر کر لیتا ہے۔ حسن کا معیار میرے لیے منجھلی چاچی ہی تھیں۔ اب میرا معیار جنتی ہو گئی تھیں۔ میں انھیں ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا، وہ مجھے اپنی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے دیکھ کر ہنس دیں۔ میں جھینپ گیا۔ انھوں نے چاندی کے دو روپے مجھے پیش کیے اور ہنس کر کہا "تم تو میرے دیور ہو ـــــ"

جنتی کو شاید پتہ تھا کہ منجھلی چاچی کا انتقال ہو چکا ہے۔ انھوں نے پوچھا "تحصیلدارنی صاحبہ کو کیا ہو گیا تھا؟"

"بیمار تھیں۔"

"ہم نے سنا ہے کہ وہ بچہ ہونے میں چلی گئیں؟"

میں تھوڑا متذبذب ہو گیا لیکن اس کی اپنائیت دیکھ کر میرے منہ سے 'ہاں' نکل گیا۔ وہ بولیں "برا ہوا ـــــ بچہ ہو بھی نہ اور عورت چلی جائے!" پھر کہا ـــــ "سنا بہت خوبصورت تھیں۔" میں جواب میں ان کی طرف دیکھنے لگا وہ بہت ہلکا سا مسکرائیں۔ پھر بدل کر بولیں "تحصیلدار صاحب بہت دکھی تھے۔ تمھارے بھیا بتا رہے تھے انھوں نے کئی دنوں تک کھانا نہیں کھایا۔ انھوں نے بہت سمجھایا آپ چلے جائیں ـــــ وہ بولے اب جا کر کیا کروں گا ـــــ جس کے لیے جانا تھا وہ نہیں رہا۔" وہ ہلکی سی جذباتی ہو گئی تھیں۔

میرے پاس ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جو تصویریں میرے سامنے یکے بعد دیگرے آنے لگی تھیں ان میں اور ان باتوں میں کوئی میل نہیں تھا۔ میں خاموشی اختیار کیے رہا۔

وہ بولیں "آپ کی ماں یعنی چاچی بھی تو نہیں رہیں نا؟"

"جی نہیں!"

"گھر میں اب کون ہے؟"

"چھوٹی چاچی ہیں، میری چھوٹی بہن رانی اور چھوٹا بھائی ارن ہے۔"

"تمھاری چھوٹی چاچی کیسی ہیں؟"

"بہت اچھی۔"

"اتنی ہی خوبصورت؟"

میں نے پھر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا خوبصورت ہی لگتی ہیں۔"

"پھر وہ ہنس کر بولیں ـــــ "تم شادی کیوں نہیں کر لیتے ـــــ تمھیں بھی ایک حسین سی بہو مل جائے گی۔ تمھیں خوبصورت لوگ اچھے لگتے ہیں نا؟"

میرا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

میرے سامنے مٹھائی، پھل، میوے وغیرہ منگوا کر رکھ دیے تھے۔ باہر الگ سے بھیج دیے گئے تھے۔ میں شش و پنج میں بیٹھا رہا۔ وہ بولیں ـــــ "میں تمھاری بھابی ہوں ـــــ نہیں کھاؤ گے تو زبردستی کھلاؤں گی؟" انھوں نے ایک مٹھائی اپنی ہاتھ میں اٹھا کر واقعی میرے منہ میں رکھ دی۔ مجھے لگا کہ اس مٹھائی میں ان کے ہاتھ کی خوشبو بسی ہے۔ میں اسے دھیرے دھیرے کھاتا رہا۔ سونے میں نہ ہو لیکن حسن میں تو خوشبو ہوتی ہی ہے۔

انھوں نے بھی ذرا سا نمکین منہ میں ڈال لیا۔ ان کے گلے کی جلد اتنی نازک تھی کہ میں اسے دیکھ کر حیران تھا۔ لگتا تھا ان کے گلے سے اترتی ہوئی ہر چیز نظر آ رہی ہے۔ مجھے بھوانی کی یاد آ گئی۔ بھوانی کو بہت سی کہانیاں یاد تھیں جب وہ کسی شہزادی کے حسن و جمال کی بات کرتا تھا تو ہمیشہ کہتا تھا کہ شہزادی کے گلے میں پانی اترتا نظر آتا تھا۔ جنٹی بھابی کو دیکھ کر مجھے بھی یہ ہی لگ رہا تھا۔ مجھے گلے کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے پوچھا ـــــ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں شرما گیا۔ وہ ہنس پڑیں۔ ان کا نام دمینتی تھا۔ جنٹ صاحب جب ایک بار اندر آئے اور انھوں نے اس نام سے پکارا تو مجھے اچھا لگا، اس زمانے میں روی ورما کی بنائی 'نل دمینتی' کی ایک تصویر قریب قریب ہر گھر میں ملتی تھی۔ بہت حسین۔ وہی دمینتی مجھے یاد آ گئی۔ راجہ نل اور دمینتی نے بہت رنج والم کا سامنا کیا تھا۔ لیکن یہ دمینتی ـــــ میں نے دل ہی دل میں اپنے کان پکڑے۔ یہ میں کیا سوچنے لگا۔ تب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جو بہت حسین لگتا ہے اس کے بارے میں بری باتیں کیوں دماغ میں آتی ہیں؟

باہر لوگ آ گئے تھے۔ میرا ابا او آ گیا تھا۔ میں چلنے لگا تو انھوں نے پوچھا "کب تک ہو؟"
"پتہ نہیں۔"
"جب تک ہو بھابی کے پاس آیا کرو۔ یہاں دن بھر اکیلے بیٹھی رہتی ہوں۔ ان کا یہ کہنا دیر تک میرے کانوں میں گھنٹیوں کی طرح بجتا رہا تھا۔

جنٹنی صاحب کی خوبصورتی اور خوشبو میری گہرائیوں تک اتر گئی تھی۔ اس رات کو جب بھی میری آنکھ کھلی تو میں نے انھیں اپنے سامنے موجود محسوس کیا۔ ایک دم نہائی دھوئی تر و تازہ جیسے غسل کے بعد منجھلی چاچی لگا کرتی تھیں۔ میں بے چین سا ہو اٹھا۔ ان کا سارا جسم شفاف سا ہو گیا تھا۔ ان کا پیار، ان کا اصرار، ان کا مسکرانا، ان کا ڈار سب کچھ آر پار نظر آ رہا تھا۔

میرے جی میں آیا کہ میں انھیں پکاروں۔ پھر خیال آیا کہ میں تحصیل میں اپنے چاچا کے گھر پر سو رہا ہوں۔ وہ جنٹ صاحب کے بنگلے پر ہوں گی! کیا وہ ابھی جاگ رہی ہوں گی؟ سوتی ہوئی کیسی لگتی ہوں گی؟! اس قسم کی بے چینی میں نے پہلی بار محسوس کی تھی۔ میں نے اچانک سوچا کہ میری چاچیاں بھی کم حسین نہیں تھیں۔ لیکن کیا ان میں دمیتی بھابی والی بات تھی؟

رات کو سونے سے پہلے چھوٹے رائے نے منجھلے رائے سے بات کرنی چاہی تھی۔ لیکن منجھلے رائے کسی کام کا بہانہ بنا کر اٹھ کر چلے گئے تھے۔ جھنجھلاہٹ مٹانے کے لیے مجھ سے بولے ـــــ "تمھیں جنٹنی کیسی لگی؟ کیا بات کر رہی تھی؟"

میں شرماتا ہوا سا بولا ـــــ "منجھلی چاچی کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ منجھلے چاچا ان کے مرنے پر بہت مغموم تھے۔ جنٹ صاحب نے ان سے جانے کے لیے بھی کہا ـــــ انھوں نے یہ کہہ دیا کہ جس کے لیے جانا تھا جب وہ نہیں رہا تو اب جا کر کیا کریں گے؟ پوچھ رہی تھیں تمھاری منجھلی چاچی بہت خوبصورت تھیں۔ چھوٹی چاچی کے بارے میں بھی پوچھا۔' پھر جھجکتے ہوئے کہا" یہ بھی پوچھ رہی تھیں کہ منجھلی چاچی کیا بچہ

ہونے میں مر ی تھیں!

چھوٹے چاچا نے فوراً پوچھا "انھیں کیسے پتہ چلا؟"

میں چپ رہا۔ انھوں نے پوچھا "تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے سوچا شاید منجھلے چاچا نے بتایا ہے۔"

ان کے ہونٹ بھینچ گئے۔ اپنے آپ بڑبڑائے "اپنی مردانگی ثابت کرنے کے لیے آدمی اس گھر کو بھی کیسے پکڑ لیتا ہے جسے جانتا ہے کہ وہ جھوٹ کی بنیاد پر کھڑا ہے۔"

منجھلے چاچا باہر سے لوٹے تو چاچا نے ان سے سیدھے سوال کیا "آپ منجھلی چاچی کے مرنے پر کیوں نہیں آئے؟"

"کیا تمھیں بتانا ضروری ہے؟"

چھوٹے چاچا زور سے بولے "ہاں میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں اس چھنال کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"وہ چھنال کیسے ہو گئی؟"

"وہ بچہ کس کا تھا ــــــ مجھے بڑے بھیا نے کہا تھا۔ اسے مجھ سے تین ماہ کا حمل تھا لیکن میں نے تو اسے چھوا بھی نہیں!"

"تو پھر کس کا تھا؟"

"ہو گا کسی کا ــــــ وہاں کیا آدمیوں کی کمی ہے؟"

"تمھیں شرم نہیں آتی ــــــ تم نے ہی اسے چیلنج کیا تھا۔ اب تم انھیں چھنال کہہ رہے ہو!"

"میں نے چیلنج کیا تو اس نے قبول کر لیا ــــــ واہ ری شوہر پرستی! میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بچہ کس کا تھا؟"

"وہ مانتی تو تم زندگی بھر مرد اور بے بوجھ بنے رہتے۔ تم انھیں کوستے رہتے کیونکہ وہ عورت 'نپوتی' اور بے اولاد تھی۔ کوئی بھی عورت زندگی بھر بے اولاد رہ کر جی سکتی ہے لیکن بانجھ ہونے کی تہمت برداشت نہیں کر سکتی۔ ہم لوگ بھی تو اپنی صلاحیتوں اور خامیوں میں جانتے رہتے ہیں لیکن سچائی کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں ــــــ منجھلی بھابی نے تمھیں کیا کم مانا ــــــ اس کا نتیجہ تم نے یہ دیا کہ وہ تڑپ تڑپ کر مریں!

میں سمجھ رہا تھا کہ منجھلے رائے یہ بات سن کر مرنے مارنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چھوٹے رائے کی باتوں نے انھیں یکایک توڑ دیا۔ ان کے پیر کانپنے لگے۔ مجھے لگا کہ وہ گر پڑیں گے۔ چھوٹے رائے نے انھیں سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کافی دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔

پھر بولے "تم شاید ٹھیک ہو ـــــ لیکن وہ کون تھا؟" "تم اس کو اپنی زندگی کی سچائی مانو۔ راجہ پانڈو تک کو ماننا پڑا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے پانچوں بیٹے کم از کم اس کے نہیں ہیں۔"

اس دن کے بعد اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم لوگ کھاتے پیتے اور گھومتے پھرتے رہے۔ شہر کے روسا میں سے کسی ایک کے یہاں کی فٹن روزانہ کر دروازے پر لگ جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے یہاں بھی افسران کی خدمت کے لیے ایک فٹن الگ سے تیار رہتی تھی۔ دراصل افسر دہ خواہ کوئی بھی ہو، سہولیات 'رنگ' ـــــ میں چاہتا ہے۔ اس کی کوئی ناپ تول نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں دودھارو گائے تک افسروں کے یہاں بھیجی جاتی تھی۔ جب دودھ دینا بند کر دیتی تو واپس آجاتی تھی دوسری چلی جاتی تھی۔ تب بھینسوں کا چلن کم تھا۔

چلنے سے پہلے دن چھوٹے رائے نے منجھلے رائے سے کہا "آپ کو بڑے رائے نے بلایا ہے اور کہا ہے کہ ساتھ لے کر آنا" اس بات کو وہ گول کر گئے جو انھوں نے واقعی کہی تھی۔ پھر کہا ـــــ "بھاسکر کو اس لیے بھیجا ہے کہ اگر میری بات نہ مانیں تو بھاسکر کا منہ دیکھ کر چلے چلیں گے۔"

"نہیں، ابھی نہیں چل سکوں گا۔ بعد میں آجاؤں گا۔ تم چاہو تو بھاسکر کو یہاں چھوڑ دو۔ میرا دل لگا رہے گا۔"

میں چکر میں پڑ گیا تھا، کہیں چھوٹے چاچا مجھے چھوڑ ہی نہ جائیں لیکن انھوں نے صورت حال سنبھال لی ـــــ آپ ابھی ساتھ چلیے۔۔۔ جب واپس آئے گا تو بھاسکر کو ساتھ لے کر آئیے گا۔ بڑے بھیا ملنے کے لیے بے تاب ہیں ـــــ اگر نہیں گئے تو پتہ نہیں کیا

ہو؟"

منجھلے رائے کشش و پنج میں تھے۔ انھوں نے بہانہ بنانے کی کوشش کی کہ کمشنر کا دورہ ہونے والا ہے۔ تحصیل ٹھیک کرانی ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ چھوٹے رائے بولے "آپ کہیں تو جنٹ صاحب سے پوچھ آؤں؟"

منجھلے رائے کو مجبور بننا پڑا۔

جانے سے پہلے ہم لوگ جنٹ کو سلام کرنے گئے۔ جنٹنی صاحب کے سامنے میری پیشی ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنے سے سٹا کر بٹھایا اور شکوہ کیا کہ میں اس دن کے بعد ان سے ملنے کیوں نہیں آیا۔ ایک پلندہ میرے ساتھ بندھوا دیا جس میں کچھ کپڑے بھی تھے چلنے لگا تو انھوں نے یکایک میرا منہ چوم لیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا جب کسی عورت نے میرا منہ چوما ہو۔ میری دونوں چاچیوں نے بھی کبھی ایسا نہیں کیا۔ منہ چومتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک تھی۔ وہ کشن بابو کی چمک سے مختلف تھی۔ حالانکہ مجھے غلطی سے یکایک لگا تھا کہ ان کی آنکھوں میں کشن بابو کی آنکھیں ابھر آئی ہیں۔

بڑے رائے کبھی کسی سے جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں ملتے تھے لیکن ان دنوں منجھلے رائے سے ملتے ہوئے ان کی جذباتیت پہلی بار سامنے آئی۔ ان کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا ـــــ "کرشن، تو مجھے بتا تا تو سہی!"

منجھلے رائے گردن نیچی کیے چپ تھے۔

پھر بولے "تو نے اپنی ناسمجھی میں اپنے خاندان کا چراغ گل کر دیا۔ تو کبھی سمجھ نہ پائے گا کہ یہ تجھ سے کتنی بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ دو بے گناہ جانیں تیری ناسمجھی کا شکار ہو گئیں۔ تمھاری بھابی کی موت کے بعد سے میں اس طرف سے بالکل اندھا ہو گیا۔ اس کے رہتے شاید وہ زیادتی کبھی نہ ہوئی ہوتی۔" منجھلے رائے پورا زور لگا کر بولے "بچے سے میرا کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ میرا کچھ نہیں تھا۔"

"تمھیں معلوم ہے یہ کیا کہہ رہے ہو؟" بڑے رائے نے ان کا کوٹ پکڑ لیا "کیا تم رائے نسل کو میرے ہوتے ہوئے کھود کر زمین میں گاڑ دینا چاہتے ہو۔" منجھلے رائے چپ رہے۔

"نہیں وہ تمھارا بیٹا تھا، تمھارے خاندان کا چراغ تھا ـــــ بہو کو قصوروار نہ

گھبراؤ۔ وہ گنہگار نہیں ہو سکتی ـــــ اس نے مرنے سے پہلے مجھ سے رو رو کر کہا تھا۔ تم جانتے ہو اس کا خاندان۔۔۔؟ بڑے رائے آگے نہیں بول پائے۔ اندر چلے گئے۔ چھوٹے رائے نے منجھلے رائے کو ان کے کمرے میں بھیج دیا۔

بڑے رائے اس کے بعد دو تین دن گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہ بھیانک طوفان میں گھرے تھے وہ اس طوفان کے درمیان ایک لچکدار درخت کی طرح تھے۔ طوفان انھیں ہلائے دے رہا تھا۔ منجھلے رائے درخت کے ٹوٹنے کی تکلیف کو نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ کیسے چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ٹوٹتا ہے۔ اگر وہ اسے سمجھ رہے تھے تو جان کر نظر انداز کر دینا چاہتے تھے۔ دو دن بعد جب منجھلے رائے نے جانے کا ارادہ کیا تو بڑے رائے کے کمرے میں گئے۔ بڑے رائے ٹہل رہے تھے۔

"بڑے بھیا میں جانا چاہتا ہوں کہ کمشنر صاحب کا دورہ ہونے والا ہے۔ تحصیل کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔"

وہ چپ رہے۔ منجھلے رائے پھر دہرایا "آپ کہیں تو کل چلا جاؤں؟"

"جیسا تم چاہو، منجھلے رائے! تم بھی مکمل رائے ہو۔ خود مختار ہو لیکن اپنی آتما کو ٹوٹنے مت دینا۔ اس کا ٹوٹنا انسان کے ظاہر و باطن دونوں ہی کا ٹوٹنا ہوتا ہے۔ دوسرے پر بلاوجہ تہمت لگا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دینے کے مقام تک پہنچا دینا بھی وہی ہوتا ہے۔ اب ایسا مت کرنا!"

"میں نے کیا کیا؟" اس بات کا جواب دے کر انھوں نے پوچھا "میں نے سنا ہے تم دوسری شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"جس سوال کو سلجھانے کے لیے میں شادی کرنا چاہتا تھا اس کا جواب تو مجھے مل گیا۔"

"راگھو کی بہو اتنا بڑا گھر کیسے چلائے گی؟"

"گھر کا چلانا ہی کافی نہیں ـــــ اور بھی بہت سی ضروری باتیں ہوتی ہیں۔"

"یعنی۔۔۔"

"میں شاید۔۔۔ وہ ساری ضرورتیں پوری نہ کر سکوں؟"

"تم یہ کیا کہتے ہو؟"

"وہی جو دیکھا اور برتا۔۔۔"

"پھر بھی۔۔۔"

"اب اگر شادی کروں گا تو۔۔۔"

"تو۔۔۔؟"

وہ چپ کھڑے ہو گئے۔ بڑے رائے بھی آگے کچھ نہ بولے۔

کچھ ہی دن بعد سنا کہ مجھلے رائے نے شادی کر لی۔ بڑے رائے کو لگا جیسے کسی سیانے نے ان کے سینے میں گھونسہ مار دیا ہو۔ ان دنوں اسی کو سب سے بڑی چوٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ تڑپ اٹھے۔ انھوں نے کرشن رائے کو دل شکستگی سے خط لکھا۔ وہ بھی اس وقت جب ان سے برداشت نہیں ہوا اور لکھنا ان کے لیے مجبوری بن گیا۔ انھوں نے لکھا:

"اگر خط کی ایجاد نہ ہوئی ہوتی تو میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ میرا کیا ہوتا؟ جو لکھنا نہیں جانتے ان کا بھی تو کچھ ہوتا ہی ہوگا۔ یا تو وہ مر جاتے ہوں گے یا مار دیتے ہوں گے۔ مرنے مارنے کو روز جو یہ سلسلہ جاری ہے اس کے پس پردہ شاید یہی سبب ہوتا ہو۔

تم نے یہ کر کے ـــــ اس خاندان کے میرے بڑے رائے ہونے پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ تم نے مجھے ایسے مٹا دیا جیسے بچے سلیٹ پر شکل بناتے ہیں، اسے دیکھتے ہیں اور غصے میں یا کھیل میں مٹا دیتے ہیں۔ میں نے تو تم سے خود کہا تھا ـــــ میں چاہتا بھی تھا تم شادی کرو۔ ہو سکتا ہے تمھارے دل کو میری بات پر بھروسہ نہ آیا ہو۔ تم نے کس سے شادی کی، کن حالات میں کی، کیوں کی ـــــ میں یہ سب نہیں جانتا۔ جب کر ہی لی ہے تو کوشش کرنا کہ اسے خوش رکھو۔ جہاں تک ہو سکے اس کے دل کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ ایک ٹریجڈی ہی کئی بار دوسری ٹریجڈی سے بچاتی ہے۔

تم خوش رہو ـــــ لیکن اس شادی نے مجھے آگاہ کر دیا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے!

تم دونوں کو دعائیں!

تمھارا

ہری رائے

بڑے رائے نے یہ خط اردو میں لکھا تھا۔ منجھلے رائے کا جواب ہندی میں آیا۔ وہ اتنی ہندی نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے وہ خط مجھ سے پڑھوایا۔ منجھلے رائے نے جواب میں لکھا تھا: ——

محترم بڑے بھیا!

نہیں، ایسا نہیں جیسا آپ سوچتے ہیں آپ کی اس بہو اور اس بہو میں فرق ہے، اس شادی اور اس شادی میں بھی فرق ہے۔ وہ شادی افزائش نسل کے لیے ہوئی تھی۔ ہم لوگ ناکام رہے۔ یہ شادی سوچ سمجھ کر صرف رفاقت اور اشتراک کے لیے ہوئی ہے۔ اس میں نہ ذات کا بندھن ہے اور نہ وہ سب رسومات —— جو آپ کو اپنی شادی میں کرنی پڑی ہوں گی۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہمیں افزائش نسل نہ کرنی ہے اور نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے اتنا سب جان کر آپ ہمیں شادی کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ پوچھنے سے پونچھ لگ جاتی۔ ہم دونوں ہی اپنی حدود سے واقف ہیں۔ اگر سمجھتے نہ ہوتے تو شاید شادی کے بندھن میں نہ بندھتے۔ ایسا نہیں کہ مجھے یا آپ کی اس بہو کو اپنے حالات سے ناتفاقی نہ ہوتی ہو۔ ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں قسمت ایسا پیڑ ہے جس کی چھال بھی کام آتی ہے اور پتہ بھی۔ سایہ تو آتا ہی ہے۔ چاہے جتنی تھکان ہو سایہ تو ملے گا ہی۔

شاید میں یہ سب باتیں آپ کو نہ لکھتا لیکن میں آپ کا وہ جملہ برداشت نہ کر سکا کہ میں نے آپ کے بڑے رائے پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو اس جھنجھٹ میں نہ گھسیٹ کر آپ کا بڑپّن قائم رکھا۔ میری صاف گوئی کو، امید ہے، آپ معاف کر دیں گے۔

ہم اپنی حدود میں جتنا خوش ہو سکتے ہیں اتنا ہیں۔ موقع ملتے ہی اور معافی کا اطمینان ہوتے ہی ہم آپ کا آشیرواد لینے آئیں گے۔ چودھری کھیم راج سنگھ کے بیٹے ویر بہادر، جو ہمارے جوائنٹ مجسٹریٹ ہیں آپ کے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے جب وہ چھوٹے تھے تو چودھری صاحب کے ساتھ ہمارے یہاں آیا کرتے تھے۔ جب وہ آئی۔ سی۔ ایس کے لیے ولایت جا رہے تھے تب بھی آپ کا آشیرواد لینے گئے تھے۔

چودھری صاحب کے ساتھ جو سرِ شتہ لڑکا تھا وہ بیٹی وہ بے بہادر تھے۔ شادی کے کئی برس بعد ان کے بچہ پیدا ہونے کی امید ہوئی تب وہ بھی مایوس ہو چکے تھے۔ جگنی خوش ہیں۔ جٹ صاحب کچھ نہیں کہتے۔ لوگ باگ طرح طرح کی باتیں اڑاتے ہیں۔ اگر وہ بچہ ہوا ہوتا تو یہ ہی بات سننے کو ملتی۔ خیر، جو ہوا ٹھیک ہوا۔

معافی کے ساتھ

آپ کا
کرشن رائے

بڑے رائے اس خط کے بارے میں کئی دنوں تک پریشان رہے، کرشن نے شادی تو کی لیکن یہ سب کیوں لکھا۔ وہ کہتا تو میں اس کا ولایت تک علاج کرواتا۔ پھر منجھلی بہو کا وہ حمل کس کا تھا؟ یہ بات ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی۔ چھوٹے رائے ان کی اس پریشانی کو دل ہی دل میں سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے دھیرے سے پوچھا ''تم جانتے ہو؟''

وہ چپ رہے۔

''کون تھا وہ؟''

''سب ہی ہو سکتے ہیں سنگیت والے استاد کو لے کر ـــــ مجھ تک۔''

بڑے رائے کو یاد آیا کہ استاد ایک دم غائب ہو گیا تھا۔ منجھلی چاچی نے بھی اس کے بعد اسے بلا کر لانے کے لیے منع کر دیا تھا۔ سنگیت سیکھنا بند ہو گیا تھا۔

''تمھارا مطلب گانا سکھانے والا وہ استاد۔۔۔؟''

''نہیں کوئی بھی۔۔۔! مجھے لگتا ہے کہ منجھلے بھیا وہم کے شکار ہیں، وہ خود اعتمادی سے محروم ہو چکے ہیں۔۔۔ ان کی ذہنی گتھیوں نے انھیں اپنے آپ پر شک کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ وہ اب کسی کا بھی اعتبار نہیں کر سکتے۔''

بڑے بھیا کچھ نہیں بولے۔ چھوٹے رائے نے انھیں پہلی بار بتایا ـــــ جس میم نے میرٹھ میں دیکھا تھا ـــــ انھوں نے غلطی سے کہہ دیا تھا کہ منجھلی بہو تو ٹھیک ہیں آپ اپنا معائنہ کروالیں۔ مرد اپنی مردانگی پر سوالیہ نشان لگنے پر کس قدر پاگل ہو سکتا ہے یہ اسی کا ثبوت ہے۔ عورت کے عورت پن پر سوالیہ نشان لگتا ہے تو وہ خود مر مٹتی ہے۔ ہم بھی اولاد

سے محروم ہیں ـــــ کیا ہم اپنی مسرت کے نقطے تبدیل نہیں کر سکتے؟
بڑے رائے جیسے گہرائیوں میں اتر گئے۔

بڑے رائے اس واقعہ کے بعد افسران سے کم ملنے جلنے لگے تھے لیکن جن انجمنوں میں وہ انگریزوں کے ساتھ عہدے دار تھے وہاں ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ زمیندار ایسوسی ایشن کی میٹنگ تھی۔ کلکٹر اس کے صدر ہوتے تھے۔ بڑے رائے نائب صدر تھے۔ ایک طرح سے نائب صدر ہی صدر کے کام دیکھتا تھا۔ کلکٹر کبھی کبھی آتے تھے۔ ہر انگریز کلکٹر بڑے رائے کو معتبر اور ذمہ دار شخص مانتا تھا۔ لیکن اس دن میٹنگ میں کلکٹر صاحب کسی اطلاع کے بغیر تشریف لے آئے۔ بڑے رائے نے کرسی چھوڑ دی۔

بڑے رائے کو لگا کہ مسٹر ڈک کا رویہ کچھ بدلا ہوا ہے۔ بڑے رائے ان کے اس طرز عمل سے کچھ سنک گئے۔ باقی لوگوں کے لیے بھی حیرت کی بات تھی۔ کلکٹر کوئی بھی ہو کسی نے آج تک بڑے رائے کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ڈارلنگ جیسا شیطان کلکٹر ایک مقررہ دوری بنائے رکھنے کے باوجود ان کی پوری عزت کرتا تھا لیکن مسٹر ڈک ایک دم فرنٹ ہو گئے تھے۔ ان کے آتے ہی سب سے پہلے چائے کا دور چلا۔ چائے نوشی کے وقت بڑے رائے کو لگا کہ اس ذلت سے بہتر ہے کہ وہ لوٹ جائیں۔ لیکن ساتھ ہی انھیں یہ بھی لگا کہ اس سے غلط فہمی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ وہ باقی لوگوں سے باتیں کرتے رہے لیکن جہاں کلکٹر ہو وہاں باقی لوگوں کو کون پوچھتا ہے۔ لوگ ان سے باتیں ضرور کر رہے تھے لیکن سب کلکٹر صاحب کی نظر عنایت کے منتظر تھے۔ کلکٹر کا رخ دیکھ کر دوسروں کا رخ بھی بدل رہا تھا۔

کالے سائیس نے گاڑی لا کر سامنے کھڑی کر دی۔ بڑے رائے کی نظر اس پر پڑی تو وہ باہر نکل آئے لیکن وہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ جائیں یا رہیں۔ کالے نے آ کر کہا "رحمت اللہ سلام عرض کرنا چاہتے ہیں۔"
وہ فوراً چبوترے سے اتر کر نیچے آئے۔ وہ دیوار کی آڑ میں دبکا کھڑا تھا جیسے وہ ادھر

تب اس نے سلام کیا اور کہا سرکار گستاخی معاف ہو۔"

"بولو کیا بات ہے؟"

"اس دن کے قصّے کے بارے میں صاحب کے جمعدار کے بھائی ویتو نے چغلی کی ہے کہ رحمت اللہ بڑے رائے سے بات کر رہا تھا۔ کلکٹر صاحب کو یہ شک ہے کہ اس دن کی ٹکر کے پس پشت حضور کی گاڑی تھی، رحمت اللہ چھپ رہا ہے۔ کپتان صاحب بھی نکلتے ہوئے آپ سے ملے تھے لیکن نہ میں نے منہ کھولا ہے نہ کھولوں گا۔ کل شاید مجھے ملازمت سے رخصت کر دیا جائے گا۔"

"تم حویلی پر آنا۔"

"نہیں حضور اب نوکری نہیں کروں گا۔"

"تو کیا کرو گے؟"

"میں درزی کا کام جانتا ہوں۔ سوچتا ہوں کپڑے سینے کا کام شروع کر دوں۔ اپنا حقّہ اپنی مرضی، پیا تو پیا نہیں دیا چھوڑ۔"

"خیر، گھر پر آنا... تب ہی باتیں ہوں گی۔"

"جی۔"

وہ جلدی سے گھوما اور گاڑی پر چلا گیا۔ ٹی پارٹی ختم ہو گئی تھی۔ بڑے رائے نے ایک منٹ رک کر ٹھنڈے دماغ سے سوچا پھر اندر چلے گئے۔

واپس آئے تو دو کرسیوں کی جگہ ایک ہی کرسی لگی تھی وہ باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کا اس طرح سب کے ساتھ بیٹھنا تعجب کی بات تھی۔ سب سے پہلے ایجنڈا پڑھا گیا۔ وہ میز پر ہی رکھا گیا تھا۔ پہلا موضوع تو سرکار کی اپیل تھی کہ بحران کے وقت جب انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، وفاداران حکومت، زمیندار، حکومت برطانیہ کی مدد کے لیے سامنے آئیں۔ سب لوگ متحد ہو کر کھڑے ہوں۔ اپنے آسامیوں اور رعایا کو سمجھائیں کہ وہ باغیوں کو منہ توڑ جواب دیں۔ اتفاق رائے سے اس تجویز کی تائید کی گئی۔ کلکٹر صاحب نے ان کی وفاداری کے لیے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ زمیندار لوگ مجموعی طور پر تاج کے خیر خواہ ہیں لیکن کچھ لوگ جو ہمارے دوست تھے اب بہ انداز دیگر سوچ رہے ہیں۔ لیکن انھیں کچھ بھی کرنے سے پہلے گہرائی سے سوچنا چاہیے۔ یہ کہہ کر انھوں نے بڑے

رائے کی جانب طائرانہ نگاہ سے دیکھا ـــــ اچھا تو یہ اس واقعہ کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش میں ہے ـــــ یہ بات فوراً بڑے رائے کے دماغ میں کوند گئی۔ لیکن وہ چپ رہے۔ وہ آگے بولے، ''ہم زمینداروں کے دوست ہیں ویسی ہی دوستی کی ہم ان سے امید بھی کرتے ہیں۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ آپ لوگ برطانوی سامراج کی ریڑھ ہیں لیکن یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ آپ سب کی حالت بھی برطانوی حکومت کی وجہ سے ہی ہے۔ کسی کے نام کا ذکر کیے بغیر یہ آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ لوگ اپنا رویہ بدل سکتے ہیں تو میں بھی بدل سکتا ہوں۔ اس حالت میں آپ کے ساتھ حکومت ہوگی نہ رعایا۔

پھر وہ زمیندار کھڑا ہوا جس نے کاشتکار کی زمین دبالی تھی اور بڑے رائے نے زمیندار کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ وہ بولا ''حضور، آپ بادشاہ ہند کے نمائندے ہیں۔ میں ایک چھوٹا زمیندار ہوں۔ میں نے یہاں پر موجود کئی بڑے زمینداروں سے زیادہ حکومت برطانیہ کی خدمت کی ہے لیکن میرے ساتھ جو سلوک ہوا ہے اسے کبھی بھول نہ پاؤں گا۔ اسی ایسوسی ایشن کے صدر نے اس زمین پر ایک زمیندار کے قبضے سے زیادہ کاشتکار کے دعوے کو ترجیح دی ہے۔ میرے لیے اپنا دبدبہ اور حکومت برطانیہ کی ساکھ بنائے رکھنا مشکل ہو گیا ہے، حضور! کاشتکاروں کے دماغ ساتویں آسمان پر چڑھ گئے ہیں، وہ بیگار نہیں کرنا چاہتے۔ انھیں بلایا جاتا ہے تو نخرے کرتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایسوسی ایشن کے عہدے دار کیا اس کے اراکین کی اس طرح حق تلفی کریں گے؟ اگر وہ زمین کاشتکار کی تھی تب بھی وہ زمیندار کی ہی تھی۔۔ زمیندار اپنی رعایا کی ہر چیز کا اسی طرح مالک ہوتا ہے جس طرح حکومت برطانیہ ہماری مالک ہے۔ ویسے بھی اس پر میرا قبضہ تھا۔ اس قبضے کی کوئی توجیہ ہوگی۔ کاشتکار سے مل کر زمین کے اس ٹکڑے کی ایک کھونٹ میں پتھر اور ایک کنڈی دبائی گئی۔ اس میں ایک سانپ پکڑ کر رکھ دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ وہ اس کا مرحوم باپ تھا جو اس زمین کی حفاظت کر رہا تھا۔ یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ زمین کا مالک سانپ بن گیا اور وہی زمین کی حفاظت کر رہا ہے تو یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ زمین میری نہ ہو کر کاشت کار کی تھی۔ ہم ہی کہنے والے، ہم ہی سننے والے اور ہم ہی منصف۔ میں اس ایسوسی ایشن کے صدر بہادر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ انصاف کریں۔ جو بڑے لوگ حکومتِ برطانیہ کی خیر خواہی کے نام پر وفاداران حکومت زمینداروں اور سرکار کے ساتھ دشمنی نباہ رہے ہیں انھیں پہچانیں!''

اس زمیندار کی بات سن کر وہاں پر بیٹھے سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ کئی کے چہرے تمتما اٹھے۔ بڑے رائے جیسی عظیم شخصیت کے خلاف وہ زہر اگلنا زیادہ تر لوگوں کو پسند نہیں آیا۔ لیکن سب کو کلکٹر صاحب کے رد عمل کا انتظار تھا۔ کلکٹر صاحب نے اس زمیندار سے بیٹھنے کے لیے کہا "یہ ایک بد قسمتی کا واقعہ تھا۔۔۔ مجھے اس کا علم ہے۔"

لوگوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ پوری بات ڈک کے اشارے پر اچھالی گئی ہے ورنہ اس چھوٹے سے زمیندار کی کیا مجال تھی کہ وہ بڑی رائے جیسی شخصیت پر کیچڑ اچھالے۔

بڑے دھیرے سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ مسٹر ڈک اس کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ ان کے جانے سے اجلاس ایک طرح سے ختم ہو گیا۔ کوئی بھی کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

رحمت اللہ دو تین دن بعد حویلی پر آیا۔ بڑے رائے دو تین دن سے نہ کلب گئے تھے اور نہ کچہری ہی کی تھی یہ ہی نہیں بلکہ انھوں نے نائب صدر کے عہدے سے استعفیٰ بھی بھیج دیا تھا۔ مجیب الحسن حاکم صدر دو تین بار آچکے تھے۔ کئی ایک زمیندار بھی آئے تھے۔ بڑے رائے اس سلسلے میں چپ تھے۔ حاکم صدر کی بات بھی انھوں نے صبر سے سنی تھی اور یہ ہی کہا تھا "آپ کلکٹر صاحب سے کہیے کہ مجھے چندن سنگھ کی بات سے کوئی شکایت نہیں۔۔۔ اس کے اس حق کی حق تلفی ہوئی تھی جسے وہ سچ مان بیٹھا تھا۔۔۔ لیکن وہ غلط تھا۔۔۔ وہ چاہتا تو اس کی اپیل کر سکتا تھا ــــ لیکن اسے ایسا نہ کرنا تھا۔۔۔ اور نہ کیا۔" مجیب الحسن صاحب نے انھیں بہت سمجھانا چاہا لیکن وہ اپنی بات پر اٹل رہے۔ رحمت اللہ آیا۔ وہ باہر بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بولے "کیا ٹھے کیا؟" "سرکار، ہاتھ کا ہنر ہوتے ہوئے اس کی بے قدری کر رہا تھا اور غلامی کو ترجیح دے رہا تھا۔ ہاتھ کا ہنر سب سے بڑا دوست ہوتا ہے۔ اسی کو نظر انداز کرتا رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا۔۔۔ کہ غلامی کو شہنشاہی سمجھ بیٹھا۔ پورا پیٹ بھی نہیں بھرتا۔۔۔ اور عزت بھی نہیں ہوتی۔"

بڑے رائے ان کی طرف دیکھ کر بولے "جس کے پاس ہنر نہ ہو وہ کیا کرے؟"

رحمت اللہ چونکا "میں سمجھا نہیں مالک!"

"کوئی خاص بات نہیں!" پھر بولے جن لوگوں کو حلوے کی عادت ڈال کر روٹی کی عادت چھڑا دی جاتی ہے، سواریوں پر بٹھا کر پیروں سے چلنا بھلا دیا جاتا ہے، ریشم پہن کر کھال اتنی نرم بنا دی جاتی ہے کہ ذرا سا موٹا کپڑا پہننے پر خون چھلک آئے۔۔۔ انھیں اگر روٹی کی طرف واپس لوٹنا پڑے یا دوہرا پہن کر سونا پڑے۔۔۔ تو ایسے لوگوں کو موت کی سزا بھگتنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"نہیں سرکار میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو اپنی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ اگر میں اپنے ہنر پر زندہ ہوتا تو کلکٹر صاحب کو بے عزتی کر کے نکالنے کا موقع نہ ملا ہوتا۔ ان کے منہ سے نمک حرام نہ سننا پڑتا۔ سرکار میری ہمت نہیں پڑی ورنہ ضرور پوچھتا کہ کیا حضور ولایت سے نمک ساتھ لے کر آئے تھے؟ وہ اس ملک کا نمک کھاتے ہیں، یہ ملک کیا ان کا ہے؟ گستاخی معاف کریں!"

"نہیں، اس میں معافی کی کیا بات ہے، کل سے تم حویلی کی سامنے والی دوکان پر بیٹھو گے۔ مشین وغیرہ کی جو ضرورت ہو، دیوان جی کو بتا دو، آجائے گی۔"

"مشین تو میرے پاس ہے۔۔۔ آخر درزی کا بیٹا ہوں، اوزار تو ہنر کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، ہنر مرتا ہے تو اوزار بھی مر جاتا ہے۔ اس کے لیے آپ تکلیف نہ کریں۔ پہلے سمجھتا تھا کہ بڑے لوگوں کے سائے میں نہ دھوپ سکھا پاتی ہے اور نہ پانی ڈبو سکتا ہے۔۔۔ لیکن وہاں تو حضور دونوں چیزیں انتہا میں ہیں، بچت کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ سوکھنے سے بچے تو بہا دیے جائیں گے۔ سوچتا ہوں اب اپنی محنت اور کام پر ہی جیوں۔"

بڑے رائے کافی دیر تک رحمت اللہ کے بارے میں سوچتے رہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو رحمت اللہ کے لیے کیوں ممکن ہے؟ دنیا میں اتنے لوگ غلامی کا طوق گلے میں ڈالے، سانی کی طرح ناند میں حلوہ پوری کھا رہے ہیں۔۔۔ وہ سب اس کی طرح کیوں نہیں سوچ اور کر سکتے؟ یہ سوچتے وقت انھیں اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا کہیں باہر کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟

اگلے دن رحمت اللہ کو گھر سے بلا کر دوکان اس کے سپرد کر دی گئی۔ اس کی مشین دوکان پر رکھی گئی۔ اس نے مشین کی صفائی کی، تیل وغیرہ ڈالا۔ نماز پڑھی اور پہلی دوپلی ٹوپلی سی کر مجھے دی۔ ایک ایک رومال بڑے رائے اور چھوٹے رائے کو دیا۔ پھر بولا "حضور، اس احسان کو تو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا لیکن اس ناچیز کی ایک گزارش تھی۔۔۔"

"بولو!"

"میری حیثیت دیکھ کر اس کا کرایہ طے کر دیں۔ مجھے بھی قیامت کے دن اس کے سامنے جانا ہے۔۔۔ وہ پوچھے گا کس کھایا اور کس کا لوٹایا۔"

بڑے رائے کے چہرے پر ایک بار جھنجھلاہٹ ابھری۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ پھر ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ سنبھلے انداز سے بولے "دیکھو رحمت اللہ، تم جانتے ہو کہ دوکان حویلی کے دروازے کے بالکل سامنے ہے۔ اسے ہم نے کبھی کسی کو دینے کی بات بھی نہیں سوچی کیونکہ حویلی کی آزادی میں خلل پڑتا۔ لیکن جیسا بھاسکر ویسے تم۔ اگر ہم بھاسکر سے کرایہ لے سکتے ہیں تو تم سے بھی لے سکتے ہیں۔۔۔ تم بے فکر ہو کر اپنا کام شروع کر دو۔"

"مالک میں کرایہ دینے لائق قطعی نہیں۔۔۔ آپ اپنی جوتیاں میرے اوپر جھاڑ دیں تو میں اس کی دھول میں دب جاؤں۔ لیکن دین کہتا ہے حلال کی کھاؤ۔ اتنے سال آپ کا دیا کھایا، آگے بھی کھاؤں گا۔۔۔ لیکن چاہتا ہوں 'اسے' منہ دکھانے لائق بنا رہوں۔"

بڑے رائے نے دیوان کی طرف دیکھا اور کہا "ایک روپیہ سالانہ پر دوکان کا کاغذ تیار کر دو۔"

دیوان نے بڑے رائے کی طرف دیکھا۔ وہ انھیں بولنے کا موقع دیے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔

بھوانی اور رحمت اللہ کی دوستی میں کافی اضافہ ہو گیا۔ ویسے وہ لوگ پہلے سے ہی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ جب بھوانی آیا تو رحمت اللہ کلکٹر صاحب کی سائیسی میں جانے والا تھا۔ رحمت اللہ مجھے بھی مانتا تھا۔ ہمیشہ میرے اوپر بڑے بھائی کی طرح نظر رکھتا تھا۔ شام کو جب دوکان بڑھاتا تو مشین اٹھا کر دیوان خانے میں رکھ جاتا تھا۔ اگلے دن جب دوکان کھولتا تو لے جاتا

تھا۔

ارن دھیرے دھیرے بڑا ہو رہا تھا۔ وہ باہر رہنا ہی پسند کرتا تھا۔ جب دیکھو تب بھوانی کے پیچھے پڑا رہتا کہ اسے باہر لے چلے۔ بھوانی خالی ہوتا تو لے جاتا تھا۔ ورنہ وہ رانی یا چھوٹی چاچی سے چمٹا ہوا روں روں کرتا رہتا تھا۔ بڑے رائے اس کا بہت باہر رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا مستقل حکم تھا کہ ان کو زیادہ زیادہ ادھر ادھر نہ لے جایا جائے۔ جب سے رحمت اللہ آیا تھا تب سے ان کی عائد کردہ یہ بندش کم ہو گئی تھی۔ رحمت اللہ ارن کے لیے دونے میں ایک آدھ مٹھائی منگوا کر طاق میں رکھے رہتا تھا۔ جہاں ارن آیا اس نے دونہ اتار کر اسے دے دیا۔ وہ خود نہیں چھوتا تھا اسے ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندوؤں کے کھانے کی چیز چھونا غلط ہو گا۔ کئی بار رانی کو کہیں آس پاس جانا ہوتا تھا تو وہ کسی نوکرانی سے رحمت اللہ کو کہلوا دیتی تھی۔ رحمت اللہ اسے چھوڑ بھی آتا تھا اور وقت پر لے بھی آتا تھا لیکن چلتا تھا قریب دو گز پیچھے ہر طرف سے محتاط! ویسے اس نے شاید ہی کبھی رانی جتنی چھوٹی لڑکی کی انگلی دیکھی ہو۔

کئی بار کشن بابو بھی اسے پیغام دے جاتے تھے۔ وہ پیغام مجھے بخوبی مل جاتا تھا۔ ادھر کشن بابو مصیبت میں تھے مسماۃ ودیا کی جس جائیداد پر وہ آئے تھے اس جائیداد کا ایک اور نزدیکی دعویدار پیدا ہو گیا تھا۔ کشن بابو کے پاس اپنی جائیداد تو کچھ بھی نہیں تھی۔ اسی جائیداد سے سارا کام چلتا تھا۔ موج مستی کا بھی، نوکر چاکر کے خرچوں کا اور زمینداری اور متعلقہ مقدمات کا بھی۔ جب وہ بہت پریشان ہوتے تھے تو مجھے بلوا بھیجتے تھے۔ میں بھی اس بات کا دھیان رکھتا تھا کہ انھیں مایوس نہ کروں! ایک دن کشن بابو کافی جذباتی ہو گئے۔ بولے—

"بھاسکر رائے، میں رایوں کے پاسنگ بھی نہیں، میں تو ایک مزدور آدمی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا رائے لوگ اتنی بڑی جائیداد کیسے سنبھالتے ہیں۔ جائیداد تو ہاتھی ہے انکس کے بغیر ہاتھی نہیں سنبھلتا ہے نہ جائیداد۔ کون جانتا ہے کس دن خونی ہاتھی کی طرح یہ ہی مجھے روند دے! میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے میں ہی اسے کھا جاؤں۔" میں نے ان کی طرف دیکھا، ان کی آنکھیں بند تھیں۔ کونے بھیگے تھے۔ میں نے پوچھا "تم ایسا کیوں کہتے ہو؟"

اس لیے کہ یہ میرے پاس بھی ہمارے دور کی رشتے کی نانی کو مار کر ہی آئی تھی۔۔ ویسے بھی اس کی ذات طوائف سے بھی زیادہ ہرجائی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فنّے خان ہوئے

لیکن یہ بھی کسی کی ہو کر نہیں رہی۔ لیکن آدمی بھی عجیب چغد ہوتا ہے۔ اس کمبخت کے لیے جان دے دیتا ہے۔ نہ باپ کے لیے دیتا ہے، نہ بیوی کے لیے اور نہ اولاد کے لیے۔ مجھے ہی دیکھو کہ میں سب کو چھوڑ کر اسی حرامزادی زمین جائیداد کے عشق میں یہاں پڑا ہوں وہاں کتنا خوش تھا اور یہاں کتنا الگ الگ ہوں۔ کون ہے میرا؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ میری نہیں ہے اس سے چمٹا ہوں۔ اب میں سوچتا ہوں ـــــ اگر اسے جانا ہی ہے تو کیوں نہ میں اسے ایک طوائف کی طرح استعمال کروں۔ تم بھی میرے ساتھ مل جاؤ۔ تم میرے ہم سفر ہو۔۔۔ اپنے سب دوستوں کو اکٹھا کرلو، ان سے بھی کہو اسے بھوگیں۔۔۔ اسے نوچ کھاؤ۔ تب تک بھوگو جب تک یہ ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔ میں اسے پوری دنیا کے سامنے بدذات بنگا کر دینا چاہتا ہوں ـــــ اسے جانا ہو تو جائے لیکن میں اسے ایسے جانے نہیں دوں گا۔"

کشن بابو نڈھال ہو گئے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ آخر میں یہی ہوا کہ انکی عقل بجلی کی طرح گم ہو گئی تھی۔ انھوں نے جائیداد کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بیچنا شروع کر دیا۔ مجرے ہونے لگے۔ دور دور سے گانے والیاں اور طوائفیں آنے لگیں۔ جب ان کے دوست احباب مجرا سنتے، خوش ہوتے، تعریف کرتے تو وہ بے حد خوش ہو جاتے۔ ناچنے لگتے۔ میں بھی گاہے بگاہے مجروں میں شریک ہوتا تھا، وہ میرے اوپر نوٹ کے نوٹ نچھاور کر دیتے۔ جائیداد ان پر بری طرح حاوی تھی جتنا وہ اسے اپنے اوپر سے اتار پھینکنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اتنی ہی حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے مٹانے کے لیے وہ سب کچھ کر رہے تھے جو کر سکتے تھے۔ سامان لاتے اور بانٹ دیتے۔ شراب پیتے اور بہاتے۔ قیمتی سے قیمتی کپڑا خریدتے اور غریب بچوں، عورتوں سے لے کر طوائفوں کو بانٹ آتے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا۔ فریق ثانی نے کچہری میں جاکر جائیداد فروخت کرنے کے سلسلے میں حکم امتناعی لے لیا۔ جائیداد بیچنے کا حق معطل کر دیا گیا۔ انھیں جو آمدنی تھی اسی سے اپنا گزارہ چلانا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تفریح اور خرچے بند۔ وہ ایک زخمی پرندے کی طرح بند پنجرے میں پھڑپھڑاتے ہوئے وہیں گر گئے۔ کچھ دن قرض کا سلسلہ بھی چلا لیکن جب ساہوکاروں کو پتہ چلا کہ عدالت نے روک لگا دی تو وہ بھی کنی کاٹ گئے۔ ساہوکار ہمیشہ پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لینے والے میں لے کر دینے کی کتنی گنجائش ہے۔ یہی نہیں جن کا قرض تھا انھوں نے ان پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ واپس کرو۔

قرض والی بات بڑے رائے کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی رحمت اللہ ہی نے بتایا تھا۔ حالانکہ بڑے رائے کو کشن بابو سے بذاتِ خود کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ خاص کیا عام بھی نہیں۔ لیکن وہ کسی بات کے بغیر بھی اپنے آپ کو ان کا احسان مند مانتے تھے۔ انھوں نے مجھے بلا کر پوچھا "تم کشن بابو سے ملتے ہو؟"

"جی!"

"کیا حال ہے؟"

میں نے پورا حال بتا دیا۔ انھوں نے پوچھا کتنا قرض ہوگا؟" میں نے اندازے سے بتا دیا۔

وہ بولے 'عیاشی اور فضول خرچی دولت کے دشمن ہوتے ہیں۔ قارون کا خزانہ بھی ان کے لیے کچھ نہیں۔ سب کچھ ایسے بہتا ہے کہ کنارے بھی نہیں بچتے۔"

میں بڑے رائے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اتنا تو سمجھنے ہی لگا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ بڑے رائے کو تو اپنے خرچے سے بھی آگاہی تھی۔ یہاں بھی کنارے لگاتار بہہ رہے تھے۔

جب انھیں پیسے کی ضرورت ہوتی تو ان کا ایک نکتے کا پروگرام ہوتا تھا پیسہ! منجھلے رائے اور ان کے درمیان دوری کا ایک سبب یہ بھی تھا لیکن چھوٹے رائے ان کے اخراجات کا دھیان رکھتے تھے۔ چھوٹے رائے انٹر کر چکے تھے۔ اس علاقے کی اعلیٰ تعلیم۔ اب انھوں نے گھر پر رہنے ہی کی ٹھان لی تھی۔ سکون سے رہ کر بڑے رائے کی خدمت کریں اور سماج کے بارے میں سوچیں۔ سماج کے بارے میں کیا سوچیں، یہ ان کے دماغ میں ابھی واضح نہیں تھا۔ بڑے رائے کے تحت دو تہائی زمینداری تھی اسے بے روک ٹوک بھوگ سکتے تھے۔ منجھلے رائے نے اپنے حصے کی ایک تہائی زمینداری کی دیکھ بھال کے لیے ایک چھوٹا دیوان رکھ لیا تھا وہ تھا بڑے دیوان کے ہی ماتحت لیکن دیکھتا تھا منجھلے رائے کی زمینداری کا حساب کتاب۔

میرے اس طرح دیکھنے سے بڑے رائے شاید میرے دل کی بات سمجھ گئے تھے۔

وہ اپنے آپ ہی بولے ”کیا سوچ رہے ہو؟“ میں گھبرا سا گیا جیسے پکڑا گیا ہوں۔ میرے منہ سے یکا یک نکلا ”کچھ نہیں“ اس بولنے میں میرے اندر کا خوف زیادہ تھا۔ ”یہی سوچ رہے ہو نا کہ میں یہ بات کیسے کر رہا ہوں؟“ میں خاموش رہا۔ وہ بولے ”عیاشی پر کیا گیا خرچ فضول خرچی ہوتا ہے جو قرض میں کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن آن بان مان اور بات پر ہونے والا خرچ بھی خرچ ہی ہے سب کچھ ختم ہو جانے پر ہر طرف خالی پن نظر آتا ہے تو اس وقت دل میں پریشانی کے بجائے یہ اطمینان ابھرا رہتا ہے کہ یہ سب خاندان کی عزت کے لیے کیا جسے بزرگوں نے پودے کی طرح سینچ کر درخت بنایا تھا۔ چاہے خاندان ہو یا سماج یا ملک اپنی اپنی حیثیت کے حساب سے آبائی قرض سب کو ادا کرنا چاہیے۔“

کبھی کبھی بڑے رائے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ راستے پیچھے لوٹ جاتے تھے نظر آنے بند ہو جاتے تھے۔ وہ سمت جو گمشدہ نہ ہوتی جب ہم ادھر دیکھتے ہیں تو کچھ دور کے بعد ایک دھند لکا جیسے اندھیرا نظر آنے لگتا ہے تب بھی ایسا ہی لگتا تھا۔

پھر وہ بولے ”کشن سے کہنا کہ مجھ سے مل لے۔ حالانکہ میں اسے پسند نہیں کرتا — لیکن موقع ملتے ہی قرض سے سبکدوش ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ سود اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اجگر کی کنڈلی کی طرح جکڑ لیتا ہے۔“

اس دن بھی کشن بابو کے پاس خبر رحمت اللہ کے ہاتھ ہی بھیجی۔ بھوانی کی معرفت بھی بھیجی جاسکتی تھی لیکن وہ بڑے رائے کے کام میں مصروف تھا۔ وہ گھر پر نہیں ملے۔ مجھے یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یا تو وہ کہیں پئے پڑے ہوں گے یا پھر کسی کوٹھے پر اڈہ جمائے ہوں گے۔ جب سے مقدمہ شروع ہوا تھا اور جائیداد بیچنے پر رول لگی تھی تب سے انھوں نے اس جائیداد کو بھوگنے کا یہی طریقہ نکالا تھا۔ آمدنی کم ہو جانے کی وجہ سے اپنے چوبارے پر مجرا بند کر دیا تھا۔ گھر پر مجرے کا خرچ زیادہ ہوتا تھا۔ ایک تو میزبان کا — کھلانے پلانے کے علاوہ نچھاور بھی زیادہ کرنی پڑتی تھی ورنہ پتہ نہیں بڑی بائی کیا کہہ بیٹھے۔ پاجامہ ڈھیلا تھا تو دوڑ کے واسطے کاہے کو کود پڑے؟ کوٹھے پر جانے لگے دوست احباب کے ساتھ۔ مجھ سے بھی کئی بار ضد کرتے تھے۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں بات بڑے رائے تک نہ پہنچ جائے۔ منجھلے

رائے کو ضرور ایک بار کہتے سنا تھا کہ بڑے رائے بھی اپنی جوانی میں مجروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ لیکن اس بات کی کسی نے تصدیق نہیں کی۔ ایک بار وہ مجھے اور رحمت اللہ کو زبردستی پکڑ لے گئے تھے۔ ویسے سچ پوچھیے تو کون کس کے ساتھ زبردستی کر سکتا ہے۔ ہم خود ہی جانا چاہتے تھے۔

وہاں میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ پایا تھا۔ ایک عجیب طرح کی بو محسوس ہوئی۔ کچھ دیر تک میں سوچتا رہا کہ یہ کیسی گندھ ہے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا: بڑے رائے کی ایک بچازاد بہن تھی۔ ان ہی کے والد پاگل قرار دے دیے گئے تھے۔ منجھلے رائے بڑے رائے کے معاملے میں اکثر اس کی مثال دیا کرتے تھے۔ ان ہی کی ٹانگوں کے درمیان ایک پھوڑا ہو گیا تھا۔ پاس بیٹھنے والوں کو بدبو آیا کرتی تھی۔ تب میں بچہ تھا۔ لوگ کانا پھوسی کیا کرتے تھے کہ شوہر کے مرنے کے بعد انھوں نے کسی چھوٹی ذات والے کو رکھ لیا تھا ـــــ اسی کی سزا ہے! کچھ کچھ ویسی ہی بدبو مجھے یہاں بھی محسوس ہوئی تھی۔ میں چپ چاپ کھسک آیا۔ رحمت اللہ جما رہا۔ پتہ نہیں اسے بدبو آئی یا نہیں ـــــ اس کے بعد میں پھر شاید کوٹھے پر نہیں گیا۔ اگر گیا تو مجھے ہمیشہ وہاں سے ویسی ہی بدبو آتی محسوس آئی تھی جیسی اس دن آئی تھی۔ ہو سکتا ہے میرا وہم ہو، لیکن تھا کچھ ضرور۔ البتہ رحمت اللہ ان کا ساتھی بن گیا تھا۔ وہ اکثر ساتھ لگ لیتا تھا۔ کشن بابو کو ذرا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ کون کس معیار کا ہے اور کس کے ساتھ کہاں جانا چاہیے۔ خیر، میں نے رحمت اللہ کے کان میں کہا "تم ان کے سب ٹھکانے جانتے ہو، جہاں ہوں، پکڑ لاؤ۔ بڑے رائے اس وقت کچھ کرنے کے ارادے میں ہیں۔" اس وقت لفظ 'موڈ' رائج نہیں ہوا تھا۔ اس کا چلن بہت بعد میں ہوا۔ لیکن اب منہ پر چڑھ گیا۔ میرے بیٹے پوتوں پر تو ہر وقت ہی موڈ سوار رہتا ہے۔

وہ بولا ـــــ "لیکن وہ اس حالت میں بڑے رائے کے سامنے کیسے آئیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ چل اور بول ہی نہ پائیں۔"

اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ان سے کہا "تم انھیں کل سویرے بڑے رائے کی پوجا سے اٹھنے سے پہلے بلا لانا۔ اس وقت بڑے رائے بھی پُر سکون ہوں گے اور وہ بھی شاید پیے نہ ہوں۔"

میں نے جا کر بڑے رائے کو یہ ہی بتا دیا کہ کشن بابو گھر پر نہیں ہیں۔ مقدمے کے

سلسلے میں کہیں گئے ہیں۔"

وہ دھیرے سے بولے "میں جانتا ہوں۔" رُک کر بولے "تم اپنا خیال رکھا کرو کہیں کوئی گندی سندی بیماری جان کو نہ لگالینا۔"

زمینداری ایسوسی ایشن والے اس واقعے کے بارے میں کچھ زمیندار تو خوش تھے۔ زیادہ تر فکر مند ہوگئے تھے۔ جب بڑی رائے جیسی ہستی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو ہم لوگوں کے ساتھ کیا نہیں ہو سکتا؟ ڈک کا برتاؤ بہت ناشائستہ تھا۔ ڈک نے جان بوجھ کر بڑے رائے کی بے عزتی کی تھی یہ راز کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ڈک نے ایسا کیوں کیا؟ اسے یکایک کیا ہو گیا؟ اب تک تو یہ ہی جانتے تھے کہ خواہ کوئی بھی کلکٹر آئیں اسے بڑے رائے سے دوستی رکھنی ہی پڑتی ہے۔ لیکن پانسہ ایک دم پلٹ گیا تھا۔

بڑے رائے اس تبدیلی کے راز کو بخوبی سمجھتے تھے۔ ڈک کو اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کی میم کی بگھی میں ٹکر مارنے والی گاڑی ہماری ہی تھی۔ انھیں اپنے بیٹے اور اپنی بھول کا احساس تھا۔ اس رات انھیں اس طرح نہیں لوٹ آنا چاہیے تھا۔ بتا کر آتے۔ ایس۔ پی۔ سے بھی بیکار ہی جھوٹ بولے۔ انھیں ہی بتا دیتے تو بات اتنی نہ بگڑتی لیکن بیٹے کی محبت ـــــ انھیں لگا کہ اولاد کی محبت کا اتنا دبیز پردہ آنکھوں پر پڑ جاتا ہے کہ وہ بھی نظر نہیں آتا جو سامنے کھلا پڑا رہتا ہے اس چھٹکل جیسے کے ذریعے کرائی گئی بے عزتی تو ان کے دل کو ڈس ہی رہی تھی لیکن اس بات کا بھی انھیں دکھ تھا کہ ان کی اپنی غلطی سے ساکھ گر گئی۔ جو لوگ انھیں چاندی کے برتن میں رکھے گئے پانی کی طرح سچا اور پہاڑ کی طرح اٹل سمجھ رہے تھے وہ اب ان کے بارے میں بالکل ہی دوسری باتیں سوچنے لگے۔ آخر انگریز بادشاہ ہے، باقی سب رعایا ہے ـــــ چاہے زمیندار ہوں یا جاگیردار یا پھر کاشتکار۔ ہمیں گستاخی کرنے اور اس سے ٹکرانے کا کوئی اختیار نہیں۔

آخر کار انھوں نے طے کر لیا کہ وہ کپتان فلپ وڈ سے مل کر سچ بتا دیں گے۔ ہو سکتا ہے بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرا دیں۔ اس حالت میں بگڑی بات بھی بن سکتی ہے۔ ان ہی لوگوں نے ہمیں یہاں بٹھایا اور یہ ہی لوگ ٹانگ گھسیٹنے لگیں تو گریں گے ہی۔ ہماری روشنی ان

ہی کی روشنی سے ہے۔ وہ لوگ اور میں جو مخالفت بھی کرتے ہیں اور باعزت بھی رہتے ہیں۔ ان کی وہ مخالفت ہی ان کی روشنی ہے ہر ایک کا اپنا طریقہ ہے اور اپنی شرطیں ہیں۔ روشنی دینے کی بھی اور لینے کی بھی۔ جن کی نہ کوئی شرط ہے نہ کوئی توقع وہ اوپر والا ہو تو ہو، انسان تو نہیں ہو سکتا۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ کلب جانا چھوڑ کر انھوں نے اپنے کو سب سے کاٹ لیا ہے۔ ان کے اندر کبھی کبھی ایک مایوسی سی ابھر آتی تھی۔ وہ سموریا بالوں والے بھیگے جانور کی طرح مایوسی کا بھیگا پن چھوڑ کر پھر تر و تازہ ہو جانا چاہتے تھے۔ کبھی انھیں ایسا لگتا تھا کہ وہ ایسا کر سکیں گے اور کبھی وہ سوچتے تھے کہ ایسا کر سکنا ان جیسوں کے لیے ممکن نہیں۔ اس کے لیے آتش مخالفت کی تپش ضروری ہے جسے ان کے بزرگوں نے پتہ نہیں کب کا بجھا دیا تھا۔

وہ کئی دن اسی کشمکش میں کھوئے رہے۔ ایک سوال کا جواب دوسرے سوال سے کاٹتے رہے۔ ایک دن انھوں نے کچھ سوچا۔ گاڑی منگوائی۔ اس پر سوار ہوئے۔ سوار ہوتے وقت ان کے قدموں میں ہلکی سی لغزش تھی۔ پھر بھی انھوں نے ارادہ تبدیل نہیں کیا۔ وہ سیدھے کلکٹر صاحب کے بنگلے پر پہنچے۔ اس رات کے بعد آج آئے تھے۔ ایک درخت کلہاڑی سے کاٹا جا رہا تھا۔ انھیں ہلکا سا ڈر محسوس ہوا۔ اتنا بڑا ہرا بھرا درخت اور اتنی بے رحمی سے کاٹا جا رہا تھا انھیں اچھا نہیں لگا۔ پتہ نہیں کب سے پروان چڑھ رہا ہوگا۔ کس کس نے اور کیسے کیسے سینچا ہوگا۔ کون کون اس کے سائے میں بیٹھا ہوگا۔ ان کے جی میں آیا کہ لوٹ جائیں۔ وہ سب کلہاڑے انھیں اپنے کانوں کے پاس بجتے ہوئے لگے۔ ایک طرح سے سر پر ہی سمجھیے۔ لیکن سامنے ہی برآمدے میں مسیز ڈک کھڑی تھیں۔ شاید پیڑ کٹوا رہی تھیں۔ مسٹر ڈک کا کچہری کا دن تھا۔ اس زمانے میں کلکٹر لوگوں کے پاس بھی انصاف کرنے کے اختیارات ہوتے تھے۔ بڑے رائے نے وہیں سے گندمار تک کی۔ مسیز ڈک کی پیشانی شکن آلود سی نظر آئی۔ بڑے رائے کا دل اپنے بارے میں ان شکنوں کے ذریعے کی گئی بے عزتی کے احساس سے متاثر ہو گیا۔ خصوصاً ایک عورت کے ذریعے۔ مسیز ڈک سے کبھی کبھی ان کا بے تکلف دوستی کا رشتہ تھا۔ لوگ آگے پیچھے ذکر کرتے تھے۔

مسیز ڈک نے کہا ـــــ "ویل مسٹر بڑے رائے۔ مسٹر ڈک تو کورٹ گیا ـــــ آج ان کا کورٹ کا دن ہے۔"

"نہیں، بھولا نہیں۔ حاکم کی بات بھلا کیسے بھولی جا سکتی ہے۔"

مسیز ڈک نے ان کی طرف دیکھا۔ بڑے رائے نے بات موضوع بدلنے کے لیے کہا "پرانے پیڑ کا سایہ گھنا ہوتا ہے۔ اسے کیوں کٹوا رہی ہیں؟"

"اس کا شیڈ ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا، ہمارے کورٹ یارڈ میں جھانکتا ہے۔"

"پتے چھنوا دیجیے۔"

"پھر بڑھ جائیں گے۔ کوئی بے حساب بڑھنے لگے تو اسے کاٹ دینا ٹھیک ہے۔ آپ تو اتنا بڑا زمیندار ہے۔۔۔!"

وہ ہلکا سا مسکرائے "میری زمینداری کی بات چھوڑیئے ـــــ آپ لوگ تو اس ملک کے بادشاہ ہیں۔"

مسیز ڈک نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہا نہیں۔ بڑے رائے ہی بولے "میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں اس رات بھی آیا تھا جب آپ کی گاڑی سے ایک گاڑی ٹکرا گئی تھی۔ چونکہ جمعدار نے آکر بتایا، صاحب نے کل آنے کے لیے کہا ہے تو میں لوٹ آیا۔ میں یہ ہی کہنا چاہتا تھا کہ اس دن میرا بچہ گاڑی ہانک رہا تھا۔۔۔ گھوڑا بگڑ گیا۔۔۔ وہ سنبھال نہیں پایا اور مڑتے ہی آپ کی گاڑی سے ٹکرا گیا۔ میں اس بات سے بہت شرمندہ ہوں اور دکھی بھی۔۔۔ میرے دل پر اس کا بہت بوجھ تھا۔ کہہ دینے سے ہلکا ہو گیا اب آپ جو چاہیں کریں۔"

"لیکن۔۔۔"

میں نے آپ کو پوری بات بتا دی۔ یہ کیسے ہوا، کیوں ہوا۔۔۔ میں اس سلسلے میں کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ بدقسمتی پر مبنی تھا۔ آپ کو جو چوٹ آئی وہ میرے روئیں روئیں میں ٹیس بن کر محسوس ہوتی ہے۔ جسم میں لگی چوٹ تو کبھی نہ کبھی ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن جب وہ انسان کے اندر گھس جاتی ہے تو ٹھیک

ہونا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کو لگی وہ چوٹ میرے اندر پیوست ہو کر رات دن درد کرتی ہے۔ بس، میں اتنا ہی کہنے آیا تھا۔"

وہ ایک منٹ چپ رہیں۔ بڑے رائے لوٹنے لگے۔ اس درمیان اس کٹتے درخت پر پڑنے والے کلہاڑوں کی آواز بے آواز ہو گئی تھی۔ انھیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلی بار مسیز ڈک کی آواز ہی سنائی پڑی ـــــ "آپ بیٹھیے۔"

"اس بنگلے میں بیٹھ کر آپ کی دوستی سے لطف اندوز ہونا اب میری قسمت میں نہیں۔ بیٹھوں گا بھی تو کس منہ سے؟"

"ویل رائے صاحب، پلیز بیٹھیے! دراصل ڈک بہت ناراض ہے اس لیے اس نے رحمت اللہ کو نوکری سے نکالا۔ زمینداری ایسوسی ایشن جو ہوا وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آپ پر نیشنلسٹ گروپ کا دباؤ ہے۔ بس" رک کر بولی "اگر آپ کے ساتھ وہاں یہ برتاؤ نہ ہوا تو کیا آپ اپنی غلطی مانتے؟"

"ضرور! لیکن شاید کچھ دن بعد۔ وقت میں طے کرتا لیکن زمیندار ایسوسی ایشن کا واقعہ اس دن کو جلدی لے آیا۔ میں نے سوچا تھا کہ جب غلطی تسلیم کرنے جاؤں گا تو ہرجانہ بھی پیش کروں گا۔ مسز ڈک کی ناراضگی بھی جائز ہے لیکن وہ ایک دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔ اس کی مجھے امید نہیں تھی مجھے لگتا ہے کہ حاکم کو یہ پتہ نہیں لگنا چاہیے کہ وہ کب کس انتہا پر پہنچ گیا۔ پھر بھی انھوں نے جو کیا۔۔۔ وہ چاہتے تو اس سے بھی زیادہ کر سکتے تھے۔" مسیز ڈک بھرپور نظروں سے اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کی تھوڑا ٹھہر کر بولیں "مجھے آپ کی بات پر بھروسہ ہے۔"

بڑے رائے کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔ پھر بولے "آپ میرے آنے کو نہ کسی طرح کا دباؤ سمجھیے اور نہ صفائی۔۔۔ میں صرف آپ کے ساتھ ہوئی اس دن کی زیادتی سے پریشان تھا۔ اسی سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔ ویسے بھی آپ ایک معزز خاتون ہیں۔ اس لیے مجھے آپ سے معذرت خواہ ہونے میں کوئی گریز نہیں۔ میں اپنا وہی فرض ادا کرنے آیا ہوں۔"

"ایسا مت کہیے۔"

"اب میں چلتا ہوں۔۔۔ اجازت دیجیے۔"

بڑے رائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسیز ڈک بھی کھڑی ہو گئیں۔ چار چھ قدم ساتھ چلیں۔ درخت کاٹنے کی آواز یکایک اتنی تیز ہو گئی بڑے رائے کے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ دھیرے بولیں "میں ڈک سے بات کروں گی۔"

بڑے رائے نے درخت کی طرف دیکھا اور گاڑی پر بیٹھ گئے۔

مسیز ڈک نے ڈک سے بات کی یا نہیں اور اگر کی تو ان کی بات کا ڈک پر کتنا اثر ہوا یہ کہنا مشکل ہے لیکن ایک عجیب و غریب حادثہ ہوا۔ سفید نام کا جو گھوڑا اس دن تنگ میں جتا ہوا تھا، سارے کا سب سے قد آور گھوڑا تھا۔ اس پر سوار ہوتے ہوئے یہ کبھی نہیں لگتا تھا کہ کسی عام گھوڑے سوار ہیں بلکہ لگتا تھا کہ کسی درمیانے ٹیلے پر سوار ہیں اور وہ چل رہا ہے حالانکہ ٹیلے کبھی نہیں چلتے۔ وہ گھوڑا حویلی کی شان تو تھی ہی، شہر کی شان بھی تھا۔ شہر کی جن نایاب چیزوں کا ذکر ہوتا تھا ان میں سفید شامل تھا۔ جب وہ واقعہ ہوا تو رحمت اللہ کے مشورے پر اسے شہر سے باہر زمینداری میں بھیج دیا گیا تھا۔ "سفید" سے مجھے بھی موہ ہو گیا تھا۔ شام کو سب گھوڑے حویلی پر دانہ کھانے آتے تھے۔ ان کے منہ پر توبڑے چڑھا دیے جاتے تھے تو گردن ہلا ہلا کر اس طرح دانے کھاتے تھے جیسے ماں کا دودھ پیتے وقت بچھڑے تھن میں منہ مارتے ہیں ان کے گلوں میں پڑے منکے بج اٹھتے تھے۔ سب سے آگے سفید رہتا تھا۔ وہ پیچھے رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے پیچھے رہ جاتا تھا تو کسی نہ کسی طرح آگے آ جاتا تھا ایک بات اور تھی۔ وہ ہمیشہ سائیس کے ساتھ آتا تھا۔ اگر کبھی کوئی گھسیارا پکڑ کر لانا چاہے تو کافی تنگ کرتا تھا۔ کودتا پھاندتا تھا —— دانہ نہیں کھاتا تھا۔ آنے پر سب سے پہلے وہی گھرگھراتا تھا۔ باقی گھوڑے باری باری سے اس کی تقلید کرتے تھے۔ میں اسے سحر زدہ انداز سے دیکھا کرتا تھا۔ بڑے رائے گھر پر ہوتے تھے تو اپنے سامنے گھوڑوں کو دانہ کھلواتے تھے۔ دانے کے توبرے چڑھ جانے کے بعد وہ یکے بعد دیگرے سب کی گردنیں سہلاتے تھے۔ جانور لمس کی زبان ایسی سمجھتے ہیں کہ ہم الفاظ کی زبان نہیں سمجھ پاتے۔ کبھی کبھی بڑے رائے بالارادہ سفید کو نہ سہلا کر کسی دوسرے کے پاس کھڑے ہو جاتے تو سفید بری طرح گردن ہلانے لگتا تھا اور پیر پٹخنا شروع کر دیتا تھا۔ جب تک بڑے رائے لوٹ کر ان کے پاس نہ آ جائیں اور اسے نہ چھو

ویں اس کی بے چینی کم نہیں ہوتی تھی۔ سفید کے باہر بھیج دیے جانے پر ہم لوگوں کو تو بہت برا لگا ہی تھا گھوڑوں میں بھی ایک سناٹا سا چھا گیا تھا۔ سب کان گرا کر آتے تھے۔ بس جب بڑے رائے انھیں سہلاتے تھے تب بھی کان ہلاتے تھے۔ گھوڑے کے کان خطرے اور جنگ اور سواری کے وقت کھڑے ہوتے ہیں۔ پیار کے وقت یا کوچوانی کی ڈانٹ کے وقت وہ انھیں دبا لیتا ہے۔

سفید کی زمینداری میں چلے جانے کے بعد اس کی ناموجودگی تو کھلتی ہی تھی، گھوڑوں کی دانہ کھاتی وہ قطار بھی کچھ بجھی بجھی سی لگتی تھی۔ ایک رات یوں ہوا کہ وہ پچیس تیس میل کی منزلیں طے کر کے حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ رات کو حویلی کا دروازہ گڑھی کی طرح بند ہو جاتا تھا۔ ویسی بھی حویلی گڑھی کی طرح لوہا لاٹ تھی۔ وہ دروازے کو پیٹھ سے دھکیلتا رہا۔ اس کی پیٹھ پر خراشیں پڑ گئیں۔ ان سے خون چھلک آیا۔۔۔ بیچ بیچ میں وہ پیروں کے بل کھڑا ہو کر اپنے پاؤں سے دروازہ کھولنے لگتا تھا، لیکن دروازے میں ذرا بھی جنبش نہ تھی۔ صبح جب دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو اتاولا ہو کر پیر پٹخنے لگا بلکہ بچوں کی طرح ناچنے لگا۔ دراصل، اس زمانے ہر دروازے کے پیچھے موسل لگا ہوتا تھا۔ دروازہ بند کیا موسل کھینچ دیا۔ دروازے کے موسل کے بارے میں اس زمانے میں اچھے برے بہت سے مذاق چلتے تھے۔ عموماً جبر کی ماری عورتوں کے بارے میں۔ دیوار کے اندر سے دو دو آدمی کھینچ کر چڑھاتے تھے اور دو ہی آدمی اتارتے تھے۔ موسل اندر گرنے کی آواز سے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ دروازہ کھلنے والا ہے دروازہ کھولا تو سفید دو پیروں پر کھڑا ہو کر ہنہنایا۔ دروازے کھولنے والے ڈر کے مارے پیچھے ہٹے تو ان میں سے ایک لڑھک گیا۔ سفید تیزی کے ساتھ اندر بھاگا اور وہیں جا کر رکا جہاں شام کو راتب کھاتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اچھی خاصی لمبی سڑک تھی لیکن ایسا لگا جیسے یہاں سے اڑا اور وہاں جا اترا۔ وہ صحن میں جا کر زور زور سے پیر پٹخنے لگا۔ بڑے رائے سامنے والے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھ کھل گئی دیکھا تو وہ دھک سے رہ گئے ــــــ ”ارے یہ سفید کہاں سے آ گیا؟!“

وہ فوراً باہر نکل آئے۔ انھیں دیکھ کر وہ اور بے چین ہو گیا۔ حتی کہ اس کا پیشاب نکل گیا۔ وہ مٹی میں بری طرح اٹا ہوا تھا۔ اس کے ایال بھی لمبے ہو گئے تھے وہاں کسی نے کٹوائے تک نہیں تھے۔ انھوں نے چبوترے پر کھڑے کھڑے اس کے ایال میں ہاتھ ڈال کر

گردن سہلائی۔ اس نے اگلے پاؤں چبوترے پر رکھ دیے۔ بڑے رائے نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے پاؤں نیچے اتار لیے جیسے تھکان اتر گئی ہو۔ پھر اس سے بولے "سفید بیٹے، تو اکیلا کیسے آ گیا؟ تجھے کون لایا؟"

اس کی آنکھوں سے بہنے والے پانی کی دو لکیریں بن گئیں۔ انھوں نے بھوانی کو آواز دی۔ بھوانی صبح چار بجے اٹھ کر جنگل جاتا تھا۔ پانچ بجے تک لوٹ آتا تھا تب تک وہ گیا نہیں تھا۔ آواز سنتے ہی دوڑ کر آیا۔ سفید کو کھڑا دیکھ کر وہ بھی حیران تھا۔ بڑے رائے بولے "اس کے لیے دانہ بھگو دو۔ پتہ نہیں کب کا چلا ہوا ہے۔ بھوکا ہوگا" پھر بولے "وہاں بھی ڈیرے پر لوگ پریشان ہوں گے۔ کسی ہرکارے کو دوڑا دو ـــــ شام تک پہنچ جائے گا کہ سفید صحیح سلامت حویلی پر پہنچ گیا۔ کالے سے بھی کہہ دینا اسے آ کر لے جائے، اس کی مالش والش کرے، نہلائے دھلائے۔۔۔ بری طرح گندہ ہے۔۔۔ ایک دم جانور لگ رہا ہے" یہ کہہ کر پیار سے ہنس دیے جیسے ان کا اپنا بچہ ہو۔

رات کا دانہ بچا ہوا تھا۔ بھوانی توبڑے میں ڈال کر لے آیا۔ رائے نے خود اپنے ہاتھ سے اس کے منہ پر توبڑا چڑھایا۔ سفید نے بڑے رائے کی طرف پھر اس طرح دیکھا کہ بڑے رائے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

تب تک پوری حویلی میں شور مچ گیا تھا کہ سفید رات میں لوٹ آیا۔ حویلی کی خواتین جھروکوں سے جھانک رہی تھیں۔

میں بھی اوپر سے آ گیا تھا۔ جب سے ماں مری تھیں تب سے بڑے رائے نیچے سونے لگے تھے۔ میں اوپر کے کمرے میں سوتا تھا۔ منجھلی چاچی کا کمرہ بند رہتا تھا۔ جب تک چھوٹے چاچا کالج میں رہے تب تک رانی اور ارن چاچی کے پاس ان ہی کے کمرے میں سوتے رہے۔ چھوٹے رائے کے آنے کے بعد وہ دونوں ان کے برابر والے کمرے میں چلے گئے۔ نوکرانی امرتی ان دونوں بچوں کے پاس سوتی تھی۔ ارن رات کو کبھی کبھی اٹھ بیٹھتا تھا۔ اس وقت اسے سنبھالنے کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ کافی ہڑدنگ مچا تھا۔ اس وقت ارن بھی بیٹھا تھا اور رانی کے پیچھے پیچھے آ کر اور اس کا دامن پکڑ کر دہلیز پر کھڑا ہو گیا حالانکہ رانی ابھی

چھوٹی تھی پھر بھی اس کا پلے کی طرح کُد کڑ لگاتے ہوئے باہر صحن میں دھمک پڑنا بند ہو گیا تھا۔ بچے اس معاملے میں خود سمجھتے جاتے ہیں کہ کس عمر میں کیا ٹھیک ہے۔ خاص طور پر لڑکیاں اس بے چاری کو نوکر تک ٹوک دیتے تھے ـــــ رانی بٹیا جاؤ اندر۔ کالا یا رحمت اللہ میں سے کوئی ہوتا تو ڈانٹ بھی دیتا۔ اس کا بہت جی چاہ رہا تھا کہ سفید کے پاس تک جائے اور دیکھے لیکن وہ دہلیز کے باہر نہیں آئی۔

چھوٹے رائے بڑے رائے کے برابر میں ہی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے بلایا "رانی بٹی، آجاؤ باہر آجاؤ۔ دیکھو یہ سفید کتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں پہنچا ہے۔ تمھیں دہلیز لانگھنے میں ڈر لگتا ہے۔"

اس نے بڑے رائے کی طرف دیکھا، وہ کچھ نہیں بولے۔ پہلے چھوٹے رائے کی بات بڑے رائے کم ہی کاٹتے تھے، وہ دہلیز لانگھ گئی۔ سفید اسے دیکھ کر پیر پٹخنے لگا۔ کچھ مہینے پہلے تک جب وہ حویلی پر جاتا تھا تو رانی سفید کو اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ کھلاتی ضرور تھی پہلے تو وہ ڈرتی تھی لیکن بعد میں کالے نے اس کے ہاتھ سے گھوڑوں کو برسیم کھلوا کھلوا کر سب سے دوستی کرا دی تھی۔

میں سفید کو دیکھ کر اچانک فکر مند ہو گیا تھا۔ بڑے رائے کی ماتھے پر بھی تشویش کی لکیریں ابھرتی جا رہی تھیں۔ وہ کالے سے بولے "یہ اچھا نہیں ہوا کالے، سفید یہاں اکیلا چلا آیا" پھر بولے "جب سے آیا ہے پاؤں پٹخ رہا ہے یا ہل رہا ہے ـــــ جانور کو تھان پر بلنے کی عادت پڑ جاتی ہے تو نہ یہ مالک کے لیے ٹھیک رہتا ہے اور نہ تھان کے لیے۔ اس بات کا دھیان رکھنا ـــــ اور اسے باہر بھی مت نکالنا!"

کالا اسے اصطبل لے گیا۔ بڑے رائے اور زیادہ فکر مند ہو گئے۔

رحمت اللہ کو پتہ چلا تو اس کے منہ سے نکل پڑا کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔

بڑے رائے نے سب سے پہلے اس ہی کو بلوایا۔ اس نے ان سے بھی وہی بات دہرائی کہ سرکار یہ اچھا نہیں ہوا۔ سفید لاکھوں میں پہچانا جا سکتا ہے۔

"ہوں" کیا اور پھر بولے "میں نے ڈک صاحب کی میم کو سب کچھ بتا دیا۔"

وہ چونک گیا۔ بولا کچھ نہیں۔

"مجھے اسی دن بتا دینا چاہیے تھا ـــــ میری وجہ سے تمھاری ملازمت بھی چلی

گئی۔ ہم لوگ بہت خود غرض ہوتے ہیں۔"

نہیں حضور۔ بہت مزے میں ہوں۔ نوکری سے نوکری ہی بھلی۔ نوکری سے چھٹنا بھی اپنے اوپر گرتا ہے۔"

"وہاں پنشن ملتی، انگریز صاحب خوش ہوتا تو اور بھی بہت سے فائدے ہوتے۔ رائے بہادر گھمنڈی لال مسٹر ولسن کی کار چلایا کرتے تھے۔ ولسن جنگل کے ٹھیکیدار تھے جب ولسن یہاں سے جانے لگا تو ٹھیکوں کا کام گھمنڈی لال کو دے گیا۔ "بولا" ویل، گھمنڈی لال تم نے ہمارا بوت خدمت کیا اب ہماری طرف سے ٹھیکیداری کا کام تم دیکھے گا۔ ہمارا میم صاحب کو انگلینڈ کی بوت یاد آتا ہے تم ہم کو دس ہزار روپے سالانہ بھیجے گا۔" گھمنڈی لال بولے "حضور دس ہزار تو بہت زیادہ ہے" وہ بولا "تو آٹھ ہزار بھیجے گا" اس زمانے کا آٹھ ہزار اب کے پچاس ہزار روپے کے برابر رہے ہوں گے۔ بس گھمنڈی لال بڑھتا چلا گیا۔ جنگ کے دنوں میں خوب پیسہ کمایا۔ سالانہ بھیجا یا نہیں ـــــ رام جانے۔"

"نہیں حضور، پیسے کا کیا ـــــ دل کا سکون بنا رہے، بس یہ ہی دعا کیجئے"

بڑے رائے نے اس کی بات غور سے سنی پھر بدل کر بولے "سفید کا کیا کیا جائے؟"

"سرکار اسے واپس بھجوا دیجئے۔"

بڑے رائے نے ایک منٹ کے لیے آنکھ بند کر لی" رحمت اللہ چونکہ یہ جانور ہے اور اپنا دکھ کہہ نہیں سکتا تو اسے بندھوا کر جلاوطن کر دوں ـــــ کیا ہم اپنے روتے ہوئے بچے کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں؟ وہ کس طرح رات بھر چل کر یہاں آیا ہے ـــــ تم تو جانتے ہو جب اس بریڈ کا جانور محبت کرتا ہے تو گود کے بچے کی طرح ہو جاتا ہے ور جب نفرت کرتا ہے تو چھونے نہیں دیتا۔ اپنی پرورش کرنے والے سے الگ رہنا اسے گوارا نہیں ہوتا ـــــ مالک بدلتا ہے تو خون کے آنسو روتا ہے۔ اسے دھوکہ فریب بالکل نہیں آتا ـــــ اب چاہے جو ہو میں اسے جلاوطن نہیں کروں گا۔"

رحمت اللہ خاموش ہو گیا۔ بڑے رائے کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ سفید کے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔ ڈک کی جانب سے ابھی دوستی کا کوئی اشارہ نہیں تھا وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ایس۔ پی سے ضرور بات ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی اس معاملے

میں ڈک کے ارادے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ بات وہیں کی وہیں رہی۔

کشن بابو آٹھ دس مقدموں میں سے دو بڑے مقدمے ہار چکے تھے دوسرا مقدمہ کافی اہم تھا۔ اس کی ہار کے ساتھ جائیداد کا بہت بڑا حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کشن بابو کے پاس وہ چوبارا اور کچھ شہری جائیداد رہ گئی تھی۔ کشن بابو کو پان میں کوکین رکھ کر کھانے کا چسکہ پڑ چکا تھا۔ ایک ہی پنواڑی تھا رامو جو کوکین کا پان لگاتا تھا۔ بس ایک سلائی بھری اور لگا دی۔ کھانے والا مست۔ کوکین کا پان کھا کر زبان اینٹھ جاتی تھی اور آنکھوں میں سرور آجاتا تھا۔ وہ چپ لیٹے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کوکین سے امساک میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں کوکین کا پان پانچ روپے کا آتا تھا۔ بعد میں جب دام بڑھ گئے تو کوکین کا پان کھانا مشکل ہو گیا۔ تب وہ افیم پر اتر آئے۔ چار آنے بھر افیم یومیہ کھاتے تھے۔ نہیں کھاتے تھے تو پیٹ میں گولہ سا اٹھنے لگتا تھا اور وہ درد سے تڑپنے لگتے تھے۔ افیم ملنے پر ہی وہ پرسکون ہوتے تھے۔

ان کا کم خرچ بالا نشینوں کے یہاں جانا بھی بند ہو گیا تھا۔ سبب پیسے کی کمی۔ لوگوں کی نظر بھی بدل گئی تھی۔ شراب نوشی کے دور بھی رفتہ رفتہ کم ہو گئے تھے۔ مفلسی کا ماحول تھا۔ درودیوار پر بھی سبزے کی طرح مایوسی نظر آنے لگی تھی۔ میں انھیں برابر سمجھاتا تھا کہ اس گندھے سے نکلیے ورنہ تحت الثریٰ تک پہنچ جائیں گے۔ ان کا کیا ہوگا جو چڑیا کے بچوں کی طرح منہ کھولے چگے کا انتظار کر رہے ہیں، بیوی کے علاوہ ان کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتاتے تھے۔ بس ایک بار کسی نازک لمحات میں ان کے منہ سے اتفاقاً نکل گیا تھا، ویسے وہ ان کے لیے ماہانہ خرچ بھیجتے تھے۔ پہلے کم ہوا، اب وہ پوری طرح بند ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی مغموم ہو کر کہتے تھے ــــــ ''ان کا کیا قصور؟ پتہ نہیں کیسے گزر بسر کرتے ہوں گے''۔ میں نے ان سے پتہ بھی پوچھا لیکن انھوں نے بتایا نہیں۔

اب وہ کبھی کبھی بسورنے لگتے تھے۔ ایک دن انھوں نے کہا'' بھاسکر بابو، پتہ نہیں میں اس جائیداد پر کنڈلی مارے کیوں بیٹھا ہوں؟ اس نے جب مسماۃ کے خاندان میں کسی کو نہیں چھوڑا تو پھر ہمیں کیوں چھوڑے گی۔ زمین جائیداد سکوں اور طوائف سے بھی زیادہ چالاک ہوتی ہے۔ کس کو پتہ یہ زمین کب کس کے پاس رہی؟ سکے تو گلا دیے جاتے ہیں اور

طوائف مر جاتی ہے لیکن جائیداد ویسی کی ویسی ہی ایک ہاتھ سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں ـــــ بس چلتی چلی آ رہی ہے چودھریاں بھلے ہی ادلتی بدلتی رہیں۔ ہم اسے اپنا کہتے ہیں ـــــ ! اتنا بہو بیٹی کے لیے نہیں مرتے لیکن اس کے لیے جان دیدیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جتنا میرا حصہ تھا وہ مجھے مل گیا ـــــ اب جس کسی کو جو گنا ہو وہ جو گے۔ میں کاہے کے لیے بیٹھا ہوں۔"

میں نے ایک روز اسی سلسلے میں پوچھا "آپ کہیں تو آپ کے بال بچوں کو یہاں بلوالیں؟"

"وہ کیا کریں گے۔ مجھے بھی تو جانا ہی ہے۔ ایک بار بمبئی گیا تھا تب دیکھا تھا کہ سمندر کتنا بڑا ہوتا ہے۔ دور سے جہاز مچھر مکھی کی طرح آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ بندرگاہ میں آکر وہی کتنے بڑے ہو جاتے ہیں۔ سیٹی بجاتے، رکتے اور لوگوں کو اترتے دیکھ کر لگتا ہے، جہاز بندرگاہ پہنچنے کے لیے کتنا مشتاق رہتا ہو گا ـــــ آکر جیسے اپنے کو ہلکا کر رہا ہے۔ ملاح بھی ایسے خوش ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں انھیں کیا مل گیا۔ بھلے یہ جہاز خالی لوٹے لیکن اپنا ایک بندرگاہ تو ہے ـــــ وہاں اپنے لوگ ہیں، دو چار بیگھا زمین ہے ـــــ سب سے بڑی بات اپنے بندرگاہ پر لوٹ آنے والے ملاح کی مسرت ہے۔ وہ دور بہت دور نکل جانے پر ہی سمجھ میں آتا ہے۔۔۔

ادھر ان کی باتیں ماحول کو اتنا گراں بار بنانے لگی تھیں کہ انھیں زیادہ دیر تک اپنے کندھوں پر سنبھالے رہنا دشوار ہو جاتا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ماحول کو نارمل کیسے کروں؟

وہ اپنے آپ ہی بولے "اس مسماۃ سے میرا کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس کے خاندان میں کسی نے میرے والد کو گود لیا تھا۔ اپنے ورثا کی تلاش میں شاید میرے والد کا نام یاد آ گیا ہو ـــــ انھوں نے اپنے وصیت نامے میں ان کا نام بھی لکھ دیا۔۔۔ اگر فلاں، فلاں اور فلاں تک جائیداد نہ پہنچے تو۔۔۔ دلیپ چند یا اس کے وارث کو یہ جائیداد دے دی جائے۔۔۔ لگتا ہے فلاں والاں کوئی نہیں ملا۔۔۔ کسی نے دلیپ چند کے بیٹے کشن سہائے کا نام سجھا دیا۔۔۔ وکیل نے آکر مجھے دھر پکڑا۔ میں گاؤں کا اجڈ گنوار آدمی۔۔۔ سوچا بھی منع کر دوں لیکن بال بچوں کو لگا کہ یہ کتنا بے وقوف آدمی ہے۔ اتنی بڑی جائیداد مل رہی ہے اور یہ سوچ رہا ہے کہ لوں یا

نہ لوں۔ اس معاملے میں عورتوں کی عقل زیادہ عملی ہوتی ہے۔ بس میری گھروالی کی حاضر دماغی نے بات پکڑلی اور مجھے اس جائیداد پر بٹھادیا! حالانکہ اس بے چاری کو کیا ملا۔۔۔ سب میں نے ہی بھوگا۔ ارے یہ کمبخت، جواب آچکا ہے اسی وقت آجاتا تو یہ آگ میرے پاس تک نہ آتی۔۔۔ میں اس میں بیکار ہی جل مرا۔ میں چاہتا تو اتنے دنوں میں حیثیت بنالیتا لیکن میں گدڑی کو ادھیڑنے میں لگ گیا۔۔۔ جینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جائیداد تو بھی ہم لوگوں کی طرح سوچتی ہوگی ـــــ ارے یہ نکھٹو کہاں چلے پڑ گیا ـــــ اس سے پیچھا چھڑا، شراب، کوکین، ناچناگاناوغیرہ کالالچ۔۔۔ اگھروالے دور ہوگئے۔ ایک بار میری گھروالی دونوں بچوں کو لے کر آگئی ـــــ میں نے اسے الٹے پاؤں واپس کردیا۔ تو یہاں کیا کرے گی ـــــ جیسے میں بہت کچھ کررہا تھا۔ پتہ نہیں ہم چھوٹے لوگ جب کچھ ہو جاتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے گھروالوں کو ہی کیوں دھتکارتے ہیں ؟ دیکھو بھاسکر، کیسے مزے کی بات ہے، وہ آئی تو میں نے بھگادیا، اب میں جاؤں گا تو وہ اپنی پلکوں پر بٹھائے گی ـــــ جشن منائے گی کہ میرا نکھٹو مالک سب کچھ کھوکر لوٹ آیا‘‘ وہ ایسے ہنسے کہ مجھے لگا کہ میں رو دوں گا۔

اس دن وہ بہت بول رہے تھے۔ شاید انھیں اچانک حساس ہوا کہ وہ واقعی بہت بول رہے ہیں۔ انھوں نے کوکین کاپان منہ میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد اس کی زبان سن ہوگئی۔ وہ اپنے غم کی لذت سے اٹھ کر اس نشیلی لذت میں ڈوب گئے۔ وہ رو رہے تھے نشے کی وجہ سے یا اس درد کے سبب ـــــ ! میں اٹھنے لگا تو انھوں نے آنکھیں کھولیں اور اس طرح دیکھا کہ میں ابھی نہ جاؤں بیٹھا رہوں میرے اوپر زمینداری کا بوجھ دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا بلکہ ارادتاً بڑھایا جارہا تھا جس سے میں نئے نئے نکالے جارہے گھوڑے کی طرح جلدی چال پر آجاؤں۔

میں اٹھ گیا۔ میرے من میں ایک سوال تھا ـــــ اگر کشن بابو کو جانا ہی ہے تو ابھی ابھی کیوں نہیں چلے جاتے۔

ایک رات حویلی کے صدر دروازے کی کنڈی بجی وہ کافی زور سے اور جلدی جلدی بج رہی تھی۔ عموماً کنڈی ایک دوبار بج کر جواب کا انتظار کرتی ہے لیکن یہ بجنا اس کا ذرا بھی انتظار نہیں کررہا تھا۔ کافی اتاؤلا پن تھا۔ ہمارے یہاں گجر بجنا بہت پہلے بند ہو گیا تھا۔ گجر وہیں

بجتا ہے جہاں خزانہ رہتا ہے۔ پہلے وصولی حویلی میں ہی خزانے میں رہتی تھی۔ اب بکتے بکتے زمینداری کی آمدنی اتنی نہیں رہ گئی تھی۔ پہلے تقریباً پندرہ لاکھ کی جلد بندی تھی۔ وہ سستا زمانہ تھا۔ سونا بیس بائیس روپے تھا۔ گیہوں بھی تین دھڑی یعنی پندرہ سیر ایک روپے میں آتا تھا۔ آمدنی کم ہوئی سو ہوئی۔ پاس ہی ایک بینک بھی کھل گیا تھا۔ بینک ہمارے خاندان والوں کا تھا۔ اس لیے فیل ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ فیل ہونے سے پہلے ہی اس میں سے دھن نکالا جاسکتا تھا۔ خیر، گجر کی بات تھی۔ کچھ دن تو خزانے کے بغیر ہی گجر بجتا رہا۔ پھر بند ہو گیا۔

دروازہ کھلوا لیا گیا۔ کالا سامیس بدحواس سا کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے بول نہیں نکل رہے تھے۔ گھگی بندھی ہوئی تھی۔ تب تک بڑے رائے اور چھوٹے رائے نکل کر باہر چبوترے پر آگئے تھے۔ چھوٹے رائے اس دن بڑے رائے کے پاس ہی سوئے تھے۔ بڑے رائے کی طبیعت تھوڑی خراب تھی۔ شام کو ان کا درد تیز ہو گیا تھا۔

کالے کو دیکھ کر بڑے رائے نے پوچھا "کیا بات ہے کالے؟ خیریت تو ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" منہ سے پورا جملہ نہیں نکل رہا تھا۔ چھوٹے رائے نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس بندھائی "گھبراؤ نہیں۔ آرام سے بتاؤ کیا بات ہے؟"

تھوڑی دیر وہ اسی طرح بلبلاتا رہا، جیسے اس کی سانس گلے میں پھنس گئی ہو۔ چھوٹے رائے کے کافی ہمت بندھانے پر وہ اتنا ہی کہہ سکا "حضور، سفید تھان پر نہیں ہے" اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس زمانے میں لوگوں کا ہنسنا رونا سب اصلی ہوتا تھا۔ بڑے رائے زور سے چلائے "تم سب کہاں مر گئے تھے؟"

جیسے کالے کا کسی نے گلا دبا دیا۔ گھر گھر کی آواز آنے لگی۔ لگا اس کا گھڑ دا بول رہا ہو، چھوٹے رائے نے ہمت بندھائی "گھبراؤ نہیں ــــ بتاؤ گے نہیں تو کیسے پتہ چلے گا!"

وہ روتے روتے بولا "حضور اصطبل کا دروازہ کھلا ہے ــــ اگاڑی پچھاڑی کٹی پڑی ہے۔"

بڑے رائے کا وہ جاگیردار ہوشیار ہو گیا جس کی ترجیحات کی فہرست میں ایسے لوگ یا تو سب سے نیچے ہوتے ہیں یا ہوتے ہی نہیں۔ انھوں نے بینت اٹھائی۔ چھوٹے رائے بیچ میں آگئے۔ کالا ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ان کا ہاتھ رک گیا۔ وہ تیزی میں بولے "اگر میرے سفید کو کچھ ہو گیا تو سب کو ایک لائن میں کھڑا کروا کر گولیوں سے بھنوا دوں گا" حالانکہ

انھوں نے کچھ زیادہ بڑی بات کہہ دی تھی۔ کھال کھنچوانے والی بات تو نہ کہی جا سکتی تھی۔

چھوٹے رائے نے دھیرے سے کہا "بڑے بھیا اس کی پوری بات تو سن لیں۔"

"دروازہ کیسے کھلا" بڑے رائے کی آواز نیچے، جہاں وہ کھڑا تھا، آئی "کنڈا لگا تھا" اس نے سکتے ہوئے کہا۔

"آس پاس پوچھ تاچھ کی؟"

"رات میں کون بتاتا ـــــ وہ پگلی راستے میں چلا رہی تھی ـــــ رائے کے گھوڑے پر سپاہی ـــــ میں نے اس سے پوچھا تو وہ گالی دے کر بولی 'ابے تیرے رائے کے گھوڑے پر سپاہی ـــــ اور رائے کے سر پر چارپائی۔ بڑے رائے جانتے تھے کہ پگلی کسی کو کچھ بھی کہہ سکتی ہے ـــــ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ ضرور کوئی سرکاری کھیلا ہے۔ انھوں نے کہا "جلدی سے گاڑی نکالو۔"

چھوٹے رائے بولے "بڑے بھیا اگر اس میں حکومت کا ہاتھ ہے تو آپ کیا کر سکیں گے۔ ہر حکومت کی ایک غیر انسانی طاقت ہوتی ہے جو قانون دشمن لوگوں کو ہی تنگ نہیں کرتی، ناراض ہو جانے پر کسی کو بھی کر سکتی ہے۔ ہاں آمنے سامنے مخالفت میں کھڑے ہو جانے پر زیادہ کچھ نہیں کر پاتی۔ آپ رات بھر درد سے کراہتے رہے ہیں۔ اگر چوری ہے تو اس کا سویرے بھی پتہ چل سکتا ہے اور اگر حکم ہے تو اس کی بھنک بھی نہیں ملے گی۔"

"راگھو تم نہیں جانتے کہ یہ درد اس درد سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اشومیگھ کا گھوڑا پکڑا جانے پر ـــــ رام کو کیسا لگا ہوگا اور جب وہ چھڑا نہیں سکے ہوں گے تو اور بھی کیسا لگا ہوگا؟ میں رام نہ ہوتے بھی سمجھ سکتا ہوں۔ ان کا گھوڑا تو بچوں نے ہی پکڑا تھا۔۔۔ لیکن میرا ـــــ پکڑا ہی اس مفروضے پر گیا ہے کہ میری عزت اس میں بند ہے۔"

چھوٹے رائے نے کالے سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑے رائے کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا رہا۔ جب بڑے رائے اندر چلے گئے تب اس نے حرکت کی۔

بڑے رائے کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ انھوں نے چھوٹے رائے سے کہا "تم میری فکر نہ کرو پولس کپتان سے جا کر ملو۔ انھیں پوری بات بتاؤ اور کہو کہ کیا حکومتِ برطانیہ ہم لوگوں

کی عزت اس طرح پیروں تلے روندنے پر اتر آئی ہے؟

سفید کی تلاش میں کئی لوگ مختلف سمتوں میں جا چکے تھے اتنا پتہ چلا تھا کہ سفید شہر میں ہی کسی جگہ چھپایا گیا ہے۔ رحمت اللہ چپ تھا لیکن اندر سے بہت پریشان تھا بڑے رائے چاہ کر بھی بستر سے نہیں اٹھ پا رہے تھے۔ میں اور چھوٹے رائے ہی بھاگ دوڑ رہے تھے۔ پولس کپتان سے ملنے پر بھی کوئی کام نہیں بنا اس نے پوری بات تحمل سے سنی تھی اور یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ اس کی تلاش کرائیں گے اور مجرم کو سزا دیں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ افسروں کی وہی نسل آج تک چلی آرہی ہے۔ وہ جانتی ہے تب بھی وہی کہتی ہے وہ نہیں جانتی تب بھی وہی کہتی ہے۔ رپٹ بہت سنجیدگی سے لکھی گئی تھی لیکن اس عمل کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ انگریز حکومت کے اتنے بڑے زمیندار اور دوست کا گھوڑا چلا گیا۔ سب خاموش ہیں۔

سارا گھر ایک ایسی ذہنی حالت کا شکار تھا جیسے دم بخود ہو۔ وہ گھوڑا گھر کے بچے کی طرح گم ہوا تھا سائیس تو کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔ اوپر سے ڈر کی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی تھی پتہ نہیں کب موت بن کر ان پر آگرے۔ کبھی سائیس چھوٹے رائے اور میرے پاس اپنی اپنی صفائی دینے آچکے تھے۔ ان بیچاروں کے پاس اس کے سوائے تھا بھی کیا حالانکہ میں بھی ان سے ناراض تھا۔ مجھے بھی لگتا تھا کہ اگر وہ چوکس رہے ہوتے تو ایسا نہ ہوا ہوتا۔ چھوٹے رائے ان کی ذہنیت کو سب زیادہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ یہ ہی کہتے تھے "سرکار ہمارا بچہ چلا گیا ہوتا تو ہمیں اتنا دکھ نہ ہوتا ـــــ جتنا سفید کے چلے جانے کا ہے۔ اگر سفید کے جانے میں ہمارا کوئی ہاتھ ہو تو آپ کا کھایا نمک پارے کی طرح ہمارے بدن سے پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔ ہم اور ہمارے بچے اسے پلکوں سے چگیں۔" اپنی سچائی ثابت کرنے کی اپنی اپنی زبان تھی۔

ہم دونوں ان لوگوں کی اپنی اپنی طرح سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کالا تو ایک دم پتھر ہو گیا تھا ـــــ اس خاندان کا ہو کر کپوت نکلا جس نے سیکڑوں برس خدمت کی اور اسے مٹی میں ملا دیا۔ میرے تن کی ایک بوند بھی ایسی نہیں جس میں اس گھر کا ہوا پانی اور نمک نہ ہو۔ اوپر جا کر جب میرے بڑے پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔ وہ کہیں گے جا تیرے خاندان میں اب کوئی گھوڑے کی راس نہ چھو سکے گا۔ یہ سن کر تیرے خاندان سے ہمیشہ کے

لیے چلا جائے گا۔ تو ٹکڑے ٹکڑے کو بھٹکے گا۔

بعد میں ہوا ایسا ہی۔ یہ ہنر اب رہا ہی کہاں؟

بڑے رائے کے لیے کھانا اور سونا دونوں حرام ہو گئے تھے۔ بس لیٹے لیٹے کروٹیں بدلتے تھے کوئی بھی آہٹ ہو فوراً چپ کر دیکھتے تھے۔ شاید کوئی سفید کی خبر لایا ہو۔ کوئی تو آکر کہے کہ سفید مل گیا۔ حالانکہ اب سفید دس سال کا تھا۔ اب بھی وہی جلوہ اور طاقت تھی جو اس وقت تھی جب وہ جوان تھا۔ بڑے رائے سفید کے دم پر ہی لمبے لمبے سفر کر چکے تھے لیکن وہ کہاں چلا گیا؟ زمینداری میں پتہ لگا لیا گیا تھا ـــــ یہ خیال بھی غلط نکلا تھا کہ کہیں وہ کسی بات سے چمک کر جیسے یہاں آیا تھا ویسے وہیں نہ لوٹ گیا ہو۔ بار بار ان کا من کھٹک جاتا تھا۔۔۔ کہیں۔۔۔ لیکن وہ یہ بات منہ سے نہیں کہہ رہے تھے۔ اس امکان کا خیال آتے ہی وہ ایک بے سہارا شخص کی طرح لمبی سانس لے کر رہ جاتے تھے جس کا سب کچھ کوئی طاقت کے زور پر آنکھوں کے سامنے سے چھین لے جائے۔ مجھ سے دشمنی تھی تو تھی۔۔۔ اس بیچارے بے زبان جانور نے کیا بگاڑا تھا۔ اس کا جواب نہ انھیں اپنے سے مل رہا تھا اور نہ باہر سے آرہا تھا۔

سفید کے غائب ہونے کے تیسرے دن صبح صبح کوتوالی سے ایک سپاہی آیا۔ بڑے رائے کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ رحمت اللہ نے رات میں آکر بتایا تھا کہ سفید کلکٹر صاحب کے اصطبل میں پہنچ گیا۔ بڑے رائے ان کے بنگلے پر جانے کے لیے چبوترے پر اپنی داڑھی بنا رہے تھے۔ داڑھی بنانے کے بارے میں وہ انگریز جانے جاتے تھے۔ ان کا کبھی کبھی دن میں دو بار بنانے کا ریکارڈ بھی تھا۔ صبح تو بناتے ہی تھے جب کمرے میں کسی بڑے حاکم وغیرہ کی دعوت ہوتی تھی تب بھی داڑھی بنا کر جاتے تھے۔ نائی صرف بال کاٹنے یا مالش کرنے کے لیے آتا تھا۔

سپاہی نے آکر سیلیوٹ مارا۔ اس کا اس طرح آکر کھڑا ہو جانا اور سیلیوٹ مارنا بڑے رائے کو پسند نہیں آیا۔ پاس ہی بھوانی کھڑا تھا۔ انھوں نے براہ راست سپاہی سے بات نہ کر کے بھوانی سے کہا "پوچھو کس نے بھیجا ہے یہاں کیوں آئے؟" بھوانی نے اس طرف دیکھ کر پوچھنے کے لیے منہ کھولا تو وہ اپنے آپ ہی بولا "کوتوال صاحب نے بھیجا ہے۔۔۔ سرکار کو ہی بتانے کے لیے کہا ہے۔"

وہ بولا "حضور ہم بھی کوتوال صاحب کے خاص سپاہی ہیں۔ انھوں نے صرف آپ سے بتانے کے لیے کہا ہے۔"

انھوں نے بھوانی کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گیا۔ بڑے رائے کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ انھیں لگ رہا تھا کہ اگر ایسی ہی خاص بات تھی تو سپاہی کو کیوں بھیجا؟ وہ پھر بولے "جلدی کہو۔۔۔"

حضور کوتوال صاحب نے کہلوایا ہے کہ صبح جب وہ گشت کو نکلے تو خونی باغ کے پاس ایک گھوڑے کی لاش پڑی دیکھی۔۔۔

"خونی باغ کے پاس۔۔۔ گھوڑے کی لاش" وہ دھیرے سے بدبدائے اور پھر بولے "ٹھیک ہے تم جاؤ۔" وہ سلیوٹ کر کے چلنے لگا تو اپنے آپ ہی رک کر بولا "کوتوال صاحب نے کہلوایا ہے کہ ان کا نام کہیں نہ آئے۔۔۔"

انھوں نے گردن ہلا دی اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر ایک دردوات سے بکھری سیاہی کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ زیر لب بولے "آخر مانا نہیں۔"

ان کا استرے والا ہاتھ رک گیا تھا۔ آدھے چہرے پر صابن لگا تھا۔ انھوں نے چھوٹے رائے کو بلوایا۔ چھوٹے رائے فارغ ہو رہے تھے۔ وہ فوراً آ گئے۔ بڑے رائے نے رندھتے ہوئے گلے میں کہا "گاڑی منگوا کر فوراً جاؤ۔۔۔ خونی باغ کے پاس گھوڑے کی تازہ لاش پڑی ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے اپنا سفید ہی ہوگا۔ انگریزوں کے انصاف پسندیدگی کی بہت داستانیں سنی تھیں۔ ان میں اس داستان کا اضافہ ہو جائے گا۔۔۔ رائے پر تو بس چلا نہیں بے زبان جانور کی جان لے لی۔۔۔" چھوٹے رائے نے انھیں پرسکون کرنے کے لیے کہا "کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔۔۔"

"اور کون ہوگا۔۔۔ خونی باغ کی آڑ میں ہری رائے کے سفید کا ہی خون ہو سکتا ہے۔ آخر کوتوال نے خبر بھیجی ہے" دھیرے سے بدبدائے "شاید مارنے والا اور خبر لانے والا ایک ہی ہو۔۔۔ خیر چھوڑو۔"

وہ اسی طرح اٹھے اور نہانے چلے گئے۔

خونی باغ کلکٹر کی کوٹھی سے ایک فرلانگ آگے تھا۔ شہر کے دوسرے موڑ پر۔ جو جگہ خونی باغ کہلاتی تھی اس کی شکل کٹورے کی طرح تھی گہرائی لیے ہوئے۔ اس میں اونچے اونچے درخت تھے۔ سڑک پر فطرت کے سپاہی سے ان پیڑوں کے اٹھے ہوئے ہرے ہرے جھبے تو نظر آتے تھے، تنے اس گہرائی میں ڈوبے رہتے تھے۔ دیسی آم، پیپل، کیکر، بڑ، جانڈ، ارجن، اگست، بن جلیبی اور نہ جانے کتنی قسموں کے جانے انجانے پیڑ تھے۔ اٹھارہ سو ستاون میں اسی باغ میں دیش بھگتوں کو پیڑوں سے لٹکا کر یا تو سولی پر لٹکا دیا تھا یا گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ کئی پیڑوں پر گولیوں کے نشان ابھی تک باقی تھے یا نہیں کہنا مشکل ہے لیکن لوگ نیچے سے کھڑے ہو کر دکھاتے تھے۔۔۔ دیکھو یہ رہا گولی کا نشان۔ کوئی ہاں میں ہاں ملا کر کہہ دیتا تھا "ہاں ہے تو!" کوئی یہ ہی پوچھتا رہتا تھا "کہاں ہے۔۔۔ نظر نہیں آرہا!" دکھانے والا آخر میں اسی بات پر آجاتا "تمھیں نہیں دکھائی دے گا۔ دیکھنا نہیں چاہتے تو دکھے گا کہاں سے!" لوگ بتایا کرتے تھے کہ دیش بھگت اماتاس کی پھلیوں کی طرح ان پیڑوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ بڑے رائے تب شاید بچے رہے ہوں گے۔

سارا شہر دہشت سے کانپ رہا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں بے پناہ خوف بیٹھ گیا تھا۔ لوگ انگریزوں کا نام سن کر ایسے بھاگتے تھے جیسے بھیڑ۔ ان میں ایک عورت تھی۔ شاید طوائف۔ اس نے پرچم بغاوت بلند کیا تھا لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ کام عورت ہی کر سکتی ہے جو عورت ہونے کی حدود پار کر جائے یا تو ستی یا پھر طوائف۔ پرانے نوکر دبی زبان سے کہا کرتے تھے کہ حویلی کے تہہ خانے میں بڑے رائے کے دادا نے دو تین انگریز خاندانوں کو پناہ دی تھی۔ ان ہی میں سے کوئی بعد میں صوبے کا گورنر ہوا کرتا تھا۔ اسی چکر میں انھیں کئی گاؤں بخشش میں مل گئے تھے۔ مجسٹریٹی تو تب ہی سے پشت در پشت چلی آرہی تھی خواہ کوئی ان پڑھ رہا ہو کانگریسی بڑے رائے کو کئی بار ہائے ہائے کر چکے تھے۔

خونی باغ کو بھوتوں کا ڈیرہ بتایا جاتا تھا لوگ کہتے تھے رات بے رات کو آؤ تو مرے ہوئے پیڑوں سے لٹکے ہوئے اور آپس میں بات کرتے ہنستے کھلکھلاتے، بھارت ماتا کی جے

بولتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ کسی کو آتا دیکھتے ہیں تو چھو منتر ہو جاتے ہیں۔ ملک کی حالت پر روتے بھی ہیں۔

چھوٹے رائے نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جب ہم چلنے کو ہوئے تو دیکھا بڑے رائے بھی تیار ہو کر آ رہے ہیں۔ چھوٹے رائے نے انھیں روکا تو وہ بولے "ارے راگھو، وہ مجھے ساری زندگی دھوتا رہا ہے ـــــ اس کی رخصتی کے وقت تو نہیں رہا، اب تو پہنچ جاؤں۔" ان کی بات سے دونوں کو لگا کہ بس رونا ہی باقی رہ گیا۔

ہم تینوں وہاں گئے۔ کالے کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ پھر بھی وہ آنکھیں پونچھ پونچھ کر گاڑی ہانکے جا رہا تھا۔ بار بار راستہ ترمروں سے بھر جاتا تھا۔ دھول بھی تھی۔ دراصل علی الصبح ہی جمعدار اور جمعدارنوں نے سڑکوں پر جھاڑو لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں چنگی انھیں تین روپے ماہانہ دیتی تھی۔ بہشتی مشک میں پانی بھر کر نالیاں دھلاتے تھے۔ ایک دھار نالی کے ادھر اور دوسری دھار ادھر۔۔ مشکی کی چال کے ساتھ دھار کم اور زیادہ ہوتی تھی اور راستہ بدلتی رہتی تھی۔ اب شاید نالیاں دھلتی ہی نہیں۔ پہلے دونوں وقت دھلتی تھیں۔ شام کے وقت تو ضرور ہی۔ یہ بات اب قصبات میں دیکھنے کو مل جائے تو مل جائے۔ شہروں میں بالکل نظر نہیں آتی۔ ادھر حلوائیوں کی بھٹیاں بھی جل گئی تھیں۔ ان کا دھواں بھی چاروں طرف کنڈل ڈالے تھا۔ آنکھیں بار بار کڑوا جاتی تھیں۔ گاڑی کا بھی یہ ہی حال تھا۔ جب پکی سڑک پر اترتی تھی تو لڑکھڑانے لگتی تھی۔ بڑے رائے کی آنکھیں چشمے میں سے بڑی بڑی اور بھری بھری لگ رہی تھیں۔ آنکھوں کی فطرت ہی ایسی ہے کہ بھری نہیں کہ بڑھی نہیں۔

خونی باغ پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا ہوگا۔ گھڑی بڑے رائے کی جیب میں ہی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی پتہ نہیں کیسے ایسا لگا کہ سارا باغ آدمیوں اور گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ آدمی رو رہے ہیں اور گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ میں نے فوراً اپنا سر جھٹکا۔ یہ سب کیا ہے؟ تب جا کر مجھے وہاں اُگے درخت نظر آئے۔ ہلتے اور بغیر آواز کلکاریاں سی بھرتے ۔ بڑے رائے آگے چل رہے تھے۔ کالا بھی بگھی کھول کر آ گیا تھا۔ وہ سب سے آگے کھوجی کی طرح جا رہا

تھا۔ ہم لوگ پیچھے پیچھے تھے۔ میری نظریں رہ رہ کر ان پیڑوں پر چلی جاتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ بیچ بیچ میں گردن جھکا کر کسی چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کافی طویل چکر کے بعد درختوں کے درمیان راستے کے پیچھے ایک گھوڑا لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سفید ہی تھا۔

اس کے جسم میں تین چھید تھے۔ درخت سے باندھ کر گولیوں سے چھلنی کر ڈالا گیا تھا۔ خون اب بھی رس رہا تھا۔ کافی موٹی لکیر اس کے پیٹ پر سے ہو کر بہہ چکی تھی۔ لوتھڑے باقی تھے۔ جو کہیں کہیں چپکے نظر آ رہے تھے۔ پاؤں بندھے تھے اور آنکھیں کھلی تھیں جیسے اسے کسی نجات دہندہ کا انتظار ہو۔ جتنا خون بہا تھا کالی کے کھپر کی طرح زمین پی گئی تھی۔ کالا دہاڑ مار کر وہیں اس پر گر پڑا ـــــ "میرے بچے، تو اس طرح چھوڑ کر کیوں چلا گیا ـــــ اس سے تو اچھا تھا کہ تو میری بھینٹ لے لیتا بھگوان ـــــ اب میں مالک کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

بڑے رائے زمین پر ہی بیٹھ گئے اور اس کی گردن پر جھک گئے۔ اس کی کھلی آنکھیں ان کی طرف ہی تھیں۔ میں بھی ادھر ہی تھا۔ مجھے لگا کہ وہ کہہ رہا ہے ـــــ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ میں اس سے آنکھیں چرا رہا تھا۔ درخت بار بار میری طرف جھک آتا تھا۔ اس میں لٹکی وہ سب رسیاں تیزی سے ہلنے لگتی تھیں۔ جیسے میرے گلے میں ہی لپٹ جائیں گی۔ مجھے لگا کہ سفید کی پتلیاں حرکت کر رہی ہیں۔ کہیں یہ اس کے بھوت کی آنکھیں تو نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو اس کیفیت سے باہر نکالا۔ دراصل میں نے یہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میری بے وقوفی اتنے بڑے حادثے کا سبب بن جائے گی۔ چھوٹے رائے چپ چاپ ایک کنارے کھڑے تھے۔ کائی پوش اور ٹھہرے پانی کی طرح۔ بیچ بیچ میں ان کے ہونٹ حرکت کرنے لگتے تھے۔ جیسے دعا مانگ رہے ہوں۔

بڑے رائے نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اور چھوٹے رائے نے انھیں سہارا دیا۔ کالا بے حال تھا۔

قاعدہ یہ تھا کہ اس طرح کے بڑے جانوروں کو قصائی کے سپرد کر دیا جاتا لیکن سفید کے بارے میں ایسا نہیں کیا گیا۔ اسے ٹھیلے پر لدوا کر ندی کے اس ڈھال پر لے جایا گیا جس پر سے بڑے رائے کو لے کر سفید نے ایک بار چھلانگ لگائی تھی اور اس خطرے سے بچایا

تھا جو زمینداری سے لوٹتے وقت یکایک ان کے چاروں طرف گھر آیا تھا۔ چند زادوں نے لوٹ کے بل پر انھیں گھیر لیا وہ سب ان کی اپنی زمین تھی۔ گڈھا کھود کر اوپر تک بھر دیا اور ہم سب کی موجودگی میں سفید کو دبا دیا گیا —— اتنا گہرا کہ کوئی جانور اسے آسانی سے نہ کھود سکے۔ حالانکہ یہ طریقہ مردہ ہاتھیوں کو دفنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، لیکن سفید کو بھی یہی اعزاز دیا گیا تھا۔ بوریوں میں نمک لگا دیا گیا تھا۔ اس جگہ تیرہ دن کا پوجا پاٹ کرایا گیا تھا۔ اور پر ہم جھوٹ بھی لیکن مجھے لگتا رہا یہی لگتا رہا کہ گنہگار میں ہوں۔ مرا سفید کوئی۔

سفید کا کام ختم ہو جانے پر چودھویں دن بڑے رائے مجھے لے کر کمشنر صاحب کے بنگلے گئے۔ کمشنر صاحب کو اس بات کی امید نہ تھی کہ بڑے رائے اس طرح ان کے یہاں چلے آئیں گے۔ وہ منع نہیں کر سکے چاہتے تو کر بھی سکتے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے "آئیے رائے صاحب، آپ ہم سے ناراض ہیں۔ مسٹر ڈک نے ہمیں بتایا۔"

"ناراض تو آپ ہم سے ہیں۔"

"اوہ نو، ہم اس بات کو بھول گیا۔ ہم نے اسے بھی ڈانٹا —— زمینداری ایسوسی ایشن میں اس نے بدتمیزی کیا۔ ہم سمجھا نہیں تھا —— ہم غلطی سے اسے سپورٹ کیا۔"

بڑے رائے سنتے رہے۔ اتنا سب کچھ کہہ چکنے کے بعد مسٹر ڈک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا کہیں۔ کچھ دیر چپ رہ کر بولے "ہم مسز ڈک کو بلاتا ہے۔ وہ آپکو بہت پسند کرتا۔"

"آج تو مجھے آپ سے ہی کام ہے۔۔۔" انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ مسٹر ڈک ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے "بتائیے، ہم کیا کر سکتا؟" "پہلے میں گاندھی جی کو مورکھ اور سر پھرا سمجھتا تھا۔ سوچتا تھا کہ اتنی بڑی حکومت کے سامنے وہ بھوک ہڑتال، اہنسا ستیہ گرہ جیسے ٹھنڈے اور بودے اوزاروں کا استعمال کر کے کیا کر پائے گا۔ لیکن اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ اپنے سے زیادہ طاقتور سے لڑنے کا طریقہ ہتھیار کبھی نہیں ہو سکتے۔ میں اپنے بڑے لڑکے بھاسکر کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اسی کی نگ مسز ڈک کی فتن سے ٹکرائی

تھی۔ آپ نے میرے اس ایک بیٹے کو گولیوں سے چھلنی کرادیا جو اس گگ کو کھینچ رہا تھا اس سے زیادہ قصور اس کا تھا جو اسے ہانک رہا تھا۔ بعد میں پکڑوا کر گولی مارنے سے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے دست مبارک سے اڑا دیں ـــــ میں اف نہیں کروں گا۔ ہم ہندوستانیوں میں ضبط کرنے کی زبردست صلاحیت ہے۔ ویسے بھی آپ کو ہم لوگوں کو اور گہرائی سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

میں نے بڑے رائے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم جامد تھے۔ ایک بار ان کی زبان لڑکھڑائی۔ ڈک کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکے "پلیز بی سٹیڈ!" حالانکہ ہم لوگ بیٹھے ہی ہوئے تھے۔

"میں یہ چاہتا ہوں یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے ـــــ تاکہ اس کی لاش بھی لے جا کر جلدی سے ٹھکانے لگادوں اور حکومت برطانیہ کا اقبال اور زیادہ بلند ہونے کی دعا کروں۔ مجھے خوشی ہے کہ حکومت کی نظر میں دوست، دشمن، بے قصور، قصوروار، انسان حیوان سب برابر ہیں۔"

مسیز ڈک آ گئیں۔ ڈک کی جان میں جان آئی۔ وہ شاید صورت حال کی نزاکت بھانپ گئی تھیں۔ آتے ہی بولیں "ویل رائے صاحب، ہم آپ سے معافی چاہتا ہے۔ ہمیں پتہ چلا کہ کچھ مسکریئنٹ MISCREANTS نے آپ کے گھوڑے کو شوٹ کر دیا۔"

بڑے رائے ایک خشک ہنسی ہنسے اور چپ ہو گئے۔ ماحول بھیگی روئی کے ڈھیر کی طرح وزنی ہو گیا۔ میرے سامنے ایک سوال تھا۔ کیا بڑے رائے باپ ہو کر مجھے مار ڈالنے کے لیے ڈک کے ہاتھوں سپرد کر دیں گے؟ کیا میں بھی سفید کی طرح مار ڈالا جاؤں گا؟

ڈک اتنا گھبرا گیا کہ وہ 'ساری' کہہ کر اندر چلا گیا۔ مسیز ڈک بار بار معافی مانگ رہی تھیں۔ بڑے رائے چپ تھے۔

ویسے چھوٹے رائے اس پورے واقعہ میں چپ رہے لیکن وہ اندر تک غمگین تھے۔ ان کے دل میں ایک عجیب طرح کی بغاوت تھی اس دن کے بعد سے وہ روزانہ شام کو گھر سے باہر نکل جاتے تھے۔ گھوڑا گاڑی یا نوکر چاکر لیے بغیر۔ وہ زمانہ اور تھا۔ اگر جاگیردار پیدل جائے اور ذاتی محافظ بھی ساتھ نہ ہو تو سمجھا جاتا تھا کہ خراب دن آ گئے ہیں۔ گھر کا کوئی بھی اگر پیدل جاتا تھا تو ایک یا دو ذاتی محافظ ضرور پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ حالانکہ خطرہ ذرا بھی نہیں تھا۔ لیکن

عادت۔ کافی دنوں تک میرے پیچھے بھی محافظ جاتا رہا تھا۔ بعد میں جب میں سائیکل پر چلنے لگا تھا، ذاتی محافظ کا چلنا بند ہو گیا تھا۔ جب دو سائیکلیں آ گئیں تو کچھ دن ایک ذاتی محافظ سائیکل پر بھی ساتھ چلا، وہ میری حفاظت کے لیے نہیں سماجی عزت کی حفاظت کے لیے چلتا تھا۔ حالانکہ مجھے کہیں بھی سماجی عزت غیر محفوظ پڑی نہیں ملی جسے وہ بچاتا۔ لیکن میں بھی کافی دنوں تک یہ ہی سمجھتا رہا کہ وہ مجروح ہے۔

چھوٹے رائے کافی رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ چھوٹے رائے کے طرز عمل میں تبدیلی بڑے رائے کے لیے باعث تشویش بنتی جا رہی تھی۔ ان دنوں ویسے بھی سوراجیوں کا زور تھا۔ تب یہ اکثر ہوتا تھا کہ دیر میں آنے والے نوجوان اور عمر رسیدہ یا تو اپنا وقت کوٹھے پر گزارتے تھے یا کانگریس کے دفتر میں۔ دونوں ہی باتیں گھر والوں کے لیے باعث تشویش تھیں۔

چھوٹے رائے، کا وقت کانگریس کے دفتر میں گزرتا تھا۔ اس بات کا پتہ کافی دن بعد چلا کہ چھوٹے رائے کانگریسی ہو گئے ہیں اور حکومت کے خلاف پرچار کرتے گھومتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، پربھات پھیریاں نکالتے ہیں۔ ان دنوں منجھلے رائے بھی آئے ہوئے تھے وہ اکیلے ہی آئے تھے۔ نئی والی منجھلی چاچی نہیں آئی تھیں۔ دراصل وہ زمینداری کا حساب سمجھنے آئے تھے۔ ان کے چھوٹے دیوان جی کے پاس حساب تیار تھا۔ وہ اسی طرح تین چار ماہ بعد آتے تھے، پیسہ بینک میں جمع کرتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ جس دن چھوٹے رائے کے بارے میں پتہ چلا کہ اس دن منجھلے رائے واپس جانے والے تھے۔ یہ بات اتنی پریشان کرنے والی تھی کہ منجھلے رائے نے اپنی واپسی ملتوی کر دی حالانکہ شروع میں منجھلے رائے تھوڑی آنا کانی کر رہے تھے۔ بڑے رائے ان کی طرف دیکھ کر بولے "مجھے معلوم ہے کہ آپ ملازمت پیشہ لوگ ہیں ـــــ چھٹی ختم ہونے کا بہانہ کر کے واپس اپنے کھونٹے پر پہنچنے کے لیے کتنے بے چین رہتے ہیں۔ چھٹی ہفتے بھر کی لے کر آتے ہیں اور گزارتے ہیں چار دن کی منجھلے رائے چپ لگا گئے تھے۔

چھوٹے رائے کی ہمیشہ کی کمزوری تھی کہ بڑے رائے کے سامنے بول نہیں پاتے تھے۔ بڑے رائے نے چھوٹے رائے کو کمرے میں بلوایا۔ منجھلے رائے بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے ہی چھوٹے رائے سے کمرہ بند کر دینے کے لیے کہا۔ کمرہ بند کرنے کے بعد بڑے

رائے نے ان کی طرف دیکھا تو چھوٹے رائے نے گردن جھکالی۔ بڑے رائے نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا ـــــ ''راگھو، تم خود ایک ذمہ دار انسان ہو۔ مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں تمھاری کارگزاریوں میں دخل اندازی کروں لیکن میرا یہ فرض ضرور بنتا ہے کہ میں تم دونوں بھائیوں کو وقتاً فوقتاً صورت حال سے آگاہ کرتا رہوں۔ میری مسٹر ڈک سے تناتنی چل رہی ہے۔ بھاسکر کی ٹنگ مسیز ڈک کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ ڈک نے ہمارے سفید کو قتل کروا کر اس کا انتقام لے لیا۔ میں نے سنا ہے کہ پولس کپتان نے بھی مسٹر ڈک کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اور اب بھی جب کبھی اسے موقع ملا وہ پلٹ کر حملہ کرے گا۔ ان حالات میں راگھو کی کانگریس میں شمولیت ہمارے لیے اور زیادہ باعث پریشانی بن سکتی ہے۔ میں یہ کہنے والا کون ہوں کہ کانگریس صحیح ہے یا غلط لیکن یہ تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ حکومت کے خلاف ہے۔ حکومت کے خلاف حکومت ہی لڑ سکتی ہے۔ جن لوگوں نے پشت در پشت حکم ہی بجایا ہو وہ بھلا کیسے حکومت کو آنکھیں دکھا سکتے ہیں۔ گاندھی ہو یا موتی لال یا ان کا بیٹا جواہر لال یہ لوگ بھی چاہے اس حکومت کے باہر رہتے ہیں اور چاہے اس حکومت کے اندر۔ وہ لوگ اپنی اتار چکے ـــــ لیکن ہم تو قبیلے دار ہیں اور عزت دار ہیں ـــــ ہمیں کل کو رانی کی بھی شادی کرنی ہے۔ اس بے چاری سے کون شادی کرے گا؟ سب یہ ہی کہیں گے کہ لڑکی کا چاچا جیل کاٹ چکا ـــــ سوراجی ہے ـــــ سڑک پر کتوں کی طرح گھسیٹا جاتا ہے۔

منجھلے رائے نے چھوٹے رائے کی طرف دیکھا۔ وہ چپ تھے۔ پھر پوچھا ''بڑے بھیا کی بات سمجھ میں آئی؟'' پھر رک کر کہا ''بڑے بھیا تو بڑے آدمی ہیں ـــــ ان کا دبدبہ ہے۔ یہ تو برداشت بھی کر جائیں گے۔ میں تو حکومت برطانیہ کا ملازم ہوں جب سرکار کو پتہ چلے گا کہ کرشن رائے کو چھوٹا بھائی سوراجی ہے تو میری ملازمت کا کیا ہوگا؟

چھوٹے رائے نے اس بار جواب دیا ''منجھلے بھیا، میری جب پوول پر ائس سے دوستی تھی تب بھی تمھیں لگتا تھا کہ کہیں یہ گورے کسی بات پر ناراض ہو جائیں اور قہر برپا نہ کر دیں۔ اب جب میں انگریزوں کے خلاف ہوں تب بھی تم اس ڈر سے پریشان ہو۔ آپ کو اپنی ملازمت کی فکر ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں چھوٹی والی کوٹھی میں چلا جاؤں گا۔ تم کہہ دینا ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ـــــ مجھے قطعی برا نہیں لگے گا۔''

بڑے رائے کو لگا کہ راگھو نے ان کی باتوں کا جواب دیا۔ ان کے ہونٹ کا بایاں کونا
اوپر اٹھ گیا۔ اپنی آواز کنٹرول کرتے ہوئے بولے "راگھو، کیا تم نے میری باتوں کا یہ ہی
مطلب سمجھا؟ کرشن چھوڑ کر چلا گیا ـــــ کچھ پوچھے بغیر شادی کرلی تو کیا تم سمجھتے ہو میں
مر گیا؟ تم چلے جاؤ گے تب بھی میں زندہ رہوں گا جب تک لکھوا کر لایا ہوں۔"

وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر بولے "نہیں بڑے بھیا، میں نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔ اس دن
مجھے لگا تھا کہ ہم ان انگریزوں کی غلامی کیوں کریں جو انسان کی ذرا سی غلطی کا بدلہ جانور تک
سے لے سکتے ہیں۔ ـــــ جن میں حیوانیت کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر یہ لوگ آدمی کا بدلہ
جانور سے لے سکتے ہیں تو جانور کا بدلہ آدمی سے بھی لے سکتے ہیں!...." "تم کانگریس میں جاکر
تاج نہیں پہن لوگے؟ وہ تو تم سے گئے گزرے ہیں۔ ایک معمولی سپاہی بھی ان لوگوں کی
گردن پکڑ کر دھکیل دیتا ہے۔ ہم لوگ اس ذلت سے بچے ہوئے ہیں۔" چھوٹے رائے نے
گردن جھکالی وہ کہتے رہے "یہ تمھارا بھائی تحصیلدار ہے۔ تم سمجھتے ہو اس کا کیا ہوگا؟"

چھوٹے رائے خاموش ہوگئے۔ انھیں لگا کہ بڑے بھیا کے سامنے اتنا نہیں بولنا
چاہیے تھا۔ منجھلے رائے تھوڑا اکھڑ کر بولے "بڑے بھیا، آپ کی بات راگھو کی سمجھ میں نہیں
آئے گی۔ وہ اپنے آپ کو انقلابی سمجھتا ہے۔ اسے کچھ کرنا دھرنا تو ہے نہیں۔ پربھات
پھیریاں لگائے گا، گاندھی جی کی جے بولے گا اور پولس کے ڈنڈے کھائے گا، ناک تو کٹنی
ہی ہے۔"

منجھلے بھیا تم مت بولو، بڑے بھیا کی بات اور ہے۔ تم ناک کٹنے کی بات کر رہے
ہو ـــــ انگریزوں کی نوکری کر کے کیا تم ناک بڑھا رہے ہو؟"

بڑے رائے نے مداخلت کی ـــــ "تمھیں یہ ہی کہنا ہے؟ اگر تم اسی سب پر آمادہ
ہو تو مجھے چاہیے کہ میں بھی اس دنیا سے کوچ کی تیاری کروں۔ میرا بھائی جیل کاٹے گا اور میں
حویلی میں رہ کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کروں گا۔ یہ ناممکن ہے۔"

چھوٹے رائے گھبرا گئے۔ وہ بولے "مجھے تھوڑا سوچنے کا وقت دیجیے۔ مجھے اس
بات کا افسوس ہے کہ اپنے ملک کی آزادی کے سوال پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آزادی کا سوال
بھلے ہمیں مصیبت میں ڈال دے لیکن بھاسکر کے بچوں کو تو عزت کی زندگی نصیب ہو جائے
گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم سوچ لو۔ میں تمھارے جواب کا انتظار کروں گا۔" تینوں اٹھ گئے، وہ سب اپنے آپ میں نہ ہو کر کہیں اور تھے۔

اس رات چھوٹی چاچی اور چھوٹے رائے دیر تک بات کرتے رہے۔ بات تو وہ ہمیشہ کرتے تھے کیونکہ انھیں لگتا تھا کہ باتیں ہی انھیں جوڑتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ باتیں چند مسئلوں پر ہوتی تھیں۔ چھوٹے رائے نے پوچھا "تم نے جب پوری بات سن لی ـــــ اب تم کیا کہتی ہو؟ میں کس کے لیے اپنوں کو ان بندھنوں میں باندھوں۔"

چاچی پہلے چپ رہیں پھر بولیں "میں کیا کہوں، میں تو آپ کے ساتھ ہوں جیسا چاہو کرو۔" پھر رک کر کہا "اگر جیٹھ جی نے آپ کی بات مان لی اور ہم لوگ چھوٹی کوٹھی میں چلے گئے تو ان بچوں کا کیا ہوگا؟ جٹھانی جی تو میرے اوپر چھوڑ گئی تھیں۔ تم بھی انھیں اتنا پیار کرتے ہو ـــــ رانی لڑکی ہے اور چھوٹی ہے۔ بھاسکر ضرور بڑا ہو گیا ـــــ اس کی شادی ہو جائے تو میری ذمہ داری ختم ہو۔ بڑے بھیا کی ذمہ داری بھی ایک طرح سے ہم پر ہی ہے۔"

چھوٹے رائے کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد بولے "مہاتما جی پرسوں یہاں سے گزرے تھے ـــــ بردوار گئے ہیں، مجھے ان کے درشن کرنے کا موقع ملا۔ چندر بابو نے میرا تعارف کرایا تھا کہ یہاں کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ وہ بچوں کی طرح ہنس دیے ـــــ جیسے میں کچھ ہوں ہی نہیں ـــــ مجھے اچھا لگا ـــــ ہنسی سے انھوں نے مجھے اپنی حیثیت بتادی۔ تم ہوتیں تو تمھیں لگتا کہ اتنا بڑا آدمی اپنے کو اتنا نارمل کیسے کر لیتا ہے۔" چندر بابو نے کہا "مہاتما جی ان کے لیے کوئی حکم ہے؟" وہ یہ بولے "میں کون ہوں حکم دینے والا؟ میں تو کوئی نہیں ـــــ یہ تو زمیندار ہیں دوسروں سے حکم لینے کے بجائے خود اپنے کو حکم دیں ـــــ اصلی کام تو بوڑھی ماں کی دیکھ بھال ہے۔ بوڑھے اور بچوں کو دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی کسی کو کچھ نہیں دے سکتا؟" میری طرف دیکھ کر بولے "سب سے پیار کرو ـــــ انگریزوں سے بھی ـــــ انسان کے روپ میں، حاکم کے روپ میں نہیں۔ تم لوگ انھیں حاکم سمجھ کر پیار کرتے ہو ـــــ کالے ہونا؟ حاکم کے روپ میں تو اپنے سے بھی

نہیں۔" پھر ہنس کر دوسری طرف گھوم گئے۔ ہندی، گجراتی بیچ میں بول رہے تھے۔

"کیا وہ مہاتما ہیں؟"

انھوں نے لوگوں سے کہا ــــ میں مہاتما نہیں ہوں۔ میں مہاتما ہوں تو تم بھی مہاتما ہو! جو ملک کا کام کرے وہ مہاتما ــــ دوسروں کا دکھ سمجھے وہ مہاتما! جو اتنا جانتا ہے وہ مہاتما نہیں تو کیا ہے؟"

تھوڑی دیر چپ رہے۔ چھوٹی چاچی نے پوچھا "تو کیا سوچا؟"

"میں نے تو یہی سوچا ملک کو گود لے لیں۔ اسے ہی پالیں۔"

"اور یہ بچے؟ جیٹھ جی کیا کہیں گے کہ بھائی تو چھوڑ گیا، اب دوسرا بھائی بھی چھوڑ رہا ہے" "رک کر بولیں" "آپ جو طے کریں؟ میری جان تو دونوں میں ہی ہے۔"

اس رات چھوٹے رائے رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ گاندھی جی اور بڑے رائے آمنے سامنے کھڑے نظر آتے تھے۔ جب گاندھی جی کی طرف دیکھتے تو وہ اسی طرح بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستے رہتے۔ پڑ گیا فکر میں۔۔۔ یہ طے کر کس کا بڑا دکھ ہے! بڑے رائے ایک دم سنجیدہ۔ لگتا ہے کہ بڑے رائے چھوٹے بچے کی طرح انگلی پکڑے کھڑے ہیں۔

صبح اٹھ کر چھوٹے رائے نے بڑے رائے سے جا کر کہا "آپ جو کہیں گے وہی کروں گا" پھر بولے "کاش آپ ایک بار مہاتما جی سے مل لیتے۔"

بڑے رائے ہنس دیے۔

چھوٹے رائے گم صم رہنے لگے تھے۔ ان کی آتما بار بار شعلے کی طرح ان کی طرف لپکتی تھی۔ زمینداری کا کام انھیں سب سے زیادہ قابل نفرت لگتا تھا۔ وہ اس سے بھاگتے پھرتے تھے۔ کوئی مسئلہ آیا نہیں اور انھوں نے کہا نہیں ــــ بھاسکر، تم جانو، مجھے کیا لینا دینا! جب میں اپنی مرضی سے قبول کی ہوئی ذمہ داری کو ہمت اور جرأت سے نبھا نہیں سکا تو وراثت میں ملی اس جائیداد کے ساتھ کیا انصاف کر سکوں گا۔ اس طرح ملی چیز اسی طرح چلی جاتی ہے۔"

وہ باہر قریب نہ کے برابر نکلتے تھے۔ کمرے میں چپ چاپ بیٹھے، ایک ٹھہرا ہوا تالاب ہو گئے تھے۔ بس کتابیں پڑھتے تھے۔ تاریخ کی یا دوسرے ملکوں میں ہوئی

جد و جہد کی۔ کبھی کبھی کتاب پڑھتے ہوئے انھیں لگتا تھا کہ ٹھہرے پانی میں لہریں اٹھنے لگی ہیں۔ جب وہ کچھ نہ کر پاتے تو رونے لگتے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر خلا سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ گاندھی جی سے مخاطب ہوتے تھے ـــــ "مہاتما جی، میں تمھاری بات بھولا نہیں لیکن اسے یاد رکھنے سے کیا حاصل؟ میں تو کھونٹے میں بندھا ہوا جانور ہوں جو اپنے چاروں طرف بٹر بٹر دیکھتا ہے اور گھومتا ہے۔ زیادہ ہوا تو اسی کھونٹے پر بندھے بندھے دو چار گلدان بھر لیں۔ اب میں بھوک پیاس کے علاوہ کچھ نہیں جھتا۔ چندر بابو نے آپ سے جھوٹ کہا تھا میں زمیندار نہیں ہوں، میں خاندان کی جھوٹی عزت کی رسی میں بندھا زر خرید غلام ہوں۔ بس، خوابوں میں ہی آزاد ہو پاتا ہوں۔۔۔"

چھوٹی چاچی انھیں اس طرح بیٹھے دیکھ کر مغموم ہوتی تھیں انھیں سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں "اگر آپ چاہتے ہیں ـــــ تو چلیے سوراج کا ہی کام کیجیے۔ اپنے کو دکھی نہ کیجیے۔ آپ کی خوشی کے علاوہ میری زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ صرف اس لیے کہ جن پودوں کو پال پوس کر بڑا کرنے کی ذمہ داری لی انھیں دھوپ میں کھڑا چھوڑ کر ہم کیسے سائے میں چلے جائیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن بات کا ٹھیک ہونا ہی تو کافی نہیں ہوتا۔ آتما بھی تو چاہیے۔۔۔ میں تو اپنے فیصلے پر رنجیدہ ہوں۔ میں نے ہی اسے مارا اور میں نے ہی اسے مہاتما جی کے لمس سے بیدار کیا تھا۔ کہیں بھجن کرتے ہیں؟ انھوں نے مٹھی بھر مٹی مانگی تھی، وہ بھی 'مان' کے لیے۔۔۔ میں نے اسے دیتے دیتے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ انھیں کیا، انھیں چاہیے بھی کیا۔ کچھ نہیں۔ انھیں دینے والے بہت ہیں۔ جسے نہیں چاہ وہ شاہوں کا شاہ۔ انھوں نے کپڑے چھوڑ دیے، کھانا چھوڑ دیا، گھر چھوڑ دیا اور لکوٹی اور لنگوٹی اختیار کرلی۔۔۔ طبقہ ہی بدل ڈالا۔ وہی وہ بھی ہو گئے جو یہ ملک ہے۔ غریب لنگوٹی اور لاٹھی والا، بھوکا اور فاقے کرنے والا، پیدل چلنے والا ملک۔ انھوں نے وہی جیل لی جو ہر غریب بھوگ رہا ہے۔ چھوڑنے کو سب کچھ چھوڑ دیا۔ اپنی تصویر اپنے ہاتھوں گرا کر چکنا چور کر دی۔ لیکن میں اس اپنی شکل، ہمت اور لباس کا کیا کروں جو مجھ پر منڈھا ہوا ہے۔"

یہ سب باتیں چھوٹی چاچی کی سمجھ میں تو نہیں آتی تھیں لیکن انھیں ڈر لگتا تھا کہ چھوٹے رائے کہیں ان سے دور تو نہیں جا رہے ہیں۔ ان کی حالت کی ذمہ دار وہی تو ہیں۔ اگر

وہ اس وقت ماں بنی ہوتیں تو شاید بچوں کی طرح ٹوٹ کر روتیں۔ وہ انھیں اپنے گلے لگا لیتے لیکن ارن بھی تو تھا ——— پیڑ کی ٹہنیاں جیسے بغیر پھل کیے سوکھ گئے تھے! ارن اس سوکھی گود میں آکر جیسے بیٹھتا۔ وہ اپنے اندر بٹنے لگی تھیں۔۔۔ کبھی پانی بھی گود اور کبھی وہ پیڑ ارن جس کا پھل تھا۔ جسے پال کر وہ پھل کو اپنے آنچل میں رکھ لینا چاہتی تھیں۔ اگر اولاد کے لیے تڑپتا ان کا دل قرار پا سکتا تو ارن کو پا کر ہی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے درد کی دوا چھوڑ کر شوہر کے غم کا مداوا کیسے تلاش کریں؟ وہ اس کے لیے بھی تیار تھیں۔ عورت کا دکھ تو زندگی کا مترادف ہی کر اس کے اندر سما جاتا ہے، مرد کا دکھ سب کو بہالے جاتا ہے۔

زمینداری ان دنوں ایک بھاری پتھر ہوتی جا رہی تھی۔ اس بات کا احساس نہ بڑے رائے کو تھا اور نہ چھوٹے رائے کو۔ بڑے رائے کے لیے تو وہ زمینداری دیوی کو ٹے سر پہ پاپڑ کی طرح تھی۔ بغیر پیسے اور ریاسے بھی پیٹ بھرتی تھی۔ شان و شوکت کا دھیان رکھتی تھی۔ دعوتوں کی محفلیں سجاتی تھی۔ جب ضرورت ہوئی انھوں نے اسے الہ دین کے جادوئی چراغ کی طرح رگڑا اور مطلوبہ مراد پوری کرلی۔ پیڑ کی طرح ڈنڈا مارا اور پھلوں کی طرح روپے توڑ لیے۔ میں اس میں کچھ نہیں تھا لیکن برتن میں پانی کی طرح کبھی کبھی کھدبداتا تھا۔ چراغ کی طرح رگڑا بھی جاتا تھا اور پیڑ کی طرح ڈنڈا بھی کھاتا تھا۔

نواب چھتاری ان دنوں اتر پردیش کے لاٹ بنے ہوئے تھے۔ بڑا لاٹ دہلی میں رہتا تھا۔ ان کا دورہ تھا۔ بڑے رائے ان کو یہاں لانے کا وسیلہ تھے۔ بڑے رائے جب ان سے ملنے ڈیرے پر گئے تو مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ چھوٹے رائے نے جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہاں پر علاقے کے بڑے زمیندار پگڑیاں باندھے، سوٹ پہنے موجود تھے۔ باقاعدہ، جیسے دربار میں جا رہے ہوں۔ گورنر کا پرسنل سکریٹری انگریز تھا۔ وہی ان سب کو لاٹ صاحب سے ملوا رہا تھا۔ جب جس کا نمبر آتا، وہ اسے اس ہال کے دروازے تک لے جاتا جہاں لاٹ صاحب تشریف فرما تھے اور دروازہ کھول کر پیش کرتا۔۔۔ یور ایکسی لینسی۔۔۔ مسٹر فلاں خدمت میں حاضر ہیں۔ جسے وہ نہیں جانتے تھے ان کے بارے میں وہ ایک آدھ جملہ کہہ دیتا تھا۔ پھر اے۔ ڈی۔ سی اسے لے کر اندر چلا جاتا تھا۔ جب بڑے رائے پہنچے تو انھیں پہلے

اندر لے جایا گیا۔ سکریٹری نے دروازہ کھول کر اور تھوڑا آگے کی طرف جھک کر کہا "مسٹر بری رائے۔۔۔ایم۔ بی۔ ای۔ (ممبر آف برٹش ایمپائر) اینڈ بزنس بھاسکر رائے۔۔۔"

نواب چھتاری نے اٹھ کر استقبال کیا۔ جس صوفے پر لاٹ صاحب بیٹھے تھے وہ مخمل کا بڑا صوفہ تھا۔ اس کے سامنے ایک دیوان رکھا تھا۔ علی گڑھ پاجامہ، کالی اچکن، سنہری چین میں لگی جیب گھڑی، مخملی اونچی ٹوپی۔ اچکن کے کالر کی پٹی پر سنہرا کام تھا۔

جب انھوں نے ہاتھ ملایا تو بڑے رائے تھوڑا جھک گئے۔ پھر بڑے رائے میرا تعارف کرایا۔ میں نے سلام کیا تو انھوں نے دعا دی ـــــ اپنے والد کی طرح خاندان کا نام روشن کرو۔ تم پر حکومت کی نظر عنایت بنی رہے۔۔۔"

ہنس کر بولے "اس سب کے لیے حکومت کی خیر خواہی ضروری ہے برخوردار۔۔۔" اور ہنس دیے۔ بڑے رائے نے میری طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا "عزت مآب، میرے خاندان میں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہم تاج کے خیر خواہ ہیں لیکن۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے۔۔۔ آپ نے اچھا کیا کہ اپنے بھائی کو وقت رہتے سنبھال لیا مجھے اس کی اطلاع ہے۔۔۔" بڑے رائے اندر تک لرز گئے۔ نواب چھتاری ہی بولے "میں آپ کے تردد کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ بھٹکے ہوئے کو راہ پر لے آنا مشکل ہوتا ہے" پھر کہا "مجھے پتہ چلا تھا کہ مسٹر ڈک نے آپ کے ساتھ کچھ بد سلوکی کی ہے۔ حکومتِ برطانیہ کے اتنے عزیز دوست کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

بڑے رائے نے کچھ کہنا چاہا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر اپنی بات پوری کی "انھوں نے آپ کے ایک نایاب گھوڑے کو مروا ڈالا۔۔۔ ہے نا؟"

ان باتوں سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ کہیں اس سلسلے میں اس رات کا ذکر نہ آجائے جب ٹنگ مسیز ڈک کی فٹن سے ٹکرا گئی تھی۔ وہ یکایک میری طرف مخاطب ہوئے "کیوں برخوردار اگر زمینداروں کے بچے گھوڑ سواری نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ جانور کب بگڑ جائے، کون کہہ سکتا ہے۔ خیر، میں ڈک سے کہوں گا۔"

ان کے اس جملے کے بعد جتنا تناؤ بڑھا تھا، وہ دھیرے دھیرے کم ہو گیا۔ بڑے رائے بھی کافی نارمل ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ نواب صاحب کے لیے ان

کے دل میں تعریف ہی تعریف ہے۔ پھر بھی ان کے من میں ایک سوال تھا کہ انھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ چھوٹے رائے اس بات پر بھی تعجب ہو رہا تھا۔ گھر کی بات باہر کیسے پہنچی۔ نواب چھتاری اپنے آپ ہی بولے "اس بات کو آپ بھول جائیں۔۔۔ اس اپنے چھوٹے بھائی کا خیال رکھیے۔"

بڑے رائے نے کہہ دیا "آپ فکر نہ کیجیے۔"

لالہ صاحب کو جیسے اچانک یاد آئی "آپ کے ایک بھائی تحصیلدار بھی تو ہیں۔"

"جی یہ سب آپ کا ہی کرم ہے۔"

نواب صاحب بولے "اس بار نائبہ کا معاملہ ملتوی ہو گیا۔"

"اور جگہ میسر ہو گا؟"

وہ ہنس دیے۔

چلتے سے بڑے رائے نے کہا "اگر عزت مآب کل عشائیہ میرے غریب خانے پر ہی کریں تو میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔" انھوں نے فوراً گھنٹی بجائی۔ انگریز سکریٹری فوراً آیا۔ پہلے دروازے پر رکا پھر جھکا، بعد ازاں اندر داخل ہوا۔ نواب صاحب نے پوچھا "بڑی رائے صاحب، کھانا کھلانا چاہتے ہیں ہم کس دن خالی ہیں؟"

سکریٹری نے تین دن بعد کی تاریخ دی۔ نواب صاحب نے گردن ہلا دی۔ سکریٹری چلا گیا۔ نواب صاحب بولے "بڑی رائے صاحب، کیوں نہ آپ یہ کھانا ٹاؤن ہال میں رکھیں۔۔۔ میں رائے بہادر جگدمبا پرشاد کو منع کر چکا ہوں وہ اپنی کوٹھی پر چاہتے تھے۔"

بڑے رائے نے لمحے بھر کے لیے سوچا اور ہاں کر دی۔

نواب چھتاری کی دعوت کا انتظام ٹاؤن ہال میں تھا۔ تب شہر میں بجلی نہیں تھی۔ مہتاب جلائے جاتے تھے۔ حالانکہ ان راتوں کے اجالوں کی اور آج کے اجالوں کی کوئی برابری نہیں لیکن تب وہ اجالے آنکھوں کو روشن کرتے تھے اور اب روشن نہیں کرتے، باہر کا منظر چمکاتے ہیں۔ اتنی روشنی ملے کہ دیکھے ہی نہیں۔ جیسا اندھیرا ویسا اجالا۔ ویسے تب ہنڈے بھی آ گئے تھے لیکن تھے کم۔ دعوت کی اس لمبی میز پر قطارسے موم بتیاں جلی تھیں۔

تمام موم بتیاں ولایت سے آتی تھیں۔ تاڑ کے پتوں کے بڑے بڑے پنکھے ہلتے تھے تو پورے کا پورا ماحول ہل اٹھتا تھا۔ کرسیاں اور صوفے قطاروں میں لگے تھے۔ ایک بڑا صوفہ اونچائی پر بیچوں بیچ بچھا تھا۔ اس زمانے میں خالص چرمی صوفے بنتے تھے۔ اوپر مخمل کے موٹے غلاف چڑھا دیے جاتے تھے۔ ہمارے یہاں بھی ایسے دو صوفے تھے۔ ایک ڈھکا رہتا تھا دوسرا ڈرائنگ روم میں پڑا رہتا تھا۔ تب لوگ اسے بیٹھک یا نشست گاہ کہتے تھے۔ ان دونوں صوفوں کے مخملی غلاف رحمت اللہ اور اس کے ساتھی نے راتوں رات سی ڈالے تھے۔ جب ان صوفوں پر چڑھائے گئے تو جیسے جگمگا اٹھے۔

جس دن دعوت کا پروگرام طے ہوا اسی رات کو مجھے دلّی جانا پڑا۔ دلّی کے لالہ رنگی مل ہمارے خاندانی دوست تھے۔ ان دنوں دلّی کے حلوائیوں کی دور دور تک دھاک تھی۔ باریک دانے کے نگدی لڈو تب دلّی میں ہی بنتے تھے۔ خستہ اور موہن حلوہ بھی دلّی کے ہی حلوائی بناتے تھے۔ پستے کی برفی بھی تب دلّی میں ہی بنتی تھی۔ رنگی مل حلوائیوں کے مکھیا تھے یا یہ کہیے کہ سب ہی حلوائی ان کے آسامی تھے۔ انھوں نے دعوت کا سارا سامان اکٹھا کرایا اور چار بہترین کاریگر بھیجے۔ لالہ رنگی مل نے انھیں سخت تاکید کر دی تھی کہ دلّی کا نام کسی حالت میں نیچا نہ ہو۔ گورنر صاحب کو یہ دعوت زندگی بھر یاد رہے۔ زبان کا کھایا بھی یاد رہتا ہے اور کیا بھی۔ بس وہی چیزیں ٹاؤن ہال میں بنی تھیں جنھیں گرما گرم پیش کرنا تھا۔ پوریاں، کچوریاں، سبزیاں، پستے کی کھیر، زعفران پاک۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا؟ سب کچھ سبزی خوروں کے لیے تھا۔ حالانکہ مسٹر ڈک نے کسی کہلوایا تھا کہ اگر اجازت ہو تو گوشت خوروں کے لیے کچھ کھانے رکھے جائیں۔ بڑے رائے نے منع کر دیا تھا۔ پتہ نہیں اتنے کم وقت میں اتنا بڑا انتظام کب اور کیسے ہو گا؟

میں، چھوٹے رائے، بھوانی، چھوٹی چاچی، رحمت اللہ، سارے نوکر چاکر، گھوڑا گاڑیاں، تانگے اور سائیس تین دنوں تک رات دن لگے رہے۔ نہ لیٹے اور نہ بیٹھے۔ منجھلے رائے کو خبر تو اسی دن بھیج دی گئی تھی جس دن لاٹ صاحب نے دعوت قبول کی تھی۔ لیکن وہ پہنچے دعوت کے دن دوپہر کو۔ آتے ہی وہ بھی کام میں جٹ گئے۔ بڑے رائے دن بھر اپنے لباس کا ہی انتخاب کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں ہم میں سے کسی کو بلا کر پوچھتے بھی جاتے تھے۔۔۔ کہاں تک پہنچے۔ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔ ہاتھ دھونے کے لیے اصلی گلاب جل کا انتظام کرایا گیا۔

اتنے گلاب جل کا انتظام بھی لالہ رنگی مل نے ہی کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی کم پڑ گیا تھا۔ جب یہ مسئلہ آیا کہ جتنا گلاب جل ہے وہ مہمانوں کے ہاتھ دھونے کے لیے کم پڑ جائے گا تو بھی لکھوا دی گئی۔ پھر بھی اتنا گلاب جل اکٹھا نہ ہو سکا تو یہ طے پایا کہ باہر سے آنے والے سب مہمانوں کے ہاتھ تو خالص گلاب جل سے دھلائے جائیں باقی لوگوں کے ہاتھ دھلوانے کے لیے گلاب جل میں ایک تہائی پانی ملا لیا جائے۔ عطر گلاب، عطر حنا۔ عطر کوئے وغیرہ بھی دلی سے منگوائے گئے تھے۔ وہ سب گلاب گندھی کا کمال تھا۔ پھواروں کے ذریعے مہمانوں پر چھڑکے جا رہے تھے۔

کئی ایک باجے منگوائے گئے تھے وہ سب الگ الگ جگہوں پر بیٹھ کر بجا رہے تھے۔ ان دنوں بین باجہ بہت رائج تھا۔ گورکھے بجایا کرتے تھے۔ انگریز ان کا رنگ ماسٹر ہوتا تھا۔ وہ مارچ کرتے ہوئے، ڈرم اچھالتے ہوئے، رول گھماتے ہوئے گھومتے تھے اور بجاتے تھے۔ موزے گھٹنوں تک کے رہتے تھے۔ فراک۔ کمر۔ کوٹ پہنتے تھے۔ الگ الگ فارمیشن بناتے تھے، اسے توڑتے تھے، پھر بناتے تھے۔ کچھ لوگ بیٹھ کر ہی بجا رہے تھے۔ گیٹ پر مچان باندھا گیا تھا۔ اس پر بندو شہنائی نواز کمخواب کی اچکن پہنے شہنائی بجا رہے تھے۔

لاٹ صاحب کو کمخواب اور کارچوبی کے کام کے تام جھام میں لایا گیا۔ جیسے لاٹ صاحب نے زمین پر قدم رکھا ویسے ہی گولیاں داغی جانے لگیں۔ سب لوگ دونوں طرف صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ بڑے بڑے افسران، پھر تعلقے دار، زمیندار، روٗسا، سب اپنی بہترین پوشاکوں میں تھے۔ چند ایک نے تو اسی موقع کے لیے لباس سلوائے تھے۔ قریب قریب سب ہی لوگ گلے میں سونے کا توڑا ڈالے تھے۔ جو جتنا بڑا تھا اس کا توڑا اتنا ہی قیمتی تھا۔ بڑے رائے اور کلکٹر ڈک نے ان کی قیادت کی۔ اس دن کے بعد ڈک اور بڑے رائے پہلی بار آمنے سامنے تھے۔ ہم چاروں بڑے رائے کے پیچھے تھے۔ منجھلے رائے چھوٹے رائے اور میں۔ سب سے پیچھے اپنی زرق برق پوشاک میں بھوانی کے کندھے پر تولیہ ڈالے کھڑا تھا۔

سب سے پہلے بڑے رائے نے چاندی کی تشتری میں نذر پیش کی اور ان کا خیر مقدم کیا۔ حالانکہ نذر راجاؤں کو ہی دی جاتی تھی لیکن بڑے رائے گورنر کو بھی راجہ

مانتے تھے۔ انھیں ایک بار وائسرائے سے بھی ملنے کا موقع ملا تھا تو انھوں نے قیمتی ہیرے کی انگوٹھی نذر کی تھی۔ منجھلے رائے نے عطر دان سے عطر لگایا۔ چھوٹے رائے نے اپنی مرضی کے خلاف جاکر نایاب گلابوں کا گلدستہ پیش کیا۔ بڑے رائے نے خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ یہ میرے سب سے چھوٹے بھائی راگھو ہیں، یوول پرائس صاحب کے اسٹوڈنٹ نواب چھتاری نے انھیں طائرانہ لیکن گہری نظر سے دیکھا ڈک کو یہ سب پسند نہیں آیا تھا۔ وہ کلکٹر کی حیثیت سے سمجھتے تھے کہ لاٹ صاحب کے استقبال کا پہلا حق ان کا تھا۔ بڑے رائے کی سوچ بالکل الگ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ بھلے ہی دعوت کا اہتمام ٹاؤن ہال میں کیا جارہا ہے لیکن ہے تو ان کی ذاتی اس لیے بطور میزبان مہمان کے استقبال کا حق انھیں ہی پہنچتا ہے۔ کلکٹر بھی مہمان ہے۔ ہم سب کے بعد مسٹر ڈک اور مسز ڈک نے لاٹ صاحب سے ہاتھ ملایا۔ پھر کپتان پولیس اور ضلع جج مارٹن آئے۔ مشنر ان کے ساتھ ہی تھے۔

میونسپلٹی کے چیئرمین برکت علی خان بھی بھاگتے دوڑتے پہنچے ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب چلنے کو ہوتے ہیں تو ایک بار اچکن بدلتے ہیں ایک بار جوتا، پھر ایک بار بیت الخلا جاتے ہیں۔۔۔ اسی میں ان کا وقت نکل جاتا ہے۔ بڑے رائے نے ہنس کر کہا" ارے برکت علی صاحب آپ کو تو نواب صاحب دو بار پوچھ چکے"۔ انھوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا" توبہ توبہ میں بھی کیا حماقت کر بیٹھا ہوں۔۔۔ لاٹ صاحب ناراض تو نہیں ہوئے۔۔۔ ڈپٹی کلکٹر مجیب الحسن نے دھیرے سے کہا" یہ تو انھوں نے کہا ہے کہ ہم برکت علی صاحب کو اس کے لیے معقول سزا دیں گے۔" اماں اب کیا ہوگا، کچھ تو کیجیے، بس ایک ہی طرح آپ کی جاں بخشی ہو سکتی ہے کہ آپ ہم سب کو ایک بڑی دعوت دیں۔

برکت علی کو لگا کہ دعوت دے کر ہی ان بخشی ہو جائے تو بہت ہے۔ فوراً مان گئے۔

نواب چھتاری نے ایک نظر بڑے رائے اور ڈک کی طرف دیکھا۔ ڈک کا ہاتھ پکڑا اور بڑے رائے کی طرف دو قدم بڑھ کر بولے" جناب کلکٹر صاحب ہری رائے سے مصافحہ کیجیے۔ کسی صحیح سلامت عمارت کے دو ستونوں کو کبھی آپس میں ٹکراتے دیکھا ہے؟ پھر بڑے رائے سے بولے" جناب ہری رائے پرانی باتیں بھول کر مسٹر ڈک کی دوستی قبول کیجیے۔

بڑے رائے نے مسٹر ڈک سے ہاتھ ملایا۔ ڈک بڑھ کر گلے ملے۔ مسز ڈک

بولیں۔۔۔ "آج ہم بہت خوش ہیں" باقی سب نے بھی تالیاں بجائیں۔ خوشی کا ماحول بن گیا۔ مسیز ڈک بڑے رائے کے پاس جاکر بولیں "میں نے گمشدہ دوست تلاش کر لیا۔"

کئی لوگ ایسے تھے جنھوں نے میز پر کھانا پسند نہیں کیا تھا۔ بڑے رائے خود ان میں سے ایک تھے۔ انھوں نے آپ ہی آپ اپنے کو انتظام اور مہمانوں کی خاطر مدارات کے بہانے معاف کرلیا۔ پھر بھی جب لاٹ صاحب میز پر بیٹھے تو میز بان خصوصی کی حیثیت سے انھیں کچھ دیر کے لیے میز پر بیٹھنا پڑا۔ بادشاہ کی لمبی زندگی اور حکومت کی بہبودی کی تمنا کر کے نقرئی گلاس میں رس پیا۔ پھل وغیرہ ٹونگے اور معافی مانگ کر نواب چھتاری کی کرسی کے پیچھے جاکھڑے ہوئے۔ وہ ایک ایک مہمان کے پاس جاجاکے پوچھ رہے تھے کس کو کیا چاہیے۔ خاص طور پر گورنر صاحب اور دوسرے انگریز صاحبان کو وہ خود ہی دیکھ رہے تھے۔

موم بتی کی لو میں بتیں تو میز پر رکھے کھانے ہل جاتے۔ لگتا جیسے وہ میزوں پر تیر رہے ہیں۔ چودھری مہتاب سنگھ اور چودھری شیام سنگھ کھانا کھانے میں گرو سمجھے جاتے تھے۔ رائے بہادر دیوی سنگھ بھی کھانا کھانے والوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انھیں چھیڑتے رہتے تھے۔ کھاتے جاتے تھے ناراض ہوتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی اٹھ کر جانے کا ڈرامہ بھی کرتے تھے۔ برابر والا پہلے سے ہی مستعد ہوتا تھا۔ جیسے ہی وہ اٹھنے کو ہوتے وہ ہاتھ پکڑ کر بٹھالیتا تھا۔ وہ پھر کھانے لگتے تھے۔ اتنی زور کا قہقہہ لگتا تھا کہ سب کا کھانا ہضم ہو جاتا تھا۔

نواب صاحب بھی بیچ بیچ میں ان مذاقوں پر زیر لب مسکرا دیتے تھے۔ نواب صاحب نے دو چار لقمے کھائے ہوں گے کہ ان کی نظر صدر بہشتی پر پڑی۔ وہ گملوں میں پانی چھڑک رہا تھا۔ انھوں نے گردن گھما کر اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو دیکھا۔ وہ فوراً جھکا اور اپنا کان ان کے منہ کے سامنے لے گیا پھر وہ ملٹری چال سے گیا اور بہشتی کو لے کر لوٹ آیا۔ نواب چھتاری بہشتی سے بولے "بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔ یہ ہمارے دین میں نہیں ہے ایک بھائی کھانا کھائے اور دوسرا بھائی کام کرتا رہے۔

وہ بھونچکا سا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے شیشہ لگے کمرے کے بیچوں بیچ کوئی

جانور آ بیٹھے اور ہر طرف اپنی ہی اپنی شکل دیکھ کر سمجھ نہ سکے وہ کدھر جائے۔ وہ بولا تو نہیں لیکن بار بار ہاتھ جوڑ رہا تھا سلام کر رہا تھا۔ معافی مانگ رہا تھا۔ سب کے ہاتھ رک گئے اور چہروں پر تناؤ آ گیا۔ نواب صاحب کو معلوم تھا لیکن وہ ادھر متوجہ نہیں ہو رہے تھے۔ ایک کرسی لا کر ان کے برابر میں لا کر رکھ دی گئی تھی۔ اس پر اسے آہستہ سے بٹھا دیا گیا۔ پانی سے پھولی مشک زمین پر پڑی تھی۔ پانی حرکت کرتا تھا جیسے سانس لے رہا ہو۔ کھانے والوں کو اور بھی کراہیت محسوس ہونے لگی۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹھے رہیں یا اٹھ کھڑے ہوں۔ گورنر کا معاملہ تھا اس لیے اٹھنا کسی کے لیے بھی مشکل تھا۔ گورنر صاحب اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کتنے بچے ہیں؟ گزارہ کیسے چلتا ہے؟ لوگ پانی پیتے رہے اور منہ چڑھاتے رہے۔ بڑے رائے کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ ساری تیاری خاک میں مل گئی تھی۔ مہمان بھوکے تھے۔ ان کے ہاتھ ٹنگ گئے اور پاؤں زمین سے جڑ گئے۔

بڑے رائے عدو کے پاس جا کر بولے ”گھبراؤ نہیں، آرام سے کھاؤ۔ یہ سب تمھارے ہی لیے ہے۔ نواب صاحب اور ان کا مہمان میری میں ایک ہی رتبہ رکھتے ہیں۔ تمھاری زندگی میں ایسے مواقع پھر نہیں آئیں گے۔ آج ہم خود تمھیں کھانا پیش کریں گے۔

نواب صاحب نے تیز تیکھی نظر سے بڑے رائے کی طرف دیکھا۔ وہ بھشتی کے لیے کھیر نکال رہے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا ”نہیں حضور، مجھے دوزخ میں نہ جھونکیں، میں تو آپ کی جوٹھن پر پلنے والا ہوں، میرا سارا خاندان آپ کی جوٹھن پر پلا ہے۔ انھوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”بیٹھ جاؤ، کھاؤ، فی الحال پرانی باتیں بھول جاؤ۔ جو ہو رہا ہے، انھیں دیکھو،

اس بات کے بارے میں شہر میں دو فرقے ہو گئے تھے۔ ایک بڑے رائے کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا۔ بڑے رائے نے نواب صاحب کو بلایا تھا تو دستر خوان پر خود بیٹھنا چاہیے تھا۔ یہ تو راجہ مان سنگھ اور رانا پرتاپ والی بات ہو گئی۔ اسی بات پر انھوں نے بھشتی کو اپنے برابر میں بٹھا کر

اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا۔ دوسرا فرقہ بڑے رائے کی طرف تھا، دبی زبان سے کہتے تھے کون جانے نواب صاحب کے خاندان میں کوئی یہ کام کرچکا ہو۔ ایک طبقے سے تعلق تھا۔ نواب صاحب بھی ٹھیک اور رائے صاحب بھی ٹھیک۔ کسی کی نہیں بڑوں کا معاملہ ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ بڑے رائے نے نواب پر برابر کی چوٹ کی ہے۔ بات بہت الجھ گئی تھی۔ کچھ سرسراہٹ ہندو مسلم مسئلے کے بارے میں بھی تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے نواب چھتاری نے ہندوؤں کے منہ پر تمانچہ مارا ہے۔ مسلمان کہتے تھے یہ نواب صاحب کا بڑپن ہے۔ یہ ان کی کرامت ہے کہ عدو جیسے حقیر انسان کو بھی اپنے دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلایا۔ کوئی ہندو بھی ایسا کر سکتا ہے۔

اس دن کی دعوت نے بڑے رائے کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ کچھ یوں سے پریشان تھے۔ انھیں یہ بات خرور بری لگی تھی۔ انھیں کیا، سب ہی لوگوں کو جو اس میز پر کھانا کھا رہے تھے کہ ایک ایسے آدمی کو پکڑ کر میز پر بٹھا دیا گیا تھا جس کے جسم تک سے بو آرہی تھی۔ یہ تک نہیں دیکھا گیا کہ اس کے کپڑے کیسے ہیں۔ اس نے ہاتھ دھوئے ہیں یا نہیں۔۔۔ پانی میں بھیگے رہنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں میں خارے ہو گئے تھے جس کی وجہ سے وہ روز کام سے نمٹ کر اپنی گلی ہوئی انگلیوں میں کتھا لگایا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر لال رہتے تھے۔ لگتا تھا جیسے سڑ گئے ہوں۔ جس وجہ سے لوگوں کے لیے کھانا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کے دل میں ایک بات برابر کھٹک رہی تھی کہ کہیں نواب کے دل میں یہ تو نہیں تھا کہ انھیں دعوت پر بلانے کی ہمت کیسے کی جبکہ بھائی سورا جی ہیں۔۔۔ تم خواہ کتنے خیر خواہ ہو، حکومت کے سامنے تمھارا چہرہ صاف ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی دولت اور ان کی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ ایک چھوٹے اور حقیر انسان کو شہر کے اکابر کے سر پر بٹھا دیا تھا۔۔۔ کیا یہ حکومت برطانیہ کی نئی پالیسی ہے؟ یہ تو گاندھی جی کے اصول کو عملی جامہ پہنانا ہوا۔ منجھلے رائے کا خیال تھا جو کچھ بھی ہو اوہ تاج کا کیا ہوا مانا جانا چاہیے۔

بڑے رائے نے سبھی باتوں کو خاموشی سے سنا اور چپ رہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس سب کا مطلب کیا ہے؟! انھیں کس مہم پر لے جا کر شکست دی گئی ہے۔ ان کے سامنے سب کچھ واضح تھا۔ چھوٹے رائے کی کانگریس سے وابستگی کی پیش کش کو کتنا اچھالا ہے اور کس نے اچھالا، یہ بات اس واقعہ نے انھیں بخوبی سمجھا دی تھی۔ جس حکومت کی خیر خواہی

تین انھوں نے ساری زندگی گزار دی۔ وہ اتنی جلد نظر بدل لے گی۔ یہ بات ان کے لیے ناقابل فہم تھی۔ کیا سرکاریں اتنی ڈرپوک ہوتی ہیں کہ اگر کوئی بھٹک کر غلط سمت میں چلا جائے تو ہوش و حواس گم کر بیٹھتی ہیں۔ اسے واپس لینے کی جگہ وہ اسے بنے رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان سے مضبوط تو ہم عام اور اکیلے لوگ ہوتے ہیں جو پھر بھی سوچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ نہ سوچ پائیں یہ الگ بات ہے۔

اگلے دن منجھلے رائے کو جانا تھا۔ بڑے رائے حجامت بنا رہے تھے۔ جا کر وہیں رے سے بیٹھ گئے۔ حجامت بناتے رہے، منجھلے رائے میں ایک طرح کی بے چینی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ انھوں نے دزدیدہ نگاہ سے منجھلے رائے کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر بعد پوچھا ”کہو، وہ حیا والے چودھری صاحب کے بیٹے بیر بہادر کا کیا حال ہے؟۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ دراصل۔۔۔“

انھوں نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا ــــ ”کیوں، کیا بات ہے؟“

”وہ مجھ سے ناراض ہیں۔۔۔ پتہ نہیں کس نے ان کے کان بھر دیے کہ 'میں رشوت لیتا ہوں“

”کیا لیتے ہو؟“

بھلا میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔۔۔ لوگ ڈالی والی لے آتے ہیں تو رکھنی پڑتی ہے۔۔۔ بیر بہادر صاحب کا عجیب رویہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں میں اسے واپس کر دوں۔ وہ خود نہیں رکھتے۔ بھلا میں سب سے اپنے تعلقات کیسے بگاڑ لوں؟“

بڑے رائے نے بات بدل دی ”بہو کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے، سوچا تھا اس بار لیتا چلوں گا۔۔۔ آپ کا آشیرواد مل جائے گا لیکن یکا یک چلے آنا پڑا۔“

”کیا آدمی نے کہا نہیں تھا کہ بڑے رائے نے بہو کو لانے کے لیے کہا ہے؟“

دراصل آج کل جینٹ صاحب ناراض ہیں نا، کسی نہ کسی کا گھر پر رہنا ضروری ہے۔“

ان کا ہاتھ رک گیا۔ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ”کرشن رائے، تم جو کچھ کہہ رہے ہو، میں سمجھ رہا ہوں۔ اگر تم بہو کو لانا نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ جینٹ صاحب

کی ناراضگی سے بہو کو اٹھنے دینا اٹھنے سے کیا مطلب! ابھی جب موقع سمجھو تو اسے اپنے اس گھر کی دہلیز دکھا دینا۔ اس دہلیز پر ڈیڑھ دو سو سال سے ہمارے بڑوں کی دھول پڑی رہی۔ جہاں تک رشوت کی بات ہے اگر نہیں لیتے تو بہت اچھا ہے۔۔۔ تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔ویسے ڈالی کیا رشوت نہیں ہوتی؟ ہم لوگ بھی ڈالی بھیجتے ہیں۔۔۔ ہم بھی سمجھتے ہیں ڈالی کا مطلب کیا ہے؟ کام اور درجے کے حساب سے ڈالی گھٹتی بڑھتی ہے۔ افسر کے پاس تو ڈالی لے کر مکر جانے کی چھوٹ ہے۔۔۔ لیکن ہم لوگوں کو بہت سوچنا پڑتا ہے۔ ویسے جہاں تک عام آدمی کی بات ہے۔۔۔ وہ ان لوگوں سے اور ہم لوگوں سے الگ ہے۔ چھوٹے آدمی کی زبان ہوتی ہے۔۔۔ وہ اسے پلٹنے میں ڈرتا ہے۔ اب ڈکی ہی کو لو، ہم نے اس کے ساتھ کیا بھلائی نہیں کی اور اس نے ہمارے ساتھ کون سی زیادتی نہیں کی۔ میں جانتا ہوں تم صرف افسر ہی نہ بنو، عام آدمی بھی بنے رہو، جو زبان اور ایمان کو بڑی چیز مانتا ہے۔۔۔ امید ہے تم میری بات پر دھیان دوگے۔ اس پر سوچو گے۔"

منجھلے رائے کو بڑے رائے کی بات اچھی نہیں لگی۔ ڈانواڈول کر دینے والی بات تھی۔ ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن انھوں نے اپنے کو سنبھال لیا اور کہا "بھیا، اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو ایک بات کہہ دیں۔۔۔ وہ بیر بہادر صاحب کا وہاں سے کہیں اور تبادلہ کر دیں۔۔۔ تو۔۔۔"

بڑے رائے نے اس سمت، جہاں منجھلے رائے بیٹھے بات کر رہے تھے، کچھ اس طرح دیکھا، جیسے کہیں بہت دور دیکھ رہے ہوں اور اس جانب سے آنے والی آواز کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

یہ اپنے کرشن رائے کی آواز ہے نا؟ وہ دوسری بار صابن لگانے لگے۔ وہ دیر تک صابن ملتے رہے۔ کافی جھاگ پیدا ہو گئے تو انھیں خیال آیا کہ آخر کب تک جھاگ اٹھاتے رہیں گے۔ وہ پتھر پر استرا تیز کرنے لگے، چھو کر دیکھا، کام چل سکتا تھا۔ وہ داڑھی بنانے میں لگ گئے۔ داڑھی بنانے کے دوران ان کا منہ رہ رہ کر ایسے بگڑ جاتا تھا جیسے کونین کی کڑواہٹ بھر جاتی ہو۔ کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف۔ استرے کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ مونچھ کے پاس پہنچ کر ان کے ہاتھ نے ہلکی سی جنبش کی اور کٹ گیا۔ خون چھلک آیا۔

"کٹ گیا؟" منجھلے رائے کے منہ سے نکلا۔

"کوئی بات نہیں، استرا ہاتھ میں لے کر آخر کٹنے سے کب تک بچا جا سکتا ہے۔ بال

پھلتے رہیں اور جلد پکی رہے یہ ہمیشہ نہیں ہوتا۔۔۔ انھوں نے پھٹکری مل لی۔ پہلے پھٹکری ہر ایک کے بقچے میں رکھی ہوتی تھی۔ کٹنے سے سیلانِ خون روکنے کا انتظام یہ ہی تھا۔

منجھلے رائے کو احساس ہوا کہ یہ تو بڑے رائے نے ان کی بات پر غور نہیں کیا یا بھول گئے۔ انھوں نے پھر کہا "بڑے بھیا، آپ نے لاٹ صاحب کے بارے میں کیا سوچا؟"

"وہی سوچ رہا تھا۔ بیر بیاد ردودھیا والے چودھری صاحب کا بیٹا ہے گورنر سے ان کی شکایت کرنا اتنا ہی غلط ہوگا جتنا چودھری صاحب کا گورنر سے تمھاری شکایت کرنا ہو سکتا ہے۔ میں اس حالت میں جس طرح انھیں معاف نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ بھی شاید مجھے معاف نہ کریں۔ تم رشوت لیتے ہو۔۔۔" کہہ کر وہ رک کر بولے اتنی زورداری سے کیا میں تمھارے بارے میں کہہ سکوں گا؟" انھوں نے منجھلے رائے کی آنکھوں میں دیکھا تو منجھلے رائے دیکھ نہیں سکے۔ دوسرے ہی پل ان کے منہ سے نکلا "بھاسکر نے چاقو مارا تھا۔۔۔"

"ہاں تم یہ ہی کہنا چاہتے ہو نا کہ میرا بیٹا ہے اور تم میرے بھائی! کرشن رشوت لینا قتل کر دینے سے بھی برا ہے۔ تم اپنی بات کے لیے اگر کسی کو قتل کر کے بھی آتے تو تم دیکھتے کہ میں تمھارے لیے کیا کرتا۔ تب مجھے اطمینان ہوتا کہ تم نے بھلے ہی غلط کام کیا ہو لیکن گندہ کام نہیں کیا۔ ہمت اور خوف میں یہ ہی فرق ہوتا ہے۔"

"میں جانتا تھا آپ یہ ہی کہیں گے۔"

"تمھیں جاننا بھی چاہیے تھا، تم میرے بھائی ہو۔ اتنا تو جانتے ہی ہو کہ میں تمھارا بھلا ہی چاہوں گا۔۔۔ بھلے ہی تمھارے دل کی مراد پوری نہ کر سکوں۔ ایک کام کرو، آج گورنر کی رخصت ہے۔ میں نے رات کے واقعہ کے بعد طے کیا تھا کہ میں ان کی رخصت کے وقت نہیں جاؤں گا لیکن تمھارے لیے چلوں گا۔ تم میرے ساتھ چلنا۔ تم چونکہ بھاسکر کی بات بعد میں لے آئے، میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔"

وہ حجامت ختم کر چکے تھے۔ بھوانی سامان سمیٹ رہا تھا۔ بڑے رائے اٹھے اور غسل کے لیے چلے گئے۔ منجھلے رائے کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔ خاموش آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے۔

گورنر صاحب تشریف لے جا رہے تھے۔ شہر کے سارے امراء رؤسا اور حکام دست بستہ موجود تھے۔ بڑے آدمیوں کی آمد جشن ہوتی ہے اور رخصت بھی۔ اور اگر غلط نہ سمجھا جاؤں تو جنازہ بھی۔ ان کے کیمپ کے آگے سڑک کے دونوں طرف دو قطاریں بنی تھیں۔ پہلے حکام پھر امراء۔ چھوٹے رائے نہیں گئے تھے۔ منجھلے رائے اور میں البتہ ان کے ساتھ گئے تھے۔ بڑے رائے کافی بجھے ہوئے تھے۔ بڑے رائے تیسرے چوتھے نمبر پر تھے۔ ان کے پیچھے ہم دونوں کھڑے تھے۔ جب لاٹ صاحب مع اپنے لوازمات کے باہر آئے تو انھوں نے کیمپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر سب کا آداب قبول کیا پھر خراماں خراماں آگے بڑھنے لگے۔ کسی کا سلام لے رہے تھے۔ کسی سے مصافحہ کر رہے تھے۔ کسی کا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کر دیتے تھے، آگے بڑھ کر کسی سے خود ہاتھ ملاتے تھے۔ ہر آدمی کو ان کے سامنے گزرنے سے ہی اپنی حیثیت کا پتہ چل رہا تھا۔ گورنر صاحب بڑے کے سامنے آکر رکے۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولے ''آپ کی دعوت کے لیے مشکور ہوں، آپ نے ہمیں اپنی مہمان نوازی سے نوازا۔'' رک کر بولے ''مجھے خیال نہیں رہا کہ آپ لوگوں کے یہاں اس بات کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بہشتی کو آپ کے دستر خوان پر بلا لیا۔ دراصل میری عادت ہے کہ بسم اللہ کرنے سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ آس پاس کوئی بھوکا تو نہیں ہے؟ اگر کوئی ہوتا ہے تو طبیعت نہیں مانتی لیکن مجھے آپ کی روایات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔'' بڑے رائے دونوں ہاتھوں سے ہاتھ دباتے ہوئے مسکرا دیے ''آپ نے تشریف لا کر میری عزت افزائی کی۔۔۔''

بڑے رائے اس وضاحت سے نارمل ہو گئے تھے۔ آہستہ سے بولے ''آپ کا وقار اور بلند ہو۔'' شکریہ ادا کر وہ آگے بڑھنے لگے تو بڑے رائے بولے ''یہ منجھلا بھائی ہے، کرشن رائے ـــــ آپ کو سلام کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے زیر سایہ ہیں اور تحصیلدار ہیں۔''

گورنر نے ان کی طرف دیکھ کر صرف گردن ہلا دی ہاتھ نہیں ملایا۔ گورنر اور تحصیلدار میں کیا ربط ضبط۔ ان کا بڑھا ہوا ہاتھ لٹک گیا۔ وہ چاہتے تھے گورنر صاحب سے مصافحہ کر لیں اور پھر وہاں جا کر سب کو دکھائیں کہ یہ ہاتھ گورنر صاحب سے مل چکا ہے۔

گورنر صاحب چلتے چلتے بڑے رائے سے بولے "ان سے کہیے، آپ کی مثال پیش نظر رکھیں۔ درخت جب تک رہتا ہے تب تک اس کا سایہ ملتا ہے ـــــ اپنی وضعداری سے جو سایہ بنتا ہے وہ ہمیشہ ساتھ دیتا ہے۔۔۔" دھیرے سے کہتے ہوئے نکل گئے "ایمانداری اور وضعداری آدمی کے لیے ضروری چیزیں ہیں۔ منجھلے رائے سن رہ گئے۔ اور کسی نے سنا ہو نہ سنا ہو لیکن انھوں نے سن لیا تھا بڑے رائے اسی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ جب تک گورنر صاحب چلے نہیں جائیں گے وہ اسی طرح ہیئت سے نکے کھڑے رہے۔

کشن بابو کا سارا کھیل بخیر و خوبی ہو گیا تھا۔ وہ دونوں آخری مقدمے بھی ہار گئے تھے۔ وہ چوبارہ بھی اب ان کا نہیں رہا تھا جسے انھوں نے بہت ذوق و شوق سے سجایا تھا۔ وہ اب سڑک پر تھے، میں کشن بابو کے بارے میں پریشان تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی مدد کیسے کی جائے؟ ان کا احسان صرف میں ہی نہیں بلکہ دل ہی دل میں بڑے رائے بھی مانتے تھے۔ میں نے چھوٹے رائے سے مشورہ کیا۔ وہ بولے ـــ "یہ ٹھیک ہے کہ کشن بابو نے اپنا یہ حال خود بنایا ہے لیکن انھوں نے کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچایا ـــ جو کچھ کیا اپنے ساتھ ہی کیا۔"

میں ان کا ہم خیال نہ تھا۔ میں مانتا تھا کہ اگر کشن بابو نہ بھی اڑاتے تب بھی اس جائیداد کو تو جانا ہی تھا۔ دوسرا حقدار پیدا ہو گیا تھا تو کشن بابو اسے کہاں تک روکتے۔ کشن بابو نے کہا بھی تھا کہ آدھی جائیداد تم لے لو، آدھی میرے پاس رہنے دو۔ لیکن وہ نہ مانا۔ مانتا بھی کیسے؟ وہ سوگباشی مسماۃ کا زیادہ قریبی وارث تھا۔ اس کا بھی بعد میں پتہ چلا اور اسے بھی۔۔۔! وہ اپنے والد کے ساتھ جا کر ملتان میں رہنے لگا تھا۔ جب لوٹا تو پتہ چلا کہ مسماۃ جائیداد چھوڑ کر پرلوک سدھار گئیں۔ اس جائیداد کا کوئی بہت دور رشتے دار مالک بن بیٹھا۔ جب وہ آیا تو کشن بابو نے ایک بار تو سوچا کہ وہ اپنا بقچہ اٹھا کر چلتے بنیں اور جائیداد کو اترے ہوئے پرانے کپڑے کی طرح وہیں چھوڑ جائیں جسے پہننا ہو پہن لے لیکن انھیں لگا کہ اس پرانے لباس نے انھیں کس کر پکڑا ہوا ہے۔ وہ اسے نئے وارث کے ڈر کی وجہ سے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔

چھوٹے رائے نے میری یہ وضاحت سن کر مجھے حیرت سے دیکھا۔ دھیرے سے بولے "کشن بابو کیا اتنا سوچ لیتے ہیں؟"

میں اس بات کا کیا جواب دیتا۔ وہ اپنے آپ ہی بولے "جب وہ اتنا کچھ سوچ سمجھ لیتے ہیں اور اتنے خوددار ہیں تو انھیں ہماری کسی بھی طرح کی مدد قبول کرنے میں تردد ہوگا۔ ہو سکتا ہے انکار کردیں۔ پھر بھی میں بڑے بھیا سے بات کروں گا ــــ ان کے دل میں بھی کشن بابو کے لیے جگہ ہے ــــ مجھے ہی وہ نہیں۔"

بڑے رائے کو تب تک معلوم نہیں تھا کہ کشن بابو مقدمہ ہار چکے ہیں۔ چھوٹے رائے سے پتہ چلا تو وہ تھوڑی دیر تک چپ بیٹھے رہے پھر کچھ دیر بعد جیسے وہ اس صدمے کی گرفت سے باہر نکل کر بولے "خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا ــــ زمین جائیداد اپنے آپ کو اس طرح نہ آئیں پچیں تو کیسے اپنا زہر ہضم کریں اور کسی دوسرے میں اتاریں۔" رک کر پوچھا "کشن بابو پڑھے لکھے تو ہوں گے؟"

"شاید زیادہ نہیں۔۔۔"

"انھیں کارندہ بھیج کر یہیں بلواؤ۔ کہاں قیام ہے؟"

"کچہری سے ایک ماہ کی مہلت ملی ہوئی ہے۔۔۔"

"ٹھیک ہے، یہیں بلواؤ۔۔۔ یہ ضروری تو نہیں کہ مہلت کا وقت وہیں پورا کریں۔"

چھوٹے رائے اٹھ کر چلے گئے۔ بڑے رائے اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوگئے اور باہر دیکھنے لگے۔ چیل آسمان میں چیخ کر کتنی چھوٹی ہو گئی تھی جیسے کسی نے سلیٹ پر کرم کانٹے کھینچ دیے ہوں۔

کشن بابو آئے تو ان کے چہرے پر کوئی ملال یا دکھ نہیں تھا۔ اسی طرح الست اور سو کر اٹھے ہوئے سے۔ آنکھوں کا سرمہ چمک رہا تھا۔ رات میں شاید کچھ زیادہ لگا لیا تھا۔ ہمارے یہاں بھی سونے سے پہلے سب سرمہ لگاتے تھے۔ روساء کا شوق تھا قسم قسم کے سرمے تیار کرانا اور لگانا۔ اسی سے پتہ تھا کہ یہ رئیس ہے۔ طلسمی یا نوشی کرن سرمے بھی ہوتے تھے۔ معشوق کو بس میں کرنے کے بھی۔ ان کے کرتے کی آستینیں اور دھوتی کے سامنے والے سڈے کی چنٹیں بھی پہلے کی طرح ہی تھیں۔ ان میں ابھی کوئی فرق نہیں

آیا تھا۔ انھوں نے آکر بڑے رائے کے پاؤں چھوئے۔ مجھے اٹ پٹا سا لگا۔ انھیں ایسا کرتے پہلی بار دیکھا تھا۔ شرم سی محسوس ہوئی۔ وہ میرے والد تھے ان کے نہیں۔ پھر انھوں نے ایسا کیوں کیا؟

بڑے رائے نے پہلا جملہ بولا "کشن بابو، آپ اس واقعہ کو بھول جائیں۔ زمین، جائیداد، عیش و عشرت سب بازار کے نرخ کی طرح ہیں، کبھی اوپر کبھی نیچے۔ سب سے زیادہ بے مراد اور بے وفا اگر کوئی ہے تو زمین ہے۔"

کشن بابو، ہنسے۔ "میرا اس میں کیا تھا؟ نہ میرے بزرگوں نے بنائی تھی اور نہ میں نے ــــ ہوا کے جھونکے میں کاغذ کے ٹکڑے کی طرح اڑتی ہوئی آئی اور میرے دامن میں آگری۔ دسرا ہوا کا جھونکا آیا اور پھر اڑا لے گیا! جو ہوا پر تیرتا ہو، اسے کون کب تک پکڑے رہ سکتا ہے؟ چلی گئی، اچھا ہوا ــــ اب میں پھر کرشن سہائے ہو کر اپنے آپ میں واپس آگیا۔ ــــ سچ پوچھیے تو یہ چیزیں آدمی کو اپنے آپ سے الگ کر دیتی ہیں۔۔۔"

بڑے رائے نے شاید اس جواب کی امید نہیں کی تھی۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ یکایک ان کے دماغ میں منجھلے رائے کود گئے حالانکہ اس سے ان کا کائی واسطہ نہ تھا۔ انھوں نے اس خیال کو برطرف کر کے کہا جیسے بھاسکر ویسے تم! ایک طرح سے تم بھی بھاسکر ہی ہو ــــ تم نے ہی اسے زندگی بخشی۔ تم ہمارے ساتھ رہو۔"

چھوٹے رائے نے بات آگے بڑھائی "ہم لوگوں کو تمھارا بہت سہارا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔"

کشن بابو کچھ زیادہ آزاد ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ جائیداد ان کے لیے کسی آسیب کی طرح تھی جو ان پر دباؤ ڈالتی تھی کہ تو مجھے کھا۔۔۔ اور وہ بھی انھیں کھا رہی تھی۔ اس کے اتر جانے سے ان کا خطرہ ختم ہو گیا تھا۔ نہ انھیں کسی کو کھانا تھا اور نہ کوئی انھیں کھانے والا تھا۔

مقدمہ ہارنے پر ان کے منہ سے اسی طرح کی بات نکلی تھی وہ ہنسے "میں کس مطلب کا ہوں ــــ نشیڑی، گنجیڑی۔ پھر جائیداد کے سائے میں آؤں گا تو پھر جھکارنے لگوں گا، اپنے کو بھول جاؤں گا۔۔۔ اپنے سے الگ ہو جاؤں گا۔ اب آزاد ہوں، رونا ہو گا تو روؤں گا۔۔۔ مرنا ہو گا تو مر جاؤں گا۔۔۔ یا پھر اس جگہ لوٹ جاؤں گا جہاں میری اپنی زندگی

اسی حال میں میرا "انتظار کر رہی ہے جس میں، میں اسے چھوڑ کر اس پڑکا پوند میں داخل ہوا تھا"

"تم یہاں نہ رہنا چاہو تو زمینداری میں کہیں بھی گھومو۔۔۔ پھر ہمارے ڈیرے خالی پڑے ہیں۔ بچوں کو بھی لے آؤ۔"

"میرے گاؤں میں کیا برائی ہے، بڑے رائے! وہ چھوٹا تو میں اسے بھول ہی گیا۔ اس جائیداد کا نشہ اس نشے سے بھی زیادہ گندھا تھا نہ۔ یہ ہی پتہ نہیں رہا کہ تھان کہاں ہے، گھوڑا کہاں ــــ ؟ ہوش آیا تو پتہ چلا کہ تھان تو کوسوں پیچھے چھوٹ گیا ــــ اس کی جگہ کشن بابو آکر جم گیا۔ اب جب تھان کا خیال آگیا تو لوٹ جانے دیجئے، مجھ پر یہ رحم نہ کیجئے۔۔۔ ورنہ میں پھر کبھی لوٹ نہ سکوں گا۔ وہ بڑھیا اور بچے جنھیں میں منجدھار میں چھوڑ آیا تھا، ان کی سدھ لے لوں۔۔۔ پتہ نہیں وقت انھیں کہاں کہاں گھما رہا ہوگا۔ ایسے میں پتوار کا ٹوٹا ہوا ہاتھ میں آجائے تو بہت سہارا مل جاتا ہے۔ وہ اتنے جذباتی تھے اور اپنے اس جذبے کو اتنے متوازن انداز میں جی رہے تھے کہ کسی کے لیے کچھ بھی کہنا ممکن نہیں تھا۔ بڑے رائے نے بات بدل دی۔ بولے "آپ گھر خالی کر آئیے اور کچھ دن ہمارے ساتھ رہیے۔"

"بڑے رائے خالی کیا کرنا ہے۔ اپنا تو وہاں کچھ نہیں۔ میں تو ایک بقچے اور بچھاون کی دری لے کر آیا تھا۔ سب کچھ جائیداد سے بنا۔ جتنا کھایا پیا اور اڑایا وہی لے کر جاؤں گا ــــ جو کچھ بچا ہوا ہے وہ سب اسی جائیداد کا حصہ ہے۔ میں یہاں سے نکلوں گا تو وہیں جاؤں جہاں میں نے اپنے کو چھوڑا تھا۔ ہاں، آپ سب کی یاد آئے گی۔ بھاسکر تو میری زندگی بھر کی کمائی ہے۔ کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کروں گا۔ اس کی شادی ہوگی تو مجھے ضرور مطلع کیجئے گا۔" انھوں نے بہت پیار سے میری طرف دیکھا۔

کشن بابو اچانک اٹھے اور چل دیے۔ جاتے وقت بس بڑے رائے کے پاؤں پر جھکے۔ چھوٹے رائے کی آنکھیں نم تھیں بڑے رائے نے مجھ سے کہا ــــ "جاؤ، انھیں لے جاؤ گاڑی سے چھوڑ آؤ" انھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "ارے نہیں صاحب، بہت ہو چکی چونچلے بازی اب زمین نظر آنے لگی تو زمین پر ہی چلنے دیجے گا۔" کشن بابو جب باہر نکلے تو وہ کسی گانے کی لائن گنگنا رہے تھے ــــ اس کا مطلب تھا اب اپنا تان پورا اٹھا لے اور بر ہاگا۔ میں پیچھے پیچھے چپ چاپ چل رہا تھا۔

گھر پر ان کا وہی نوکر تھا۔ حالانکہ وہ اس کی چھٹی کر چکے تھے لیکن وہ ضد کر کے رہ رہا تھا۔ انھوں نے ٹوپی کھونٹی پر ٹانگ دی اور پھر کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے اور میرا گال چھوا اور بولے "بھاسکر بابو، تم بھی میرے ان ہی دنوں کی دین ہو لیکن چونکہ تم ایک انسان ہو اس لیے میں تمھیں بے جان چیزوں کی طرح نہ تو چھوڑ سکتا ہوں اور نہ بھلا سکتا ہوں۔ تم میرا روحانی نشہ ہو۔ ویسے، دو آنے بھر افیم تو مجھے لیتے ہی رہنی پڑے گی، ورنہ میں مر جاؤں گا۔ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ برے سے برے دنوں کا بھی زیادہ سے زیادہ مزا لے کر جیوں گا تاکہ دل کی ہر تمنا نکل جائے۔ اگر ہندو ٹھیک ہیں تو بار بار جنم نہ لینا پڑے اور مسلمان ٹھیک ہیں تو قیامت کے دن جب صور اسرافیل بجے تو پوری طرح سے آسودہ اٹھوں ـــــ دل میں کوئی چاہ نہ باقی رہے۔ خدا پوچھے بھی تو تجھے کیا چاہیے تو ہنس کر کہوں ـــــ جو دینا ہے اوروں کو دے، مجھے تو اپنے حال میں مست رہنے دے۔ ان کی اس طرح کی باتیں سن کر ان کا وہ نوکر آنسو بہانے لگتا تھا۔ ان کے آگے پیچھے کہتا تھا ـــــ "بابو صاحب ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر ہنس دیتے تھے۔ دیکھو، "تمھاری نظر اس مردے پر ہے جو دفنایا جا چکا۔ میری نظر اس پر ہے جو زندہ بچا ہوا ہے۔ میرے ہاتھی کو دیکھو جو بہت قیمتی ہے۔ یا اس چیونٹی کو دیکھو جو اپنی طاقت سے کئی گنا وزن اٹھا کر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسے امید ہے کہ وہ وہاں پہنچے گی" اور ہنس دیتے۔

میں نے ان سے پوچھا "تم میں یکا یک اتنی تبدیلی کیسے اور کہاں سے آ گئی؟" وہ ہنسے، جب میں یہاں آیا تھا اور جائیداد کو شراب کے جام کی طرح منہ سے لگا کر غٹاغٹ پینے لگا تھا تب بھی تو یکایک ہی تبدیلی آئی تھی۔ تب نہ شراب جانتا تھا اور نہ افیم، مجرا نہ طوائف ـــــ اس وقت میں اس بھاسکر سے بھی متعارف نہیں تھا۔ رات ہی رات میں سب کچھ جان گیا۔ اب جب جا رہا ہوں تو میں ساتھ کیسے لے جاؤں ـــــ اتنا جان لینا کہ کیا کر سکتا ہوں کیا نہیں ـــــ بدل لینے کے لیے کافی ہے۔ یہاں ان سب کو چھوڑوں گا تب ہی وہاں اس چھوڑے ہوئے کو پھر سے حاصل کروں گا۔" پھر ہنس کر کہا "بس دو چیزیں شاید کبھی نہ چھوٹ پائیں افیم اور تم۔"

جس دن کشن بابو کی مہلت کا ایک مہینہ پورا ہونے والا تھا، اس دن میں سویرے ہی ان کے گھر پہنچا۔ ان کا وہی نوکر باہر بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی سہنے لگا۔ میں نے سوچا پتہ نہیں کیا ہوگا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ پوچھا۔ ''کشن بابو کہاں ہیں؟ چوبارے پر تالا کیسے پڑا ہے؟''

''وہ آدھی رات کو اٹھے اور چلے گئے'' وہ سسکتا ہوا بولا ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ انھوں نے تو سویرے جانے کے لیے کہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، تم نے روکا نہیں؟'' ''رات میں بارہ بجے مجھے جگا کر کہا کہ ''میں جا رہا ہوں۔'' تب سڑک پر کتے بھونک رہے تھے۔ میں سمجھ گیا ابھی کافی رات باقی ہے۔ چوکیدار کے ڈنڈا بجانے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ میں نے انھیں روکنا چاہا لیکن رکے نہیں۔ بولے فقیر کو رات میں سفر کرنا چاہیے۔ اب تو میں فقیر ہوں، نہ گھر سے کچھ لایا تھا ـــــ نہ لے جا رہا ہوں۔ کندھے پر دری اور ہاتھ میں ایک لنگی۔ پتہ نہیں پیسہ بھی پاس تھا یا نہیں۔ دس چاندی کے روپے میز پر رکھے ملے۔ وہ شاید میرے لیے رکھے گئے تھے۔ کیونکہ چلتے ہوئے کہا تھا، میز پر کچھ رکھا ہے تم لے لینا۔''

''یہاں تالا؟''

''جنھوں نے مقدمہ جیتا ہے وہ سویرے سویرے ہی آئے تھے۔ بابو صاحب تالا لگا کر چابی مجھے دے گئے، کہہ گئے تھے انھیں سونپ دینا۔ وہ بھرے پڑے چوبارے کو دیکھ حیرت میں پڑ گئے۔ پوچھنے لگے سامان کب لے جائیں گے؟ ان کے نام وہ ایک خط دے گئے تھے۔ میں نے انھیں پکڑا دیا۔ وہ خط پڑھ کر حیران ہو گئے۔ بولے ''یہ تمھارا مالک کیسا آدمی ہے؟ اپنا سامان تک نہیں لے گیا۔ مقدمہ ایسے لڑ رہا تھا جیسے زندگی کی سب سے سنگین لڑائی لڑ رہا ہو۔ انھوں نے باہر اپنا تالا ڈالا اور چلے گئے۔ یہ بھی کہہ گئے کہ اپنے مالک کو بتا دینا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا سامان لے جائیں، اچانک اسے یاد آیا، آپ کے نام بھی ایک خط دے گئے ہیں۔۔۔ میں اسی لیے بیٹھا تھا، جو کام میرے سپرد کیا تھا اسے نمٹا کر اپنی راہ لوں۔''

خط اردو میں تھا۔ لکھا تھا:

''پیارے بھاسکر،

میں نے کبھی اتنا پیار کسی کو نہیں دیا ___ خدا کو بھی نہیں۔ دیکھتا تو شاید کرتا۔ جب دیکھا ہی نہیں تو پیار کیسا۔ پیار ایک ایسی لو ہے جو ایک بار اٹھی تو پھر بجھائے نہیں بجھتی۔ میرے لیے یہ دیش بیگانہ تھا، تم نے اسے اپنا بنانے کا راستہ دکھایا۔ میں یہ جانتا تھا کہ میں املتاس کا درخت نہیں، صرف پھل ہوں۔ جھڑ جاؤں گا تو دھول میں مل جاؤں گا۔ جب جائیداد ملی اور میں اسے بھوگ رہا تھا تب بھی مجھے یہ لگتا تھا کہ یہ میرا نہیں لیکن مجھے اسے بھوگنے میں شہد کی مکھی کے شہد چوسنے جیسا لطف ملتا تھا۔ جب میرے لیے وہ درخت ختم ہوا تو مجھے ملال نہیں ہوا کیونکہ مکھی کی فطرت ہوتی ہے شہد اکٹھا کرنا۔ یہاں نہیں تو وہاں رہوں گا۔ پیار کے شہد کو ڈھونڈنا نہیں چھوڑوں گا۔ اس جائیداد سے آج بارہ بجے وہ رشتہ ختم ہو چکا۔

تم یہاں ہو اور خدا کرے ہمیشہ بنے رہو۔ جب تک تم یہاں ہو، تمھارے بہانے میں یہاں ہوں۔ تم میرے بنے رہو گے تو میری زندگی کا سلسلہ قائم رہے گا۔ میں بیچ بیچ میں یہاں آتا رہوں گا۔ رحمت اللہ کے پاس ہی ٹھہروں گا۔ وہی میرے اپنے جیسا ہے۔ بس تمھیں دیکھ کر لوٹ جایا کروں گا۔ میں اصلی کرشن نہیں جو اپنے پیار کو دیکھنے کے لیے لوٹے ہی نہیں۔ بڑے رائے نے مجھے جتنی عزت بخشی میں اس کے لائق نہیں تھا۔ میں ادنیٰ انسان۔۔۔

ہاں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ رحمت اللہ نے ایک طوائف کی زندگی کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ کہنے کو تو طوائف تھی لیکن دل میں پیار اور ایثار کا سمندر ہے۔ رحمت اللہ بھی ایک انسان واقع ہوا ہے جو اس دنیا کا نہیں۔ ہمارے بھجنوں والا پتت پاون! (گناہگاروں کا پاک کرنے والا)۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ بھلاؤ گے نہیں۔ رحمت اللہ کو کبھی غلط نہ سمجھنا۔

تمھارا

کرشن

انھوں نے خادم لکھ کر کاٹ دیا تھا۔ میں تھوڑا چکرا گیا ___ آخر انھوں نے اپنے سے اتنے چھوٹے کے لیے اس لفظ کا استعمال کیوں کیا؟ یہاں ان کی محبت کی دنیا میں عاشق کے لیے اسی لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے؟ کیا جاتا ہے تو پھر لفظ کاٹا کیوں؟

"جب تک کشن بابو تھے اپنی موجودگی زبردستی محسوس کراتے رہے اور اب اپنی عدم موجودگی کو بھی اسی شدت سے محسوس کرا رہے تھے۔"

رحمت اللہ کی دوکان کئی دن سے بند تھی۔ میں بھوانی کو کئی بار بھیج چکا تھا۔ دراصل ارن یا تو رانی کے پاس سو رہا تھا یا چھوٹی چاچی کے پاس۔ بھوانی مل جاتا تھا تو پھر کیا کہنے! لیکن بھوانی بڑے رائے کا خدمت گار تھا۔ جب تک وہ حویلی میں رہتے تھے، بھوانی کو ان کی پیشی میں رہنا پڑتا تھا۔ جب بھوانی اتنا مصروف ہو جاتا تھا کہ اسے ارن کو باہر لے جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی تو وہ اسے رحمت اللہ کے سپرد کر آتا تھا۔ رحمت اللہ اسے گھمانے لے جاتا تھا اور بات چیت میں اس کا من لگائے رکھتا۔

رحمت اللہ کی دکان بند ہونے کی وجہ سے ارن پریشان تھا۔ رحمت اللہ کی دکان اس کا کلب تھی۔ اس کے بند ہو جانے کی وجہ سے وہ یا تو رانی سے چپکا رہتا تھا یا بھوانی کے پیچھے رواں رواں کرتا گھومتا رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا گھوڑا بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک سائیس گھوڑے کی لگام پکڑ کر چلتا تھا۔ دوسرا آدمی پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ کہیں ارن بابو کو کد وانے نہ ہو جائیں۔ اکثر رحمت اللہ ہی ساتھ رہتا تھا۔ پیچھے سے ٹوکتا رہتا تھا، 'سیدھے بیٹھو بھیا'، 'دائیں جھک رہے ہو'، 'دائیں مت جھکو گر جاؤ گے'۔ رحمت اللہ کی ایک سب سے بڑی خوبی تھی کہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، وہ بات ایسے کرتا تھا کہ بچوں کا من تو لگتا ہی تھا، بڑوں کا من بھی لگے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اسے بے انتہا کہانی قصے یاد تھے۔ اس طرح سناتا تھا کہ سب ہنس پڑیں اور خود کو ہنسی نہ آئے۔ ارن کو اس کی باتوں میں بہت مزہ آتا تھا۔

رحمت اللہ کی اس غیر حاضری سے میں اور فکر مند ہو گیا تھا۔ چھوٹے رائے بھی

تھے۔ ایک دو بار آدمی اس کے گھر بھی بھیجا گیا تو پتہ چلا کہ اس نے گھر بدل دیا۔ کہاں گیا۔ یہ محلے والوں کو بھی پتہ نہیں تھا۔ اسے تلاش کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ارن اسے شب و روز تلاش کیا کرتا تھا حتی کہ کئی بار بڑے رائے بھی اسے اپنے ساتھ کلب لے گئے تھے تاکہ اس کا من بدل جائے۔ اسے ٹینس کی کئی کھیلی ہوئی گیندیں بھی دلوائی گئیں۔ کلب میں ممبروں کے بچوں کو کھیلی ہوئی گیند مفت یا برائے نام قیمت پر دے دی جاتی تھی لیکن وہ رات کو رانی اور دن میں رحمت اللہ اور جھوائی کی رٹ لگائے رہتا تھا۔

بات بڑے رائے تک پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن کالے کو بلا کر کہا ــــ "تم تو اپنے طور پر پتہ لگاؤ کہ رحمت اللہ کہاں ہے؟ ایک تو وہ سائیس اور دوسرے بڑے رائے کا معتبر آدمی۔"

دو تین دن بعد اچانک رحمت اللہ کالے کے ساتھ نمودار ہوا۔ بڑے رائے اس وقت کسی میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ ارن کو پتہ چلا تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگا چلا آیا۔ رحمت اللہ اسے دیکھ کر جذبات سے مغلوب ہو گیا اور کافی دیر تک سینے سے لگائے رہا۔

کچھ دیر ایک طرح کی افراتفری مچی رہی کہ رحمت اللہ آ گیا۔ حویلی کے جو لوگ اسے جانتے تھے قریب قریب سب ہی اسے دیکھنے آئے۔ شاید ملتے بھی لیکن چھوٹے رائے اور میری موجودگی کے سبب وہ دور سے جھانکتے رہے۔ چھوٹے رائے نے رحمت اللہ کو اشارے سے پاس بلایا۔ ارن ابھی تک اس کی گود میں سوار تھا۔ وہ بار بار اس کا منہ اپنی طرف گھما لیتا تھا پوچھتا "بھیا اب تو نہیں جاؤ گے؟"

رحمت اللہ صرف مسکرا دیتا تھا۔ ویسے وہ اس سوال سے پریشان ہو جاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ چھوٹے رائے نے پوچھا "کیا بات ہے رحمت اللہ؟ کیا ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہیں اور کاروبار شروع کر دیا؟"

رحمت اللہ چپ، ارن بیچ بیچ میں چپر چپر بولے جا رہا تھا "بھیا ہمیں گھوڑ سواری کے لیے لے کر چلو۔"

"ابھی لے چلتے ہیں ارن بابو!"

"چھوٹے رائے نے پھر پوچھا "کیا ہم لوگوں کی طرف سے کوئی ایسی بات ہوگی جس نے تمھیں بدظن کر دیا؟ آخر تمھاری دوکان اتنے دن سے کیوں بند ہے؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "چھوٹے مالک، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو آپ کی رعیت ہوں۔"

"تو پھر۔۔۔؟"

"بے ادبی تو میں نے کی ہے؟"

چھوٹے رائے ہنس دیے "ایسی کون سی بے ادبی کر ڈالی، جو ہمیں معلوم نہ ہوئی۔ کہیں کلکٹر صاحب نے تو نہیں پکڑ بلوایا؟"

اس کا چہرہ ایک دم تمتما گیا، وہ بولا "آپ کتوں سے کچھ لا لیجیے لیکن یہ نہ کہیے حضور، میں تو ناچیز ہوں۔ اتنا تو میں کر ہی سکتا ہوں کہ جس نے بے زبان جانور کو مروا ڈالا، اس کی شکل نہ دیکھوں۔ اگر دیکھنی ہی پڑے تو اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالوں۔ جانور تو درختوں کی طرح، حضور، ہمارے ہم قدم اور ہم سفر ہوتے ہیں۔ انھیں کوئی مارے تو چھانسی کی سزا تو نہیں دے سکتے لیکن انھیں دیکھ منہ تو گھما ہی سکتے ہیں۔ ان کے لیے سفید اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔"

چھوٹے رائے اس کے جواب پر دل ہی دل میں ہو گئے جھینپ اور خوش بھی ہوئے۔ بولے "پھر تم نے ہم سب کو کیوں چھوڑ دیا؟"

ارن دن رات روتا ہے۔ جب ہم لوگوں کی نظر حویلی کے دروازے کے باہر جاتی ہے اور ہم تمھیں دوکان پر نہیں دیکھتے تو ہمیں لگتا ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔"

رحمت اللہ کی گردن جھک گئی، آنکھیں بھر آئیں، آواز گھٹنے لگی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر ارن سے بولا "بیٹا جاؤ، رانی دیدی سے کہو، بھیا کو بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دے دو۔"

"تم چلے تو نہیں جاؤ گے بھیا؟"

وہ بے دلی سے گیا۔ جاتے ہوئے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ کہیں بھیا اٹھ کر تو نہیں چلا گیا۔ اسی میں وہ ٹھوکر بھی کھا گیا۔ رحمت اللہ نے اسے دوڑ کر اٹھایا لیکن وہ رویا نہیں۔ اس نے ایک بار پھر پوچھا "جاؤ گے تو نہیں؟"

وہ بولا ''نہیں بیٹا نہیں، ہرگز نہیں جاؤں گا'' اس بار وہ بے فکر سا نظر آیا۔

رحمت اللہ چھوٹے رائے سے بولا ''چھوٹے مالک، میں اب آپ کے لائق نہیں رہا۔ میں نے ایک طوائف گھر میں بٹھالی۔۔۔'' جملے کا آخری حصہ کہتے ہوئے آواز میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ وہ بتا رہا تھا ''نکاح کے وقت کشن بابو بھی موجود تھے۔ ان کی شخصیت اتنی بڑی تھی کہ ان کی آنکھوں میں نہیں سما پا رہی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ رحمت اللہ تم تو سائیں رہے ہو، کوچوان رہے ہو، گھوڑ سوار ہو، جس گھوڑے پر چلتے ہو، اس کی دیکھ بھال کرتے ہو، اسے پیار کرتے ہو۔ لیکن جو انسان اپنے کو نیچا گرا کر بھی تمھاری زندگی میں خوشیاں لانے کی کوشش کرتا ہو، تمھارے جوش مارتے جذبات کو اپنے اندر جذب ہو جانے دیتا ہو، کیا وہ تمھاری پناہ کا مستحق نہیں؟ خدا کی پناہ بھی کسی نہ کسی ذریعے سے ہی ملتی ہے؟ انسان کسی سے پیار اور نفرت ایک ساتھ کیسے کر سکتا ہے۔۔۔؟ طوائف ہے تو کیا ہوا؟ وہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمھارے پیار کے لیے بھی برتن کا کام دے اور نفرت کے لیے بھی؟ کشن بابو کی بات میرے اندر تک گئی۔ میں نے اس سے نکاح کر لیا۔ بڑے رائے کو پتہ چلے گا تو وہ کیا کہیں گے ــــ بہو بیٹیاں سنیں گی تو انھیں کیسا لگے گا ــــ میں ان بچوں پر اپنا سایہ کیونکر پڑنے دوں؟'' وہ سسکنے لگا۔

چھوٹے رائے کشش و پنج میں پڑ گئے۔ سمجھاتے ہوئے بولے ــــ ''رحمت اللہ، دیکھو اگر تم نے اس سے محبت کی، تب بھی ٹھیک کیا اور اگر فرض کے تحت یہ نکاح کیا تو اور بھی زیادہ ٹھیک کیا۔ فرض کے لیے کیے جانے والے کام کے پیچھے ایثار اور قربانی کی جھلک بھی ہوتی ہے، محبت تو ایک بہاؤ ہے جو چاہے اس میں نہا لے۔ جہاں تک نفرت کی بات ہے وہی لوگ کرتے ہیں جنھیں نہ محبت کا احساس ہوتا ہے اور نہ فرض کی پہچان۔''

رحمت اللہ کو لگا کہ کوئی ہے جو اسے کنارے سے پکار رہا ہے۔ وہ بولا ''چھوٹے مالک، میں نہ ان بچوں کے بغیر رہ سکتا ہوں اور نہ میں انھیں اپنی شکل دکھانے لائق رہا ہوں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟''

تم کچھ نہ کرو، بس اتنا طے کر لو کہ تم اپنے اس فیصلے سے شرمندہ ہو یا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو تم نے کیا اس سے بہتر اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر نادم ہو تو جو تم سوچتے ہو وہی مناسب ہے اور اگر نہیں تو کل سے دوکان کھولو اور کام شروع کر دو، ویسے اس بات سے میں واقف ہوں یا بھاسکر!''

"بڑے رائے میرے لیے اپنے والد سے بھی زیادہ ہیں۔ اگر انھیں بعد میں پتہ چلا کہ میں نے انھیں دھوکا دیا تو میں اپنے آپ کو بھی معاف نہ کر سکوں گا۔"

"میں ان سے بات کر لوں گا۔"

ارن اس وقت تک نوکرانی سے مسلمانی برتنوں میں ناشتہ لوا لایا تھا۔ اب مسلمانی برتنوں کی بات کھٹکتی ہے۔ تب مسلمانی اور ہندوانی برتن الگ الگ ہوتے تھے۔ تب دلوں میں فرق نہیں تھا۔ صرف برتنوں تک محدود تھا۔ اب برتنوں کا بھید بھاؤ تو مٹ گیا لیکن دلوں کا بڑھ گیا۔ چھوٹی چیز حاصل کرنے کے لیے بڑی چیز کھو دی۔

رحمت اللہ نے ہنس کر کہا "میں نے تو انھیں یہاں سے بھیجنے کے لیے کہا تھا۔۔۔ یہ تو بچ گیا۔"

چھوٹے رائے بولے "تو کیا تمھیں یہاں سے کھدیڑ کر جانے دیا جاتا۔ کھوا! اتنے دنوں میں تم نے کیا شکل بنائی ہے، یہاں نہیں آ سکتا تو نہ آتے، کاروبار تو بند نہ کرتے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا، اتنی دور چلا گیا ہوں لیکن یہاں آنے سے کہاں باز آتا ہوں۔ روز دن چھپے حویلی تک آ کر خیر خبر لے جاتا ہوں۔ موقع ملا تو آپ لوگوں کو دیکھ گیا۔ اگر کالے حیاند مل گئے ہوتے تو کسی کو بھی پتہ نہ چلتا کہ رحمت اللہ جیتا ہے یا مر گیا۔" وہ دھیرے سے بولے "گھر لے جا کر کھاؤں گا۔"

"ارے تو تم یہیں کھاؤ۔۔۔ "گھر کے لیے میں نے بنوا دیا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

چھوٹے رائے دو دن سوچتے رہے۔ مجھ سے بھی مشورہ کیا۔ بڑے رائے کو یہ بات کیسے بتائی جائے۔ پتہ نہیں کہ وہ کون سا رخ اختیار کریں۔ رحمت اللہ کو معاف بھی کر سکیں گے یا نہیں؟ بڑے رائے کے ایک دوست تھے من سکھ رائے۔ ہر وقت کا ساتھ اٹھنا ساتھ بیٹھنا۔ ہم نوالہ ہم پیالہ والی کہاوت ان پر اچھی طرح لاگو ہوتی تھی۔ بس اُس نوالے پیالے کی کمی تھی۔ لیکن سنتے ہیں کبھی وہ بھی ان دونوں کے بیچ رہا تھا۔ لیکن اس کا چشم دید گواہ کوئی نہیں تھا۔ دونوں ساتھ ستار بجایا کرتے تھے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بڑے رائے اور من

سکھ رائے نے کلکتہ والی گوہر جان کا گانا بھی ساتھ ساتھ سنا تھا۔ گوہر جان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ چار گھوڑوں کی گاڑی پر ہوا خوری کے لیے نکلا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں وائسرائے کے علاوہ کوئی اور چوکڑے میں نہیں نکل سکتا تھا۔ جو نکلتا تھا اسے جرمانہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ وہ روزانہ نکلتی تھی اور روزانہ جرمانہ ادا کرتی تھی۔ ویسے اس زمانے میں رئیسوں کی طرح طوائفوں کے بھی بہت سے قصے مشہور تھے۔ غلط بھی، صحیح بھی۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے راج درباروں میں راجاؤں کی قصیدہ خوانی ہوتی تھی۔ وہ چھپن چھری کے مجرے میں بھی جا چکے تھے۔

من سکھ رائے نے ایک مشہور طوائف سے شادی کر لی تھی۔ شادی کیا اس کا رکھا ور کھ لیا تھا۔ اس کی رہائش کے لیے ایک چھوٹی حویلی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ من سکھ رائے بہت پر مذاق آدمی تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ رکھیل ہوتی ہے تو لگتا ہے جیسے دعوت میں جا رہے ہوں۔ گھر والی چوکے کی طرح ہوتی ہے۔ کوئلے کی لکیر کھینچی اور بٹھا دیا۔ وہی پیڑھا، وہی تھال۔ رکھیل کے زینے پر پاؤں رکھتے ہی اپنے آپ اٹھنے لگتے ہیں۔ جیسے پنکھ نکل آئے ہوں۔ خیر! جس دن سے انھوں نے طوائف کو رکھا تھا، بڑے رائے اور من سکھ رائے کی دوستی میں فرق آ گیا تھا۔ گزشتہ سال جب من سکھ کا انتقال ہوا تو مرنے سے پہلے انھوں نے بڑے رائے کو دلی ہسپتال میں بلوایا۔ پہلے تو بڑے رائے طے نہیں کر سکے کہ جائیں یا نہ جائیں۔ چھوٹے رائے نے ہی انھیں سمجھایا ـــــ ''بڑے بھیا، موت تو سارے گناہ اور امتیازات مٹا دیتی ہے۔ من سکھ رائے اب اسی حالت میں ہیں۔ آپ کے بچپن کے دوست ہیں۔ ایک غلطی ہو گئی، اس کی سزا آپ تک دیں گے۔ کیا وہ ادھوری تمنا لے کر جائیں گے۔ دوست دوست ہوتا ہے... اسے دیکھ کر مرتے آدمی کو بھی لگتا ہے کہ یہ میں ہی ہوں جو پیچھے رہ جائے گا۔''

بڑے رائے کی سمجھ میں بات آ گئی۔ جب وہ پہنچے تو انھیں لگا کہ ان کا دوست ان ہی کے انتظار میں دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ انھیں دیکھتے ہی من سکھ رائے ایسے مسکرائے جیسے سوکھا پتہ ہلتا ہے۔ پھر بولے ''ہری، تم آ گئے... میں جانتا تھا، تم چاہے جتنے بھی ناراض ہو... آؤ گے ضرور! موت کا مگرمچھ جب پاؤں پکڑ لیتا ہے، کوئی دوست ہاتھ پکڑ لے اور کہے کہ میں ہوں تو اس مگرمچھ سے لڑنا آسان ہو جاتا ہے۔''

بڑے رائے انھیں اس حالت میں دیکھ کر سن رہ گئے۔ ان کا وہ دیم شیم دوست، جو زمین پر پاؤں مارے تو پانی کی دھار اچھال دے، اس وقت ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سوتے کا ہارا بچہ ہو۔ "کچھ دیر بعد من سکھ رائے بولے "تم مجھے معاف کرو یا نہ کرو، اسے معاف کر دو۔ یہ ایک زمانے میں تمھاری بھی ہم سفر تھی۔ تم نہیں ملے تو اس نے میرے ساتھ اپنی زندگی کاٹ دی۔ میں تو اگلے جنم میں ہی تم سے دو دو باتیں کروں گا۔۔۔ اس کا تو ابھی یہ جنم باقی ہے۔ اب میرے ساتھ کوئی نہیں علاوہ اس کے! میرے بھائی، میرے بیٹے، میری بیوی، میرے رشتے دار سب منہ پھیر چکے ہیں۔ اسی کے کہنے سے میں نے اپنی ساری جائیداد ان سب کو دے دی! اب میرے پاس چھوٹی حویلی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔۔۔ وہ بھی اس کی ہے۔ اس کی پرورش کیسے ہوگی؟ اس کے لیے کوئی گھونسلہ چاہیے اس کی اپنی ڈال۔۔۔ اگر تم کہہ دو گے کہ تم اسے سہارا دو گے تو میں آرام سے مر سکوں گا۔۔۔ ورنہ بھوت بن کر اس کی حفاظت کرنی ہوگی۔ کتنی کر سکوں گا یہ میں نہیں جانتا۔ ویسے اس کی جتنی زندگی میرے ساتھ گزری وہ تو گزری۔۔۔ تمھارے حصے میں بھی وہ اتنی ہی آئی ہے۔"

بڑے رائے اس کے بارے سوچ رہے تھے۔۔۔ وہ بھی زندگی کی کڑاہی میں تلی کھرچن سی ہو گئی تھی۔ اس کا وہ روپ ان کے سامنے پتھر بنا اب بھی موجود تھا۔ وہ اسے بدلنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ فوری طور پر کچھ سوچ نہیں سکے۔ من سکھ کا وہ پرانا واسطہ دینا بھی انھیں اچھا نہیں لگا۔ وہ اسے جانتے تھے لیکن اس سے کیا؟ ان کے دل میں یہ ملال بھی تھا کہ وہ اپنے دوست کے پاس آئے بھی تو کب؟ جب چراغ کا تیل ختم ہو چکا۔ وہ اب ٹمٹمار ہا تھا اور ان کی جانب یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ من سکھ رائے کو ہچکیاں آنے لگی تھیں۔ ساری جان آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ کچھ کانوں میں بھی بٹ گئی تھی۔ بڑے رائے کو بھاشا میں گیتا کے ہر باب کے پیچھے دیے گئے عظمت کے بیانات یاد آ رہے تھے۔ کسی نے گیتا کے فلاں باب کا پھل دے دیا اور مرنے والی کی جان سو نکلی، وہ سیدھا بیکنٹھ سدھار گیا وغیرہ وغیرہ۔ بیکنٹھ ہوتا ہے یا نہیں، وہ سدھارا یا نہیں، یہ بات الگ ہے۔ لیکن جو جان نکل نہیں رہی تھی وہ تو نکل گئی۔ من سکھ کی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔ وہ بے چینی کے ساتھ گردن ہلانے لگے جیسے کوئی گردن دبا رہا ہو اور وہ کہہ رہے ہو پل بھر کے لیے رک جا مجھے اپنے سوال کا جواب سن لینے دے۔ آدمی ساری زندگی سوال جواب کرتا رہتا ہے لیکن جو آخری سوال وہ کرتا ہے اگر اس کا جواب

پا جائے تو زندگی بھر کے ان سوالوں کو بھلانا آسان ہو جاتا ہے، جن کا جواب نہیں ملا۔ بڑے رائے کو لگا کہ ان کی سانس بھی گھٹ رہی ہے ـــــ وہ بولے ''من سکھ، ان کی فکر مت کر، اب یہ میری بھابی ہیں۔۔۔'' جملہ مکمل ہوتے ہی من سکھ رائے یہ جا وہ جا۔ اس کا چہرہ جو قابل رحم اور پر درد تھا وہ یکا یک صورت حال کے تصفیے کا چہرہ ہو گیا تھا۔ مکمل طور پر آسودہ۔ بڑے رائے نے اس کی طرف دیکھا تو وہ دیوار کی طرف چپ چاپ کھڑی تھی۔ بڑے رائے کو لگا کہ جیسے کوئی عورت بیابان میں اکیلی ہے۔ اس ہسپتال کا شور شرابہ ایکدم غائب ہو گیا تھا۔ لوگوں سے بھری پڑی وہ جگہ کچھ دیر کے لیے یکا یک 'آدم نہ آدم ذات' والی ہو گئی تھی۔

وہ من سکھ رائے کی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے بولے جیسے وہ سن رہے ہوں ''اس کے اور میرے درمیان دوستی کی لڑائی تھی۔۔۔ آپ کو کیا بتانا؟ آپ مجھے بھی اتنا ہی جانتی ہیں جتنا اس کو، لیکن اس سب کو بھول جایئے! میں غلط تھا یا من سکھ یا آپ۔۔۔ یہ فیصلہ کرنے کا وقت نہیں۔ آپ اپنی حویلی میں رہنا چاہیں تو وہیں رہیں۔۔۔ وہاں نہ رہنا چاہیں تو جہاں آپ کہیں انتظام کر دوں۔ میں نہ من سکھ کو واپس لا سکتا ہوں اور نہ میں اب من سکھ بن سکتا ہوں۔۔۔ تب نہیں بنا جب بنا جا سکتا تھا۔ انھیں کہنے کے بعد احساس ہوا کہ شاید یہ جملہ کہنا نہیں چاہیے تھا۔ انھوں نے گردن اٹھا کر چشم نم انھیں دیکھا۔ بڑے رائے کانپ گئے۔ ایک بے پناہ گہرائی۔۔۔ وہ خود اس میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے نظر آئے۔ دھیرے دھیرے وہ آنکھیں وہی ہو گئیں جنھیں آج تک بھلا نہیں سکے تھے۔ وہ پیٹھ گھما کر کھڑے ہو گئے۔

بڑے رائے نے خود ان کا 'داہ سنسکار' کیا اپنی نگرانی ان کو ان کے گھر بھجوا دیا۔ وہ وہیں جانا چاہتی تھیں جہاں انھوں نے زندگی کا بہترین حصہ من سکھ رائے کے ساتھ گزارا تھا۔ جب تک وہ رہیں، ان کا خرچ ہر مہینے پہنچ جاتا تھا۔ انھوں نے خود جا کر ان کے تمام رشتے داروں کو ہدایت بھی کر دی تھی کہ تلسی بائی کو تنگ نہ کیا جائے۔ تلسی بائی کے بعد یہ حویلی ان ہی کی ہو جائے گی۔

چھوٹے رائے من سکھ رائے کو اس واقعہ کے بارے میں رحمت اللہ کے واقعہ کو بھی دیکھ

رہے تھے۔ دونوں ہی باتیں ممکن تھیں۔ اس واقعے سے بڑے رائے کا دل بھی بدل سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس سب کی وجہ سے ہمدردی کا اپنا خانہ پوری طرح بند کر چکے ہوں لیکن کسی طرح چھوٹے رائے نے ہمت کر کے بڑے رائے کو تیسرے دن رات کو رحمت اللہ والی بات بتائی۔ وہ اتنے پریشان ہو گئے کہ چھوٹے رائے گھبرا گئے۔ وہ بولے "من سکھا تو مجھے ادھ مرا کر ہی گیا —— یہ سب پوری طرح میری جان لینے پر کیوں تلے ہیں؟ میں نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا پھر مجھے کس بات کی سزا؟ من سکھ نے جو چوٹ دی اس درد میں نے زندگی بھر برداشت کیا۔ کرشن رائے نے جو کچھ کیا وہ مجھے رات دن تڑپاتا ہے۔۔۔ رحمت اللہ نے یہ گل کھلایا۔۔۔ وہی بالکل وہی جو من سکھ نے کیا تھا۔"

وہ جذبات سے اتنے مغلوب ہو گئے جیسے ان کے اندر آتش فشاں ابل پڑا ہو۔ وہ سر کو بار بار صوفے کی پشت سے ٹکرا رہے تھے۔

چھوٹے رائے چپ تھے۔ انھوں نے پہلی بار انھیں اس قدر مضطرب دیکھا تھا۔ وہ بولے "معاف کیجیے بڑے بھیا، میں نے آپ کو یہ بات تکلیف پہنچانے کے لیے نہیں بتائی تھی۔ میرا بس اتنا ہی سا کہنا تھا کہ رحمت اللہ نے اس خیال سے کہ وہ آپ کو کیسے منہ دکھائے گا —— اپنا کاروبار بند کر دیا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے کا محتاج ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اس حویلی میں قدم رکھنے کے لائق نہیں رہا۔"

"ٹھیک ہے تو نہ آئے۔ من سکھ رائے نے نیچا دکھایا، آج رحمت اللہ بھی میرے سامنے اپنے کو وضعدار اور باوفا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ باوفا وہی نہیں ہوتے جو ہر مسئلے کو ایک بار میں ادھر یا ادھر کر دیتے ہیں، وہ بھی ہوتے ہیں جو کمہار (پنجیری) کی طرح دھیمی دھیمی آنچ پر جھلستے رہتے ہیں۔ یہ سب باوفا ہیں —— بہادر ہیں —— اپنی بہادری آزمائیں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ نہ آتا تو بہتر تھا۔"

"وہ تو نہیں آ رہا تھا، کالا پکڑ کر لایا۔"

"اس کے لیے بھی میں ہی ذمہ دار ہوں؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ رحمت اللہ میرے سامنے ہی چیلنج بن کر کھڑا ہو جائے گا۔"

چھوٹے رائے سمجھ نہیں پا رہے تھے بڑے رائے میری کس بات کا اتنا برا مان رہے ہیں۔ وہ بولے "نہیں بڑے بھیا، میں کچھ نہیں کہہ رہا، میں تو بات بتا رہا تھا۔"

''کوئی کچھ نہیں کہتا ـــــ سب میں ہی کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔''

چھوٹے رائے کو لگا کہ اس وقت کچھ بھی کہنا مناسب نہیں۔

میں دروازے کے باہر کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ وہ اٹھ کر چلے تو بڑے رائے بولے ''بیٹھو۔''

وہ بیٹھ گئے۔ جیب سے ایک خط نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔ کشن بابو کا خط تھا۔ اپنے گاؤں سے بھیجا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا ''رحمت اللہ کے نکاح کے لیے میں ذمہ دار ہوں۔ اس نے میرے کہنے سے ستابو بائی سے شادی کی ہے۔ آپ نے اپنا دست شفقت میری طرف بڑھا دیا تھا۔ آپ سے میری التجا ہے کہ آپ وہ ہاتھ ان کی طرف بھی بڑھا رہنے دیں۔ اگر آپ سزا دینا چاہیں تو مجھے دیں۔ گناہگار میں ہوں۔ آپ اس کے سر سے اپنا دست کرم کبھی نہ ہٹائیں۔ ستابو بائی ایک مصیبت زدہ عورت ہے۔ ایک اچھے گھر کی بیٹی ہے۔ وقت نے اسے اندھے کنویں میں دھکیل دیا ورنہ اس کا بھی اپنا ایک گھر ہوتا۔ بچے ہوتے۔ اس کی زندگی کے اس حصے سے واقف ہوں جس پر نہ کبھی روشنی پڑی اور نہ پڑے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ کبھی پڑے۔ وہ ہندو ہے۔ ہندو قبول نہیں کریں گے ورنہ یہ نسا کبھی ستابو نہ ہوئی ہوتی۔ رحمت اللہ نے مان لیا ہے کہ وہ اسے نسا ہی بنا کر رکھے گا۔ میں اس ذمہ دار سے بری ہو گیا۔ بس، آپ کا آشیرواد بھر مل جائے۔۔۔''

کشن بابو کا خط پڑھ کر چھوٹے رائے سمجھ نہیں سکے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ انھیں لگا کہ کشن بابو کوئی ایسے انسان ہیں جو اپنے جسم میں ایک عظیم روح چھپائے ہوئے ہیں ـــــ بٹن دباؤ اور وہ پوشیدہ۔ روح تصور کی طرح بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ بڑے رائے بولے ''بھاسکر کو بھی پڑھا دینا۔ ہم اس انسان کو اسی کی وجہ سے جانتے ہیں۔''

چھوٹے رائے باہر نکل آئے۔ وہ خط میرے حوالے کر دیا۔

نکاح والا واقعہ بھوانی بھی جانتا تھا۔ وہ اس میں شرکت کر چکا تھا۔ نکاح ولی کی مسجد میں پڑھایا گیا تھا۔ گھر پر بھی پڑھا جا سکتا تھا لیکن رحمت اللہ بولا ''میرا اصلی گھر تو خدا کا ہی گھر ہے''۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس مسجد میں ولی رہتے ہیں۔ ان کی کرامات اب بھی موجود ہیں۔

ایک بار ایک ولی دیوار پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ ان کا ایک پاؤں دیوار کے اس طرف لٹکا ہوا تھا اور دوسرا دوسری طرف۔ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں۔ شہر کوتوال کا سپاہی آکر بولا "اے فقیر تجھے کوتوال صاحب نے بلایا ہے۔۔۔" ولی نے دیوار کو ایسے ایڑ لگائی جیسے گھوڑے کو ایڑ لگائی جاتی ہے۔ سنا ہے کہ دیوار کھسکنی شروع ہو گئی۔ سپاہی ڈر گیا۔ وہ دوڑا دوڑا گیا۔ جاکر کہا وہ فقیر تو دیوار کو گھوڑا بنا کر آرہا ہے۔ کوتوال صاحب دوڑے دوڑے آئے انہیں بھی لگا کہ دیوار سرک رہی ہے۔ وہ زمین پر لوٹنے لگے "بابا معاف کرو۔" ولی ہنس پڑے "یہ تو تیری نظر کا فتور ہے۔ میں تو وہیں کا وہیں ہوں۔ تو نے بلایا تھا میں نے سوچا کہ چلوں تب تک تو ہی آ گیا۔۔۔ ورنہ کبھی نہ کبھی پہنچ ہی جاتا۔" تب سے ولی کی مسجد مشہور ہو گئی۔ جن بچوں کو میعادی بخار یا نمونیا یا کوئی خاص بیماری ہو جاتی تھی، ان کی مائیں اور بہنیں بچے کو گود میں لے کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ مغرب کی نماز پڑھ کر لوٹنے والے نمازی بچے کو پھونک مارتے جاتے تھے۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ان کا خیال تھا کہ بچے اسی پھونک سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اسے ولی کا کمال مانتے ہیں۔ حالانکہ ولی اب وہاں نہیں تھے۔ ان کے انتقال کو سیکڑوں سال ہو گئے تھے۔ وہ مسجد حویلی کی چھت سے نظر آتی تھی۔

جب صبح سو کر اٹھتا تھا تو مسجد کے آنگن میں لگے ہوئے نیم کی پھننگی ہلتی تھی۔ کئی بار تو لگتا تھا کہ جو فاختہ روز سویرے بولتی ہے اسی درخت میں سے نکلتی ہے اور پھر اسی میں سما جاتی ہے۔ چڑھائی پر دال پیسنے والی بڑھیا کی چکی چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ بڑھیا محلے والوں کا دال آٹا وغیرہ پیسہ دو پیسہ لے کر پیس دیتی تھی۔ چکی چلنے کی وہ آواز نیم کے ننھے ننھے سفید پھولوں کی طرح اسی پیڑ سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ بھوانی اس فاختہ کا ایک قصہ ارن کو سنایا کرتا تھا۔ ارن اسے بہت غور سے سنتا تھا۔ لوک کتھا تھی یا خیالی، یہ بات نہ ارن جانتا تھا نہ بھوانی۔ یہ کتھا فاختہ کی عاشق سے جدائی کی کتھا تھی۔ اسے سن کر یہی پوچھتا رہتا تھا کہ پھر کیا ہوا۔ فاختہ کا عاشق لوٹا یا نہیں؟ اس کا رونا ـــــ اسے عاشق تک پہنچایا نہیں۔ ایک بار یہ کہانی سناتے ہوئے بڑے رائے نے سن لیا تھا جب تک وہ سناتا رہا، وہ چپ چاپ اوٹ میں سنتے رہے لیکن جیسے ہی کہانی ختم ہوئی بڑے رائے نے بھوانی کو خوب کھری کھوٹی سنائی۔ بچوں کو ابھی سے اس طرح کی واہیات کہانی سناتا ہے۔ آگے چل کر وہ کیا کریں گے؟ یہ بات کبھی ارن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ فاختہ کی یہ کہانی اتنی بری ہے کہ اسے سننے سے گناہ ہوتا ہے۔

بھوانی آگے پیچھے کہا کرتا تھا کہ میری ماں کہا کرتی تھی کہ کہانی قصے سنے بغیر بچے بڑے نہیں ہوتے اور بغیر سنائے بڑوں کی عمر پوری نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی یہ بات اس کے عقائد کو لمحہ بھر میں ڈھیر کر دیتی تھی۔

جب میں نے رحمت اللہ کے نکاح والی بات بھوانی کو بتائی تو وہ چونکا نہیں۔ وہ بولا کہ ولی کی مسجد میں وہ اس کے نکاح کے چھوہارے کھانے گیا تھا۔ کشن بابو بھی موجود تھے۔ پھر ہنس کر بولا ''کشن بابو نے ہی تو یہ سارا چکر چلایا تھا۔ مجھ سے کہہ بھی رہے تھے کہ چل بھوانی، ہاتھ لگے تیری بھی شادی کرا دوں۔ میں نے منع کر دیا۔''

میں نے پوچھا ''منع کیوں کر دیا؟''

وہ ہنس دیا ''دو نوکریاں ساتھ ساتھ نہیں ہوتیں ـــــ ہنومان نے سمندر کی اس مچھلی سے یہ ہی کہا تھا کہ میں تو رام کا چاکر ہوں تو تیرے ساتھ بیاہ کیسے کروں؟''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ وہ سمجھا نہیں۔ شاید اسے لگا کہ جو بات اس نے غور و فکر کے بعد اتنے جذبۂ عقیدت سے کہی اس پر بھاسکر بھیا کیوں ہنس دیے؟ لیکن بولا کچھ نہیں۔

میں نے بھی بات گھما دی۔ اس سے رحمت اللہ کی گھر والی کے بارے میں پوچھنے لگا، میرے دل میں اس کے گھر والی کے بارے میں جاننے کی فطری خواہش تھی۔ وہ کیسی ہے؟ حسین ہے یا نہیں؟ لیکن مجھے سیدھا سوال کرنا اچھا نہیں لگا۔ بھوانی کیا سوچے گا؟ اس نے آپ ہی آپ بتایا کہ رحمت اللہ کی گھر والی کی شکل و صورت اچھی ہے۔ بہت شیریں زبان ہے۔ کشن بابو کے پاؤں چھوتی ہے۔ وہ چاہتی تو تھی کسی ہندو کے سنگ گھر بسانا۔ کشن بابو نے سمجھایا کہ ہندو یا مسلمان میں کیا فرق ہے۔ تجھے ہندو ملے گا کہاں؟ رحمت اللہ بھلے ہی مسلمان ہو لیکن اندر بلوری کانچ کی طرح صاف ہے۔ جتنا تو اندر جھانکے گا اتنا ہی تجھے نکھرا ہوا دکھائی دے گا۔ جتنا کوئی ہندو پیار کرے گا اس سے زیادہ رحمت اللہ کرے گا۔ ان کے سمجھانے پر وہ مان گئی۔ اب دونوں خوش ہیں۔ رحمت اللہ اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ تو برت کیوں رکھتی ہے اور وہ اس سے یہ نہیں پوچھتی کہ تو نماز کیوں پڑھتا ہے۔ رحمت اللہ سن کر کئی بار کہہ چکی ہے

کہ ایک بار پھر بڑے مالک کی دہلیز پر لے چلو۔ ان کے پیروں کی دھول لوں گی۔ ان کی دھول لے کر یہ پاپی جسم پاک ہو جائے گا۔ رحمت اللہ ہنس کر ٹال جاتا ہے۔ کہہ دیتا ہے کہ اسے پتہ چل گیا کہ ہم نے شادی کر لی تو بندوق اٹھا کر گولی سے دھائیں دھائیں اڑا دیں گے۔ مجھ غدار کو تو ان کی شکل دیکھنے کا اختیار بھی باقی نہیں بچا۔ وہ کہتی ہے ان کے ہاتھوں مر بھی جاؤں گی تو سورگ ملے گا۔ وہ ہنس کر کہہ دیتا ہے۔ "سورگ کس نے دیکھا! ملے یا نہ ملے۔ دھرتی تو چھوٹ جائے گی۔

بھوانی رک کر بولا "ہر جمعرات وہ پکھری والے پیر کے مزار پر دیا جلانے جاتی ہے۔ پچھلی جمعرات کو وہ برقعے میں آئی تھی۔ میں بھی مالک کی طرف سے دیا رکھنے گیا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بولی "بھوانی بھیا! تمہارے بھیا کو پتہ نہیں کیا ہو گیا، حویلی جانا بند کر دیا۔ کہتے ہیں مالک کو منہ کیسے دکھاؤں! مجھے پتہ ہوتا تو میں کشن بابو کو منع کر دیتی ـــ کشن بھائی کا نام لیتی ہے تو کانوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ پھر بولی ـــ کہتی ہوں، مجھے لے چلو۔ میں کہوں گی کہ آپ میرے والد ہیں جو سزا دینا ہو اس جسم کو دیں۔ اسے ہی رولی چاہیے تھی ـــ پیٹ کی آگ سے یہ ہی ڈرتا اور جلتا تھا۔ اسی نے مجھے اس آگ میں جھونکا ـــ اس کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ اس نے گندے پانی پڑی دم توڑتی ایک جان کو باہر نکال کر پناہ دی ہے لیکن وہ سنتے ہی نہیں۔ تم ہی سمجھاؤ۔"

میں نے پوچھا "تم نے پہلے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

رحمت اللہ نے منع کر دیا۔ کہا تھا کہ جھگڑا بڑھا کر کسی دوسرے شہر میں نکل جاؤں گا۔"

اسے بڑے رائے نے پکارا تو وہ لپک کر چلا گیا۔ میں سوچتا رہا اگر یہ لوگ کہیں اور چلے گئے تو کیا ہو گا؟"

چودھری کھیم راج سنگھ کے بیٹے بیر بہادر آئی۔ سی۔ ایس کا ایک دن پیغام آیا کہ وہ بڑے رائے سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس وقت بڑے رائے کلب جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی جی چاہتا تھا تو کلب چلے جاتے تھے۔ وہ رک گئے۔ تب بڑے لوگوں کے ملنے جلنے کے

طور طریقے الگ تھے۔ پہلے ایک آدمی ایک نوکر یا قاصد جو بھی کہیے یہ پوچھنے آتا تھا کہ فلاں صاحب ملنے آنا چاہتے ہیں خواہ آنے والے صاحب آکر باہر گاڑی میں ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں۔ سیدھے دھڑ دھڑاتے ہوئے چلے آنا بد تمیزی سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے بیر بہادر نے پہلے ایک آدمی بھیج کر اسی روایت کی تقلید کی تھی۔ ویسے جب وہ مہمان کے طور پر چودھری صاحب کے ساتھ آتے تھے تو اس طرح تکلفات نباہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ سیدھے مہمان خانے میں پہنچ جاتے تھے۔ وہاں سے خود خبر آجاتی تھی۔

بیر بہادر نے آتے ہی بڑے رائے کے پاؤں چھوئے۔ بڑے رائے یہ بات آخری دم تک نہیں بھولے۔ آخری دنوں میں بستر پڑے پڑے بھی وہ بیچ بیچ میں اس بات کو یاد کر لیتے تھے کہ اولاد ہو تو ایسی ہو۔ کھیم راج سنگھ کے بیٹے نے آئی۔ سی۔ ایس ہو کر بھی پاؤں چھوئے تھے حالانکہ بیر بہادر اب نہیں رہا لیکن اس کا یہ بڑپن مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ بھگوان اس کی آتما کو شانتی دے۔ دنیا میں غلطی کس سے نہیں ہوتی۔

بڑے رائے نے اس طرح گلے سے چپکایا جیسے ان کا اپنا بچھڑا بیٹا ملا ہو۔ ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔ چودھری صاحب کے بارے میں ایک ایک بات بہت اشتیاق سے پوچھتے رہے۔ چودھری صاحب پہلے ہندوستانی ڈپٹی تھے ان کے بال بچوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ بیر بہادر نے اس بات کا جواب براہ راست نہیں دیا۔ اس زمانے میں اپنے بال بچوں کے بارے میں بات کرنا بے ادبی سمجھا جاتا تھا۔ اشارے کنائے میں بتایا "بابا ہمارے پاس آکر اس لیے تو نہیں رہتے کہ۔ گاؤں میں ان کا من بھائی صاحب کے بچوں کے ساتھ لگا رہتا ہے۔۔۔"

کچھ دیر بعد بیر بہادر سنگھ نے اپنی بات براہ راست شروع کر دی "چاچا جی چھوٹے چاچا کرشن رائے میرے ساتھ تحصیلدار ہیں۔ میرا وہاں جوائنٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر الہ آباد تبادلہ ہو رہا ہے۔ میں جانے والا ہوں۔ ابھی تک ان کے معاملے کو اپنے ہاتھ سے باہر جانے نہیں دیا حالانکہ میرے کلکٹر مسٹر رچرڈس بار بار کہتے ہیں کہ میں ان کی فائل آگے بڑھا دوں۔ لیکن وہ انگریز ہے اسے ہندوستانیوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میں بابا کو بھی بتا چکا ہوں۔ بابا نے رائے دی کہ میں آپ سے بات کروں۔ ان کا یہ ہی کہنا ہے کہ چاہے اسے فائدہ نہ پہنچانا لیکن اس کا نقصان بھی مت کرنا۔ اس لیے میں نے اب تک کچھ نہیں

کیا ـــــ میں پوری فائل ساتھ لایا ہوں۔ آپ خود مجسٹریٹ ہیں، خود دیکھ لیں اور مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔"

بڑے رائے چپ تھے۔ تھوڑی دیر دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ پھر بولے "پچھلی بار گورنر صاحب نے بھی اس سلسلے میں اشارہ کیا تھا۔" بیر بہادر چونکے "میں نے تو سنا تھا کہ گورنر نے کہا تھا کہ انھیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم تھا اور وہ اس کی مجھے مناسب سزا دیں گے۔"

بڑے رائے نے ان کی جانب مایوسی کے ساتھ دیکھا۔ دھیرے سے بولا "تم چودھری صاحب کے ہی بیٹے نہیں، میرے بھی کچھ لگتے ہیں ـــــ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انھوں نے کرشن رائے کو ضرور سمجھایا تھا۔ میں دیکھتا رہ گیا تھا کہ ایک اتنے بڑے صوبے کا گورنر تحصیلدار تک کے بارے میں جانتا ہے۔ پھر سوچا شاید اس لیے کہ میرا بھائی ہے۔ پھر بھی ہو تحصیلدار ایک معمولی اہلکار ہی تو ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گورنر اس کے کام کی نگرانی رکھے۔"

"شاید کلکٹر صاحب نے کبھی ہوم سکریٹری سے ذکر کیا ہو۔ چونکہ وہ آپ کے بھائی ہیں، ہز ایکسی لینسی کو یاد رہا ہو۔ ویسے بھی ہز ایکسی لینسی جب بھی کہیں دورے پر جاتے ہیں تو ہر سکریٹری اپنے اپنے محکمے کے بارے میں پوری طرح بریفنگ کرتا ہے تاکہ وہ ہر بات کے لیے تیار رہیں۔"

وہ چپ ہو گئے۔ دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بیر بہادر ہی پہلے بولے ـــــ "بڑے چاچا، میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں آج واپس جا رہا ہوں۔ صرف آپ سے ملنے کے لیے رکا تھا۔ جسے چارج دوں گا اسے یہ فائل بھی دینی ہو گی حالانکہ کرشن رائے صاحب سب سے یہ ہی کہتے ہیں، انھوں نے میرا تبادلہ کرایا۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا یہ کہنا ان ہی کو نقصان پہنچائے گا۔ آپ کو صوبے بھر کے لوگ جانتے ہیں اس لیے لحاظ کرتے ہیں لیکن میری جگہ جو بھی آئے گا وہ ایک انگریز ہے۔ نیا آئی۔ سی۔ ایس۔ وہ ہندوستان کی طرف نہیں دیکھتا انگلستان کی طرف دیکھتا ہے۔ اپنے اور انگلستان کے درمیان آنے والی پرچھائیں تک کو وہ نہیں بخشتا۔"

"میں جانتا ہوں ایک بار کرشن رائے سے بات کر لوں۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔۔۔"

"اگر میری طرف سے کوئی پیغام نہ پہنچے تو سمجھنا کہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ دراصل وہ شروع سے ضدی ہے ـــــ بچہ نہ ہونے سے اور بھی زیادہ ضدی ہو گیا۔"

جنٹ صاحب نے "ہم لوگ تو ابھی ویسے ہی ہیں"

چلتے وقت بیر بہادر نے پھر پاؤں چھوئے "خوش رہا بزوں کی عزت کا صلہ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا، وہ ایشور کے یہاں ہی درج ہوتا ہے" بیر بہادر نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ بڑے رائے ان کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک ان کے بارے میں سوچتے رہے۔

میں اگلے دن سویرے زمینداری کے دورے سے لوٹا۔ حویلی میں قدم بھی نہیں رکھ سکا تھا کہ بڑے رائے کا بلاوا آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے "بھاسکر، تم فوراً منجھلے رائے کے پاس جاؤ اور کہنا کہ آپ کو فوراً بلایا ہے۔ ساتھ لے کر آنا۔ ہاں کل بیر بہادر آئے تھے۔ تمھیں پوچھ رہے تھے۔"

میری سمجھ میں قطعی نہیں آیا کہ آخر ایسا کیا کام آ پڑا کہ منجھلے رائے کو فوراً بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کسی اور آدمی کو بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ وہ شاید میرے دل کی بات بھانپ گئے۔ بولے ـــــ "تم بڑے ہو گئے، تمھارے من میں یہ بات آنی واجب ہے۔ تمھیں بھی اصلیت جاننے کا حق ہے لیکن بڑوں کی کمزوریاں چھوٹوں کے من کو زیادہ پکڑتی ہیں۔ عزت اور احترام کا رشتہ بھی ٹوٹتا ہے۔ انھیں کم سے کم جانا جائے تو اچھا ہے۔ ویسے میں بتائے دیتا ہوں ـــــ بیر بہادر کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ ان دونوں کے بیچ کچھ گانٹھیں ہیں ـــــ کھل جائیں تو اچھا ہے۔ بیر بہادر آئی۔ سی۔ ایس ہے وہ بھی چاہتا ہے کہ کرشن معافی مانگ لے تو معاملہ رفع دفع ہو جائے لیکن کرشن رائے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے اس بات کا تو احساس ہے کہ وہ رائے خاندان سے ہے لیکن اس کا مطلب معلوم نہیں ـــــ اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ گورنر صاحب نے بھی اس دن اشارتاً کہا تھا۔"

"ان کا اتنا بتا دینا میرے کافی تھا۔ ایسے بہت کم مواقع مجھے یاد تھے جب انھوں نے مجھ سے ایک ساتھ اتنی لمبی بات کی ہو۔ میں چپ چاپ منجھلے چاچا کو بلانے چلا گیا۔ منجھلی

چاچی کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ وہ موٹی تو ضرور تھیں لیکن غضب کی خوبصورت تھیں۔ ہر وقت پان کھاتی رہتی تھیں۔ میں انھیں دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت منجھلے چاچا گھر پر نہیں تھے۔ جیسے ہی میں پہنچا اور منجھلی چاچی کو پتہ چلا کہ، انھوں نے فوراً بلوالیا۔ وہ مسند لگائے بیٹھی تھیں۔ ایک نوکرانی پنکھا جھل رہی تھی۔ ان کے ہیرے جواہرات کے زیورات کی چمک دمک میں پنکھے کی ہوا کے سبب چار چاند لگ رہے تھے۔ چمک دمک نوٹی پڑ رہی تھی۔ منجھلی چاچی نے پہلے تو ایک نظر دیکھا پھر بولیں "آؤ بھیا، میرے پاس بیٹھو۔ میں نے تو تمھارے چاچا سے کئی بار کہا کہ مجھے جیٹھ جی کے چرنوں کی دھول دلوا دو، اپنے بچوں سے ملوا دو۔ تمھیں دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ گئی۔"

میں ان سے کچھ دور بیٹھا۔ سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ انھوں نے فوراً مہاراج کو بلایا اور کہا "یہ تحصیلدار سرکار کے بھتیجے ہیں۔ ایسی رسوئی بنانا، تمھیں ہمیشہ یاد رکھیں۔ ان کے گھر بڑے بڑے رسوئیا کھانا پکا چکے ہیں۔" مجھ سے بولیں "ہمارا یہ مہاراج بھی بڑے بڑے رجواڑوں میں کھانا بنا چکا ہے۔ ایک وقت کی رسوئی میں سو روپے لگتے ہیں۔ کئی طرح کے تو چاول بناتا ہے۔ ایک ہی سبزی کو بیس طرح سے پکائے گا اور ہر ایک میں الگ مزہ آئے گا۔"

میں نے بیچ میں روک کر پوچھا "منجھلے چاچا کہاں ہیں؟"

"کلکٹر صاحب کی پیشی میں گئے ہیں۔ کمبخت ان کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ کہتا ہے تم اور تمھاری میم صاحب اتنے ٹھاٹ سے کیسے رہتے ہیں؟ میں پوچھتی ہوں تم جنم کے بندر، تم کیا وہ ولایت سے یہ سب ٹھاٹ لے کر آئے تھے۔ بیر بہادر بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ کہنے کو جیٹھ جی کا بھتیجہ ہے، ویسے نوکری لینے پر تلا ہوا ہے۔ ہم کیا نوکری کے دم پر جیتے ہیں۔ ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔"

میں چپ رہا، وہ بولتی جا رہی تھیں "میں نے سنا تمھاری پہلی والی منجھلی چاچی بہت خوبصورت تھیں۔ بچہ ہونے میں مر گئیں۔۔۔"

میں چونکا ضرور لیکن بولا نہیں۔

لیکن وہ رکی نہیں "میرے والد بالکل تیار نہیں تھے۔ وہ تو تمھارے منجھلے چاچا ہی پیچھے پڑ گئے۔ پتاجی ٹھہرے سیدھے آدمی، انھیں ماننا پڑا۔ دراصل وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کسی دوہاجو کے گھر جائے۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ یہ ساری باتیں مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں۔ میں تو رشتے میں ان کے بیٹے کے برابر تھا۔ انھوں نے نہ تو یہ بتایا کہ وہ کہاں کی ہیں اور نہ یہ بتایا کہ ان کے پتا جی کیا ہیں۔ حالانکہ سن ہم بھی چکے تھے۔ کئی چھوٹے موٹے سوال میرے دماغ میں آرہے تھے۔ جب سے میں آیا تھا وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہلی تھیں۔ مسند کا سہارا لیے اسی طرح بیٹھی تھیں۔ پنکھا مستقل جھلا جارہا تھا۔ ذرا بھی رکتا تو فوراً پنکھا جھلنے والی کو آنکھیں تریر کر دیکھتی تھیں۔ وہ ہاتھ بدل کر پنکھا اور زور سے جھلنے لگتی تھی۔

میرے منہ سے یکایک نکلا "آپ گھر کیوں نہیں آتیں؟ بڑے رائے نے تو پچھلی بار بھی منجھلے چاچا سے کہا تھا۔"

"یہ تو کہتے ہیں کہ پتہ نہیں وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ میں ٹھہری دوسری ذات کی۔"

"بڑے رائے کو دکھ ضرور ہوا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ سب مل کر رہیں! آپ انھیں نہیں جانتیں، جہاں تک ہوتا ہے وہ سب کچھ اپنے اوپر جھیلتے ہیں ——"

منجھلی چاچی کچھ کہنا چاہ رہی تھیں لیکن کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے ان کے سامنے نہ کہہ پائیں یا کبھی نہ کہہ پائیں۔ وہ بات کو ادھر ادھر جھلاتی رہیں۔ ان کے چہرے پر اس کا ثبوت صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے انھیں ہلایا ڈلایا بھی لیکن وہ بالآخر بات پی گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ باقی دونوں چاچیوں سے زیادہ ہوشیار ہیں۔

منجھلے رائے تقریباً ڈیڑھ بجے لوٹے۔ پسینے سے شرابور۔ چہرہ بھی کچھ سیاہ پڑ گیا تھا۔ انھوں نے اپنی گھوڑا گاڑی لے لی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گئے۔ "بولے تم کب آئے؟"

"کچھ ہی دیر پہلے۔"

انھوں نے چاچی کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔ چاچی نے گردن ہلا کر اپنی لاعلمی ظاہر کر دی۔ وہ تھوڑا نارمل ہو گئے۔ ان کے منہ سے بہت ہی فطری انداز میں دوسرا سوال نکلا!

"اچانک کیسا آنا ہوا؟ وہاں سب خیریت ہے نا؟"

پتہ نہیں میرے من میں یہ بات کیسے چھپی رہ گئی تھی کہ میں ان سے کہہ دوں کہ منجھلی چاچی سے ملنے آیا تھا۔ دراصل ان کا مجھے چاچی کی طرف ہوا ایسا نظر سے دیکھنا پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن میں چپ لگا گیا۔ میں جانتا تھا کہ چھوٹے رائے کو چھوڑ کر باقی دونوں رایوں کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ منجھلے رائے کے تو زیادہ ہی۔ میں نے ان سے وہی بات کہی جس کے لیے مجھے بھیجا گیا تھا "بڑے رائے نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔" منجھلے رائے کے منہ سے فوراً نکلا "میں ان کی طرح خالی تھوڑا ہی بیٹھا ہوں۔"

ان کے اس ردعمل نے میرے سارے نظریات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ بولے جا رہے تھے۔ میں چپ تھا "اس چودھری کے بچے نے جا کر کان بھرے ہوں گے۔ بڑے رائے ہیں تو ہمارے بڑے بھائی لیکن انھیں باہر والے سچ لگتے ہیں۔۔۔ ہم غلط۔ میں رجھ جاؤں کے اس بتیجے کی نوکری نہ لی تو میں بھی رایوں کے خاندان میں نہیں پیدا ہوا۔"

منجھلی چاچی نے پہلی بار کروٹ بدلی "آپ تو بیکار غصہ ہو رہے ہیں، ہاتھ منہ دھوئیے، خود کھانا کھائیے، انھیں کھلائیے ـــــ اتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ اندر والے کمرے میں کپڑے بدلنے گئے۔ تھوڑی دیر لگی۔ پہلے لوگ کپڑے سنبھال کر پہنتے تھے اور سنبھال کر رکھتے تھے۔ پتلون پریس میں لگاتے تھے۔ لکڑی کا ایک شکنجہ ہوتا تھا جس میں پتلون لگا کر کس دیا جاتا تھا۔ میں جھانک کر دیکھا تو وہ پینٹ کو پریس میں لگا کر اس کے اسکرو کس رہے تھے۔ مجھے ان کے چہرے سے لگا کہ پینٹ کی جگہ وہ خود ہیں اور کسنے والے تو ہیں ہی۔ وہ دھوتی اور کھڑاؤں پہن کر آئے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ چوکے میں چلے گئے۔ مجھے بھی وہیں بلا لیا۔ میں بھی کپڑے بدل کر گیا۔ کھانا لگا دیا گیا۔ ہم دونوں چپ چاپ کھانے لگے۔ ان دنوں کھانا کھاتے وقت سب کے منہ سے چپ چپ کی آواز آتی تھی۔ کچھ کے منہ سے کم کچھ کے منہ سے زیادہ۔ مہاراج نے رسوئی اچھی بنائی تھی۔ جب چاول نکالے تو لگا جیسے ہر سنگھار کے پھول بکھیر دیے ہوں۔ دالیں بھی لاجواب تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایک ہی دال کو تین چار طرح سے بنایا گیا تھا۔ سوکھی سبزیوں پر چاندی کا ورق تھا۔ تھالی میں نکالتے وقت ضرور الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ اتنا لذیذ کھانا گھروں میں کم بنتا ہے۔ رسوئیا بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا کہ میں کچھ کہوں۔ منجھلے رائے بے خیالی میں کھانا کھا رہے تھے، اپنے میں کھوئے ہوئے تھے۔

میں نے کھاتے کھاتے بیزار ہو کر پوچھا "منجھلی چاچی کھانا نہیں کھائیں گی؟"
منجھلی چاچی سن کر انھوں نے جھٹکے سے میری طرف دیکھا جیسے میں نے کچھ اور کہا ہو اور انجانے میں انھیں جھنجھنا دیا ہو۔ مجھے کھانا کھاتے دیکھ کر وہ پھر تھالی کی طرف جھک گئے لیکن ان سے کھانا کھایا نہیں گیا۔ وہ اٹھ گئے۔ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں باہر برآمدے میں آ بیٹھا۔ برآمدے سے جھانک کر دیکھا۔ چاچی کا کھانا میز پر لگا ہے اور وہ کھا رہی ہیں۔ چاچی بھی کھانا کھانے کمرے میں چلی گئیں۔

چاروں طرف ایک دم سناٹا تھا۔ رات کی طرح جھینگروں کی آواز دن میں ہی سنائی دے رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اگر جھینگر نہ بولیں تو سناٹے کی آواز پہچانی ہی نہ جائے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد چاچا کپڑے پہن کر باہر نکلے۔ چاچا کو بھی کپڑوں کا شوق اپنے بڑے بھائی ہی کی طرح تھا۔ یا تو وہ کوٹ پینٹ کا سوٹ پہنتے تھے یا اچکن پاجامے کا۔ گرمیوں میں البتہ بڑھیا لٹھے کا۔ چوڑی دار پاجامہ چلتا تھا۔ ان کی اچکن کے بٹن میں بھی سونے کی زنجیر میں بندھی جیب گھڑی لگی رہتی تھی۔ ان کے باہر آنے پر میں کھڑا ہو گیا ـــــ "تم لیٹے نہیں؟"
"نہیں، کچھ ضرورت نہیں تھی" میں کہنا تو کچھ اور چاہتا تھا لیکن صرف اتنا ہی کہا۔ ان کی گاڑی آ گئی۔ جیسے وقت بندھا ہو۔ تقریباً سو قدم پر تحصیل تھی۔ میں نے پوچھا "تو میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"میں ایک دو دن میں وقت نکال کر آؤں گا۔"

"لیکن انھوں نے تو کہا تھا کہ ساتھ لے کر آنا۔"

اس پوری تحصیل کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ کوئی دس پانچ گاؤں کی زمینداری نہیں۔"

اس بات میں بھی پہلے والا ڈنک تھا۔ میں چپ رہا۔ گاڑی چلی گئی۔

چاچی ابھی تک اندر سے باہر نہیں آئی تھیں۔ میں ایک باہری آدمی کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ میں نوکر کو بتا کر بیر بہادر کے کمرے کی طرف چل دیا۔

بڑے رائے نے بھی کہا تھا اور مجھ بھائی کا بھی دھیان آ رہا تھا۔ انھیں دیکھے کافی

وقت ہو گیا تھا۔ راستے میں کچھ پھل اور مٹھائی خریدلی۔ حالانکہ ایک بار گھر جا چکا تھا پھر بھی یاد نہیں تھا پوچھتا پوچھتا پہنچا۔

جنٹ صاحب کچہری گئے تھے۔ میں نے سامان اندر بھجوادیا۔ کہلا دیا کہ بڑی رائے کے بیٹے بھاسکر آئے ہیں۔ فوراً بلا لیا گیا۔ انھیں دیکھتے ہی میرا من انھیں چھونے کو ہوا۔ میں نے ان کے پاؤں چھو لیے۔ وہ ایک دم ویسی کی ویسی ہی گڑیا سی لگ رہی تھی جیسا پچھلی بار دیکھا تھا۔ اتنی ہی حسین اور سیدھی سادی۔ وہ ہنس کر بولیں "ارے تم بہت بڑے ہوگئے۔ پورے مرد" انھوں نے میرا گال چھوا پھر کہا "مجھے تو تمھاری کئی بار یاد آئی، تم نے تو ایک بار بھی نہیں سوچا ہوگا کہ بھابی کیسی ہیں۔ لیکن کیا کرتی؟ تمھارے بھیا تو رائے چاچا سے مل کر کل ہی لوٹے ہیں۔ میں نے تمھارے بارے میں پوچھا تو بولے ـــــ گھر پر تھا ہی نہیں، زمینداری میں گیا تھا، اب سارا کام بھاسکر ہی دیکھتا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ تم بڑے ہوگئے۔ تحصیلدار صاحب سے ملنے آئے ہو یا تحصیلدارنی سے؟" ان کی آنکھیں چم چم چمک رہی تھیں۔

میرے منہ سے صرف 'جی' نکلا حالانکہ میرے دل میں ان سے ملنے کی خواہش بھی کم نہیں تھی۔

اسی انداز سے پوچھا "کب تک رکو گے؟"

"آج ہی چلا جاؤں گا۔ بڑے رائے نے منجھلے چاچا کو بلوایا تھا۔ ان ہی کو لینے آیا ہوں لیکن یہاں انھیں بہت کام ہے۔"

"تم ایک آدھ دن میرے پاس رک جاؤنا! میں تمھیں خوب پیار سے رکھوں گی" وہ ہنس دیں۔ لفظ 'پیار' سن کر جیسے مجھے جھرجھری سی آگئی۔ وہ ہنس کر بولیں "ارے تمھیں کیا ہوگیا؟ اتنے شرما کیوں گئے؟ اچھا سمجھی میں نے تمھیں پیار سے رکھنے کی بات کہی، ارے پگلے پیار دینے والا اور پیار لینے والا ہمیشہ زندہ رہتے ہیں" انھوں نے چٹکی لی "تمھاری یہ چاچی بھی بہت خوبصورت ہیں۔" 'بھی' لفظ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے کہیں سنا تھا ایسے معاملوں میں جب 'بھی' لفظ کہا جاتا ہے تو وہ ایک ساتھ دو کی بات کرتا ہے۔

میں نے گردن ہلادی۔

"رائے چاچا کا آشیرواد لینے گئیں یا نہیں؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں۔"

میں نے سنا ہے کہ وہ دوسری ذات کے ہیں ـــــ کائستھ۔ ان کی شادی ہونے والی تھی اور برات دروازے سے لوٹ گئی تھی تو تحصیلدار صاحب نے سہارا دیا۔ بڑے جیوٹ کے آدمی ہیں۔"

میں جیسے چونک پڑا۔ غیر ذات ہونے کی بات منجھلی چاچی نے بھی کہی تھی لیکن ایک بات روک گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے یہ ہی کہنا چاہتی رہی ہوں۔ ٹھکرانی صاحب بھانپ گئیں۔ فوراً بولیں "میں نے نوکروں چاکروں سے سنا ہے۔ پتہ نہیں غلط ہے یا صحیح۔" تھوڑی دیر بعد بولیں "تم یہ بات باہر جا کر کسی سے نہ کہنا۔ تحصیلدار صاحب ویسے ہی تمھارے بھیّا کو دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ تو ان کی بہت مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن پتہ نہیں ان کے دماغ میں الٹی سیدھی باتیں کہاں سے بھر گئیں؟

میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا، اجازت دیجئے۔ اب چلتا ہوں۔ گاڑی بھی پکڑنی ہے۔"

"میری بات کا برا تو نہیں مان گئے؟"

"ارے نہیں، آپ اتنا پیار کرتی ہیں۔۔۔" پیار لفظ سے میں خود چونک پڑا وہ ہنس دیں۔ میں جھینپ گیا۔ وہ بولیں "کبھی میرے پاس آکر رہو تو جانوں۔ ہمارا تبادلہ الہ آباد ہو گیا ہے۔ وہیں آنا۔ دیکھنا تمھیں کیسے آنکھوں میں رکھتی ہوں۔"

چلتے وقت انھوں نے چاندی کا روپیہ ریشم کے رومال میں باندھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ بولیں "ایشور تمھیں خوش رکھے۔"

میں چاہتے ہوئے بھی منع نہیں کر سکا۔ اسے مٹھی میں دبائے باہر آ گیا۔

جنٹ صاحب لوٹتے ہوئے باہر ہی مل گئے۔ بولے "بھاسکر ہو نا؟"

"جی!"

"میں تو پرسوں ہی رائے چاچا کے پاس گیا تھا۔ تم زمینداری میں گئے ہوئے تھے۔"

"کیسے آنا ہوا؟" پھر پوچھا

"بڑے رائے نے منجھلے رائے کو بلوایا ہے۔"

"کیا ہوا؟" ان کے چہرے پر اشتیاق تھا۔

"ایک دو دن میں آنے کو کہا ہے ـــــ یہاں کام ہے"

"ان کی مرضی۔ تب تک تو یہاں سب کچھ لٹ جائے گا۔" پھر رک کر پوچھا۔

"تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو؟"

"مجھے آج ہی لوٹنا ہے۔ بڑے رائے انتظار کریں گے۔"

"بھابی سے ملے؟"

"جی!" مٹھی میں دبا روپیہ اور رومال بار بار کو چبھتے محسوس ہوئے۔

وہ بولے "بڑے چاچی سے کہنا کہ میں پرسوں چارج دے دوں گا۔ میں کرشن رائے کو بچانے کے لیے جتنا کر سکتا تھا کیا اب ان کی قسمت!ایک لمبی سی سانس چھوڑ دی۔

میں نے پاؤں چھوئے تو انھوں نے میری بانہہ پکڑ لی" یہ کیا کرتے ہو؟"

میرے دماغ میں طوفان اٹھا ہوا تھا۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ منجھلے چاچا یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟ کیا چاچی کا مستحق نہیں؟ کیا بڑے رائے یہ بات جانتے ہیں؟ یہ تو اس نے بھی سنا تھا کہ وہ دوسری ذات کی ہیں۔ بڑے رائے کو جب پتہ چلے گا تو ان پر کیا بیتے گی؟ کیا منجھلے رائے اسی لیے تو اس قسم کا برتاؤ نہیں کر رہے ہیں؟ وہ تو ہمیشہ انھیں بہت پیار کرتے تھے۔ میں گھر پہنچا تو منجھلے رائے لوٹ آئے تھے انھوں نے دیکھتے ہی پوچھا کہاں گئے تھے؟

مجھے ایک لمحہ طے کرنے میں لگا۔ سچ بولوں یا جھوٹ؟ میں نے انھیں سچ بتا دیا۔

"جنٹ صاحب کے بنگلے۔"

یہ حرام کا بچہ میری گردن اتارنے پر لگا ہوا ہے اور تم اس سے رشتہ قائم کرتے گھوم رہے ہو؟ پھر میرا تم لوگوں سے کیا مطلب؟

"بڑے رائے نے آپ کو اسی لیے بلایا تھا کہ بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرا دیں"

وہ کیا کرائیں گے صلح صفائی ـــــ ساری زمینداری ان افسروں کی خوشامد میں برباد کر دی۔ جب بھائی کا کام پڑا تو بڑے رائے سے بھی نواب صاحب تک سے یہ کہتے نہیں بنا کہ بیر بہادر کا وہاں سے تبادلہ کرا دیجئے۔ جو وقت پر میرے کام نہ آئے، اس سے میرا کیا رشتہ؟"

پیچھے سے آواز آئی "یہ آپ کیا بولے جا رہے ہیں؟ پہلی بار بھتیجے بابو میرے سامنے گھر آئے ہیں اور آپ جو منہ میں آ رہا ہے کہہ رہے ہیں ان کا کیا قصور؟ جو جیٹھ جی نے کہا وہ آ کر آپ سے کہہ دیا جو آپ کہیں گے ان سے جا کر کہہ دیں گے۔" وہ چپ ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد پوچھا "ہتنی نے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو کہا ہوگا۔ وہ اس خوبصورت بدن میں پوری ناگن ہے"

میں غصے سے پاگل سا ہو گیا۔ میرا گلا رندھ گیا۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے سامان اٹھایا اور چل دیا۔ نہ کسی نے مجھ سے رکنے کے لیے کہا اور نہ میں رکا۔ پیچھے سے گاڑی آئی، میں نے واپس کر دی۔

بڑے رائے بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اکیلے آتے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر پوچھا "کرشن نہیں آیا؟"

میں نے گردن ہلا کر منع کر دیا۔ چھوٹے رائے بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ بولے "میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ منجھلے بھائی اس مٹی کے نہیں بنے کہ میں اپنی ضد چھوڑ کر غلط اور صحیح کا فیصلہ کر سکیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیا آپ انھیں نہیں جانتے؟"

میں اندر آنے لگا تو انھوں نے ڈپٹ کر کہا "اندر کہاں جا رہا ہے؟"

"پوری بات کیوں نہیں بتاتا۔"

"بڑے بھیا، کیا اتنے پر بھی اسے بتانے کی ضرورت ہے؟"

"پھر بھی۔۔۔"

میں سوچ کر آیا تھا کہ میں کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن میں جیسے اچانک پھٹ پڑا وہ بھی بڑے رائے کے سامنے۔ میں بولا "انھوں نے کہا کہ وہ آپ کی طرح خالی نہیں بیٹھے۔ یہ آٹھ دس گاؤں کی زمینداری نہیں ـــــ پوری تحصیل کی ذمہ داری ہے ایک دو دن میں موقع ملا تو آئیں گے۔"

چھوٹے رائے کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ یہ بات سن کر ان کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ بڑے رائے دھیرے سے بولے "جیسے بہت لمبی بیماری سے اٹھے ہوں۔ "لگتا ہے یہ انار اب پھوٹ کر بکھرنے ہی والا ہے۔۔۔"

چھوٹے رائے نے بات بدلنے کے لیے پوچھا "تمھاری نئی چاچی کیسی ہیں؟" میں اب بھی بھرا

ہوا تھا۔ بمشکل اپنے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہیں!''

وہ سمجھ گئے اور بولے ''اچھا جاؤ، نہا دھو کر تازہ ہو لو۔'' میں اندر چلا گیا۔ چھوٹے رائے نے دھیرے سے کہا ''لگتا ہے کافی زخمی ہو کر لوٹا ہے۔''

چھوٹی چاچی —— چھوٹی چاچی کیا چاچی —— اب تو گھر میں ایک ہی چاچی تھی۔۔۔ ایک دن بڑے رائے کھانا کھانے اوپر آئے تو چھوٹی چاچی نے انھیں روک لیا۔ میری چھوٹی بہن رانی بچھو لیا تھی۔ انھوں نے رانی سے کہلایا ''بھاسکر اب بڑا ہو گیا۔ اس کی شادی کر دیں۔''

بڑے رائے بولے نہیں۔ صرف سنا۔ ہاتھ پیر دھوئے اور چوکے میں آسن پر کھانا کھانے کے لیے جا بیٹھے۔

چھوٹی چاچی کو اچھا نہیں لگا۔ کمرے میں لوٹ کر رانی سے پوچھا ''کیا جیٹھ جی غصہ تھے؟''

''نہیں، سن کر چپ ہو گئے تھے۔''

رانی کی اس بات کے باوجود چھوٹی چاچی تھوڑی فکر مند ہو گئیں۔ کہیں وہ ان کی بات غلط نہ سمجھ جائیں۔ وہ اس طرح کی باتیں ان رائے کے سامنے نہیں کہتی تھیں۔ نہ تشویش کا اظہار اور نہ گھر کی بات اس کے سامنے وہ ہمیشہ ہنستی رہتی تھیں۔ البتہ رانی اب بڑی ہو گئی تھی۔ وہ ایک حد تک ان کی رازداں تھی، ویسے بھی ارن کوئی بات سن لیتا تھا تو ڈھنڈورا پیٹتا گھومتا تھا۔ یہ بات تو ایسی تھی کہ وہ اس بات کو شوق میں ہی کہتا گھومتا۔

چاچی سمجھی تھی کہ بڑے رائے کو یہ بات کبھی پسند نہ آئی۔ وہ منہ سے کچی بات نکل جانے کے سخت خلاف تھے۔

چاچی نے سوچا، اب وہ اس بات کو اپنی طرف سے آگے نہیں بڑھائیں گی۔

بڑے رائے نے ماسٹر کھچیڑو مل کی نگرانی میں دیوان خانے کے دائیں جانب ایک مکتب کھلوا دیا تھا۔ اس میں حویلی سے وابستہ تمام لوگوں کے بچے پڑھتے تھے۔ ماسٹر صاحب بچوں کو بلند آواز

میں بول بول کر پڑھایا کرتے تھے۔ شاید وہ یہ سوچتے ہوں کہ ان کی آواز بڑے رائے کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ ارن کافی شرارت کرتا تھا۔ بچوں پر حکومت تو گانٹھتا ہی تھا، ماسٹر صاحب کو بھی کافی ناچ نچاتا تھا۔ کبھی اس طرح آنکھیں ٹیڑھی کر کے بیٹھ جاتا تھا کہ دو ماسٹر صاحب نظر آنے لگتے۔ پھر پوچھتا "بتائیے ماسٹر صاحب، ہم کس ماسٹر سے پڑھیں۔"

ماسٹر صاحب ڈانٹ دیتے تو بڑے رائے کے پاس شکایت پہنچ جاتی۔ بڑے رائے بچوں کو ڈانٹنا یا مارنا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔

رانی ایک استانی سے پڑھتی تھی۔ وہ سنگیت بھی سکھاتی تھیں اور اردو انگریزی بھی پڑھاتی تھیں۔ ہندی وہ چاچی سے سیکھتی تھی۔ چاچی اتنی ہندی جانتی تھی کہ رانی کو پڑھا دیں۔ ارن رانی کے پڑھنے میں بہت خلل ڈالتا تھا۔ کبھی اس کا ہر مونیم بے سرا کر دیتا کبھی بیچ میں ہی جاکر کہتا ـــــ کھانا دو۔ کبھی جب وہ رونے لگتی تو وہ بھی اپنا بے سرا گانا شروع کر دیتا۔ وہ چاچی کو پکارتی۔ چاچی آکر اسے ڈانٹتی۔ وہ نہ سنتا۔ تب بھوانی کو یا کسی اور نوکر کو بلوایا جاتا۔ کئی بار اسے زبردستی لے جانا پڑتا۔ بڑے رائے کو پتہ چلتا تو وہ کہتے گانا سیکھنا ضروری ہے یا بچے کا بہلانا، جب رانی اکیلی پڑ جاتی اور چاچی کہیں گئی ہوتی تو اس بے چاری کو استانی کی چھٹی کرنی پڑتی۔

ویسے رانی کے پاس زیادہ کام نہیں تھا۔ نوکر چاکر تو تھے ہی۔ ویسے بھی تب کنواری لڑکیوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کوئی نہیں کھاتا تھا۔ کچا کھانا تو بالکل نہیں۔ اس لیے اس کا ارن کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ وقت بچتا تو پڑھنا، سلائی۔ کڑھائی کرنا۔ کبھی کبھی رسوئی میں جاکر کھانا بنانا بھی سیکھتی تھی۔ بڑے رائے تو گانا سکھانے کے خلاف تھے۔ اگرچہ انھوں نے خود ستار بجانا سیکھا تھا۔ لڑکیوں کے لیے اسے برا مانتے تھے۔ خاص طور سے بڑے گھر کی لڑکیوں کے لیے۔ چھوٹے رائے نے زبردستی اجازت دلوائی تھی۔ زمانہ بدل رہا ہے، عورتیں آج دیش کی آزادی کے لیے لڑ رہی ہیں۔ بڑے رائے اگر کسی بات سے پریشان ہوتے تھے تو آزادی کی لڑائی والی بات سے۔ کہیں یہ بلا ایک بار پھر اس گھر میں نہ گھس آئے۔

بڑے رائے جب کھانا کھا کر جانے لگے تو وہ اپنے آپ ہی ان کے کمرے کے پاس کھڑے

ہو کر کھنکھارے، چاچی نے رانی سے کہا "دیکھو تو جیٹھ جی کچھ کہہ رہے ہیں۔" اس زمانے میں کھنکھارنا پردے کی زبان ہوتی تھی۔ صرف کھنکھارنے سے ہی بہت سے کام چلتے تھے۔

وہ گئی اور جا کر دروازے میں سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ تب زمانہ ایسا تھا کہ بیٹیاں نہ باپ کے سامنے گردن اٹھا کر کھڑی ہوتی تھیں اور نہ چپڑ چپڑ بولتی تھیں۔ بڑے رائے ہی بولے "اپنی چاچی سے پوچھو، کیا کوئی لڑکی نظر میں ہے؟"

انھوں نے چوڑیاں بجا کر منع کر دیا۔ رانی نے اس کا ترجمہ کر دیا۔

"نہیں، —— چاچی منع کر رہی ہیں۔"

"تو پھر شادی کی بات کیسے اٹھی؟ کیا کوئی اور بات ہے؟"

اس بار چاچی کو اس طرح بولنا پڑا کہ بڑے رائے بھی سن لیں "رانی، جیٹھ جی سے کہہ دے کہ بات تو کچھ نہیں —— رانی اکیلی پڑ جاتی ہے۔ بھابی آجائے گی تو بچی کا بھی من لگے گا —— کچھ نیا سیکھیں گی۔

لڑکیوں کے لیے بہو میں ہی کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر میں تو برسوں کوئی بہو نہیں آئی۔ ان کی شیطانی بھی کم ہو گی۔ نئی بھابی گھر میں رہے گی تو بند ھا رہے گا۔ میرا بھی تو خدمت کرانے کا وقت آ گیا۔ آخری جملہ انھوں نے ذرا بلند آواز میں کہا اور گھونگھٹ میں ہلکا سا مسکرا دیں۔

بڑے رائے کا چہرہ ایک پل کے لیے تھوڑا سا نارمل ہو گیا۔ بولے "میں نے سنا ہے نئی منجھلی بہو اپنی ذات کی نہیں۔" ان کے منہ سے یکایک نکل گیا۔

چھوٹی چاچی کچھ نہیں بولی۔ رانی بھی گھبرا گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کھڑی رہے یا بھاگ جائے۔ بڑے رائے کو اپنی غلطی فوراً محسوس ہوئی وہ فوراً رانی سے بولے "تم جاؤ۔"

رانی چلی گئی لیکن کھسیا گئی۔

بڑے رائے کچھ دیر چپ رہے پھر بولے "مجھے بچی کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ بہو، تم کوشش کرنا کہ اس بات کا زہر ان کے دل سے نکل جائے۔ کئی بار بچوں کی سوچ ایسے واقعات سے بھٹک جاتی ہے، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جب ہمارے بڑے ایک بات کر رہے ہیں تو وہ بات غلط کیسے ہو سکتی ہے! میرے کہنے کا مطلب تھا، ایسے میں کون ہمارے بیٹے کو اپنی

بیٹی کا ہاتھ دے گا؟" چھوٹی چاچی کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ انھوں نے ایک بار کھنکھارا اور ایک بار چوڑی بجائی۔ چوڑیوں کی کھنک کچھ ایسی تھی جس سے بڑے رائے سمجھ گئے کہ بہو کو بھی بات کا احساس ہے۔ انھوں نے کھنکھار کر یہ احساس دلایا کہ میں کیا کہاں۔ بڑے رائے بولے "کرشن اپنا خون ہے۔ کچھ کہا بھی نہیں جاتا لیکن بزرگوں نے خاندان کی عزت کے اردگرد حصار باندھا تھا اس نے اس میں آگ لگادی۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے دھوں دھوں جل رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سب راگھو جیسے نہیں۔۔۔" پھر رک کر کہا "میں سوچتا ہوں کہ اس مسئلے پر بھی کچھ دن چپ رہیں تو اچھا ہے۔"

چھوٹی چاچی نے پہلے کواڑوں کو ہلکا سا ہلایا پھر وہ اسی کو مخاطب کرکے بولیں "جیٹھ جی کی بات صحیح ہے لیکن اگر بات اس پار گئی تو بہت مشکل ہو سکتی ہے۔ کوئی اچھا سا رشتہ آئے تو کر ڈالیں۔ منجھلے جیٹھ جی پچاسیوں میل دور ہیں۔ کسی نے جانی کسی نے نہ جانی۔ کواڑ میں ہاتھ دب جائے تو کواڑ کو تھوڑے ہی نکال کر پھینکا جا سکتا ہے۔ دونوں کو ہی اپنی اپنی جگہ بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ ہاتھ کو بھی اور کواڑ کو بھی۔"

بڑے رائے نے دھیرے سے ہوں کیا اور اتر گئے۔ چھوٹی چاچی کو اس دن کافی ملال ہوا کہ جیٹھ جی کے سامنے بول کر مریادا کی خلاف ورزی کی۔ چھوٹے رائے سے بھی کہا۔ چھوٹے رائے ہنس دیے۔ اری پگلی، یہ اتنی عورتیں گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی لڑائی لڑ رہی ہیں۔ اگر وہ بھی ایسا ہی سوچتیں تو پتہ نہیں کب کی احساسِ گناہ کا شکار ہو جاتیں۔ جب انھوں نے رانی کو بھیج دیا اور تم سے کو دبات کرنے لگے تو تم کیا کرتیں۔

بڑے رائے نے چھوٹے رائے کی بھی صلاح لی۔ بات کرتے بڑے رائے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ یکایک انھیں ماں کی یاد آگئی۔ اگر وہ ہوتیں تو شاید منجھلے رائے نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ عورتوں کا لمس مرد کے جذبات کے آڑے ترچھے بہاؤ کو جلدی سیدھا کر دیتا ہے۔ میری شادی کے بارے میں دونوں بھائیوں میں اتفاق رائے ہو گیا۔

منجھلے چاچا بیر بہادر کو چارج دینے کے تقریباً ہفتے بھر بعد معطل ہو گئے تھے۔ بڑے رائے کو پتہ چلا تو جیسے ان پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ان کے خلاف رشوت اور اپنے عہدے کے غلط استعمال

کا الزام تھا۔ بڑے رائے کئی دنوں تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ جب بھی کچھ اس قسم کے حالات در پیش ہوتے، بڑے رائے ملنا جلنا بند کر دیتے تھے۔ شہر کو لوگوں میں اس معاملے میں کھلے عام چرچا تھا، کچھ لوگ خوش تھے کہ بڑے رائے کی ساٹھ سالہ خضاب آلود مونچھوں کی اب قلعی کھل جائے گی یہ جو بڑہپن کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں، وہ تار تار ہو جائے گا۔ لوگ رائے خاندان کے نوکروں سے لے کر افراد تک کو کنکھی اور ہنستی ہوئی نظر سے دیکھتے تھے ہو نہ ہو! ایسا لگتا تھا کہ جیسے رائے خاندان جیل جانے والا ہے یا سر اکاٹ کر جیل سے نکلا ہے، یا اس کے سینگ نکل آئے ہیں یا سب کے سب کرشن پکش (چاند کا اندھیرا پکھواڑہ) کے گھٹتے چاند میں بدل گئے ہیں۔

معطلی کے بعد منجھلے رائے ایک رات کو چھپتے چھپاتے آئے لیکن بڑے رائے نہیں ملے۔ وہ چھوٹے رائے کو سب کچھ کہہ کر اور کاغذات دے کر فوراً ہی لوٹ گئے۔ چھوٹے رائے نے بڑے رائے کو بہت سمجھایا کہ اب آپ کے علاوہ کون ہے جو منجھلے رائے کو اس بھنور سے نکال سکتا ہے۔ آپ نے جس طرح اب تک ان کی غلطیوں پر دھیان نہیں دیا، اب بھی نہ دیجیے۔ آخر میں بڑے رائے کو رویہ بدلنا پڑا۔ جا کر بورڈ صاحب سے ملنا پڑا۔ بورڈ صاحب نے اس حادثے پر دکھ کا اظہار کیا اور بولے "میں آپ کے خاندان کے وقار کو دیکھتے ہوئے ایک یہی مدد کر سکتا ہوں کہ اگر آپ کے بھائی استعفیٰ دے دیں تو میں اس معاملے کو رفع دفع کرا دوں، انھیں اس طرح کی ذلت سے بچاؤں گا۔" بڑے رائے نے جب یہ بات منجھلے رائے کو بلوا کر ان کے سامنے رکھی تو وہ بھنک اٹھے "آپ تو ان سب کی باتیں سنتے ہیں۔ ویسے بھی مجھے ملازمت میں دیکھ کر آپ کو کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں ہرگز استعفیٰ نہیں دوں گا۔ اوپر سے نیچے تک سب کو جیل بھجواؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

بڑے رائے سختی سے بولے "کرشن، تم جو بھی الزام مجھ پر لگا رہے ہو وہ تمھاری سوچ کی اپنی حد ہے۔ تم نے کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنے والی نظر ہی تیار نہیں کی۔ تمھارا گریبان ویسے بھی اتنا تنگ ہے کہ تم خود اس کے اندر نہیں جھانک سکتے۔ انسان کی اس سے بڑی بدقسمتی دوسری نہیں ہوتی کہ اس کا اپنا گریبان اس کے لیے انجان رہے۔ بس، میں ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ اگر تم اپنے دل میں پوری طرح صاف ہو کہ یہ سارے الزام جھوٹے ہیں، من گھڑنت ہیں، تو پریوی کاؤنسل تک لڑو، میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر ایسا

نہیں ہے تو اپنی اور خاندان کی عزت بچانے کے لیے تمھارے پاس ایک راستہ بچا ہے کہ تم استعفیٰ دے دو۔ یہ برطانوی سرکار ہے، اپنے پر اتر آتی ہے تو بے گناہ کو بھی گناہ گار بنا کر چھوڑتی ہے۔"

اس کے بعد وہ چپ ہو گئے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں تک منجھلے رائے شاید اپنے گریبان میں جھانکنے کے لیے اسے ڈھیلا کرتے رہے۔ چوبیس گھنٹے بعد انھوں نے اپنا استعفیٰ لا کر بڑے رائے کے سامنے رکھ دیا۔ سینئر ممبر، بورڈ آف ریونیو یعنی بورڈ صاحب نے اس معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ لیکن اس واقعہ نے دونوں بھائیوں کے درمیان کبھی نہ پٹ سکنے والی کھائی بنا دی۔ منجھلے رائے کو جب بھی موقع ملا یہ ہی کہا کہ بڑے رائے ان سے جلتے تھے ـــــ انھوں نے ہی ان سے استعفیٰ دلانے کی سازش رچی۔ وہ چاہتے تو ان کا کچھ نہ بگڑا ہوتا۔ وہ ڈپٹی کلکٹری تک تو پہنچ ہی جاتے ـــــ کلکٹر بھی بن سکتے تھے۔ بڑے رائے انھیں اتنا اونچا اٹھتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ بڑے رائے اسے ہر بار زہر کے گھونٹ کی طرح غٹک جاتے تھے۔

اس پس منظر میں، میں نے یعنی بھاسکر رائے نے جوانی کی ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ جنگ آزادی بھی آگے بڑھ چکی تھی لیکن میرا مقصد جنگ آزادی کے بارے میں بات کرنا نہیں کیونکہ اس سے رائے خاندان کا کوئی سروکار نہیں رہا۔ بس جو رہا، وہ چھوٹے رائے کا ہی سمجھیے۔ ملک ہمارے لیے بڑے رائے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اب کبھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ ہم لوگ اپنی تنگ نظری سے بڑی سے بڑی چیز کو کتنا چھوٹا بنا لیتے ہیں اور اسے ہی درست مان بیٹھتے ہیں۔ اگر ملک آزاد نہ ہوا ہوتا تو میں شاید اس بوڑھاپے میں بھی اپنے نظریے کو اتنا ہی تنگ، جتنا تب تھا، بنائے رکھتا۔ وہ تو میرے بیٹے رگھوور نے وقتاً فوقتاً استاد کہو، استاد، رہنما کہو رہنما، کا کام کیا۔

بڑے رائے کا ایک بازو تو الگ ہو چکا تھا۔ اب وہ اس کی جگہ مجھے دست راست کے طور پر تیار کر رہے تھے۔ ان کا مضبوطی کا تصور بالکل دوسرا تھا۔ مضبوطی کبھی دوسرے کی

طاقت سے نہیں آتی۔ اپنے اعمال اور قوت فکر سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت اتنی سمجھ نہیں
تھی۔ منجھلے رائے نے بھی تو غلطی کی تھی۔ انھیں اپنی ایک آزاد پہچان بنانی تھی۔ میری شادی کی
جد و جہد جاری تھی۔ مجھے اکثر لگتا تھا کہ شادی ایک قلعہ ہے، رائے خاندان اسے فتح کرنا چاہتا
ہے۔ میں تو صرف گھوڑا تھا جسے آگے کر کے ان لوگوں کو مہم سر کرنی تھی۔

شادی جب طے ہو گئی اور مجھے دولہا ہونے کی خصوصیت بخشی گئی تو میں نے محسوس کیا کہ
کوئی دوسرا میرے مقابلے میں نہیں۔ بڑے رائے ــــ کیسے کہوں ــــ کچھ دیر کے لیے تو
وہ بھی ان ہونے ہو گئے تھے۔ بس میں ہی میں تھا۔ میرے جینے میں، میرے ان سپنوں کی
کنجی کسی ایک شخص کے پاس تھی جو پروں پر بیٹھ کر آنے والا تھا اور اس قیمتی اور بیش قیمت
خزانے کو میرے سامنے بے پردہ کرنے والا تھا جس کے بارے میں، میں نے چپ چپ سنا۔
میں سوچتا ہوں، یہی بات تھوڑے بہت ردو بدل کے ساتھ میرے بیٹے رگھوویر نے بھی
محسوس کی ہوگی ــــ یہی بات شاید اس کا بیٹا بھی محسوس کرے گا کہ شادی جوانی میں جس
خزانے کو اچانک کھول دیتی ہے اس کی قیمت کا اندازہ لگانا بڑے سے بڑے جوہری کے لیے
شاید ممکن نہیں ہوتا۔

شادی طے ہونے سے پہلے کا منظر بہت عجیب و غریب تھا جن دنوں رشتے آ رہے
تھے اچانک سارے شہر میں افواہ پھیل گئی کہ بڑے رائے نے اپنے منجھلے بھائی کرشن رائے کو
اسی لیے الگ کر دیا کیوں کہ انھوں نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ مجھے اس افواہ پر
تھوڑا غصہ بھی آیا تھا لیکن بڑے رائے اس پر خاموش تھے۔ ایک ہی جملہ ان کے منہ سے نکلا
تھا کہ لوگوں کی زبانیں اب بے حساب لمبی ہو گئی ہیں۔ رشتے آنے کا جو راستہ کچھ تنگ ہو گیا
تھا اس افواہ سے تھوڑا کھل گیا۔ حالانکہ رشتے معیار کے نہیں تھے جس معیار کے رائے
خاندان کے لڑکوں کے لیے آتے تھے گزشتہ ڈیڑھ صدی سے ہمارے گھر میں تعلقے داروں یا
جاگیرداروں کی لڑکیاں آتی رہی تھیں لیکن اس وقت رائے خاندان کو ایک ایسی لڑکی کی
ضرورت تھی جو گھر سنبھال سکے۔ بکھرتے ہوئے گھر کو مٹھی کی طرح باندھ سکے۔ ہر گھر کی
کچھ کچھ ویسی ہی تاریخ ہوتی ہے جیسی ایک ملک کی ہوتی ہے۔ آپ اس بات کو الٹ کر بھی

لاگو کر سکتے ہیں۔ ملک کی طرح گھر کو بھی بنتے یا بگڑتے حالات سنبھالنے کے لیے ایک عدد ہیرو یا ہیروئن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت اس خاندان کو سنبھالنے والی ایک ایسی ہی ہیروئن کی ضرورت تھی۔ چاچی تھی لیکن وہ بہت اکیلی پڑ گئیں تھیں۔ وہ سے بھی وہ اہم ترین ابر سے تھوڑا الگ پڑ جاتی تھیں۔ میرے یعنی لڑکے کے حق ایک بات تھی۔ سمٹ جانے کے باجود اتنی بڑی زمینداری کو میں آزادانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جس کا پھیلاؤ اب بھی پٹواری کے کاغذات میں دور دور تک نظر آتا تھا۔ آس پاس کے علاقوں میں بڑے رائے کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ اس زمانے میں لڑکے لڑکی کے ایک دوسرے کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسا کرنا اخلاقی، دنیاوی اور عملی نظریات کے خلاف مانا جاتا تھا۔ تبھی سٹہ چالو ہوا تھا۔ لوگ نمبر لگاتے تھے آ گیا تو سوا کے سو نہیں تو سوا بھی گیا۔ ہوا بھی یہی۔ میرا رشتہ روہتک کر دیا گیا۔ ایک وکیل صاحب تھے ___ اننت رام جی یہ میری پہلی شادی تھی۔ میری اور بھی شادیاں ہوئیں وہ بعد کی بات ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ شادی یا شادیوں کے بارے میں بھرم پیدا ہو۔

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ بارات بالکل اسی طرح گئی جیسے چھوٹا موٹا لاؤ لشکر ہو۔ بارکس، گھوڑا گاڑیاں، سنہری سازوالے گھوڑے، زری کی مسندیں، دو ہاتھی بھی تھے۔ ہتھیار بند لوگ تو ساتھ تھے ہی۔ رات کو جہاں پڑاؤ ہوتا تھا، وہاں ڈیرے تمبو نصب کر دیے جاتے تھے۔ تموئیاں ساتھ تھیں۔ الاؤ اور ہنڈے جلتے تھے۔ پہرے دیے جاتے تھے بالکل چھاؤنی کا سا منظر ہوتا تھا۔ پتہ نہیں کتنا روپیہ قرض لیا گیا اور کتنی زمین رہن رکھی گئی۔ منجھلے رائے پہلے تو بارات میں شریک نہیں ہو رہے تھے۔ بعد میں رشتے داروں اور دوستوں کے کہنے پر شریک ہوئے۔ ان کی اور جو شکایتیں تھیں وہ تو تھیں ہی، انھیں سب سے بڑا ڈر تھا کہ منجھلی چاچی کے ساتھ بہوؤں والا برتاؤ نہیں ہوگا۔ انھوں نے یہ ہی شرط رکھی کہ ان کی بیوی کے ساتھ باعزت برتاؤ کیا جائے۔ چھوٹی چاچی خود منجھلی چاچی کو لینے گئی بس ایک بات کا خیال رکھا گیا کہ وہ کچی رسوئی میں نہ جائیں۔ وہ خود اس بات کو سمجھ رہی تھیں ویسے ان کے ہاتھ کا کچا کھانا تو خود منجھلے رائے بھی نہیں کھاتے تھے۔ وہ کبھی کبھی کہتی تھیں کہ منہ سونگھتے ہو، تن بھی چھوتے ہو لیکن میری چھوئی ہوئی روٹی میں میرا پاپ جھلکتا ہے۔ وہ ہنس دیتے تھے۔

جیسے ہی منجھلی چاچی کچھ لانے کے لیے اٹھتیں، چھوٹی چاچی فوراً کہتیں "بھلے ہی آپ عمر میں مجھ سے چھوٹی ہوں، رشتے میں تو بڑی ہیں آپ تو پہلی بار آئی ہیں۔ میں تو برسوں سے یہاں بھوپن جھونک رہی ہوں۔ میں آپ کو اس طرح حیران نہیں ہونے دوں گی یہاں عمر کا بڑھاپن چلاؤں گی۔ منجھلے جیٹھ جی اور بڑے جیٹھ جی کیا کہیں گے؟ بھاسکر کی بہو پہلی بار آئے گی تو کیا میں اس سے کام کرواؤں گی۔ آپ جیٹھانی ہی سہی لیکن بہو کے روپ میں رایوں کی حویلی میں پہلی ہی بار آئی ہیں۔"

جو بڑی بڑی رشتے دار بطور مہمان آئی تھیں وہ ضرور تھما پھرا کر کچھ نہ کچھ کہہ دیتی تھیں۔ چھوٹی چاچی ان کی طرف سے معافی مانگ لیتی تھیں۔ موقع پڑنے پر انھیں سمجھا دیتی تھیں۔ منجھلی چاچی چھوٹی چاچی کی آؤ بھگت اور اپنائیت سے خوش تو تھیں لیکن ان کا پرایاپن کم نہیں ہو رہا تھا۔ انھیں بار بار لگتا تھا کہ کہیں ان کی ذات اس کا سبب تو نہیں؟ اس بات کو وہ نقطۂ عروج تک نہیں جانے دیتی تھیں۔

وکیل صاحب نے خاطر مدارات میں کمی نہیں رہنے دی۔ بس ایک چوک ہو گئی۔ تب وقت رخصتی جہیز دکھانے کا رواج تھا۔ کچھ علاقوں میں آج بھی ہے دونوں جانب کے لوگ دیکھتے تھے۔ تب دکھاوا حقیقت سے بڑا تھا۔ وکیل صاحب نے جہیز میں سونا اور زیورات دکھائے تھے وہ چھوٹے ہونے، جوڑا رہے سے نکر لیتے تھے۔ بڑے رائے کا دماغ بھی ٹھنکا تھا۔ لیکن وہ چپ رہے۔ جب آ کر جہیز کھولا گیا تو صرف پچاس تولہ سونا نکلا۔ بات دلہن کے کان میں پڑی تو وہ رو دی۔ عورتوں میں ایک خاص بات ہوتی ہے عمل میں بھلے ہی چوک جائیں، کہنے میں کبھی نہیں چوکتیں۔ چھوٹی چاچی نے بہت سمجھایا ـــــ "بہو تو کیوں من چھوٹا کرتی ہے یہاں کس چیز کی کمی ہے ـــــ ہمارے لیے تو مجسم لکشمی ہے تو آ گئی تو سب کچھ آ گیا۔"

لیکن وہ دیر رات تک روتی رہی۔ پہلی ہی رات کو اسے بے ساختہ کھانسی آئی۔ ڈاکٹر کو بلانا چاہا تو اس نے منع کر دیا۔ اس کے پاس اپنی دوا تھی۔ وہی کھائی۔ یہ بات بعد میں پتہ چلی۔ اس وقت تو یہ ہی سمجھا گیا کہ گھر والوں سے پہلی بار الگ ہوئی ہے، جی نہیں لگا پا رہی ہے۔ میں نے بھی اس طرح کی حالت پہلی بار دیکھی تھی میں اسے کھانستے دیکھ کر بری طرح گھبرا گیا۔ تھوڑی دیر تک تو دیکھتا رہا۔ پھر باہر چلا گیا۔ اس نے مجھے باہر جاتے ہوئے کچھ ایسی بے بس نظروں سے دیکھا تھا کہ میں انھیں آج تک بھول نہیں سکا۔ بڑے رائے کو بھی اس

بات کی خبر مل چکی تھی۔ وہ کافی پریشان تھے۔ منجھلے رائے اور چھوٹے رائے بھی ان کے پاس موجود تھے۔ منجھلے رائے اس وقت تک گھر نہیں گئے تھے۔ دراصل، استعفیٰ کے بعد منجھلے رائے یہیں لوٹ آئے تھے۔ وہ حویلی میں نہ رہ کر گہرے باغ والی کوٹھی کے ایک حصے میں رہنے لگے۔ وہ کوٹھی صاحبوں اک مہمان خانہ تھی۔ اسے ولایتی مہمان خانہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے پچھلے حصے پر انھوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

اس واقعہ سے منجھلے رائے کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔ اس خاندان کے کیا یہی خاتمہ ہے؟ دو بھائی تو بے اولاد ہیں ہی۔ کیا بڑے بھائی کا خاندان بھی بھاسکر اور ارن تک ہی آکر رک جائے گا؟ چھوٹے رائے آنکھیں بند کیے جیسے اپنے سے باتیں کر رہے تھے لیکن چپ تھے۔ تب ان کی پریشانی کی خبر مجھے خاص سمجھ میں نہیں آئی لیکن بعد میں جب اپنا خاندان ہوا اور مہلک بیماری ہوئی تو مکمل طور پر سمجھ سکا۔

دو دن بعد ہی میری بیوی کا بھائی اسے لینے آگیا۔ اس کا نام وشوناتھ تھا۔ سب اسے راجہ بابو کہتے تھے۔ وہ بھی وکالت پڑھ رہا تھا۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح وکیل بننا چاہتا تھا۔ ویسے میرے سسر مختار تھے۔ تب مختار ہی وکیل ہوتے تھے۔ انھیں اچھے اچھے وکیلوں سے زیادہ قانون کی سمجھ ہوتی تھی۔ نظیریں تو انھیں حفظ تھیں۔ بس ایک ہی بات تھی کہ ہائی کورٹ میں ان کی رسائی نہ تھی۔ میری بیوی یعنی راج بابو کی بہن کا نام روپ وتی عرف روپا تھا۔ روپا تھی تو خوبصورت لیکن ایک دبلی پتلی اور خون کی کمی کا اشتہار، میں اسے اسی رات کو دیکھ پایا۔ تب ہی اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ جیسے میری نظر کا اثر ہو، اس کے بعد بڑے رائے نے چھوٹے رائے سے منع کر دیا کہ میں بہو کے پاس نہ جاؤں۔ روپا تب سولہ یا سترہ سال کی رہی ہو گی۔ اس بات نے میرے دل کو زخمی کر دیا لیکن تب بڑوں کے حکم کے سامنے گھر والی کی چاہ بے اثر رہ جاتی تھی۔

بھائی ایک دو دن رہا۔ اسے جب بتایا گیا کہ روپا کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور جب ہی

سے اسے بخار ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانا نہیں چاہتی تو راجہ بابو بہت پریشان ہو گیا اور روپا کے جانے کی ضد کرنے لگا۔ کبھی کہتا کہ بابو جی کو بخار چڑھا ہے، انھوں نے روپا کو لے کر آنے کو کہا تھا۔ پھر کہتا کہ ماما کے گھر شادی ہے۔ روپا وہاں بھی جائے گی۔ بڑے رائے نے بہو کو رخصت کرنے کی اجازت دے دی۔ سب ہی لوگوں نے بڑے رائے کو سمجھایا کہ بہو کو اتنا زیور دے نہ دیں لیکن بڑے رائے نے سن کر ٹال دیا۔ انھوں کا کپڑا اور زیور بہو کے ساتھ کر دیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ رائے گھر کی لکشمی بھکارنوں کی طرح نیہر جائے گی۔ روپا جاتے ہوئے بہت روئی۔ یہ بات سب کو عجیب سی لگی۔ تب نیہر جاتے وقت کسی لڑکی کا رونا بے شرمی میں شمار ہوتا تھا۔ اب الٹا ہو گیا۔

بہو کے رخصت ہوتے ہی منجھلے رائے بھی کوٹھی پر چلے گئے۔ بڑے رائے نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ حویلی میں رہنے سے جو ساکھ ہے وہ گہرے باغ کی کوٹھی میں رہنے میں نہیں ہوگی۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا "یہاں مجھے بھی اور آپ کی منجھلی بہو کو بیگانہ پن لگتا رہے گا۔"

بڑے رائے نے پوچھا "اتنے دنوں میں کیا تمھیں ایسا لگا کہ کسی نے بہو کی یا تمھاری خاطر مدارات میں کوتاہی کی؟"

"پھر بھی چھوا چھوت تو ہے ہی۔"

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں ـــــ اتنی تو تم بھی کرتے ہو۔"

چھوٹے رائے اب تک چپ تھے۔ فوراً بولے "منجھلے بھائی، ایسا نہ کہو۔ تمھاری چھوا چھوت تو تمھاری محبت اور نفرت اور بے عزتی ـــــ بذات خود میں چھوا چھوت کو نہیں مانتا۔ چھوا چھوت کے مقابلے میں انسانیت کو ترجیح دیتا ہوں۔"

دور کے رہے۔ بڑے رائے نے بھی یہ ہی سوچا کہ کچھ بھی کہنا بے کار ہوگا۔

شادی میں کشن بابو بھی آئے تھے وہ مجھ سے مل کر بچوں کی طرح جذبات سے مغلوب ہو گئے۔انھوں نے ہمیشہ کی طرح ہی میرے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے ہلکا سا ناگوار بھی گزرا۔ جہاں ان کا ہاتھ لگا تھا وہاں کی کھال جیسے سکڑ گئی۔ انسان، گائے اور گھوڑے کی کھال کی حساسیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ بھلے ہی آدمی کی کھال کا سکڑنا نظر نہیں آتا لیکن خود آدمی کو تو پتہ چلتا ہی ہے۔ اس بار مجھے جنتی کا چھونا بھی یاد آیا۔ وہ دلکش تھا ان کے چھونے پر لگا تھا جیسے جسم میں سارے بدن میں کوئی نامعلوم جذبہ چھا گیا ہو۔

کشن بابو رحمت اللہ کے گھر پر ٹھہرے تھے۔ بڑے رائے نے اس بات کا برا مانا تھا۔ رائے کے خاندان کا مہمان رحمت اللہ کے گھر ٹھہرے۔ رحمت اللہ نے بھی سمجھایا — کشن بابو آپ ایسا نہ کیجیے۔ اتنے بڑے آدمی کا مہمان بن کر آئے ہیں۔ میرے یہاں ٹھہر کر ان کی بے عزتی نہ کریں۔ میں ان کی رعایا ہوں۔ لیکن کشن بابو عجیب ضدی ثابت ہوئے۔ بولے "تم نہیں جانتے، میرا نام کشن ہے۔ کشن تو پڑ گیا۔ ہمارے یہاں کرشن کے بہت سے مطلب ہیں۔ ایک یہ بھی ہے۔" اور ہنس دیے۔ میں نے بھی انھیں سمجھایا "کشن بابو، بڑے رائے تمھاری اتنی عزت کرتے ہیں۔ رحمت اللہ سے وہ اتنے ناراض تھے لیکن تمھارا خط آنے پر اس کی گھر والی کے لیے چاندی کی ہنسلی بنوائی، اناج، گڑ کی بھیلی اور روپے بھیجے۔ تم ان ہی کی بے عزتی کر رہے ہو۔"

کشن بابو ہنس کر بولے "دیکھو بھاسکر، تو میری کمزوری ہے۔ بڑے رائے میری طاقت ہیں۔ آدمی طاقت کے سامنے نہیں، اپنی کمزوری کے سامنے جھکتا ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کے سامنے میری کوئی اوقات نہیں۔ میں ماچس اور بیڑی کے بنڈل بیچ کر گزارہ چلاتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ ٹھہر کر ان کی بے عزتی کروں گا؟ رحمت اللہ میرے اپنے جیسا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ رہ کر اپنے چھوٹے پن کا احساس نہیں ہوگا اور اسے لگے گا کہ میں نے اس کا مان رکھا۔ پھر ہنس کر بولے "مجھے اپنی حیثیت سے اوپر اٹھ کر بھی رہنے کا موقع ملا ہے۔ اپنی جڑیں چھوڑ کر دوسروں کی جڑوں میں ہم تب ہی مل سکتے ہیں جب مکمل طور پر طفیلیے بن جائیں۔ طفیلی ایک بیل ہوتی ہے یہاں سے اٹھاؤ وہاں پھینک دو، وہاں جی اٹھے

کی۔ میں وہ زمین ہوں۔ وہ میری زمین ہے ـــــ اپنی زمین سے بھوکے پر جسے گھر سمجھا تھا وہ مانگا ہوا گھر تھا۔ یہ گھر میرا اپنا گھر ہے۔ دیکھو بھائی، تو میری آزادی کی قدر کر، میں تیری آزادی کی قدر کروں، تب ہی رشتہ قائم رہتا ہے۔ اگر مجھے اپنی تیری خاطر چھوڑنی پڑے تو تو میرا دوست کہاں رہا!"

مجھے چپ ہو جانا پڑا۔ حالانکہ ان کی ساری باتیں بے ترتیب تھیں لیکن وہ اس طرح سے بول رہے تھے جیسے مجھ سے نہیں بلکہ میری روح سے مخاطب ہوں۔

رحمت اللہ کی گھر والی بھی کشن بابو کو اپنا مہمان بنا کر خوش تھی۔ شادی کے موقع پر اس نے میرے لیے تن زیب کا ایک گول ورق کا کرتہ ہاتھ سے بنا کر بھیجا تھا۔ بہو کے لیے کارچوبی کے کام کی چولی بنائی تھی۔ جب سے وہ آئی تھی، رحمت اللہ کا کام کافی بڑھ گیا تھا۔ اس کی گھر والی ہاتھ کا کام بہت اچھا کرتی تھی۔ چاہے کشیدہ کا کام ہو یا کارچوبی کا یا ہاتھ کے کرتے بنانے کا۔ اس کی دوکان کرتوں کے لیے مشہور ہو گئی تھی۔ ہر کھاتا پیتا آدمی چاہتا تھا کہ اس کے پاس کم از کم ایک کرتہ رحمت اللہ کی دوکان کا سلا ہوا ہو۔ اس زمانے میں باقی لوگ چار آنے فی کرتہ سلائی لیتے تھے۔ رحمت اللہ آٹھ آنے لیتا تھا، چار اپنے اور چار گھر والی کے۔

رحمت اللہ کی بارات میں براتی کی حیثیت سے گیا تھا۔ اسے باقاعدہ سپاری دی گئی تھی۔ پہلے باراتیوں کو سپاری بانٹی جاتی تھیں۔ اسی سے ان کی گنتی کی جاتی تھی۔ برات چھ کوٹھیوں میں ٹھہری تھی، چونکہ زیادہ تر سامان ساتھ تھا اس لیے وکیل صاحب کو ساز و سامان کی بہت کم فکر کرنی پڑی تھی۔ دری، قالین، مسند، تمونیاں، جھالریں، برتن وغیرہ سب ہی ساتھ گئے تھے۔

رحمت اللہ نے خاموشی سے ناچ کا انتظام کیا تھا۔ اس میں کشن بابو اور چند ایک ہمارے رشتے داروں کی شہہ تھی۔ رام پور والی کو بلایا گیا تھا، وہ حسین تو تھی ہی، ناچتی بھی بے مثال تھی۔ ایک تھیلی کشن بابو کو سونپی گئی تھی جیسے چاہیں خرچ کریں۔ میں تو دولہا ہی تھا۔ اس روز کی رات براتیوں اور گھراتیوں دونوں ہی کو بہت مزہ آیا تھا۔ ویسے بھی سات سات دن برات رہنے کا چلن تھا۔ کشن بابو ہمیشہ کہا کرتے تھے ـــــ ایک اچھی کھاتی پیتی

کر او تو جسم کو سال بھر کے لیے کھیا ہو جاتی ہے۔ ناچ بھی ہو تو کیا کہنے۔ دل کی عمر سال بھر کم ہو جاتی ہے۔ لیکن کشن بابو نہ تو اب شراب پیتے تھے اور نہ پہلے کی طرح کھاتے تھے ــــ کہتے تھے ــــ جتنا اپنے دم پر کھا سکو، کھاؤ۔ ناچ البتہ دیکھ رہے تھے۔ ان کا رخ کچھ کچھ ویسا ہی تھا جیسے کسی دوسرے کی بغیہ میں لگے آم ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے ہوں۔ بس افیم کی لت ویسی کی ویسی ہی تھی۔ جب کوئی پوچھتا کہ آپ نے دیوتاؤں کا مشروب یعنی سوم رس کا استعمال کیوں چھوڑ دیا تو کہتے تھے کہ دیوتاؤں کے پاؤں زمین سے اوپر رہتے ہیں اگر آدمی بھی دیوتا بن جائے تو چاروں خانے چت نہ گرے گا۔ دیوتا بن کر دیکھ چکا ہوں۔ افیم غریبوں کا نشہ ہے۔ آنے دو آنے سے کام چل جاتا ہے۔ پھول پتی سے بنا ناشتہ زیادہ اپنا ہوتا ہے بہ نسبت انگور کی بیٹی کے۔ پتہ نہیں کہاں سے اچھلے اور کہاں پہنچ جائے۔ اپنی حدود کے اندر رہے گا تو کبھی بے دخل نہیں ہو گا۔ وہ کچھ عجیب قسم کے جملے بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے بے چینی ہونے لگتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی منجھے منجھائے اور چوٹ کھائے ہوئے ہو گئے ہیں۔

جب تک کشن بابو شہر میں رہے، وہ صبح سے ہی رحمت اللہ کی دوکان پر آجاتے تھے اور وہیں جمے رہتے تھے۔ کچھ دیر کے لیے حویلی کے اندر بھی چلے جاتے تھے۔ بڑے رائے کے لیے ان کا یہ رویہ حیران کن تھا۔ جو اتنی شان و شوکت سے رہا ہو، جس کے کپڑوں پر بھی سلوٹیں نہ پڑی ہوں اور پڑی ہوں تو وہی سلوٹیں جو سجاوٹ کے لیے ڈلوائی گئی ہوں وہ اس طرح کیسے رہنے لگا؟ من کو بدلے بغیر تن کو بدلنا کیسے ممکن ہے؟ من کوئی کپڑا نہیں کہ رنگ میں ڈبویا اور نکال لیا۔ پھر یہ کیسے ہوا؟ اس سلسلے میں انھوں نے کبھی ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ لیکن جب کبھی چھوٹے رائے یارانے کے موڈ میں آجاتے تھے تو پوچھ لیتے تھے "اماں یار کشن سہائے، کہاں تم موج مستی والے آدمی اور کہاں تمہارا یہ بھیس ــــ بات جمی نہیں۔"

کشن بابو ہنس دیتے "چھوٹے رائے پہلے تن کی مستی تھی، اب من کی مستی ہے جب ہستی ہی پہچان ہو جاتی ہے تو مستی کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے، پھر ہنس کر بولے "میرے پاس تو سب سے بڑی مستی ہے فاقہ مستی۔ جو اس مستی کو جان لیتا ہے پھر اسے کسی اور مستی کو جاننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس مستی کو میرا گھر بھر جانتا ہے۔ میں بیچ میں بھٹک گیا تھا۔

اب پھر اپنے راستے پر آ گیا ہوں۔ میری بیوی بھی بھگوان نام پر مست رہتی ہے۔ میں اپنے بال بچوں کے نام پر بھی کبھی اپنی بیوی کا شکر ادا کر کے دونوں مزے لیتا ہوں۔ آج کل میں یہاں زیادتی کر رہا ہوں ــــ وہاں جا کر سب برابر کر لوں گا۔ وہ بے چارے نہ کبھی زیادتی کرتے ہیں نہ کبھی کمی۔"

ادھر کشن بابو کی عادت بن گئی تھی ــــ بولنا شروع کرتے تھے تو بولتے چلے جاتے تھے، ہر بات کو ایسے بولتے تھے جیسے اپنے دل پر سے کھرچ کھرچ کر بانٹ رہے ہوں۔ شاید یہی ان کا اکلوتا اطمینان تھا۔ ان کے کہنے کا سلسلہ جاری تھا"" چھوٹے چاچا ــــ کبھی کبھی وہ چھوٹے رائے کو چھوٹے چاچا بھی کہتے تھے ــــ "اس آنند کو وہی جانتے ہیں جنھوں نے اسے بھوگا ہے۔ جب گھر میں کچھ نہیں ہوتا تو سب ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ جاتے ہیں ــــ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں ــــ دھاگوں میں بندھ جاتے ہیں ــــ اپنائیت کا سب سے بڑا پل تب ہی بنتا ہے۔ قریبی سے قریبی کی موت پر بھی ایسا پل بنتے نہیں دیکھا۔ کچھ نہ ہونے پر ہونے کی آس میں جینا کتنی بڑی رومانیت ہے، لوگ اسی سے برسوں جیتے چلے جاتے ہیں۔ جب میرے پاس اتنا سب تھا تب میں اس غم سے مر رہا تھا کہ کہیں چلا نہ جائے۔ اس جیسی اس دنیا کی کوئی آس نہیں۔ میں بھی کیا لے بیٹھا ــــ یہ تو فقیروں کا سا سفر نامہ ہے جو نہ کبھی ختم ہوتا ہے اور نہ ہوگا۔ اپنی ہی غربت سے لوگ امیر ہیں۔ مفلسی کی دولت کبھی ختم نہیں ہوتی ــــ باقی سب دولتوں کو گھن لگتا ہے چاہے وہ اوپر کی ہوں یا نیچے کی۔ ابھی ہے، ابھی نہیں ہے جب پہلے والے دنوں کو دیکھتا ہوں تو سچ جانیے۔۔۔ تب میں مفلس تھا۔ اب جو پاتا ہوں وہ کھاتا ہوں۔ تب جو میرا نہیں تھا اسے بھی کھاتا اور اڑاتا تھا۔'

چھوٹے رائے کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ ان کی بات، وعظ کی طرح سن رہے تھے۔ وہ ہنس کر بولے "گاندھی جی سے تو نہیں مل لیے۔۔۔؟"

"ارے صاحب، وہ مہاتما ہم پاپی! گاندھی جی کے پاس دنیا کا درد ہے یہاں اپنا درد دنیا کا درد ہوا جا رہا ہے!"

چھوٹے رائے یہ بات سن کر ہلکا سا چونکے۔ بولے "میں سمجھا نہیں"

"چھوٹے رائے، سمجھنا کیا، ان کے پاس ویسے کھونے کو کچھ نہیں، ہمارے پاس ایسے کھونے کو کچھ نہیں۔ بس ویسے اور ایسے کا ہی فرق ہے۔"

چھوٹے رائے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آگے کیا کہیں۔ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔

ایک ہفتہ بعد کشن بابو اپنے گھر لوٹ گئے۔ حویلی سے ان کے ساتھ کچھ سامان باندھا گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ اس سامان کو اپنے ساتھ نہ لے جا کر رحمت اللہ کے یہاں چھوڑ گئے۔ شادی کے بعد جوڑے، کھانے پینے کا سامان برتن وغیرہ اپنے اعزا کو دیے جانے کا رواج تھا۔ اسی کے تحت وہ سامان ان کے ساتھ بھی باندھ دیا گیا تھا۔ یہ بات رحمت اللہ نے بھوانی کو بتائی تھی۔ اس نے ان سے پوچھا بھی تھا کہ اس سامان کا کیا کروں؟ مجھے تو خود ہی حویلی سے کافی سامان ملا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر میں واپس کرنے جاؤں گا تو بڑے رائے کو دکھ ہوگا۔ تو وہ بولے، میں لے جاتا لیکن میں نہیں چاہتا کہ عادت خراب ہو۔ گیلی مٹی میں گر کر پتھر یا کوئی بھاری چیز جیسے اپنی جگہ بنا لیتی ہے اور وہاں آرام سے فٹ ہو جاتی ہے اسی طرح ہم نے اپنے حالات میں اور حالات نے ہمارے اندر آرام دہ جگہ بنالی ہے۔ میں اس میں ردو بدل نہیں کرنا چاہتا۔ تب اس نے پوچھا کہ میں اس سامان کا کیا کروں؟ تو وہ بولے ـــــ اپا ہجوں میں بانٹ دو۔ میں نے بھوانی کی بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ بھوانی کو بھی منع کر دیا کہ وہ بھی اس بارے میں کسی سے کچھ نہ کہے۔

کچھ دن بعد ان کا خط آیا تو اس میں بھی اس بات کی ہلکی سی آواز تھی۔ انھوں نے خط میں لکھا تھا "میں امیری کے اس نقطے پر پہنچ چکا ہوں جو دنیا میں ہر ایک کو میسر ہوتی ہے لیکن لوگ اسے مفلسی میں بدل لیتے ہیں۔ یہاں امیدیں ختم ہو جاتی ہیں ـــــ لگتا ہے اس کے بعد کچھ نہیں۔ میرے بال بچوں وہ کافی راس آگئی۔ لیکن وہ کبھی کبھی پریشانی محسوس کرتے ہیں۔ میں اسے نہیں سمجھتا ہوں کہ میں وہاں سے لوٹا ہوا ہوں جہاں تم جانا چاہتے ہو۔ میری بات مانو ـــــ یہاں رہ کر تمھیں جو بھی ملے گا وہ تمھارا اپنا ہوگا۔ بے نیاز ہو جاؤ گے۔ پانے کو کچھ نہیں رہے گا۔ وہاں جا کر جو بھی پاؤ گے وہ کم لگے گا ـــــ اسے بڑھانے کے لیے دوسروں کا چھینو گے ـــــ چھینتے ہی جاؤ گے ـــــ جب سب کا سب کچھ چھین چکو گے اور چھیننے کو کچھ نہیں بچے گا یا کوئی تم سے بڑا چھیننے والا آجائے گا تو تم کیا کرو گے؟ پتہ نہیں وہ

سمجھتے ہیں یا نہیں لیکن لگتا ہے کہ میری بات فی الحال تو ان کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ خیر۔

اب میں نے افیم چھوڑ دی۔ جب ایک دن ـــــ ایک دن کیا کئی دن افیم نہیں ملی اور میری تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو میں جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہ میری مایوسی کا سب سے گہرا اندھیرا تھا۔ اس طرح کا اندھیرا تب ہی سامنے آتا ہے جب انسان اپنے کو کسی چیز سے اس طرح باندھ لیتا ہے جیسے کسی زمانے میں عطائی لوگوں کو گھوڑے سے باندھ کر گھسٹواتے تھے۔ مجھے ایک سانپ اپنی بانبی میں جاتا دکھائی دیا ـــــ مجھے اور تو کچھ نہیں سوجھا، میں نے بانبی میں ہاتھ ڈال دیا ـــــ شاید اس سانپ نے مجھے کاٹ لیا۔ وہ مجھے اپنی بانہہ پر چڑھتا محسوس تو ہوا پھر میں شاید بے ہوش ہو گیا ـــــ جب ہوش آیا تو لگا کہ مجھے اتنا ہی نشہ ہے جتنا آخر آنے بھر افیم کھانے پر ہوتا ہوگا۔ حالانکہ اتنی افیم میں نے برسوں سے نہیں کھائی۔ میں اٹھ کر چلنے لگا تو سانپ وہیں پڑا تھا۔ میں نے اسے مارنے کے لیے پیر اٹھایا تو پیر نہیں اٹھا۔ میں بے بس تھا۔ حالانکہ وہ سانپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ شاید سانپ کو میرے جسم کے زہر نے مار ڈالا تھا۔ مجھے ایک بہت مزے دار بات یاد آئی ـــــ میں نے سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ غریبی کے زہر سے سانپ بھی نہ بچ پاتا ہو؟ لیکن یہ بات غلط ہے۔ ساری دنیا بچی پڑی ہے میری مصیبت ختم ہو گئی۔ اب جب مجھے طلب اٹھتی ہے تو میں جنگل میں اپنے شکار کی تلاش میں نکل جاتا ہوں ـــــ نشے کا تو نشہ اور ایک عدد سانپ کی موت۔ کبھی کبھی لگتا ہے سانپ آدمیوں سے زیادہ ہیں اور کبھی لگتا ہے آدمی کو بھی سانپوں میں ہی کیوں نہ شمار کر لیا جائے۔"

میں نے ان کا یہ خط رحمت اللہ کو پڑھ کر سنایا۔ سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا لیکن افسوس ضرور ہوا کہ آخر ان کو یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ چھوٹے رائے کو بتایا تو فکر مند ہو گئے۔ ان کا ردعمل تھا کہ جائیداد کا کیس ہارنے سے کشن بابو بہت متاثر ہوئے ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے گھل رہے ہیں۔ اپنے لیے وہ غریبی کا ایک ایسا کھوکھا بناتے جا رہے ہیں جس میں وہ اپنے کو محفوظ محسوس کر سکیں۔

بڑے رائے کو شاید سامان چھوڑ کر جانے والی بات معلوم ہو گئی تھی۔ انھوں نے ایک قاصد کے ذریعہ کچھ سامان چپ چاپ ان کے گھر بھجوایا لیکن وہ واپس لوٹا دیا۔ ساتھ میں میرے نام ایک خط تھا ـــــ "لگتا ہے تم نے بڑے رائے کو میرا خط دکھا دیا۔ وہ خط تو میں

نے اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے ایک اس شخص کو لکھا تھا جو اب بھی میری جان کا ٹکڑا ہے جیسے غریب کی کوئی دلیل نہیں ہوتی ویسے پیار کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ دونوں کی سمجھ ضروری ہے۔ مجھے سانپ کاٹتا ہے تو میں بچ جاتا ہوں۔ نشے میں لہرانے لگتا ہوں۔ انسان اگر سانپ میں اپنا زہر اتار دے تو وہ مر جاتا ہے۔ میں اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہوں۔ میں نے اپنا ڈنک کافی تیز کر لیا ہے۔ اگر پہلے جیسی حالت ہوتی تو سانپ نے مجھے ڈس لیا ہوتا۔"

"میں جانتا ہوں کہ بڑے رائے نے یہ سامان اپنے بڑے پن کے تحت بھیجا ہے لیکن اپنے عمل دخل میں، میں بھی کم بڑا نہیں۔ لگتا ہے دو بڑے ٹکرا گئے۔ یہ ٹکراہٹ تم نے ہی پیدا کی۔ تمھیں ہی ختم کرنی ہو گی۔ سامان واپس بھیج رہا ہوں۔ پہلا سامان بھی میں ساتھ نہیں لایا تھا۔ یہ تم جانتے ہو کتنے دن کام چلے گا۔ بری عادت تو دو چار دن میں ہی پڑ جاتی ہے چھوڑنے میں بھلے ہی برسوں لگ جائیں۔ میں تجربے کے بغیر نہیں کہہ رہا کہ برسوں کی اچھی عادت کو کمبخت انگوٹھا دکھا دیتی ہے۔۔۔ ٹی۔۔۔ بی۔۔۔ بی۔۔۔ جھرر! بڑے رائے چونکہ مجھے دینے کا عزم کر چکے ہیں اس لیے تم اس سامان کو ان ندیدوں میں بٹوا دینا جو مانگ کر کھانے کی عادت کے غلام ہیں، غریبی جنھیں کال کوٹھری کی طرح لگتی ہے اور جو اس کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں اور سہمے ہوئے اپنی گدڑیوں میں دبکے رہتے ہیں —— اس سے بڑا ہتھیار اور کون سا ہو گا۔"

رحمت اللہ کو میرا سلام کہنا۔ ستابو کو بھی۔ تعلقات کو بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ لوگوں کی نظر میں کم از کم معزز لوگوں کی کوسے لائق احترام بنایا جاتا ہے —— یہ دونوں اس کی مثالیں ہیں۔ ویسے احترام کچھ نہیں ہوتا۔ شیشے کو الٹ کر دیکھو تب بھی وہی شکل سیدھا کر کے دیکھو تب بھی وہی۔ ہم میں شیشے میں ایک طرف سے دیکھنے کی عادت پڑی رہتی ہے اس لیے ہم اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ کیوں؟"

میں کافی دیر کشمکش و پیچ میں رہا۔ بالآخر میں نے وہ خط بڑے رائے کو دے دیا۔ انھوں نے اسے پڑھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بدبدائے "پتہ نہیں کس قماش کا آدمی ہے۔ دن بہ دن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔"

نئی منجھلی چاچی کا وزن بھی بڑھ گیا تھا۔ ان کا رہن سہن ویسا ہی تھا۔ وہی مہاراج ان کے ساتھ یہاں بھی آیا تھا جو تب تھا، جب میں وہاں گیا تھا۔ منجھلے رائے زمینداری کا کام خود بہت مستعدی سے دیکھتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ گیہوں کے دانے بھی پیسے کی طرح گنتے ہیں۔ چڑیوں نے کتنے دانے چگے، اس کا حساب رکھتے ہیں۔ کسی پر اپنا چھوڑتے نہیں اور کسی کا آجائے تو دیتے نہیں۔ ان کے یہاں مہمان نوازی کا خرچ بھی نہ کے برابر تھا۔ کوئی مہمان آجاتا تھا تو اس سے پوچھا جاتا تھا "کھانا کھا کر آئے ہیں یا بنوا دیا جائے؟" اس زمانے میں اس بات کو خاطر مدارات کے بالکل خلاف سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنی گھوڑا گاڑی وہیں سے ساتھ لائے تھے۔ اس بات سے بڑے رائے کو تکلیف ہوئی تھی۔ ان کو لگتا تھا کہ اتنے گھوڑے اور گاڑیاں ہیں، کرشن رائے انھیں استعمال کیوں نہیں کرتے۔ دوسرے بڑے رائے خاطر مدارات کو انسان کی شرافت کی پہچان سمجھتے تھے۔ انھیں دھیرے دھیرے لگنے لگا تھا کہ فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بیچ میں ٹیلے اونچے ہوتے جا رہے ہیں۔

بڑے رائے مجھے کبھی کبھی منجھلے چاچا کے یہاں بھیجا کرتے تھے۔ ان کو تو وہ بھوانی یا کسی بھی نوکر کے ساتھ اکثر بھیج دیتے تھے۔ جب سے منجھلے رائے یہاں رہنے لگے تھے تب سے بڑے رائے نے گھر سے باغ میں دعوتیں دینی بند کر دی تھیں۔ چاچا اور رانی بھی ڈولی میں بیٹھ کر آئی تھیں اسے ڈولی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس میں کہار نہیں جتتے تھے بلکہ عورتوں کے لیے اسی ڈیزائن کی ایک بگھی بنوائی گئی تھی جسے گھوڑا کھینچتا تھا۔ بڑے رائے کو یہ پسند نہیں تھا کہ آدمی، آدمیوں کو ڈھوئے۔ وہ چاروں طرف ڈھکی ہوئی تھی۔ ہوا کے لیے ڈولی کی دیوار میں پھول کٹے ہوئے تھے۔ ان میں جالی لگی تھی۔ عورتیں جب باہر جاتی تھیں تو ڈولی دہلیز کے سامنے لگ جاتی تھی۔ سواریاں پیچھے سے بیٹھتی تھیں۔ جب وہ بیٹھ جاتی تھیں تو دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ چھوٹے رائے کو اگر کسی بات سے نفرت تھی تو عورتوں پر عائد اس پابندی سے۔ یہ تبدیلی ان میں کانگریس میں جانے کے بعد سے آئی تھی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ عورتیں کیا بھیڑ بکری ہیں کہ جنھیں مال کی طرح بھرا اور لے گئے۔ یا بلی اور خرگوش ہیں کہ اچک کر کسی بھی گود میں جا بیٹھیں گی لیکن نہ تو وہ بڑے رائے سے کہہ پاتے تھے اور نہ

ور توں کو بھیڑ بکری کی طرح ڈولی میں بھر نے سے روک پاتے تھے۔

جب بھی کبھی میں گھرے باغ والی کوٹھی پر منجھلے رائے کے پاس جاتا تھا تو وہ بڑے رائے کے بارے میں یہ نہیں پوچھتے تھے کہ بڑے بھائی یا راگھو کیسے ہیں بلکہ یہ پوچھتے تھے کہ تمھارے والد اور اصلی چھوٹے چاچا کیسے ہیں؟ ان کا یہ پوچھنا کانوں کو اکھر جاتا تھا۔ منجھلی چاچی ارن کو بہت ناپسند تھیں۔ منجھلے رائے تو اس کے ساتھ کھیل کود بھی لیتے تھے لیکن چاچی کچھ اس طرح سے برتاؤ کرتی تھیں جیسے کوئی باہری بچہ گھر میں گھس آیا ہو۔ ایک بار انھوں نے پتہ نہیں کیسے اسے دھکیل ہی دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی تھی۔ چوٹ بھی انھوں نے ہی ماری اور پھر روئیں بھی ایسے جیسے ان کے اپنے بچے کو کسی دوسرے نے چوٹ ماری ہو۔ رونا عورتوں کا تب بھی بڑا ہتھیار تھا اور آج بھی ہے۔ ارن روتا روتا بھی یہ کہہ رہا تھا کہ منجھلی چاچی نے دھکہ دے کر گرایا۔ چاچی نے چوٹ ماری۔ منجھلے چاچا سمجھ گئے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ وہ خود اسے حویلی پر چھوڑنے گئے تھے۔ انھوں نے چھوٹے رائے کو بتایا بھی تھا کہ ارن تمھاری بھابی کے دھکے سے گر گیا۔ یہ بات بڑے رائے نے بھی سنی تھی لیکن چپ لگا گئے تھے۔ باتوں کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ اگر عام تعلقات ہوئے ہوتے تو وہ ڈانٹے بغیر نہ چھوڑتے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی طرف سے نہ تو کسی کو گھرے باغ والی کوٹھی پر جانے کو کہا اور نہ کسی کو جانے سے روکا۔

زمینداری میں بھی منجھلے رائے کا رخ کافی سخت ہوتا جارہا تھا۔ چار چھ بار ایسا ہی ہوا کہ انھوں نے لوگوں کے کھیت جتوالیے۔ جب اعتراض کیا گیا تو اسے آدھے پونے کے دام دے کر زمین اپنے نام لکھوالی۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوا تو اسے پٹوایا اور ڈنڈا ڈولی گروا کر گاؤں سے باہر پھنکوادیا۔ وہ لوگ بڑے رائے کے پاس فریاد لے کر آتے تھے۔ بڑے رائے پہلے تو سوچتے رہے کہ کیا کریں۔ پھر انھوں نے منجھلے رائے کو بلانے کے لیے مجھے بھیجا۔ ویسے وہ کسی کے بھی ذریعے بلوا سکتے تھے لیکن انھوں نے احتیاط اس لیے برتی کہ کہیں وہ منع نہ کردیں۔ حالانکہ وہ پہلے بھی منع کر چکے تھے۔ بیشک منجھلے رائے ایک ہوشیار آدمی تھے دور کی چڑیا پہچانتے تھے۔ وہ یہ بات سمجھ گئے کہ بڑے رائے نے انھیں کیوں بلوایا ہے؟

جب میں گیا تو کوٹھی کے لمبے چبوترے پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا تو وہ بولے "کیوں بلوایا ہے؟" پھر اپنے ہی آپ پتہ آسامیوں کا نام لے کر پوچھا کہ فلاں فلاں لوگ تو نہیں آئے تھے۔ انھوں نے یکایک کراہنا شروع کر دیا۔ "طبیعت ٹھیک ہونے پر آؤں گا۔"

میں نے لوٹ کر پورا قصہ چھوٹے رائے کو بتا دیا تھا۔ بڑے رائے نے پہلے ایک منٹ کے لیے سوچا پھر بولا "کرشن کی طبیعت خراب ہے تو میں ہی دیکھ آتا ہوں۔"

وہ کرتہ دھوتی اور پمپ شو پہنے جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی اٹھ کر چل دیے۔ منجھلے رائے نے اس کوٹھی میں آنے کے بعد بڑے رائے شاید پہلی بار جا رہے تھے۔ یا ہو سکتا ہے ایک دو بار دیکھنے بھالنے گئے ہوں۔ بڑے رائے کو اس طرح پیدل جاتے دیکھ کر رحمت اللہ دوکان سے اٹھ کر پیچھے ہو لیا تھا۔ ایک تو وہ پیدل کم جاتے تھے۔ دھوتی کرتے میں تو بہت ہی کم۔ ان کی چال کافی تیز تھی۔ لوگ باگ دیکھ کر ایک طرف ہو جاتے تھے۔ جھک کر سلام کرنے لگتے تھے۔ وہ برابر ہاتھ اٹھا کر سب کی بندگی لیتے جا رہے تھے۔ رحمت اللہ برابر دوری قائم رکھے ہوئے تھا۔ بڑے رائے جیسے ہی پہنچے، منجھلے رائے انھیں دیکھ کر بوکھلا سے گئے۔ وہ انھیں اس لباس میں اور اتنی جلدی آتے دیکھ کر طے نہیں کر سکے کہ یہ کیا ہو گیا۔

بڑے رائے نے پوچھا "بھاسکر نے جا کر بتایا تمھاری طبیعت خراب ہے — ساتھ رہتے تھے تو پتہ رہتا تھا... طبیعت اب کیسی ہے؟"

منجھلے رائے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں۔ ان کے منہ سے نکلا "کچھ بدن میں درد تھا۔"

"اپنا خیال رکھا کرو۔ کئی بار درد نہیں بھی ہوتا تو محسوس ہونے لگتا ہے۔ کہو تو ڈاکٹر بھیج دوں۔"

"نہیں، میں دکھاؤں گا۔"

بڑے رائے گھومتے گھامتے کوٹھی میں چلے گئے۔ منجھلے رائے نے پوری کوٹھی میں قبضہ کیا ہوا تھا۔ جو حصے صاحب لوگوں کے لیے رہتے تھے وہ بھی منجھلے رائے کی عملداری میں آ گئے تھے۔ بڑے رائے چکر لگاتے ہوئے باہر چبوترے پر آ گئے۔ کوٹھی کے بستر کے حساب سے چبوترا بھی چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ بڑی سے بڑی محفلیں اس چبوترے پر ہوتی

تھیں۔ ان کا سلسلہ اب ختم ہو گیا تھا۔

بڑے رائے بولے "اب تم قبضہ کرنے میں ماہر ہو گئے ہو۔"

پہلے تو ہٹپٹائے پھر بولے "میں سمجھا نہیں۔"

پوری کوٹھی پر ایک تفصیلی نظر ڈالتے ہوئے بولے "کچھ لوگ اپنے کھیتوں کے بارے میں شکایتیں لے کر آئے تھے۔"

منجھلے رائے زور سے بولنے لگے "وہ بدمعاش ہیں، حرامزادے ہیں، کمینے ہیں ــــ کھیتوں کے چاروں طرف گڈھے کھود کر راستہ روکنا چاہتے ہیں۔"

"یہ کام تو غلط ہے لیکن تم نے تو ان کے کھیت ہی جتوا لیے۔ سنا ہے پٹوایا بھی۔"

"تب ہی تو انھیں عقل آئے گی۔"

"اب تو آ گئی ہو گی؟"

منجھلے رائے کی سمجھ میں یا تو آیا نہیں یا انھوں نے جان بوجھ کر نہیں سمجھا۔ بڑے رائے نے بھی پھر کہا "وہ کھائیں گے کیا؟"

"یہ میری ذمہ داری تھوڑے ہی ہے۔"

"کرشن، یہ تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کس کے لیے کر رہے ہو؟ تمھارے پاس تو اپنا اتنا ہے کہ تم چاہو تو دس آدمیوں کی پرورش کر سکتے ہو۔ پھر بھی آرام سے رہ سکتے ہو۔ ان بے زبان لوگوں کی بددعائیں کیوں لیتے ہو؟ پانی اڑ کر بادلوں میں نہیں جاتا، بھاپ جاتی ہے۔ کبھی وہ اتنا برستی ہے کہ جل تھل ہو جاتا ہے۔۔۔"

"بڑے رائے، آپ میرے مقابلے ان کی طرف داری کریں گے۔ جہاں تک کسی کے لیے کرنے کا سوال ہے، جب تک ہم زندہ ہیں، اپنے لیے کر رہے ہیں بعد میں جو رہے گا وہ جو ئے گا۔"

وہ لوگ ہماری رعایا ہیں ــــ ان کی دکھ تکلیف کو سمجھنا ہمارا فرض ہے ہم ان ہی کے دم پر عیش و عشرت کر رہے ہیں۔"

"آپ کی رعایا ہیں تو آپ جانیں ــــ یہ آپ کا سر درد ہے۔ میں کسی کو رعایا نہیں مانتا۔ جس کا پہلے موقع ملتا ہے وہ دوسرے کو چوس لیتا ہے۔"

بڑے رائے پہلے تو بڑے رائے کے تخاطب سے ہی چونکے تھے۔ اس سوال نے

انھیں اندر تک زخمی کردیا۔ وہ بولے "کرشن، جس طرح تم نے میری اس کوٹھی پر قبضہ کرلیا، اسی طرح ان (غریبوں) کی روٹی پر قابض ہونا چاہتے ہو۔ ایسا مت کرو۔ تم منجھلے رائے ہو یا کچھ اور، میں تمھارا بڑا بھائی ہوں۔۔۔ میں نے تمھیں پالا ہے۔ روٹی بیٹی پر کیا گیا ظلم کوئی برداشت نہیں کرتا۔ اندر کا ہوا پانی کبھی نہ کبھی بہتا ہے۔"

بڑے رائے کھڑے تھے۔ منجھلے رائے نے انھیں بیٹھنے تک کے لیے نہیں کہا تھا۔ منجھلی چاچی دروازے کے پیچھے کھڑی مسلسل منجھلے رائے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کررہی تھیں لیکن وہ ذرا بھی دھیان نہیں دے رہے تھے۔ وہ بولے "اپنی اپنی طرح سب یہی کرتے ہیں۔ پہلے کوٹھی پر آپ کا قبضہ تھا اب میرا ہے۔ آخر یہ بھی تو زمینداری کی آمدنی سے تھی۔"

بڑے رائے سیڑھیاں اترتے ہوئے بولے "کوٹھی کی بات تو بعد میں ہو جائے گی بس تم ان کے کھیت چھوڑ دو۔ وہ تمھیں دعائیں دیں گے۔ انھیں اور غریب کرکے تم کس کھیتی میں دھکیلنا چاہتے ہو۔ وہ سب تو سب سے نچلی سیڑھی پر کھڑے ہیں۔ اس کے نیچے تو صرف موت ہے ـــــ ویسے موت تو بہت اوپر بھی ہے۔"

"وہیں انھیں زیادہ آرام ملے گا۔"

بڑے رائے گھومے اور دھیرے سے بدبدائے "وہاں تو سب کے لیے آرام برابر ہے" بڑے رائے تیزی سے سیڑھیاں اتر گئے۔ رحمت اللہ دور کھڑا دیکھ سن رہا تھا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور پھر پیچھے ہولیا۔

منجھلی چاچی اندر سے نکلیں "تم نے جیٹھ جی سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔"

"میں دشمن کو گھر میں نہیں بٹھاتا۔ وہ لڑنے آئے تھے۔"

"آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔ سب مجھ ہی کو کہیں گے کہ میری وجہ سے تم میں یہ تبدیلی آئی۔"

"مجھے جو کہنا اور کرنا تھا، کہہ اور کردیا ـــــ تم ان کی طرف داری کرتی ہو، جو تم سے نفرت کرتے ہیں، میں ان سے تو ان سے، ان کے کتوں تک سے نفرت کرتا ہوں جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں ان۔"

منجھلی چاچی اندر چلی گئیں۔

روپا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ بڑے رائے چپ چاپ لیکن پریشان تھے۔ وکیل صاحب نے بہو کے حال چال کے بارے میں نہ کوئی خط لکھا اور نہ خبر بھیجی۔ ایک آدھ بار آدمی بھی بھیجا گیا۔ باہر ہی باہر سے لوٹا دیا گیا۔ کبھی یہ کہہ کر روپا ماما کے گھر گئی ہوئی ہے اور کبھی یہ کہہ کر کہ بوا نے بلوایا تھا وہاں چلی گئی۔ بڑے رائے کو ان سب باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ان کی تشویش دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ ایک دن چھوٹے رائے نے مجھے بلا کر کہا بڑے رائے نے کہا ہے کہ تم فوراً جاؤ اور بہو کو لے آؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب بڑے رائے مجھ سے براہ راست یہ بات کہنے میں متذبذب ہوتے ہیں تو بھلا میں وہاں جاکر کیسے کہوں گا کہ روپا کو رخصت کردو۔ میں لینے آیا ہوں۔ خط و کتابت کے بغیر اس طرح جانے سے پتہ نہیں وہ کیا سمجھیں؟ چھوٹے رائے ہنسے اور بولے ''بھاسکر، تم اپنی گھروالی کی فکر نہیں کروگے تو کون کرے گا؟ یہ تجویز تو تمھاری طرف سے آنی چاہیے تھی۔۔۔ اور تم کہنے پر بھی منہ پھیر رہے ہو۔ ارے بیوی تمھاری ہے، ہماری نہیں۔ ہم تو اپنے زمانے میں بیوی کے پاس چھپ چھپا کر جایا کرتے تھے'' پھر وہ سنجیدہ ہوگئے ''دیکھو میاں بیوی ہونا کوئی شرم کی بات نہیں۔ شرم کی بات ہے بیوی کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑنا۔ جب تک تم لوگ اسے عزت و احترام کی بات نہ سمجھوگے تب تک ان تعلقات کی کوئی خاص افادیت نہیں ہوگی۔ ایک دوسرے کو ڈھونے والا رشتہ بن کر رہ جائے گا۔ سچ پوچھو تو منجھلے بھائی اس معاملے میں زیادہ صحیح ہیں۔ زیادہ ذمہ دار ہیں انھوں نے شادی کی تو کسی کی پرواہ کیے بغیر۔ اس ذمہ داری کو نباہا بھی۔ لیکن وہیں یہ صحیح ہے کہ انھوں نے پہلے والی منجھلی بھابی پر ظلم بھی کیا۔ جب میں ان کی جانب تحسین آمیز نگاہ سے دیکھتا ہوں تو یہی بات آکر میری نظریں جھکادیتی ہے۔ تمھاری چھوٹی چاچی کے ساتھ بھی میرا برتاؤ وہ نہیں جو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن میں اس کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بڑے بھیا نے بڑی بھابی کو ہمیشہ بیوی سے زیادہ ایک معزز آیا کا درجہ دیا۔ لیکن وہ سب کی ماں بن کر رہیں۔ بھاسکر، عورتیں بچے پیدا کرنے کے لیے ہی نہیں۔ ان کے اندر ایک ایسی نگاہ ہوتی ہے جو تمھارے آرپار دیکھ لیتی ہے اور پھر بھی منہ نہیں کھولتی۔ جب بدلہ لیتی ہے تو سب کچھ اپنے اوپر لیتی ہے۔ منجھلی بھابی اس کی مثال ہیں'' پھر سوچ کر

بولے "بس ان کی ایک ہی کمزوری ہے کہ وہ مرد کی جانب سے نظر انداز کیا جانا برداشت نہیں کرپاتی۔ مرد اس کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ تحقیر کو ہی ہتھیار بنالیتا ہے۔ ویسے معافی، تحمل، ایثار، پیار ــــــ سب میں مرد ان سے کم ہے۔ مرد مرجائے تو عورت کے لیے کچھ نہیں ــــــ عورت مرجائے تو مرد کے لیے سارا جہان پڑا ہے۔ ہماری بہن تیرہ سال میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ اس کا معلوم ہے کیا ہوا ــــــ؟ اس کے بعد ہزار لاکھ کروڑ جتنے بھی پل اس نے جیے اتنی ہی بار وہ مری۔ میں یہ سب باتیں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم عورت کو ایک ایسا پرزہ نہ سمجھو جو تمھارے بچے لائے گی، انھیں پالے گی اور تمھیں پیار کرے گی ــــ تم چاہو کرو۔ ہم سب تو عورت ذات کے قاتل ہیں اس کی خودداری کے ہتھیارے ہیں۔ تم لوگ تو ایسے نہ ہو۔"

وہ کافی برانگیختہ ہوگئے تھے۔ انھوں نے چپ رہ کر اپنے دو سنبھالا اور پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "جاکر دیکھو رویا کیسی ہے ــــ یہ سمجھو اب دنیا میں اگر اسے کسی کا انتظار ہے تو تمھارا ــــ دیر مت کرو۔"

'دیر مت کرو' انھوں نے کچھ اس طرح کہا کہ میں اندر تک لرز گیا۔ میرے سنسکار کا وہ تالا ابھی تک پورا نہیں کھلا تھا۔ ابھی ایک دیوار اندر چنے تھے۔ میں ایک غار میں بند تھا جالا تک روشنی آنی شروع ہوگئی تھی لیکن اتنی گہری تاریکی میں وہ یہ روشنی ناکافی تھی۔ آخر چھوٹے چاچا نے مجھے اس تاریکی سے باہر آنے کے لیے مجبور کردیا۔ مجھے روہتک جانا پڑا۔

راجہ بابو یعنی میرا سالا مجھے باہر ملا۔ مجھے لگا کہ مجھے آیا ہوا دیکھ کر وہ خوش ہونے کی جگہ ناخوش ہی زیادہ ہوا ہے۔ ایسے تعلقات بندھن نہیں بن پاتے۔ وہ جیسے گھبرا سا گیا تھا جو جملہ اسے فوراً کہنا چاہیے تھا وہ اس نے کچھ رک کر کہا "آیئے جیجاجی۔"

اندر اس کے والد لیٹے تھے اس نے جاکر بتایا کہ میں آیا ہوں تو وہ دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے اٹھے۔ تب تک میں اندر پہنچ گیا۔ گھر میں ایک عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسے بگڑے ہوئے میعادی بخار والے بچے کی جلد میں سے آتی ہے۔ وہ چشمہ اتارے نیم تاریکی میں بیٹھے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں میرے اوپر ٹکی تھیں۔ میں نے انھیں آداب کیا۔

وہ فوراً ہی بولے "اب آئے ہو داماد بابو"

میں کچھ نہیں سمجھا۔ کچھ کہا بھی نہیں۔ چپ رہا۔ وہ فوراً بولے "پتہ نہیں تم نے میری بیٹی کو کیا دے دیا کہ وہ آتے ہی کھاٹ میں لگ گئی۔ دو دو تار دیے۔ کوئی سنکا تک نہیں۔ تم لوگوں نے میری بیٹی کو سنکھیا دے دی۔۔۔ ننگی بچی کر کے یہاں بھیج دیا۔"

سسر جی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ ماتم سا کر رہے تھے۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا "انھیں کیا ہوا؟" انھیں اسی دن سے کھانسی آرہی تھی۔ ہم نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا تو انھوں نے منع کر دیا۔ راجہ بابو لینے آئے اور جب انھیں پتہ چلا کہ کھانسی آرہی ہے تو وہ انھیں رخصت کرانے کے لیے بے چین ہو گئے۔"

"اپنا قصور راجہ بابو پر منڈھنے لگے۔"

میں نے ان کی بات بیچ میں کاٹ کر کہا "روپا کہاں ہے؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ روپا کے والد روہانسے ہو کر بولے "اوپر۔۔۔ وہاں" ان کی انگلی سیدھی کھڑی تھی جیسے انھوں نے اس میں سدرشن چکر پہنا ہوا ہو۔

میں سن رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟ جو ہوا اس کا اندازہ لگا کر کچھ کہنا یا کرنا مجھے دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ میں پہلے کرسی پکڑے کھڑا رہا پھر اس پر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں میں ان کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفے سے تیز اور دھیمی ہو رہی تھی ـــــ اوپر ۔۔۔ اوپر۔۔۔ وہاں ہے۔ میں اتنا اکیلا تھا جتنا میں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ روپا سے بیوی جیسا میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ میرے اس کے ساتھ پھیرے ہوئے تھے۔ پہلی رات کو بے تحاشہ۔۔۔ کھانستی ہوئی وہ گڑی مڑی بنی بیٹھی تھی۔ وہ رات بھر اس طرح کھانستی رہی جیسے کراہ رہی ہو۔ میں اس کا درد جب چاہے نہ سمجھ پایا ہوں لیکن اب سمجھ سکتا ہوں۔ اسے بیوی بن کر بھی بیوی نہ ہو پانے کی کوفت گھلاتی رہی ہو گی۔ مجھے یہ یاد تھا کہ جب میں نے انھیں چھونا چاہا تو اس نے گھونگھٹ کے پیچھے سے مجھے منع کر دیا ـــــ "مجھے مت چھوئیے میں۔۔۔ میں!" اس کے بعد اسے رونا بھی آگیا تھا اور کھانسی بھی بھڑک گئی تھی۔ میرے من میں بہت سی باتیں اٹھی تھیں۔ اس نے مجھے چھونے سے کیوں منع کیا؟ بعد میں پتہ چلا کہ جو کچھ بھی میں نے سوچا وہ بے بنیاد تھا۔ بات کچھ اور تھی۔ جب وہ کھانسی سے

بے حال ہونے لگی اور میں نے اس کی پیٹھ سہلانی چاہی۔ اس نے تب بھی منع کر دیا۔ میں بہت دیر تک بے بس بنا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے درد کا خاموش ناظر بنے رہنے کی اذیت سے اپنے کو نجات دلانے کے لیے میں باہر چلا آیا۔ چلے آنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ اپنی بیوی کے روپ میں ایک عورت کا اس روپ میں پہلا، درد بھرا تعارف تھا۔

مجھے باہر آ کر لگا کہ میرے اندر سے کچھ اس طرح رس گیا تھا جیسے دامودر کنڈ کے میں کرشن کے پاؤں چھو کر پانی اتر جاتا ہے۔ میں شادی کا نابکار تھا۔ اسی کی سزا مجھے رنڈوا ہو کر ملی تھی۔ رنڈوے ہونے کا خالی پن قیمتی سامان سے بھرے مال خانے کے یکایک خالی ہو جانے کے خالی پن سے بڑا ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس طرح۔۔۔!

میں نے شاید تب اپنے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا: رنڈوا ہونا کیا ہوتا ہے؟ آج تک سمجھ نہیں سکا کہ میں اپنے آپ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہا ہوں؟ شاید اس لیے کہ نہ وہ بیوی بن سکی اور نہ میں شوہر۔ پھر مجھے ان بواؤں کا خیال آیا —— وہ بیوہ کیسے ہوئی تھیں؟ وہ نہ تو شوہر کا مطلب جانتی تھیں اور نہ انھوں نے شوہر کو دیکھا تھا۔ بیوہ ہونے پر انھیں یہ بھی معلوم نہیں رہا ہو گا کہ بیوہ ہونا کیا ہوتا ہے۔ میں تو جان اور سمجھ بھی رہا تھا۔ ان جانے میں بیوہ ہو جانا اور بعد میں جاننا بھلے ہی بے سود ہو لیکن تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اتنا تکلیف دہ کہ اس تکلیف کو لائق برداشت بنانے کی کوئی دوا نہیں ہوتی۔ ایک رسم کا پورا ہو جانا کیا اتنا بڑا عذاب بن جاتا ہے کہ وہ بیوہ ہو گئی اور میں رنڈوا ہوں۔

میں نے آپے سے باہر ہو کر وکیل صاحب سے پوچھا "روپا کب مری؟" کبھی کبھی متحمل یکایک تب زندہ ہو کر لکیر کی طرح سیدھے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جب ہم کسی ویسے ہی واقعہ کے شکنجے میں کس جاتے ہیں مجھے لگا کہ میں ہی حق کا شوہر ہوں —— مجھے اپنے سسر کا پورے کا پورا 'جیون یگ' بھنگ کر دینا چاہیے۔ ان کے چہروں کو بکروں اور سوروں کے سروں میں بدل دینا چاہیے۔ لیکن کیا میں اپنا توازن کھو بیٹھا تھا؟ مجھے لگا کہ وکیل صاحب مجھ سے زیادہ زور سے بول سکتے ہیں۔ وہ بولے "مری نہیں، مار دی گئی" میں بھی زور سے ہی بولا "بند کیجیے بکواس —— سیدھے سیدھے بتائیے —— اس کی موت کب اور کیسے ہوئی؟"

انھیں امید بھی نہیں تھی کہ میں اس طرح چلا پڑوں گا۔ وہ ہڑبڑا گئے۔ روپا کے

والد وکیل ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔

"تمہیں اب اس سے کیا مطلب؟ وہ یاد کرتی کرتی چلی گئی ـــــ دو دو تار دیے گئے۔۔۔"

"جھوٹ بولنا بند کیجئے۔۔۔ بہت ہو چکا۔"

میرے ساتھ دیوان جی بھی آئے تھے۔ وہ سنجیدہ آدمی تھے۔ پاس آ کر بولے "سمراٹی صاحب، ہمارے تو آپ بھی مالک ہیں اور بھاسکر بابو بھی مالک ہیں۔ کیا آپ یہ مان کر چلتے ہیں کہ بہو کی بیماری کا تار ملتا اور ہم نہ آتے۔ فاصلہ ہی کتنا تھا ـــــ دوڑ بھی لگائے تو اگلی صبح بمبئی ہوتے۔ آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ بیوی کو اس کے شوہر کا ہاتھ نہیں لگنے دیا۔ اس بے چاری کی 'مکتی' کیسے ہوگی؟ اس کی جان تو اپنے شوہر کو ہی ڈھونڈتی بھٹک رہی ہوگی۔۔۔" دیوان جی جذباتی ہو گئے۔

راجہ بابو ان کی بات سن پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ پریشان وکیل صاحب بھی تھے۔

دیوان جی بولے "ان کا کام تو اپنے ہی گھر ہونا چاہیے تھا۔ اب تو وہی ان کا گھر تھا۔ ان کا کچھ سامان تو دے دیجئے ـــــ اسی کو رکھ کر کام نمٹا دیں۔"

"نہیں، نہیں، اس گھر اور اس گھر میں کیا فرق ہے؟" وہ ایک ہی سانس میں بول گئے۔

مجھے اپنی حالت کچھ کچھ ایسی لگ رہی تھی جیسے آسمان میں گاتے ہوئے اڑ رہے پنچھی کا ایک پنکھ کٹ کر گر گیا ہو اور وہ بھی اڑتا اڑتا زمین پر آ گرا ہو اور پنکھ پھیلائے لنگڑاتا اپنا کٹا پنکھ کھوج رہا ہو۔

دیوان جی نے پھر کہا "چاہے اور کچھ نہ دیں، اس کے چند کپڑے تو دے دیجئے جس سے 'پاتک' نوارن' اور 'مکتی یگیہ' کرا لیں۔ ہم تو انجانے ہی 'پاتک' بھوگ رہے ہیں ـــــ ایسے میں دیو پوجا ممنوع ہوتی ہے۔"

وکیل صاحب بولے "آپ لوگوں نے دیا ہی کیا جو مانگ رہے ہو اوپر سے میری

بیٹی کو ٹکھیاڈے کرمارڈالا۔ میری بیٹی سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔"

میں پل پل نڈھال ہوتا جارہا تھا۔ دیوان جی بی مورچہ سنبھالے تھے۔ انھوں نے ڈھنگ آواز میں کہا "وکیل صاحب، آپ یہ ٹھیک نہیں کررہے ہیں۔ ہمارا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا۔ بگڑے گا آپ کا۔ ہم ہندو ہیں —— موت کے بعد کی زندگی کی، اس زندگی سے زیادہ چنتا کرتے ہیں۔ آپ نے تو اپنی بچی کی یہ زندگی خراب کردی اور اپنی اس زندگی کو بگاڑنے پر آمادہ ہیں۔ ہم پر تو جو ہوگا، اپنی بہو کی مکتی کے لیے کریں گے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ وہ آپ کو بھی معاف نہیں کرے گی۔"

میں کرسی پر نڈھال بیٹھا تھا۔ دیوان جی مجھے سہارا دے کر باہر لے آئے "چلو بھیا، ان لوگوں کی نیت صاف نظر نہیں آتی جو ہوگیا سو ہوگیا —— صبر کرنا پڑے گا۔ بہورانی ہمیں چھوڑ گئیں —— یہی لکھا تھا۔

ہم وہاں سے دھیرے دھیرے اسٹیشن آگئے تھے۔ تب ایسے اسٹیشنوں سے ایک آدھ گاڑی گزر جائے تو گزر جائے سناٹا ہی رہتا تھا۔ مجھے کھانسی کی وجہ سے رویانی ملتی ہوں، ہاتھ اور بے پناہ اٹھتی کھانسی کو دبا کر کھانسنے کی جدوجہد سامنے نظر آرہی تھی۔ بار بار امنگ سی اٹھتی تھی کہ میں پاگل ہاتھی کی طرح اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادوں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میں ہاتھی نہیں ہوں۔ پھر سانپ اور سانپن کے سنے ہوئے قصے یاد آنے لگتے تھے۔ نر سانپ کو مارنے پر اس کی مادہ سات سمندر پار جاکر بدلہ لیتی ہے کیا سانپن کے مارے جانے پر سانپ بھی کچھ کرتا ہے یا وہ نامرد کی طرح نالی میں سرک جاتا ہے۔ سوال راکھ میں دبے اپلے کی طرح دھواں رہے تھے۔ یہاں راکھ ڈالی تو وہاں سے، وہاں ڈالو تو کہیں اور سے سوالوں کا دھواں پھوٹ نکلتا تھا۔

گاڑی آنے میں دیر تھی۔ ان دنوں سفر میں کھانا پینا اندھب ہو جانا سمجھا جاتا تھا۔ چند ایک ہندو کھالیتے تھے وہ ملیچھ مانے جاتے تھے۔ پانی تک میسر نہیں ہوتا تھا۔ اسٹیشن پر تو دو پانی ہوتے تھے۔ ایک مسلم پانی دوسرا ہندو پانی۔ ہندو پانی سے پینے میں بھی لوگوں کو اعتراض ہوتا تھا۔ ہندوؤں میں تو بہت سے ہندو تھے۔ کب کون سا ہندو اسے چھودے —— پتہ نہیں

چلتا تھا۔ وہ دیہہ کو بھلے ہی کھائی پھاڑتی ہو، ہندوؤں کو پھاڑنے کے لیے تب پانی ہی کافی تھا۔

ہم لوگ بھوکے تھے اور پیاسے بھی۔ سسرال میں پانی کو نہیں پوچھا گیا تھا ــــ کھانے کی امید کرنا تو بیکار ہی تھی۔ ہم لوگ سوکھے گلے اور سوکھے منہ چھاؤں تلاش کر کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس بات کو سوچوں اور کس کو نہیں۔ بیچ بیچ میں دیوان جی سمجھانے والی باتیں بول کر مرہم لگا رہے تھے۔ لیکن ان کی باتیں مجھے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ سنائی دے رہی تھیں تو اندر نہیں اتر رہی تھیں۔ میرے سامنے روپا ہی تھی۔ روپا کا ہی ہیولہ جو میں نے اس رات دیکھا تھا۔ بیچ بیچ میں اگر کوئی لفظ میرے اندر داخل ہو جاتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پُر سکون ماحول میں تار کو ٹن سے ٹھنا دیا ہو۔

یکا یک دیوان جی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ادھر دیکھا۔ راجہ بابو تھا اور اس کے ساتھ کوئی خاتون تھیں۔ اس خاتون نے یکا یک میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا تو راجہ بابو نے کہا "یہ میری ماں ہیں۔"

میرا دل تلخی سے لبریز ہو گیا۔ میں بولا "کیا بات ہے؟ یہاں کیوں آئی ہیں؟ اب مجھ سے ان کا کیا واسطہ؟"

وہ بولیں "ایسا مت کہیے کنور جی، بیٹی تو چلی گئی، کیا آپ کو بھی کھودیں؟ بیٹی کے جانے سے ان کا تو دماغ خراب ہی گیا؟ آپ ہمیں نرک میں نہ ڈھکیلئے۔" میں نے ان سے کہا "ایک ناٹک میں آپ کے گھر پر دیکھ چکا ہوں دوسرا ناٹک آپ یہاں دکھا رہی ہیں؟"

دیوان جی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس مصیبت کو کیسے ٹالیں۔ عورتوں کے سامنے آجانے پر پرانے لوگ حواس باختہ ہو جاتے ہیں جیسے کسی نے اکنے پر ترپ چلا دی ہو۔ انھوں نے اپنی ٹوپی اتار کر گنجے سر سے پسینہ پونچھا۔ راجہ بابو سے کہا "آپ بہو جی کو گھر لے جائیے۔ یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان سے کہیے کہ ہم وہاں جا کر جیسے بنے گا، بہورانی کا کریا کرم کریں گے ــــ آپ کے لیے نہیں اپنے لیے۔" دھیرے دھیرے وہ بولنے لگے "بہو جی تو بہورانی کی ماں تھیں، انھیں تو ہم لوگوں کی خبر بھجوانی چاہیے تھی ــــ داماد اور بیٹے میں کیا کوئی فرق ہوتا ہے؟ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ اچانک چھوٹی بہورانی کو کیا ہو گیا؟

دوا چانک کیسے چلی گئیں۔ بڑے راجہ تو دشر تھ کی طرح ہیں ـــــ اگر انھیں ولایت تک جانا پڑتا تو جاتے۔ علاج کراتے۔ آپ نہیں جانتیں راجاؤں کو بہو کا کتنا چاؤ تھا۔ کتنے عرصے بعد ان کی ڈیوڑھی پر بہو کے پاؤں پڑے تھے۔"

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں دیوان جی کی بات سن کر رو پڑا۔

راجہ بابو کی ماں بولیں "بیٹا، تم مت روؤ! غلطی ہماری تھی۔ دیا کو تپ دق تھی ـــــ ہم نے سوچا شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کسی کو اپنے آپ کو چھونے تک نہیں دیتی تھی۔ اگر اس کے بابو اس کی بات مان جاتے تو شاید کچھ دن اور رہ جاتی۔ وہ مرتی مر گئی لیکن اس نے آپ لوگوں کی تعریف کرنا نہیں چھوڑا۔ وہ یہی کہتی تھی ـــــ وہ مجھے چھونا چاہتے تھے ـــــ پیار کرنا چاہتے تھے ـــــ میں نے انھیں روک دیا۔ انھیں بلوا دو ـــــ میں ان کے چرن چھو کر معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ لیکن میں کیا کرتی ـــــ جیسے وہ مجبور تھی ویسے میں بھی مجبور تھی۔"

وشوناتھ یعنی میرا سالا ایک گناہ گار کی طرح کھڑا تھا۔ گردن نیچی تھی تو آخر تک جھکی رہی۔ اس کی ماں بولی "آپ ایک بار گھر چلیے اس کی آتما آپ ہی کے لیے بھٹک رہی ہوگی۔"

میری حالت دیکھ کر دیوان جی بولے "دیکھیے بھو جی، آپ بے فکر رہیے ـــــ وہ آپ کی ہی بیٹی نہیں تھی، ہمارے گھر کی لکشمی بھی تھی۔ گھر جا کر ہم سب کچھ کریں گے ـــــ لیکن اب ہمارا لوٹ کر جانا مشکل ہے۔ وکیل صاحب نے جس طرح کا برتاؤ کیا ہے، اس کے بعد واپس جانے کو کچھ نہیں بچا۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ آپ کی بیٹی جائے گی ـــــ لیکن ہم کو دیکھیے ہم تو رام اور سیتا کی جنم جنمانتر تک جینے والی جوڑی لے کر گئے تھے ـــــ ہماری لکشمی نے تو پاؤں رکھا اور روٹھ گئی۔ گھر کھلتا کھلتا بند ہو گیا۔۔۔" پھر رک کر بولے "ہم نے سوچا تھا بہو رانی کے کپڑے یا کوئی سامان مل جائے گا تو اس کو رکھ کر کریا کرم کر دیں گے ـــــ وکیل صاحب نے یہ بھی نہیں دیا ہم نے تو اپنی بہو کو راج رجواڑوں کی طرح اوپر سے نیچے تک لاد کر بھیجا تھا۔"

راجہ بولا "میں بابو جی سے کہہ کر ـــــ ہو سکا تو سامان پہنچا دوں گا۔"

میں اتنی دیر کے بعد پہلی بار بولا "تم مت بولو، تم جب لینے گئے تھے اگر تب ہی بات بتا دیتے تو کیا ہم علاج نہ کراتے۔ اب ماتا جی کو لے کر جائیے۔ اس کی فکر چھوڑ دیجیے۔"

میں نے اس کی ماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسے چل پا رہی تھیں۔

بڑے رائے نے سنا تو بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ دھیرے سے بڑبڑائے "اے بھگوان! اس ڈیوڑھی پر کس کی بددعا ہے! کیا یہ ڈیوڑھی کبھی نہیں بھرے گی؟ ہم نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟"

ایسا لگا کہ حویلی کی جھمچاتی روشنیاں ایک دم گل ہو گئیں۔ سب ایک ایسے اندھیرے میں ڈوب گئے تھے جس کی کوئی حد نہیں تھی اور نہ روشنیوں کی پھر سے لوٹنے کی امید ہی تھی۔ نوکر چاکر سب اس طرح دبے پاؤں چل رہے تھے جیسے گھر میں میت رکھی ہو۔ اس کے چاروں طرف سناٹے کی بھاری بھاری چٹانیں نمودار ہو گئی ہوں۔ ذرا سی آواز بھی ان کو بڑھانے کے لیے کافی تھی۔ رحمت اللہ سویرے ہی آجاتا تھا۔ وہاں پر بچھی دریوں پر ایک کونے میں بیٹھا روتا رہتا تھا۔ لوگ دن بھر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس نے اس درمیان بس ایک دن دوکان کھولی تھی۔ صرف اس دن جب روپا کا آٹے کا پتلا بنا کر اس کا کفن سیا گیا تھا۔ اس نے خود ضد کی تھی کہ جب ڈولی سجانے میں تھا تو کفن سینے میں بھی رہوں گا۔ اس کی بات سن کر لوگ دم بخود رہ گئے تھے۔ ڈولی کا پردہ اس نے سیا تھا اور گھر والی نے اس پر کڑھائی کی تھی۔ یہ بات سب کو یاد تھی۔

گھوڑے بھی شام کو کھانا کھانے آتے تھے تو دبے پاؤں۔ گردن جھکا کر چپ چاپ کھڑے ہو جاتے تھے۔ توبرا چڑھ جاتا تھا۔ گردن کے ساتھ ساتھ توبرا ہلتا رہتا تھا اور وہ کھاتے رہتے تھے۔ توبرے سے نکلی ہوئی آنکھیں کبھی کبھی ایسی لگتی تھیں جیسے پہچان رہی ہوں کہ یہ کیا ہے؟ بڑے رائے اندر تک سل کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چھوٹے رائے دیکھ رہے تھے، کر رہے تھے اور چپ تھے۔ میں 'کریا' میں بیٹھا تھا، کبھی کبھی لگتا تھا ___ کس کے لیے؟ جسے میں نے چھوا اور نہ دیکھا۔ رانی اور ارن میں نئی بھابی کو جو شوق اور چاہت جاگی تھی وہ جھاگ دار ابال والی خالی پتیلی کی طرح ایک کونے میں لڑھکا پڑا تھا۔

چاچی کو روز دوپہر کے بعد پلہ لینے بیٹھنا پڑتا تھا۔ عورتیں آتی تھیں۔ روتی

تھیں۔ پھر ان سے جرح کرتی تھیں۔ ارے ابھی تو بیاہ کے آئی تھی، ابھی چلی بھی گئی؟ کیا ہو گیا تھا؟ چاچی کیا کہتیں کہ کیا ہو گیا تھا۔ ایسی بات تھی تو بیاہ ہی کیوں کیا؟ رایوں کے بیٹے کو لڑکیوں کی کمی تھوڑے ہی تھی؟

سنا بہت دیا گیا تھا۔ چاچی پھر چپ۔ یہ کہہ دیتیں جو رام نے چاہا وہ ہوا۔ ہم کون کرنے والے اور ہم کون نہ کرنے والے۔ وہ ہاں میں ہاں ملاتیں۔ پھر شروع ہو جاتیں۔

کچھ اور بات تو نہیں تھی؟ کہتیں کچھ اور ہو۔۔۔؟ چاچی سمجھتی تو تھیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ وہ یہ ہی کہتیں بات کیا ہوئی تھی —— بس آئی اور لے گئی! اتنا ہی ساتھ تھا اور کیا کہا جائے!

منجھلی چاچی اور چاچا بس دو بار آئے تھے۔ باہری لوگوں کی طرح بیٹھ کر چلے گئے۔ بڑے رانے لوگوں کے بیچ ایسے بیٹھے رہتے تھے جیسے نمائش میں رکھے گئے کوئی بت ہوں۔ کوئی آیا تو گردن جھکا کر سلام لے لیا، گیا تو ہاتھ جوڑ دیے۔ لوگوں کی باتیں سوتی دارے بیچ بیچ ان تک پہنچتی تھیں اور بکھر جاتی تھیں۔ بہت ہوا تو ایک جملہ کہہ دیتے —— میرے گناہوں کی سزا ہے۔

جب کبھی اکیلے میں ہوتا تو ارن رانی سے بہت جھک مارتا اس سے پوچھتا "کیا بھابی مر گئی؟"

رانی اس کا دھیان پلٹنے کے لیے کہتی "نہیں روٹھ گئی۔"

"کیا روٹھ جانے پر مر جاتے ہیں؟"

"ہاں وہ ٹالنے کے انداز میں کہتی۔

"منجھلی چاچی بھی تو روٹھی ہیں!"

رانی بھی چھوٹی ہی تھی۔ الٹی بات کو سلجھانا کبھی نہیں آیا تھا وہ اپنی بات میں ہی پھنس جاتی تھی۔ بات سلجھانے کی غرض سے اس نے کہا "منجھلے چاچا سنیں گے تو ناراض ہو جائیں گے۔"

رانی نے اس کا منہ ہاتھ سے دبا لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ پھر بولی "گھر والوں کے بارے میں کہیں ایسا کہتے ہیں۔"

"تم نے بھی تو نئی بھابی کے لیے کہا تھا۔ بھابی مر گئی۔"
رانی رونے لگی۔ ارن یہ سمجھے بغیر کہ غلطی کہاں ہے، اسے منانے لگا۔

تیرھویں کے بعد رائے اپنے آپ ہی بولے "اس ڈیوڑھی کو کہیں منجھلی بہو کا 'شاپ' تو نہیں لگ گیا؟"
چھوٹے رائے کو پتہ نہیں کیا ہوا، وہ تپاک سے بولے "منجھلی بہو کو کیوں کہتے ہیں 'شاپ' تو اس حویلی کی کسی بھی عورت کا لگ سکتا ہے۔ ہم نے انھیں سمجھا ہی کیا ہے۔۔۔؟" وہ آگے کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ بڑے رائے دوسری طرف دیکھنے لگے۔

سب کچھ نمٹ جانے کے بعد بڑے رائے وکیل صاحب کی ڈیوڑھی پر خود گئے۔ پہلی بار لوگوں نے جانا کہ ان کے بال سفید ہیں۔ اس واقعہ کے بعد انھوں نے خضاب لگانا چھوڑ دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جب بڑے رائے پہنچے تو وکیل صاحب گھر پر ہی تھے۔ بیٹے نے جھوٹ کہہ دیا کہ باہر گئے ہیں، وہیں آکر چپ چاپ بیٹھ گیا تھا جیسے ندامت میں انسان کے چہرے کی چمک کم ہوتی جاتی ہے، اسی طرح گھر بھی بجھ سا گیا تھا۔ راجہ بابو چپ چاپ بیٹھا تھا۔ وکیلن نے اندر سے ناشتہ پانی بھیجا تو بڑے رائے نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ روپا کا جو سامان جہیز میں گیا تھا بڑے رائے ساتھ لائے تھے۔
اس بات سے وکیلن کہیں نہ کہیں مجروح ہوئی تھیں۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر بولیں "آپ بڑے آدمی ہیں ـــــ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ ہماری تو بیٹی تھی ہی، آپ نے تو اسے اپنی بیٹی سے زیادہ عزت دی تھی۔۔۔" رک کر بولیں "آپ کی چڑھائی ہوئی چیزیں بھی تھیں۔۔۔ ان کا بابو جی کو ہی پتہ ہے!" "آپ نے غلط سمجھا۔ میں واپس مانگنے نہیں آیا ہوں، لوٹانے آیا ہوں۔ ہم انھیں رکھ کر کیا کرتے جب وہ ہماری نہیں بن سکیں۔ بیٹی گئی تھی، بیٹی ہی واپس لوٹ آئی۔ ہم تو شاید دیکھنے کے گنہگار بھی نہ تھے۔ اسی لیے یہ بیٹی کا دھن ہے یہ آپ کا حق ہے۔" پھر رک کر بولے "وکیل صاحب

آتیں تو کہیے جیسے ایک بار ہو جانے پر ہندو شادی نہیں ٹوٹتی، ایسے ہی ہمارے یہاں رشتے داریاں نہیں ٹوٹتیں۔ اسے بنائے رکھیں۔ انھوں نے ہمارے ساتھ ہی زیادتی نہیں کی، اپنی بچی کے ساتھ بھی کی ہے۔ کہہ نہیں سکتے، اس کی آتما انھیں معاف کر سکے گی یا نہیں۔ ہم نے تو صبر کر لیا۔"

بڑے رائے اٹھنے لگے تو ناشتہ کی تھالی چھن سے زمین پر گری سامان بکھر گیا۔ تھالی تھوڑی دیر جھنجھناتی رہی۔ اس کے گرنے کی آواز سے سارا گھر دھک سے رہ گیا۔ بڑے رائے جھکے اور تھالی اٹھا کر میز پر رکھ دی۔

پورے کا پورا گھر ایک شکستہ کشتی پر سوار تھا۔ وہ بار بار ڈگمگاتی تھی اور سنبھل جاتی تھی۔ کئی بار لگتا تھا کہ اسے ڈوبنا تو ہے ہی ڈوب جائے تو اچھا لیکن کشتی چاہے کتنی بھی شکستہ کیوں نہ ہو، ڈوبتے ڈوبتے بھی وقت لگتا ہے۔ شاید یہی ہمارے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ ہماری ناؤ پر کئی طرح کے وزن تھے۔ کچھ ہمارا اپنا تھا جو بلاوجہ اکٹھا کر لیا تھا۔ سیاسی حالات بھی دن بہ دن بدلتے جا رہے تھے۔ سیاست ترازو کے جس پلڑے میں بیٹھ جاتی ہے وہی جھک جاتا ہے اور دوسرا پلڑا ہلکا ہوتے ہوتے اتنا اوپر اٹھ جاتا ہے کہ خلا سے زیادہ کچھ نہیں بچتا۔ سیاست کے جس پلڑے میں ہم تھے وہ چند ایک لوگوں کی جانب دارانہ سیاست تھی۔ جو سیاست بن رہی تھی اس میں ملک بھر کے لوگ مالا کی طرح گندھتے جا رہے تھے۔ حالانکہ ہم جیسے لوگ ابھی سے مانتے تھے کہ طاقت حکومت میں ہوتی ہے۔ سیاست حکومت چلاتی ہے۔ وہ حکومت ہمارے ساتھ ہے لیکن کبھی کبھی اپنی سوچ میں شک کی لہریں اٹھنے لگتی تھیں تو سب کچھ گڈمڈ ہونے لگتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ باڑھ کی طرح امنڈتی سیاست کو نگل جائیں؟ چونکہ پہلے کی کوئی ایسی مثال نہ تھی، ہمیشہ حکومت نے حکومت کو نگلا تھا اس لیے سوچ پھر اپنی جگہ قائم ہوتی نظر آنے لگتی تھی۔

چھوٹے رائے گھنٹوں اخبار لیے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی کہتے بھی تھے کہ ملک ایک گھوڑے کی طرح غیر ملکیوں کی رسیوں سے جکڑا پڑا ہے لیکن یہ 'سفید' نہیں جسے لوگ گولیاں چلا کر جان سے مار ڈالیں گے۔ پھر کہتے ـــــ میں ہی کون آزاد ہوں۔ میں نے اپنے

لیے اعزا و اقارب کی زنجیریں قبول کی ہوئی ہیں۔ لیکن میرا بندھن کیا بندھن ہے؟ بندھن تو بھارت ماتا کا ہے۔ جب وہ ٹوٹے گا تو سب آزاد ہو جائیں گے لیکن ہم لوگ تب بھی اپنے باندھے بندھنوں میں بندھے رہیں گے۔ تب میں اپنے آپ سے پوچھوں گا کہ میں نے جانتے ہوئے بھی ایسا کیوں ہونے دیا؟ کیا میں اپنے بارے میں بھی ایک تاناشاہ کی طرح برتاؤ نہیں کر رہا تھا؟ تاناشاہ ملک کے لیے ہی نہیں ہوتے، انسانوں میں ان کے اپنے لیے بھی تاناشہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی بغاوت کو ایک تاناشاہ کی طرح دبایا ہے۔ اگر کنکری آنکھوں میں گر جاتی ہے تو جب تک موجود رہتی ہے آنکھوں کو کھلنے نہیں دیتی۔ ایسے جکڑے رہتی ہے جیسے اسی کا تسلط ہو ہم لوگ ملک کی آنکھوں میں اسی کرکری کی طرح ہیں۔ تاناشاہی اور جاگیرداری کی مرادوں سے جھڑ کر اڑنے والی چھیلن کی طرح۔

ان کی حالت ٹھیک اس جانور کی طرح تھی جس کے پیر میں رسی باندھ کر چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔ چرنے کو خواہ کتنا چرلے لیکن بندھے رہنا کھونٹے سے ہی پڑے گا۔ انھوں نے اس رسی کو ایک بار جھٹک کر توڑنے کی کوشش کی تھی جھٹکا بھی پھر اپنے آپ باندھ ہی لیا۔ اب وہ اسے مقدر مان بیٹھے تھے۔ ایک دن چھوٹے رائے نے مجھے بلا کر کہا "بھاسکر، میں یہ جانتا ہوں کہ میں تمھارا فقط چاچا ہوں، باپ نہیں۔ تم پر میرا اتنا ہی اختیار ہے جتنا ایک چاچا کا ہو سکتا ہے۔ چاچا کا اختیار باپ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باپ چاہے تو اسے واپس بھی لے سکتا ہے۔ منجھلے رائے کا تم لوگوں پر کوئی اختیار نہیں اور نہ تمھارا شاید ان پر۔ کچھ انھوں نے اسے کھویا اور کچھ ان سے واپس لے لیا گیا۔ میں تم سے یہ ہی کہنا چاہتا ہوں کہ تم اپنا مستقبل طے کرو۔ تمھیں اس اتنی بڑی زمینداری کو سنبھالنا ہے۔۔۔" ان کی نظر کہیں دور تھی۔ وہ پھر بولے "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے اور ملک آزاد ہو جائے۔ لوگ کہیں، کیا کرو گے اتنی جائیداد کا؟ اتنا ہی رکھو جتنا چاہیے، باقی چھوڑ دو۔ یہ کون مانے گا کہ جتنا ہے اتنا ہی کم پڑتا ہے۔ جنھیں بتانا ہو گا، وہ سب بکھڑ ہوں گے، سمجھ نہیں پائیں گے۔ سمجھنے اور نہ سمجھنے کا رشتہ ہی الجھنوں بھرا ہوتا ہے۔ پھر تمھیں اس گھر کو سنبھالنا ہے۔ ارن ابھی چھوٹا ہے۔ وہ دن کب آئے گا، یہ ابھی کہا نہیں جا سکتا۔ تم دوسری شادی کر لو۔ ہم دو بھائی تو لاولد ہیں ہی۔ تمھاری یہ شاخ تو پھلے پھولے۔ تم دونوں بھائیوں کو ہم لاولدوں کو بھی دیکھنا پڑ سکتا ہے۔"

چھوٹے راجہ کے بولنے کے دوران مجھے لگ رہا تھا کہ وہ کہیں بہت دور سے بول رہے ہیں۔ ان کی آواز آرہی تھی۔ وہ یہاں نہ ہو کر وہیں تھے جہاں سے بول رہے تھے کہیں بہت اندر۔ آدمی کئی بار اندر ہی اندر روتا رہتا ہے۔ باہر کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کبھی وہ باہر ہی رہتا ہے اندر اتر نہیں پاتا۔ یہاں وہ اندر تھے اور باہر سنائی دے رہے تھے۔ میں نے یہ ہی کہا "آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ بھگوان نے چاہا تو..." وہ ہنس دیے۔ میری بات ان تک پہنچ گئی تھی۔ وہ بولے "میں بچہ نہیں ہوں!" پھر سنبھل کر کہا "ایسا نہیں کہ ہمارے یہاں بچے نہیں ہوئے۔ ہوئے... پر ہونا یا نہ ہونا برابر ہو گیا۔ جب پہلا بچہ ہوا تو تیری چاچی اسے دودھ نہیں پلا سکی۔ وہ دودھ میں منہ لگاتا تھا اور پستان سے خون آنے لگتا تھا ___ لوگوں نے کہا کہ وہ بھوت ہے ___ میں نے سب کو بہت ڈانٹا ___ ہمارے بچے کہیں بھوت ہوتے ہیں۔ ایک آیا رکھی۔ اس کا دودھ اسے ہضم نہیں ہوا۔ دو مہینے بعد وہ مر گیا۔ لوگوں نے کہا ___ آیا پوتنی تھی۔ میں نے پھر کہا کہ دودھ پلانے والی ماں ہوتی ہے ___ میری ماں مختا تیری چاچی رو رو کر پاگل ہو گئی۔ اسے یہ ندامت تھی کہ وہ اپنے بچے کی قاتل ہے۔ میں نے اسے بھی سمجھایا کہ جنم دینے والی کیا کبھی قاتل ہو سکتی ہے۔ کسی طرح وہ سنبھلی۔ میں چاہتا تھا کہ اسے ایک بچہ ہو جائے تو اس کا دھیان بچے کی طرف ہو جائے گا۔ ایک لڑکی ہوئی ___ اس کے لیے ایک بکری پالی گئی۔ تمھاری چاچی اسے اپنا دودھ پلانے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوئی۔ اس کی چھاتی دودھ سے بھری رہتی تھی ___ وہ روتی تھی لیکن پلاتی نہیں تھی۔ کہتی تھی ___ میرا یہ دودھ پوتنا کا دودھ ہے بچی کا پیٹ نہیں بھرتا تھا ___ بالآخر وہ بھی چل بسی۔ پھر ہم دونوں نے صبر کر لیا۔ یہ ہی سوچا ___ چھوڑ بچے کا موہ سارا جگ ہمارا بچہ ہے اور ہم جگ بھر کے بچے ہیں لیکن ہم سب ایسا کہتے ہیں، کر نہیں پاتے۔ اب بھی ہمارے لیے کچھ ہی بچے ہیں۔ جیسے تم، درانی، اور ارن...! اس لیے میں نہیں چاہتا کہ ہماری طرح بعد میں تمھاری بھی کرنی اور بھرنی میں فرق ہو۔ کرنی بھرنی کے فرق کا احساس آدمی کو کھاتا ہے!"
"لیکن..."

"تمھاری بات ٹھیک ہے جیسے کاجل کی کوٹھری سے نکلتے ہوئے کالک لگ جاتی ہے اسی طرح تمھارے ماتھے پر رنڈوا ہونے کی لکیر کھنچ گئی ہے... تم اس کے لیے قطعی ذمہ دار نہیں۔"

چھوٹے رائے مجھے مکمل طور پر ایک الگ قسم کے شخص لگے۔ مجھے لگا کہ انھوں نے اپنے دکھ کو اپنے سے الگ کر دیا تھا۔ یا پھر وہ اس کا استعمال دوسروں کی معلومات کے لیے کر رہے تھے۔

اس دوران ایک دن بڑے رائے کے قریبی دوست ان سے ملنے آئے جب وہ بغیر اطلاع کے آتے تھے تو سب ڈر جاتے تھے کہ یقیناً کوئی دھماکہ خیز خبر لائے ہیں۔ وہ ان سے عمر میں بڑے تھے۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، پھر بولے "بری رائے، تمھیں معلوم ہے؟"

"کیا؟"

"تمھارے لاولد بھائی کرشن رائے اب والد ہو گئے ہیں۔"

بڑے رائے چونکے اور ہنس کر بولے "رامیشور بابو، جب تک بات میں چمتکار پیدا نہ کرو اس وقت تک تمھارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ میرا تو کوئی بھی بھائی لاولد نہیں۔"

"یہی تو تمھارا بڑپّن ہے اور خام خیالی بھی۔ لیکن کرشن رائے نے ایک لاوارث بچے کو گود لے لیا ہے۔ اسے تم کرامت سمجھو یا سچائی ـــــ یہ تم جانو۔"

بڑے رائے کے چہرے پر ایک سیاہ ہوتا سایہ ابھر آیا۔ انھوں نے جملہ دوہرایا "کرشن نے لاوارث بچے کو گود لے لیا" پھر بولے "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"مجھے تو تمھاری طبیعت کی فکر ہے۔ کل رات ہسپتال کے پیچھے ایک لاوارث بچہ پڑا ملا تھا۔ شاید کسی کی بد چلنی کی نشانی ہو۔ اسے کوتوالی میں داخل کر دیا گیا۔ اسی بچے کو آج کلکٹر صاحب نے کرشن رائے کو سونپ دیا۔ عوضاً اس نے ایک اقرار نامہ بھرا ہے کہ وہ دونوں ـــ اس کی پرورش کریں گے اور اگر کسی وقت ان کا من اس سے پھر اتب بھی وہ بچہ جائیداد کے فلاں فلاں حصے کا مالک ہوگا۔ کلکٹر صاحب نے اسے اس مقدس کام کے لیے مبارک باد دی اور کہا ـــــ تم نے انسانیت کے لیے ایک ذمہ داری نباہ کر ایک عجیب و غریب مثال قائم کی ہے۔"

بڑے رائے خاموش تھے۔ رامیشور بابو ہنستے جا رہے تھے اور اپنی بات کہتے جا رہے تھے "ویسے تو مہاتما گاندھی بھی ذات پات کو نہیں مانتے۔ لیکن انھوں نے کسی ایسے بچے کو

نہیں پایا ـــــ علاوہ اس بچارے ـــــ خود اپنے ہی مر'' یہ۔۔۔ حالانکہ اس معاملے میں
حکومت برطانیہ اور وہ ہم خیال ہیں۔ اب رایوں کا خاندان بھی ان کی برابری پر آ گیا۔ پھر بھی
جیسے کہا ہے کہ کرشن کا رائے پسر ہی۔'' چھوٹے رائے چپ رہتے۔ وہ بولے ''رامیشور بھائی، بچہ
ہی گود لیا، کوئی عورت تو نہیں رکھ لی۔ ہر بچہ پیار کا مستحق ہوتا ہے۔ اسے پیار کرنا ہر ایک کا
فرض ہے۔ اگر بچوں میں کوئی رنگ نظر آتا ہے تو وہ ہماری نظروں کے فرق کی وجہ سے۔''

اس بات سے رامیشور بابو تھوڑا جھینپ گئے۔ وہ بولے ''نہیں، نہیں، میں کوئی برائی
تھوڑے ہی کر رہا ہوں'' یکایک آنکھوں میں چمک ابھر آئی ''تم بھی کیوں نہیں اٹھا لاتے؟''

بڑے رائے بیچ میں ہی بولے ''رامیشور بابو اول جلول بولے جا رہے ہیں؟''
رامیشور بابو کی زبان پر زہر چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ہنس کر بولے ''میں نے اول جلول کیا کہا؟ بتاؤ۔
یہی تو کہا کہ اپنے بھائی کی روایت کو بڑھاؤ۔ دام سے ملے تو دام سے لے لو۔۔۔ جیسے بھی ہو
بچے مہیا کرو لیکن والد بنو۔ پیدا کرنے کی علت سے بچو۔ ہو سکتا ہے تھوڑے دنوں میں ڈال کی
جگہ پال کے بچے ملنے شروع ہو جائیں۔''

چھوٹے رائے بری طرح زخمی ہوئے۔ صبر سے بولے ''بجا فرماتے ہیں آپ۔
میں بھی کر لیتا۔ نہ تو مجھ میں اتنی ہمت ہے جتنی منجھلے بھائی میں اور نہ اتنا بڑا دل۔۔۔ میں سوچتا
ہوں لیکن کہہ نہیں پاتا۔ پتہ نہیں منجھلے بھائی سوچتے ہیں یا نہیں۔۔۔ لیکن کر گزرتے ہیں۔
لیکن میں اس کے لیے دکھی نہیں۔ کیونکہ میں نے اپنا دکھ سکھ بڑے بھائی کے دکھ سکھ سے
جوڑ لیا ہے۔ منجھلے بھائی نے اسے پاس ہی رکھا۔ اپنے دکھ سکھ کو اپنے پاس رکھنا کسی حد انسان کو
آزاد تو کرتا ہی ہے۔ اب میرے بچے بھی ہیں۔'' آخری لفظ انھوں نے ایک لمبی سانس لے کر
کہا

چھوٹے رائے ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر چلے گئے۔ بڑے رائے نے انھیں
جاتے ہوئے دیکھا لیکن چپ رہے۔ وہ رامیشور بابو سے بولے ''تم نے یہ کہہ کر ٹھیک نہیں
کیا۔''

''دیکھو بڑی رائے، ہم پرانی روایت کے آدمی ہیں، اگر یہ نئی روشنی میں نہائے
ہوئے ہیں تو ہماری طرف اسی میں شب و روز غسل کرتے رہیں لیکن ہمارے منہ نہ لگیں۔
ہمارے لیے اپنا اندھیرا ہی روشنی ہے۔ کرشن رائے تمھارا بھائی ہے تو کیا ہم اپنی آنکھیں بند

کرلیں۔ جو ہمارے خاندان آج تک بے داغ رہا ـــــ اب کیا اسی خاندان کا چراغ یہ پاپ سے پیدا بچہ روشن کرے گا ـــــ اگر کرے گا تو کرے۔"

"پوری بات کا پتہ تو لگنے دو۔"

"پتہ لگنے کو رہ ہی کیا گیا؟ اقرار نامے پر کلکٹر صاحب کے کہنے پر میں نے گواہی کی ہے۔"

بڑے رائے چپ ہو گئے۔ دیئے جلنے کا وقت ہو گیا تھا۔

اس دن کے واقعہ سے چھوٹے رائے کئی دن تک اندر ہی اندر کشاکش میں مبتلا رہے۔ انھوں نے چھوٹی چاچی کو پوری بات نہیں بتائی تھی۔ بس اتنا ہی بتایا تھا کہ منجھلے رائے نے کسی لاوارث بچے کو گود لے لیا وہ بولیں ـــ "کاش منجھلے جیٹھ جی یہ کام منجھلی جٹھانی کے سامنے ہی کر لیتے۔ وہ اس پاپ سے تو بچ گئی ہوتیں ـــ "لمبا سانس لے کر کہا" بچوں کے بغیر کوئی کیسے زندگی کاٹے!"

چھوٹے رائے نے چھوٹی چاچی کے چہرے کی طرف دیکھا اور گردن گھمالی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے "ٹھیک کہتی ہو ـــ منجھلے بھائی نے ٹھیک کیا۔ کہنے کو بچہ بھی ہو گیا اور ایک بے سہارا کو سہارا بھی مل گیا۔ سنا، کلکٹر صاحب نے بہت تعریف کی ـــ عیسائی ہے نا۔ ایسے بچوں کو دیکھ کر انھیں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا خیال آجاتا ہے!"

چھوٹی چاچی بولیں "ہم نے تو جنا بھی ـــ بھرا بھی اور کھو بھی دیا۔ ان ہوئے کا ملال نہیں ہوتا۔ ہوا جاتا رہے تو بہت درد ہوتا ہے۔ نہ بھولے بنے نہ یاد کیے۔ تم ایک دن جاکر اسے دیکھ آنا ـــ کچھ دے آنا۔ اب تو وہ تمھارے شجر خاندان پر اگی ہوئی ایک کونپل ہے۔"

چھوٹے رائے پہلے تو سوچتے رہے پھر بولے "بڑے بھیا کو شاید ٹھیک نہ لگے۔ وہ اس واقعہ سے بہت مجروح ہیں۔ ایک تو رامیشور بھائی کے کہنے کا ڈھنگ، دوسری طرف خاندان کی عزت کا سوال۔ یہ دونوں باتیں بڑے رائے کو اندر ہی اندر متھ رہی ہیں۔ منجھلے بھیا۔ پتہ نہیں کیوں، بڑے بھیا کی تال سے نہیں بیٹھ پاتی۔ انھیں منجھلے بھائی کے بارے میں

لیکن انسان کی اپنے بچوں سے آزاد ہونے کی بات نہیں تھی۔ بچے بھلے ہی باندھتے ہوں لیکن ان کے ہونے کا سکھ اس بندھن سے بہت بڑا ہے!"

چھوٹی چاچی، چاچا کی بات سے اندر تک کھا گل ہو گئی تھیں۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے دوسری طرف دیکھنے لگی تھیں۔ سارا کا سارا منظر کپکپاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں بھلے ہی دو چھوٹا تھا لیکن ایک چھوٹی موٹی ریاست کا ایک طرح سے ولی عہد تھا۔ لڑکا ہو اور اوپر سے امیر ـــ تو دو چھوٹا ہے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ رشتے آنے شروع ہو گئے تھے تب لڑکے لڑکی کی خواہش کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو اب بھی کم ہی رکھتی ہے۔ ہمارا زمانہ تو پھر بھی پینسٹھ ستر سال پرانا تھا جو لوگ رشتے لے کر آتے تھے، بڑے رائے ان سب کو چھوٹے رائے کے پاس بھیج دیتے تھے۔ چھوٹے رائے کشمکش و پیچ میں تھے وہ یہ معاملہ کیسے طے کریں۔ انھیں لگتا تھا کہ وہ اتنے خود مختار ہیں جتنا ایک باپ ہوتا ہے۔ کسی کی طرف سے ہاں یا نہ کہنا انھیں ہمیشہ دوسرے کے حق تلفی لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے ہر ایک کو اپنے فیصلے اپنے آپ ہی کرنے چاہئیں۔ ایسا نہ کرنا اپنی ذمہ داری سے بچنا تو ہوتا ہی ہے، جسے آپ یہ ذمہ داری سونپتے ہیں ـــ اسے اجازت نہیں بخشتے بلکہ اس کے لیے دھرم سنکٹ پیدا کرتے ہیں۔

ایک دن انھوں نے مجھے بلایا ـــ "دیکھو بھاسکر، میں بہت زیادہ عملی آدمی نہیں ہوں۔ بے سر و پا باتیں سوچا کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے کبھی اپنے یا کسی دوسرے کے دکھ سکھ کے بارے میں ذمہ دار بننا نہیں سیکھا، میں مانتا رہا کہ اس کی ذمہ داری آدمی کو خود اٹھانی چاہیے۔ حالانکہ انسان کا دکھ تب ہی وسیع ہوتا ہے جب دوسروں کا دکھ بھی اس میں آملتا ہے۔ یہی بات سکھ کی ہے۔ وہی سکھ بڑا ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کا سکھ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن میری یہ باتیں لوگوں کو ہوائی زیادہ لگتی ہیں۔ شادی کا تعلق تمھارے اپنے دکھ سکھ سے ہے اس میں دو افراد کے علاوہ تیسرے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ حالانکہ ان ہی دو افراد کو کوئی نہیں پوچھتا۔ فیصلہ باقی لوگ کرتے ہیں۔ بڑے بھائی اس معاملے کو نمٹانے کا فخر بھی مجھے دینا چاہتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ میں تمھاری حق تلفی کر رہا

ہوں۔"

ان کی بات اس وقت میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ میں چپ تھا۔ وہ کہتے جا رہے تھے "جو لوگ میرے پاس آتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں انھیں تمھارے پاس ہی بھیج دوں۔ لیکن شاید میں یہ کر پاؤں کا لیکن میں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ جب کوئی آئے تو میں تمھیں بلا کر بٹھاؤں ــــ تم ان باتوں کو جانو اور مجھے اپنی رائے دو۔"

میرے لیے یہ عجیب و غریب واقعہ تھا۔

لیکن چھوٹے راے ایسا ہی کرتے تھے۔ جب بھی کوئی ملنے آتا تھا، وہ مجھے بلا لیتے تھے۔ لڑکی اور خاندان کے بارے میں میری رائے پوچھتے تھے۔ مجھے سمجھاتے "اگر میں بڑے بھیا کا نمائندہ نہ ہوتا اور اپنے میں آزاد ہوتا تو بتا لڑکی اور لڑکے کو آپس میں بات کر کے طے کرنا چاہیے۔ منجھلے راے نے دوسری شادی خود کی۔ وہ ہم سے دو قدم آگے ہیں ـــ" رک کر بولے "ہم نے عورتوں کو پسند و ناپسند کا کوئی اختیار ہی نہیں دیا۔ شاید وہ اپنے اس حق کو پہچانتی بھی نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے منجھلی بھابی کی قربانی۔ میں انھیں بہت عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ لوگ انھیں کچھ بھی کہیں لیکن انھوں نے منجھلے بھائی کی تہمت کا مناسب جواب دیا۔ اگر وہ ویسے ہی مر جاتیں تو شاید میرے دل میں ان کی عزت نہ ہوتی۔ کئی بار گناہگار کو گناہگار ثابت کرنے کے لیے بے گناہ بننا پڑتا ہے۔"

جب بھی اس طرح کے ذکر آ جاتے تھے تو چھوٹے راے جذباتی ہو کر بہکنے لگتے تھے۔ اپنی منجھلی بھابی کا دکھ ان کے دل میں گہرا اترا ہوا تھا۔ وہ انھیں ایک ایسا بے قصور مجرم سمجھتے تھے جسے گناہگار قرار دے کر دوسرے کے گنا[illegible] کے لیے سولی پر چڑھا دیا گیا ہو۔ وہ اس کے لیے اپنے کو اور بڑے راے کو بے قصور مانتے تھے۔ وہ کبھی کبھی مجھ سے بھی ایک سیدھا سوال پوچھتے تھے "تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے ہو؟"

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اس کا جواب سوچنا بھی بے غیرتی کی بات مانی جاتی تھی۔ میں چپ ہو جاتا۔ وہ کہتے "شرماؤ نہیں، اس سوال پر گہرائی سے سوچو۔ ہمارے دھرم میں مانا جاتا ہے کہ باپ کے قرض (بیٹا پیدا کرنے سے ادا

ہو اولاد فرض) کی ادائیگی بچہ پیدا کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ وہ بھی لڑکا۔ یہ کام بنا اس سب کے بھی ہو سکتا ہے۔ مہابھارت اس کی مثال ہے۔ وقوع پذیر ہوئے بغیر ادب میں کچھ نہیں آتا۔ بھلے ہی اسے تخئیل مان کر انکار کر دیں۔ تم ہو گے وہ عیاشی تھی۔ کیا اب نہیں ہے؟ اتنی ذرا سی بات کے لیے یہ سب کیوں؟ منجھلی بھابی نے بھی تو وہی کیا۔ ہاں، شادی کا ایک ہی مطلب —— دو انسانوں کو اگر تحفظ چاہیے، قبولیت چاہیے —— جسمانی طور سے ہونے والے سکھوں میں برابر کی حصہ داری چاہیے تو شادی کریں، یہ ان سکھوں کا معاون عمل ہے۔ ہم دونوں اس کی مثال ہیں۔ تم اگر اس طرح سوچ سکو تو شادی کا کوئی مطلب ہوگا۔ ورنہ وہی ڈھاک کے تین پات۔"

ان کی یہ باتیں مجھے اول جلول زیادہ لگتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ چھوٹے رائے سوچتے بھی زیادہ ہیں اور بولتے بھی زیادہ ہیں، کیا ان کی بات کا کوئی مطلب ہے؟ دراصل وہ مجھے وقت سے آگے لگتے تھے۔ اس زمانے میں جب عورتیں صرف عورتیں ہوتی تھیں ان کے بارے میں اس طرح سوچنا عجیب لگتا تھا۔ اب تو یہ سب سوچنے کا رواج سا ہو گیا ہے! تب سوچ کی بھی حدیں کھینچی ہوئی تھیں۔

ایک دن چھوٹے رائے نے ایک صاحب کو میرے پاس بھیجا۔ میں زمینداری میں تھا جو صاحب آئے تھے وہ پنجاب کے تھے اور کچہری میں کام کرتے تھے۔ شاید کوئی اہلکار، جج کے پیشکار یا محافظ خانے میں منصرم۔ اب مجھے یاد نہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں اتنی چھوٹی حیثیت کے آدمی کے لیے ہمارے خاندان میں بیٹی کی شادی کرنے کی بات سوچنا ہمت کی بات تھی مجھے جھٹکا سا لگا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ دیکھو ہوں۔ ویسے بھی ایک قریبی رشتے دار کے توسط سے آئے تھے۔ ان کے چاچا پنجاب کے پرانے شاندار لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ وہ مجھے ان کے بارے میں دوہرا دوہرا کر بتا رہے تھے۔

جب وہ پہنچے تو میں سویرے کا ناشتہ کر کے زمینداری کی خیر خبر لینے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلنے ہی والا تھا۔ زمینداری میں پیسہ وصول کرنا ایک مشکل کام تھا۔ لوگ غریب تھے۔ ان کی کھیتی اکیلے ان کی کھیتی نہیں ہوتی تھی۔ اس میں بہت سے حصے دار

ہوتے تھے۔ زمیندار سے لے کر گاؤں کے چوکیدار تک۔ گزارہ مشکل سے چلتا تھا۔ قرضہ بھی لیتے تھے اور مار بھی کھاتے تھے۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد جب قریب قریب ویسے ہی دن ہم لوگوں پر بھی آئے تو ان کی تکلیف کا کچھ کچھ احساس ہوا۔ زمینداری کے پیچھے کی اتنی اولاد اور کھاؤ جاؤ نہ ہوتی تو شاید انھیں دوسرے لوگوں کے سمجھنے کا موقع ملا ہوتا۔ جاگیردارانہ نظام کے لوگوں کی سب سے بڑی حد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کے دائرے سے باہر نہیں دیکھ پاتے۔ انھیں پوری دنیا اسی دائرے کے اندر کھپاتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات میری سوچی سمجھی نہیں۔ میرا اپنا شعور کہہ رہا ہے۔ آپ کہیں گے شادی ہوئی نہیں لڑکا کہاں سے آگیا۔ میں یہ سب باتیں اب چوراسی برس کی عمر میں بیان کر رہا ہوں۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ پوتے پوتی۔ کبھی کبھی سب کچھ خواب ہوتے لگتا ہے۔ ان کے معاملے میں تب کی اور تب کے معاملے میں اب کی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ اب جب اس زمانے کی بات سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ گڑھے میں بھرے پانی کو تب ہم ہر طرف پھیلا سمندر سمجھ کر پی رہے تھے۔ چڑیا کی آنکھ جتنی وسعت ہے اور آپ سے اڑتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے لیے وہی دانہ آسمان بن جاتا ہو۔ خیر چھوڑیے اس گفتگو کو۔ میں اس بات پر آتا ہوں۔ ان صاحب نے آکر کہا "مجھے آپ کے چچا حضرات نے بھیجا ہے۔ میں پنجاب سے آیا ہوں۔"

لوگ تب شہر کا نام نہ لے کر یہی کہتے تھے کہ میں فلاں صوبے سے آیا ہوں۔ پنجاب تھا تو وہاں سب کچھ پنجاب تھا۔ ہم لوگ اپنے کو یو۔پی یا پچھاں کا بتاتے تھے۔ ہم لوگوں کا پنجاب سے تعلق بھینسوں کے ذریعہ تھا۔ میرے منہ سے یکایک نکلا "پنجاب کی بھینس بہت اچھی ہوتی ہیں۔"

وہ بزرگ آدمی تھے۔ پہلے تو چونکے پھر مسکرائے۔ مجھے لگا کہ شاید میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے حالانکہ میں نے سیدھے پن سے وہ بات کہی تھی۔

وہ بولے "میں بھینسوں کے بارے میں نہیں آیا۔۔۔ اپنی بیٹی کے رشتے کے بارے میں آیا ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے اس طنز کا کیا جواب دوں۔ ہر جس میں آدمی ویسے ہی پالش شدہ لکڑی کا ڈھانچہ لگتا ہے۔ میں ان کی بات سن کر خاموش اور بے حرکت

ہو گیا۔ تب بھیکو آ گیا تھا۔ وہی انھیں تانگے میں لایا تھا۔ اس نے ہم لوگوں کے درمیان سکوت ختم کیا "چھوٹے رائے نے حضور کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"ہاں ---- آپ نے بتا دیا۔"

وہ بولے "میرا نام پی۔ سہائے ہے۔"

اب میں سنبھل گیا تھا۔ میں نے کرسی منگوائی۔ ڈیرے میں دو تین کرسیاں تھیں۔ زیادہ تر کھاٹیں ہی استعمال ہوتی تھیں۔ وہ بیٹھ گئے۔ میں نے اندر مہاراج سے کہلوایا کہ شہر سے ایک مہمان آئے ہیں ساتھ میں بھیکو سائیس بھی آیا ہے۔ دونوں کھانا کھائیں گے۔ گنے کا تازہ رس پلوایا۔ گرم گرم گڑ بن رہا تھا، گڑ کھلوایا۔ گڑ میں سونٹھ اور میوہ پڑا تھا۔ لیکن انھوں نے ناشتہ نہیں چھوا۔ وہ اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرتے رہے "میں جانتا ہوں کہ رایوں کا گھر بہت بڑا ہے ---- ہمارے لیے تو آپ کے گھر میں بیٹی کے بیاہ کی بات کرنا چاند کو چھونے کی طرح ہے۔ لیکن میری بیٹی کالا لاکھی ہے۔ اس نے بہت پڑھا ہے۔ بھلے ہی اس نے آٹھویں جماعت پاس کی ہو لیکن وہ ایک استانی کی شاگرد ہے جس نے اسے انگریزی کی پوئٹری، شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھائے، گانا سکھایا، وہ گھوڑے اور سائیکل کی سواری کرنا بھی جانتی ہے۔"

میں چونکا، اپنی طرف دیکھا۔ وہ بتاتے جا رہے تھے "اگر آپ چاہیں گے تو زمینداری کے کام میں بھی وہ بھرپور مدد کرے گی۔ نہیں چاہیں گے تو کوئی بات نہیں۔ میں جانتا ہوں یو۔ پی۔ میں ان باتوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ چھوٹے لوگوں کے یہاں تو عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ بڑے گھروں میں ایسا نہیں ہوتا، یہاں کام کرنا برا مانا جاتا ہے۔ ہمارا پنجاب تھوڑا الگ ہے جیسا بیٹا ویسی بیٹی" پھر ہنس کر بولے "اس کا رنگ بہت گورا نہیں لیکن میرے جیسا کالا بھی نہیں۔ اس کی ماں گوری تھی۔ بھائی بھی بہت گورا ہے" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ میں تھوڑا اینٹھا گیا وہ ہنس دیے۔ پھر اپنے آپ ہی بولے "اس کا رنگ گندمی ہے۔ میں نے کالا کو بہت لاڈ پیار سے پالا ہے۔ یہی سوچا تھا کہ کسی بڑے گھر کی زینت بنے گی۔ اس کا بھائی پدم وکالت پڑھ رہا ہے۔ اس کے بابا رائے بہادر بنسی دھر بھی وکیل تھے۔ پنجاب کے ایک پرانے شاندار آدمی۔ پدم منصفی کے لیے کوشش کرے گا۔ میری بھی دوسری بیوی ہے۔ پہلی شادی کے دو سال بعد ہی فوت ہو گئی تھی، اس

سے کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ بھی ان ہی بچوں سے پیار کرتی ہے۔"

میں چونکا "کیا مطلب؟"

وہ بولے "مطلب کچھ نہیں۔ ویسے ہی کہا۔ ماں بننے کی خواہش دل میں رکھے ہوئے مر جانے والی ماؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب تک اس گھر میں بچہ نہیں آتا تب تک آتما بھٹکتی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی بچی ہونی بھی۔۔۔"

میں نے انھیں ٹوک دیا "اس بات کو رہنے دیجیے۔"

وہ چپ ہو گئے۔ اپنے ساتھ کاکا کا فوٹو لائے تھے۔ ابھی یہ رواج یو۔ پی۔ میں شروع نہیں ہوا تھا۔ مجھے تذبذب ہوا۔ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک بار دیکھ چکا تھا لیکن نظر بار بار ادھر جا رہی تھی۔ میں نے زبردستی نظر ہٹائی۔ آج کل کا فوٹوگرافی آرٹ دیکھتے ہوئے اس زمانے کے فوٹو بہت بھدے ہوتے تھے۔ تپائی دار پھول دان کے اسٹینڈ پر پھول دان کے بجائے ایک عدد لڑکی کھڑی رہتی تھی۔ پیچھے محل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ سب لڑکیوں کی شادی کے فوٹو ایک انداز سے کھنچے ہوتے تھے۔ فوٹو دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگ جاتا تھا کہ لڑکی کنواری ہے اور شادی کے میدان میں اتری ہوئی ہے۔ میں نے ان سے فوٹو کو رکھنے کے لیے کہا وہ گھبرا گئے۔ انھیں لگا کہ فوٹو پسند نہیں آیا۔

کیا فوٹو پسند نہیں آیا —— کئی بار فوٹو اچھا نہیں آتا" مجھے لگا کہ مشک بیچنے والے خان کی طرح کہہ رہے ہیں کہ شکل پر نہ جائیے۔ اصلی نافہ ہے استعمال کر کے دیکھیے۔

میں بولا "نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ آپ چاچا جی یا بڑے راجے کو دکھائیے۔ وہی پسند کریں گے اور ان ہی سے سب بات طے کرنی ہے۔

مہاجے صاحب مسکرا دیے۔

شاید گڑ اور رس کی انھیں عادت نہیں تھی۔ رات کو انھیں دست آنے لگے۔ جھکو رات ہی کو انھیں لے کر لوٹ گیا۔ کسی نے بیل پتر اور دہی ملا کر انھیں کھلا دیے تھے۔ جاتے وقت کچھ بہتر تھے۔ لیکن ایک بالٹی پانی ساتھ رکھ دیا گیا تھا۔ کہیں موقع بے موقع حاجت محسوس ہوئی تو کیا ہوگا۔ وہ ضرور راستے بھر چھلکتا گیا ہوگا۔

میری دوسری شادی بی۔ سہائے کی بیٹی کلا سے ہوئی۔ کلا یو۔ پی کی لڑکیوں سے ایک دم الگ تھی۔ ہمارے یہاں گھونگھٹ نکالنے کا رواج تھا۔ کلا کو گھونگھٹ نکالنے میں پریشانی ہوتی تھی۔ کلا چاہتی تھی میں اور وہ ایک ہی تھالی میں کھانا کھائیں۔ کھانا کھانا تو دور، ہم لوگ دن میں ایک پلنگ پر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ بھلے ہی بیٹھ جائے لیکن میرے لیے تو موت کا سامان تھا۔ کلا کو اس بات کا بھی برا لگتا تھا کہ میں دن بھر مردانے میں رہتا تھا۔ رات میں سونے کے وقت زنانے میں آتا تھا۔ اسے پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ ہمارے یہاں پڑھنے کے نام پر رامائن کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ سائیکل چلانا چاہتی تھی، گھوڑ سواری کرنا چاہتی تھی ـــــ سب کچھ ہوتے ہوئے اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ سائیکل، نہ گھوڑا۔

چھوٹی چاچی کلا کو کافی سمجھاتی تھیں۔ "دیکھو بہو، تم رائے خاندان کی لکشمی ہو، تمھیں اس خاندان کے طور طریقے اپنانے ہوں گے۔ لڑکے تو چاہے یکبارگی انھیں ان دیکھا بھی کر دیں لیکن بہو بیٹیوں پر انھیں زندہ رکھنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

کلا اتنا سیکھ گئی تھی کہ چاہے اندر طوفان اٹھ رہا ہو لیکن اوپر سے چپ رہو۔ وہ چپ چاپ سنتی رہتی تھی۔ لیکن اس کا چپ رہنا اندر ہی اندر دراڑیں پیدا کر رہا تھا۔ یہ نہ اسے پتہ تھا نہ کسی اور کو۔ کبھی کبھی کمرہ بند کر کے وہ اکیلی بڑبڑانے لگتی تھی ـــــ "دیکھو کلا، تو تو پنچھی سے بھی گئی گزری ہے۔ وہ تو اڑ سکتا ہے، چاہے جہاں اتر کر سستا سکتا ہے پر تو تو عورت ہے ایک بار باپ کے گھر اور دوسری بار سسرال میں۔ ایک وہ پنجرہ دوسرا یہ پنجرہ۔ وہ شاید کچھ بڑا تھا ـــــ اس میں تو سکڑ کر بیٹھا جا سکتا ہے" ایک بار وہ کلکتہ گئی تھی۔ کلکتہ میں اس نے پالتو کوئلیں دیکھی تھیں۔ وہ سویرے سویرے خوب دلکش گاتی تھیں۔ پنجاب لوٹ کر اس نے ایک کوئل پالی تھی۔ جاڑے شروع ہوئے تو اس نے اس کا پنجرہ کپڑے سے ڈھک کر کھونٹی پر ٹانگ دیا ـــــ سویرے وہ پانی کی کٹوری کے پاس لڑھکی پڑی ملی۔

کوئل والا یہ قصہ کبھی کبھی وہ مجھے بھی سناتی تھی۔ کہتی تھی کوئل کا دم گھٹ گیا۔ ایک بار میں نے اس سے پوچھا "تم یہ کوئل والا قصہ مجھے بار بار کیوں سنایا کرتی ہو؟" وہ پر مذاق بھی تھی، فوراً کہتی 'سناتی کہاں ہوں، دکھاتی ہوں۔" پھر ہنس دیتی "تمھیں کوئل سے دکھ

پہنچتا ہے تو مینا کی اپنجرے میں بند ہونے والی کوئی بھی چڑیا چہکے گی۔ کالی مینا تو سمجھدار ہوتی ہے کہ نام لے کر پکارتی ہے ـــ رام رام رٹتی ہے ـــ بس پنجرہ نہیں کھلتا۔"

مجھے اس کی باتوں سے پریشانی ہونے لگتی تھی۔ میں اسے ڈانٹ دیتا تھا۔ "تم یہ کیا بے وقوفی کی باتیں کیا کرتی ہو!"

وہ حاضر جواب بھی تھی "ایک بات پوچھوں؟ ایسا کیسے ہوتا ہے کہ ماں باپ کی نظروں میں بڑے بڑے ہوشیاروں سے کم لگنے والی بیٹی سسرال پہنچ کر ہزار احمقوں کی ایک احمق بن جاتی ہے۔"

جب اس کی باتیں برداشت نہ ہوتیں تو میں بگڑ جاتا۔ وہ روتی کم تھی، کبھی کبھی جب کوئی بات ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی تو رو بھی دیتی تھی۔ اس کا رونا بے سکون اور دوسروں کو پریشان کرنے والا ہوتا تھا۔ نہ اس کا چہرہ بگڑتا تھا اور نہ نفرت کا جذبہ ابھرتا تھا۔ بس ایک طرح کی بے بسی اور چند آنسو۔ تب مجھے ڈر لگنے لگتا تھا۔ ویسے وہ ہر بات چھوٹی چاچی سے بتاتی تھی۔ اس نے انھیں اپنا رازداں بنا لیا تھا۔

چھوٹے رائے چاچی سے کہا کرتے تھے "کبھی کبھی تم کلا کو اپنی برابری پر رکھ کر دیکھا کرو۔ ہمارے یہاں چھوٹوں کو برابر کا مقام دینے کا رواج نہیں ہے۔ پہلے پیدا ہو گیا تو بڑا ہو گیا۔ اس کے لیے انسان ہونے کے سارے حقوق بڑے کے پاس رہن ہو گئے۔ ساتھی مل جانا کتنی بڑی بات ہوتی ہے ـــ زندگی جینے میں مدد دینے والی، برابر کا درجہ۔۔۔"

چھوٹے رائے کی باتیں چاچی سب سے زیادہ سمجھتی تھیں۔ پھر بھی انھیں کبھی کبھی لگتا تھا کہ ان کی باتیں منتر کی طرح ہیں جنھیں تشریح کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔

ہمارے یہاں پہلی لڑکی ہوئی تھی۔ سارے گھر میں جیسے خوشی کے فوارے چھوٹنے لگے تھے۔ ارن کے بعد وہ پورے خاندان کا پہلا بچہ تھا۔ منجھلے چاچا نے اپنے آپ کو اس خوشی سے الگ رکھا تھا۔ جب پروہت نے انھیں جا کر بتایا کہ حویلی میں بیٹی کا جنم ہوا ہے تو وہ کچھ نہیں بولے۔ چاچی نے ضرور کہا: بڑے رائے کے گھر پوتی ہونے کی تو رام جانے، ہمیں بہت خوشی ہی ہے لیکن بڑے رائے کو ہمارے گھر بیٹا ہونے کی ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی" چاچی بیٹا ہونے

کے دن کے بعد ہوانے والے سارے واقعات گنانے لگیں۔ پھر بولیں۔ "گھر کے بڑے تھے تو انھیں ہماری خوشی کو بھی گلے لگانا چاہیے تھا۔ ان کی خوشی تو ہماری خوشی، ہماری خوشی ان کا غم!"

منجھلے رائے نے زیادہ بولتے دیکھ کر انھیں ڈانٹ دیا "بیکار کی باتیں نہ کرو، وہ ہماری بھی پوتی ہے۔ جہاں ان کی پوتی جیے گی، وہیں ہمارا بیٹا بھی پلے گا۔"

پروہت کے ساتھ بھوانی بھی گیا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا سن رہا تھا لیکن وہ ان سب باتوں کو پی گیا تھا۔ پروہت سے بھی منع کر دیا تھا کہ وہ بڑے رائے سے جا کر کچھ نہ کہیں۔ بیچ میں کھائی تو کھد ہی گئی، کھتی بھی کھد جائے گی۔ بڑے رائے نے پہلے تو ان کی طرف دیکھا پھر پوچھا "کرشن نے کیا کہا؟"

جب وہ اس پر بھی نہیں بولا تو بڑے رائے چپ ہو گئے اور کاغذ الٹنے پلٹنے لگے۔ چھوٹے رائے بھی سمجھ گئے تھے لیکن چپ تھے۔ بعد میں مجھے بھوانی سے ہی ساری باتوں کا پتہ چلا تھا۔ میں نے بھی بڑے رائے کو نہیں بتایا۔ میں جانتا تھا کہ دلوں کا فرق اور بھی بڑھ جائے گا۔

بچی کے آنے سے کلا بہت خوش تھی۔ چھوٹی چاچی کی جیسے اپنی ہی مراد پوری ہو گئی تھی۔ رانی حالانکہ بڑی تھی لیکن بچے کو کھلانے کی للک لڑکیوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ دو نوکرانیوں کے ہوتے ہوئے وہ بچی کا سارا کام خود کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ارن تو اس کے پاس سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ حتیٰ کہ بڑے رائے جب دوپہر کو کھانا کھانے آتے تھے تو اس کے پاس رکتے تھے، اس سے ایک دو باتیں کرتے تھے۔ کلا کو لگتا تھا کہ بیٹی کی ماں بن کر گھر میں اس کا مقام کچھ خاص ہو گیا تھا۔ میں کسی سے کہتا نہیں تھا لیکن مجھے بیچ بیچ میں روپا کا خیال آتا تھا۔ اگر وہ ماں بنی ہوتی تو اسے کیسے لگا ہوتا لیکن وہ تو۔۔۔ کلا کبھی کبھی گایا کرتی تھی۔۔۔ "جس کی تس دھر دینی چدریا۔۔۔" مجھے اس کا مطلب تو زیادہ سمجھ میں نہیں آیا لیکن ایسے موقع پر یاد ضرور آ جاتا تھا۔

روپا کی ماں کو جب پتہ چلا کہ کلا کے بیٹی ہوئی ہے تو انھوں نے بچی کے پانچوں

کپڑے اور سونے کے کڑے کی ایک جوڑی بھیجی تھی۔ تھوڑی دیر گھر میں کشمکش کی سی حالت قائم رہی تھی۔ کیا کریں؟ بچی کو مبارک باد بھی دے اور وکیل صاحب کے ذریعہ کی گئی بے عزتی کا اعادہ بھی۔ چھوٹی چاچی نے معاملہ کو سمجھا۔ وہ بولیں "مبارک باد کا ایک رومال رکھ لیتے ہیں۔ زیور نہیں رکھیں گے۔ روپا ہوتی تو جو وہ بھیجتیں، ہم رکھ لیتے ——— سب کا ہے۔ پھوپھی بھتیجے کا حق کالا کے گھر والوں کا ہے۔"

اس کے بعد وکیل صاحب کے یہاں سے کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ نہ ادھر سے ہی دی گئی۔ بس جب راجہ بابو کا انتقال ہوا تو چھوٹے رائے ہو آئے تھے۔ ان دنوں تپ دق مہلک بیماری ہوتی تھی۔ وکیل صاحب کا سب کچھ دوا ہی میں لگ گیا تھا۔ وکیل صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر روتے رہے تھے۔ یہی کہتے رہے تھے ——— معاف کردو۔ روپی کی ماں نے ایک ہی جملہ کہا تھا ——— تم نے جو بچی کے ساتھ کیا اس کا پھل یہیں پایا اور گھر بھی خالی اور پیٹ بھی خالی۔

چھوٹے رائے ان کے گھر میں حالت دیکھ کر دنوں تک پریشان رہے تھے۔

کالا کے ایک خالہ زاد بھائی تھے جگن۔ ویسے تو انھیں خالہ زاد کہنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ کالا کی خالہ کی موت ہو گئی تھی۔ ان کی جگہ جو دوسری آئی تھی، جگن اس کے لڑکے تھے چونکہ خالو بہت مانتے تھے اس لیے نئی خالہ بھی مانتی تھی۔ خالو برٹش آرمی میں صوبے دار رہ چکے تھے۔ دنیا گھومے تھے۔ وہ ان ہی کے لڑکے تھے۔ پڑھنے میں بہت تیز۔ خالو کے پاس پیسہ بھی کافی تھا۔ دبدبہ تو تھا ہی۔ انھوں نے اپنے لڑکے جگن کو اس زمانے میں ولایت پڑھنے بھیجا تھا۔ ان کے جانے میں اینی بیسنٹ کی تھیوسوفیکل سوسائٹی نے بھی مدد کی تھی۔ جگن جب پڑھائی ختم کرکے ہندوستان آئے تو راستے میں ہی انھیں گاندھی جی کا پیغام ملا کہ وہ ہندوستان پہنچ کر ان سے ملیں۔ جگن آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہی مجلس طلبا کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ وہ اگر حکومت برطانیہ کی حمایتی جماعت نہیں تھی تو خلاف بھی نہیں تھی لیکن جگن کچھ گرم خیالات کے شخص مانے جاتے تھے۔ موقع ملنے پر ہندوستان میں لڑی جارہی جنگ آزادی کی حمایت میں بھی بول دیتے تھے۔ انگریزوں نے نہ انھیں روکا اور نہ ملک چھوڑ کر جانے کے

لیے کہا۔

جگن کو جب گاندھی جی کا پیغام ملا تو خوشی سے پاگل ہو اٹھے۔ یہ انھیں بعد میں معلوم ہوا کہ بیرون ملک پڑھ کر لوٹنے والے نوجوانوں کے بارے میں گاندھی جی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا عوامی رابطہ اتنا زبردست تھا کہ ہر نوجوان کو ان کا پیغام جہاز پر یا ولایت میں ہی مل جاتا تھا۔ ایسے نوجوان بہت کم تھے جو گاندھی جی دعوت نامے کو نظر انداز کر دیں۔ زیادہ تر لوگوں کے لیے گاندھی جی کا دعوت نامہ عزت کی بات ہوتی تھی۔ چند ایک لوگ جو ولایت کے رنگ میں رنگے ہوتے تھے، وہ ملتے بھی تھے اور باہر نکل کر گالی بھی دیتے تھے ''لنگوٹی والا یہ فقیر سمجھتا ہے کہ ہم لوگ بھی لنگوٹی لگا کر اس کی کیرتن منڈلی میں شامل ہو جائیں گے ـــــ نان سینس!'' لیکن ایک بات تھی چاہے کوئی کتنا بھی انگریز ہو جائے لیکن ہندوستان لوٹنا سب کا سپنا ہوتا تھا۔

چند ایک گاندھی جی کے خطوط دکھا کر برطانوی حکومت کی نظروں میں چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ چند ایک لوگ بھلے ہی گاندھی جی کے دعوت نامے پر ان سے ملنے نہ جاتے ہوں لیکن ایسے بڑبولا لوگوں کو منہ توڑ جواب بھی دیتے تھے ''تم سمجھتے ہو کہ تم اس طرح کی باتیں کر کے گاندھی جی کو چھوٹا کر دیتے ہو ـــــ اگر گاندھی نے لنگوٹی پہنی ہے تو اس لیے نہیں کہ گاندھی کے پاس پہننے کے لیے تمھاری اور ہماری طرح کے کپڑے نہیں تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ان کپڑوں کی اصلیت سمجھ چکے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے اور عوام کے درمیان کم از کم کپڑوں کی دیوار تو نہ رہے دھرم اور رنگ کی دیوار تو پہلے سے ہی موجود ہے۔ جس دیوار کو توڑا جا سکتا ہے اسے توڑ ہی دینا چاہیے۔ اس طرح کے کپڑے پہننے والے 'ہم تم'، 'ہم تم' سے ہی مل سکتے ہیں۔ اس 'ہم تم' کی حد سے باہر جانا ہم لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ہمیں تو سکھایا بھی یہ ہی جاتا ہے کہ جانوروں میں آدمی بہتر ہے اور آدمیوں میں تم بہتر ہو، گاندھی نے اس گمان تو توڑ دیا کہ ہم بہترین ہیں۔''

جب جگن ہندوستان آئے گا تو گاندھی جی چمپارن میں تھے نیلہوں کے خلاف چمپارن کی کسان تحریک چلا رہے تھے۔ کرپلانی جی بھی ان دنوں وہیں تھے۔ جگن کو وہاں پہنچنے میں کئی

دن لگے۔ نہ تو گاڑیاں ہی زیادہ تھیں اور نہ ان کی رفتار ہی اتنی تیز تھی۔ انھیں گاندھی جی سے ملنے کے لیے دو دن انتظار کرنا پڑا۔ وہیں ان کی ملاقات راجندر بابو سے ہوئی تھی۔ گاندھی جی کی عدم موجودگی میں جنگ آزادی کے بارے میں انھیں بہت کچھ بتا دیا گیا تھا۔ کچھ لٹریچر بھی پڑھنے کے لیے دیا گیا تھا۔ جب گاندھی جی سے آمنا سامنا ہوا تو جگن کو لگا کہ ان کے سامنے کوئی بہت بڑا بچہ بیٹھا ہنس رہا ہے۔ کھلی ہوئی اور بچوں جیسی ہنسی۔ اسے بھی ایک بات پر ہنسی آئی۔ گاندھی جی کے سر کے بال ایسے تھے جیسے چوہوں نے کتر دیے ہوں۔ جسم ایک دم سوکھا۔

گاندھی جی نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں پوچھا "تم نے ولایت میں رہتے ہوئے ہمارے ہندوستان کے بارے میں کچھ پڑھا۔۔۔؟" جگن سمجھے نہیں۔ بولے "وہاں کے اخبار بادشاہ اور ملک کی خبروں سے زیادہ آپ کے بارے میں چھاپتے ہیں۔ آپ ان کے لیے جادوئی شخصیت ہیں۔

وہ پھر ہنس دیے۔ ان کی وہ ہنسی جگن کے اندر تک اتر گئی۔ ایک جادو سا کر گئی۔

گاندھی جی بولے "میری بات کیوں کرتے ہو ـــــ میں تو کچھ بھی نہیں۔ اصلی تو ہندوستان کے لوگ ہیں۔ تم ان کے بارے میں جانتے ہو۔ جگن سن رہ گئے۔ انھیں جواب نہیں سوجھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا "ولایت کی پڑھائی کے بعد یہاں کے لوگوں کو پڑھو ـــــ اب اسی پڑھائی کی ضرورت ہے۔"

جگن نے ایسے گردن ہلا دی جیسے گاندھی جی ان کے اندر آ بیٹھے ہوں۔ گاندھی جی پھر ہنسے "دیکھو بھائی، میں بدنام آدمی ہوں۔ گھر بگاڑتا ہوں۔ ملک بنانا ہے تو گھروں کو قربانی تو دینی ہی ہوگی۔ ملک بن گیا تو گھر بھی بن جائیں گے" انھوں نے جگن کو غور سے دیکھا۔

ان کی ہر ہنسی سے جگن کو لگتا تھا جیسے اس کا اپنا ایک اور کھونٹا [illegible] ہو گیا۔ بعد میں وہ با سے بھی ملے۔ گاندھی جی نے ہی با کو بتایا تھا ـــــ یہ ولایت سے پڑھ کر لوٹا ہے۔ با نے ہنس کر گجراتی میں کہا۔ گاندھی جی مسکرا دیے اور با سے کہا "ایسا بولو، جو یہ بھی سمجھے، صحیح زبان وہی ہے جسے سب سمجھیں" میں نے کہا تھا "تمھیں معلوم ہے اس کے گھر والے کیا کہیں گے؟ چور!" گاندھی جی ہنس دیے "وہ تو میں ہوں ـــــ اسی میں میرا فائدہ ہے!"

جگن نے ولایتی کپڑے پہننے چھوڑ دیے۔ گاندھی جی نے جگن کو تعلیم کا کام سونپا۔ کرپالانی اور جگن کی پٹتی تھی۔ بعد میں وہ دونوں کچھ دن ساتھ ساتھ گجرات ودیا پیٹھ میں بھی رہے تھے۔ جگن نے کچھ دن رام جس کالج میں بھی پڑھایا تھا۔ پھر وہ لالہ لاجپت رائے کے نیشنل کالج، لاہور پڑھانے چلے گئے تھے۔ سردار بھگت سنگھ، یش پال، سکھ دیو وغیرہ تب وہیں تھے۔ لوگ تب ہی جگن کو آچاریہ کہنے لگے تھے۔ جگن آچاریہ بھگت سنگھ کو بہت پیار کرتے تھے۔ بھگت سنگھ رات رات بھر کے لیے غائب ہو جاتے تھے۔ وہ انھیں سمجھاتے تھے تو بھگت سنگھ ہنس کر کہتے تھے ''کس کا دن کس کی رات، اب تو ایک ہی لو لگی ہے ہندوستان کے لیے آزادی اور چیونٹوں کے لیے روٹی۔ آپ لوگ آزادی کو ماہرین آثار قدیمہ کی طرح دھیرے دھیرے نقاشی کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے کہ ادھر چاک کریں اور ادھر آزادی کا انڈا باہر آ جائے۔ ملک ان کے پاس ہو جن کا ہے، روٹی ان کے گھر میں ہو، جو اسے کماتے ہوں۔ ابھی تو جناب ملک بھی بند حالپڑا ہے اور روٹی بھی۔''

جگن آچاریہ ہنس دیتے تھے۔ وہ یہی سمجھاتے تھے ''کئی بار طوفان پہاڑوں تک کی چوٹیوں کو چھو کر نکل جاتا ہے ـــــ لیکن اونچائی پر پہنچنے کے لیے دھیرے دھیرے چڑھتا ہے۔''

''جناب اس باکا کیا یقین کہ دھیرے دھیرے چل کر پہنچ ہی جائیں گے اور پہنچیں گے بھی تو کب؟''

پھر بھگت سنگھ رک کر سمجھاتے ''سر، تیز طوفان میں تو وہ تنکے بھی اڑ جاتے ہیں جن کے اڑنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔''

پھر ایک دن طوفان آیا۔ لالہ جی سائمن کمیشن کی بلی چڑھ گئے۔ جگن آچاریہ گاندھی جی کے آشرم لوٹ آئے۔ بھگت سنگھ کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ گاندھی جی مہاتما سے باپو ہو گئے۔ کھادی کا آندولن تیز ہو گیا تھا۔ تلک نے جسے بیج کے روپ میں روپا تھا، گاندھی جی نے اسے عملی روپ دے دیا تھا۔ جگن اس تنظیم کے ناظم بنا دیے گئے تھے۔

جب سے جگن آچاریہ کانگریس میں بھرتی ہوئے تھے تب سے وہ کالا سے نہیں ملے

تھے۔ کلا اکثر ان کا ذکر کیا کرتی تھی۔ مجھے اس بات سے ڈر لگتا تھا۔ بڑے رائے کو پتہ چل گیا تو جانے کیا ہو؟ جگن آچاریہ کی شادی بھی کب چپ ہو گئی تھی۔ ان کی بیوی من کانتی بھی جو بات میں بنجی بہن کے نام سے معروف ہوئیں، ان کے ساتھ ہی ملک کی آزادی کے کام میں لگ گئی تھیں۔ کانتی بھابی کو دیکھنے کے لیے کلا کا دل بہت بے قرار تھا۔ بس ایک بار بنجی جگن آچاریہ کے ساتھ اسٹیشن پر ملی تھی۔ شاید پولس ان کے پیچھے تھی۔ صرف تعارف ہی ہوا تھا۔

۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے "کرو یا مرو" کا نعرہ دیا۔ ۹ اگست کو گاندھی جی کی گرفتاری ہوئی۔ اس کے بعد صف اول کے سارے رہنما پکڑے گئے۔ دوسری صف میں جگن آچاریہ باہر تھے۔ تحریک چلانے کی ذمہ داری ان پر آ گئی تھی۔ انھیں کہا گیا تھا کہ وہ فی الحال انڈر گراؤنڈ رہ کر کام چلائیں۔ ان ہی دنوں جگن آچاریہ ہمارے گھر آئے تھے۔ میں ان سے اپنی شادی میں ملا تھا، لیکن جس دن وہ آئے، میں زمینداری کے کام سے باہر تھا۔ وہ یا تو مجھے پہچانتے تھے یا کلا کو۔ انھوں نے دروازے پر آکر آغا قار رحمت اللہ سے ہی پوچھا "بھاسکر رائے یہیں رہتے ہیں؟"

اس نے انھیں کھادی پوش ہونے کی وجہ سے تعجب سے دیکھا۔ پھر پوچھا "آپ کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے انھیں پہلے کبھی حویلی پر نہیں دیکھا تھا۔

جگن آچاریہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

رحمت اللہ انھیں حویلی میں لے آیا۔

چھوٹے رائے سامنے ہی بیٹھے تھے ان کے ہاتھ میں تلک مہاراج کا "گیتا رہسیہ" تھا۔ چھوٹے رائے کھادی پہن کر آئے ہوئے جگن آچاریہ کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان دنوں چاہے کتنا بھی بڑا آدمی ہو، کھادی پہن کر آتے ہوئے کسی بھی شخص کو دیکھ کر اس کا احترام کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ ویسے بھی چھوٹے رائے کو یہ ہی لگا کہ وہ ان ہی سے ملنے آرہے ہیں۔ اس گھر میں اس طرح کا شخص اگر آسکتا تھا تو ان ہی کے پاس آسکتا تھا۔

جگن آچاریہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں جگن ہوں، کلا میری خالہ زاد بہن ہے۔"

چھوٹے رائے ان کا نام کانگریس میں بھی سن چکے تھے اور انھیں یہ بھی پتہ تھا کہ بہو کے خالہ زاد بھائی جگن آچاریہ کانگریس کے بڑے رہنما ہیں اور گاندھی جی نزدیک ہیں۔

ان کے اندر جیسے کپکپی سی آ گئی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر ان کے پیروں کی طرف جھک گئے۔

جگن آچاریہ نے انھیں دونوں ہاتھوں سے تھام لیا "مجھے آپ کے پاؤں چھونے چاہئیں ــــ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"نہیں، میں آپ کے پاؤں نہیں چھو رہا ہوں، گاندھی جی کی اس نوازش کا لمس کر رہا ہوں جو آپ کو حاصل ہے۔ میں نے سنا ہے، آپ نے سب کچھ چھوڑ کر گاندھی جی کا دامن پکڑ لیا ہے۔ میں نے اسے کبھی چھوا بھر تھا۔"

جگن ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چھوٹے رائے اپنے جذبات کے بہاؤ کو بمشکل روک سکے۔ بولے "مجھے ایک بار گاندھی جی پاس جانے اور ان سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔ انھوں نے مجھ سے ملک کا کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں اتنی ہمت نہیں کر سکا۔ ایک کمزور آدمی نہ اچھا کام کرنے کے لائق ہوتا ہے نہ برا۔ میں بھی وہی ہوں۔ میں آپ کو سامنے دیکھ کر شاد کام ہو گیا۔"

رحمت اللہ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا من بھی ان کا پاؤں چھونے کو ہوا لیکن رک گیا۔ چھوٹے رائے نے پوچھا "آپ کب آئے؟" "بس ابھی چلا آ رہا ہوں۔ مجھے تھوڑی مدد چاہیے! بھاسکر بابو کہاں ہیں؟"

"زمینداری میں گیا ہے ــــ شام تک لوٹ آئے گا۔"

"کلا؟"

اندر حویلی میں ــــ میں آپ کو بھجوائے دیتا ہوں۔ اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیں۔ بھاسکر میرا بھتیجہ ہے!"

جگن بابو نے رحمت اللہ کی طرف دیکھا۔ چھوٹے رائے نے کہا "بھاسکر اور رحمت اللہ میں کوئی فرق نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر بات کیجیے۔"

ایک منٹ انھوں نے رک کر کہا "میں انڈر گراؤنڈ ہوں ــــ سارے لیڈر پکڑ لیے گئے ہیں۔ اس تحریک کی خاطر کسی محفوظ مقام کی تلاش میں ہوں۔"

چھوٹے رائے کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ آپ یہیں قیام کیجیے۔ ان کا چہرہ یکا یک اتر گیا۔ انھیں پہلی بار لگا، یہ گھر میرا نہیں۔ بڑے رائے کا ہے لیکن فوراً ہی سنبھل کر بولے "آپ کلا سے مل لیجیے۔ بھائی صاحب آتے ہی ہوں گے، ان سے بات کر کے کوئی

انتظام کرتا ہوں۔"

جمن آچاریہ نے ان کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا "کوئی بات نہیں۔"

چھوٹے راجے نے رانی کو پکارا اور اس سے کہا "بیٹی، یہ تمھاری بھابی کے بھائی ہیں۔ انھیں اندر لے جا۔ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ ولایت تک پڑھے ہیں۔"

رانی نے پوری آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا اور چپ چاپ آگے آگے چل دی۔ اس نے زینے سے دوڑ لگائی "بھابی، آپ کے بھائی آئے ہیں۔"

کلا نے جمن بھائی کو دیکھا تو لپٹ گئی "جمن بھیا، آپ کو یہ کیا ہو گیا؟ بھائی کیسی ہیں؟ سنا ہے وہ بھی آپ کی طرح جنگ آزادی میں شامل ہو گئی ہیں۔ بس ایک بار اسٹیشن پہ آپ کے ساتھ دیکھی تھی۔ آپ نے ولایت تک پڑھائی اسی لیے پڑھی تھی؟"

جمن بھائی نے کلا کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور ہنس کر بولے "تو نے تو اتنے سوال پوچھ لیے کہ میں تو گھبرا گیا۔ اری، سب تیری طرح تو خوش قسمت نہیں ——— ہم تو گاندھی کے عدم تشدد والے سپاہی ہیں۔ جب تک ملک میں سب تیری طرح یا میری طرح نہیں ہو جائیں گے تب تک اسی طرح الکھ جگائی ہے۔"

کلا نے جلدی جلدی ان کے لیے ناشتے کا انتظام کیا۔ ہاتھ پیر دھلوائے۔ اتنے میں بیٹا کے رونے کی آواز آئی۔ جمن بھائی فوراً بولے "اری کلا، تو تو بہت چھپی نکلی ——— مجھ سے دنیا بھر کی جرح کی اور یہ نہیں بتایا ———"

کلا شرما گئی۔

"لا، بچے کو میرے پاس لا ——— بیٹا ہے یا بیٹی؟"

"بیٹی۔"

اچھا تو نے سروجنی نائیڈو کو جنم دیا ہے۔"

کلا بٹیا کو اٹھا لائی۔ لا کر ماما کی گود میں لٹا دیا۔ وہ ہنس کر بولے "دیکھ کلا، اس وقت میرے پاس دینے کو تو کچھ نہیں ——— بس خالی چیلی کا ماما ہوں۔ باپو جب ہم لوگوں کو خط لکھتے ہیں تو آخر میں لکھ دیتے ہیں ——— باپو کے آشیرباد! اسی طرح میرے پاس بھی اس کے لیے ——— ڈھیر سارا آشیرباد ہیں۔ بس۔" انھوں نے ہاتھ پھیلا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔

جگن بابو کی آواز میں ہلکی سی کپکپی آ گئی تھی۔

کلا کو لگا، جگن بھائی سست ہو گئے۔ بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

"پہلے تو یہ بتا، خوش ہے یا نہیں؟"

"خوش تو بہت ہوں لیکن آزاد نہیں۔ آزاد ہوتی تو میں آپ کے ساتھ چلتی۔ میں بھی گاندھی جی کے درشن کرتی۔ ویسے تو یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ پردہ ہے، بند ھن ہے، چھوا چھوت ہے ــــ سب بہت مانتے ہیں لیکن اپنی شرطوں پر۔ آپ نے تو دیکھا ہے میں وہاں لڑکی کی طرح رہتی تھی، یہاں بہو کیا ہوئی، پنجرے کی مینا ہو گئی۔ جب آپ کی آزادی آجائے گی تو کیا ہم عورتوں کے یہ پنجرے بھی کھل جائیں گے؟"

"آزادی آئے گی تو اسے گھر کے اندر تو لانا ہی پڑے گا۔ بند دروازے رہے تو آ نہ آئے۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ بٹیا گود میں ہی سو گئی تھی۔ جگن ماما اس کے سر پر مسلسل ہاتھ پھیر رہے تھے۔ کلا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "آپ نے نہیں بتایا۔۔۔" وہ ہنس دیے "اری فرصت کہاں ہے؟ میں باہر ہوں، تیری مامی اندر!"

تھوڑی دیر سناٹا رہا، کلا نے پھر پوچھا "بھیا آپ نے بتایا نہیں۔ کیسے آنا ہوا؟"

"ادھر سے نکل رہا تھا تو یاد آیا تو بھی تو یہیں ہے۔ سوچا، چلو ملتا چلوں۔ آنا تو چاہیے تھا کچھ لے کر ــــ لیکن فقیر بھائی جو ٹھہرا" یہ کہہ کر اٹھ گئے۔

کلا نے انھیں روکنا چاہا لیکن رکے نہیں۔

دونوں اندر تھے۔

جگن آچاریہ نیچے آئے تو رحمت اللہ نے باہر آکر کہا "بڑے مالک آگئے ہیں!"

"وہ مجھے نہیں جانتے۔"

وہ پھر بولے "نہیں حضور مل تو لیجیے۔ بہت محبت کے آدمی ہیں۔"

وہ بولے "حضور نہیں، بھائی کہو!" پھر ہنس کر کہا "لیکن میں تو روکھا سوکھا آدمی ہوں۔"

"آپ یہ کیا کہتے ہیں۔ مجھے چھوٹے رائے سب بتادیا۔"

وہ جانے لگے تو اس نے پھر دوہرایا "مل تو لیجیے ہی۔"

"پھر کبھی ملوں گا۔ انھیں بے کار پریشانی ہوگی۔ کلا اور کلا کی بیٹی سے مل کر جو سکھ ملا ہے، اسی کے ساتھ نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"ان کو دکھ ہوگا" رحمت اللہ کو ضد کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اس وقت ان کے ساتھ کچھ زیادہ ہی کھل گیا تھا۔

"اچھا، آپ کہتے ہیں تو چلیے۔"

بڑے رائے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ جگن آچاریہ نے انھیں نمسکار کیا تو نظر اٹھا کر دیکھا۔ دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر بہت محبت سے پوچھا "آپ نے کھانا کھایا کہ نہیں؟"

"کلا نے بہت کھلا دیا۔ بس نکل ہی رہا تھا۔ سوچا اور کچھ تو کر نہیں سکتا آپ کو آداب ہی کرلوں۔ انھوں نے بھی ضد کی" ــــــ رحمت اللہ کی طرف اشارہ کرتے کرتے بولے۔ پھر کہا "کلا بہت اچھی لڑکی ہے ــــــ بہت سال ہوگئے تھے دیکھے۔ ایک زمانے سے خالو سے بھی نہیں ملا۔ پدم کو بھی نہیں دیکھا۔ بس بھاگم بھاگ میں کہیں ملنا نہیں ہوتا۔ جب ولایت گیا تھا تو خالو بمبئی چھوڑنے گئے تھے۔ پدم اور کلا چھوٹے چھوٹے تھے۔ کلا بالکل لڑکوں کی طرح رہتی تھی۔ اب چلتا ہوں۔ آپ کو زیادہ پریشانی میں نہیں ڈالوں گا۔"

"دراصل ــــــ"

"میں جانتا ہوں۔ گزر رہا تھا تو کلا کا دھیان آگیا۔ پھر سوچا وہ تو خود معلوم ہے۔"

کسی ردعمل کا انتظار کیے بغیر انھوں نے آداب کیا اور باہر نکل آئے۔ چھوٹے رائے بھی پیچھے پیچھے باہر آئے۔ وہ کافی دیر تک ان کا ہاتھ پکڑے رہے۔ ان کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ کچھ کہنا مشکل ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے کہہ سکے "اگلی بار جب آپ گاندھی جی سے ملیں اور آداب کریں تو اس ناقص کا نام بھی من میں لے لیں۔ اتنا ہی پُن میرے لیے کافی ہے۔"

جگن آچاریہ باہر نکلے تو انھیں چوڑیوں کی آواز سنائی دی۔ بارجے کی کھڑکی کی طرف دیکھا تو چلمن کے پیچھے سے دو آنکھیں انھیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

جگن تیزی کے ساتھ دروازے سے نکلے اور سامنے والی گلی میں گھس گئے۔ رحمت اللہ ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنی دھن میں چلتے رہے۔ یکایک نظر گھومی تو وہ رک گئے اور پوچھا "آپ میرے پیچھے کیوں آرہے ہیں؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "میں مسلمان ہوں، درزی کا کام کرتا ہوں ـــــ پہلے مالک کی گھوڑا گاڑی چلاتا تھا۔ آپ کے لائق تو نہ میں ہوں نہ میرا گھر۔ بس ایک ہی توقع ہے، آپ کے جوتوں کی دھول اس ناچیز کے دروازے پر پڑ جائے ـــــ میں شہر سے بہت دور محلّہ کھٹی کان میں رہتا ہوں۔ میری گھر والی پہلے ہندو تھی ـــــ اب بھی بڑے 'نیم' سے رہتی ہے۔"

جگن آچاریہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کہتا جا رہا تھا "رات ہوتی جا رہی ہے۔ اس اندھیرے میں آپ کہاں جائیں گے۔ ویسے بھی تو آپ کے ذمے جتنا بڑا کام ہے۔ آپ ایک بار چل کر دیکھ لیں ـــــ میری بھی عاقبت سدھر جائے گی۔ جگہ ضرور کم ہے لیکن سلامتی زیادہ ہے۔"

جگن نے اس کی آنکھ میں ایک ایسی دعوت دیکھی جو شاید اس نے تب دیکھی تھی جب پہلی بار گاندھی جی سے ملے تھے۔ وہ گھوم کر رحمت اللہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ رحمت اللہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ وہ کچھ دن اس کے پاس رہے۔ وہ اندھیرے نکل جاتے اور دیر رات گئے آتے تھے۔ زیادہ تر کھانا پینا باہر ہوتا تھا۔ سویرے البتہ رحمت اللہ کی گھر والی انھیں چنا چبینا دیتی تھی۔ وہ اسے بہت شوق سے کھاتے تھے جب وہ نکلتے تھے تو رحمت اللہ کی گھر والی ان کے چرن چھو کر دھیوری ماتھے سے لگاتی تھی۔ وہ رحمت اللہ سے کہتے تھے کہ انھیں منع کر دو، یہ سب نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں سادھو سنیاسی تھوڑے ہی ہوں۔ ایک دن جب جگن نے براہِ راست اسی سے کہا تو بولی "اہلیا رام کے چرن چھو کر پتھر سے انسان بنی تھی۔ میں بھی پتھر ہی ہوں کیا پتہ ان چرنوں کے چھوتے چھوتے ہی کبھی میں بھی انسان بن جاؤں۔"

بیچ بیچ میں غائب ہو جاتے تھے۔ رحمت اللہ خدا سے یہ ہی دعا مانگتا رہتا تھا کہ جہاں بھی رہیں سلامت رہیں۔ اس کی گھر والی ان کا کمرہ باقاعدگی سے صاف کرتی تھی۔ دھوپ جلاتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ ان کے لیے کھدر کے کرتے اور پاجامے بھی سلے تھے۔ وہ پیسے دینے لگے تو وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ پیروں پڑنے لگی۔ انھیں ماننا پڑا۔

ایک دن جگن آچاریہ گئے تو پھر نہیں لوٹے۔ رحمت اللہ سے دعائیں مانگتا رہا اور گھر والی باقاعدگی سے اپنا کام کرتی رہی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ جیل میں ہیں ایک آدمی آیا اور رحمت اللہ کے کان میں کہہ گیا کہ جگن آچاریہ متھرا جیل میں ہیں۔ وہ کہاں سے آیا تھا اور

کہاں چلا گیا۔ اس نے بہت ڈھونڈا لیکن پتہ نہیں چلا۔ اس کی گھر والی رو رو کر بے حال ہو گئی۔ شاید وہ اتنا کشن بابو کے لیے بھی نہ روئی۔

اس دن جب میں رات کو گھر واپس آیا تو کلا نے بتایا، کیسے کشن بھیا آئے اور چلے گئے۔ میں فوراً طے نہیں کر سکا کہ یہ غلط ہوا یا درست۔ کلا بچہ کہہ تو نہیں رہی تھی لیکن اس کے من میں شدید ندامت تھی۔ کشن بھائی آئے اور ایسے ہی چلے گئے۔ کسی نے یہ تک نہیں کہا کہ ایک رات تو ٹھہر جائے۔ رحمت اللہ نے یہ بات ایک عرصے تک نہیں بتائی کہ وہ اس کے مہمان تھے۔ میرا لڑکا جب بڑا ہو گیا اور اپنے ماما کے پاس جا کر رہا تو انھوں نے اس سے پوچھا تھا "رحمت اللہ ہی یا۔۔۔؟"

جب انھیں پتہ چلا کہ رحمت اللہ تو آزادی کے چند دنوں پہلے چلا گیا تھا تو دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ کافی دیر تک چپ رہنے کے بعد انھوں نے رحمت اللہ کی گھر والی کے بارے میں پوچھا تھا۔ تب تک وہ بھی فوت ہو چکی تھیں۔

"بچے؟"

"وہ لاولد مرے تھے۔ ان کی بیوی ہمیشہ کہتی تھی، رحمت اللہ مجھے ایک بچہ تو دے دو، رحمت اللہ ہنس کر ٹال دیتا تھا۔

کشن آچاریہ نے ایک بات اور پوچھی تھی ـــــ کیا وہ طوائف تھی؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ تب ہی انھوں نے اسے پورا قصہ سنایا تھا۔ آزادی کے بعد کشن آچاریہ مختلف عہدوں پر رہے تھے۔ ہم سب ان سے درخواست گزار کی طرح امداد مانگنے جایا کرتے تھے۔ پتہ نہیں انھیں وہ واقعہ کس طور پر یاد تھا ـــــ لیکن انھوں نے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا۔ یہ بات بے موقع یاد آگئی۔ یادیں موقع بے موقع آکر اکثر اس طرح کی چہل کرتی ہیں۔

خیر، کلا کی بات سے مجھے تکلیف ہوئی۔ چھوٹے راے سے پوچھا تو وہ مجھے اس سے بھی زیادہ ست نظر آئے۔ وہ بولے "ہم لوگوں نے کشن بابو کو اس طرح لوٹا کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ویسے بھی وہ تمھارے سالے تھے۔ اس کا پاپ ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ گھر صرف اپنے لیے ہی نہیں ہوتا۔ مہمان کا بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ آئے تو اسے بھی گھر ہونے کے احساس کو چھونا چاہیے جو گھر میں رہنے والوں کو چھوتا ہے۔ ہماری ماں کہا کرتی تھی کہ آدمی کو ہر وقت نارائن کے انتظار میں آنکھیں فرش راہ کیے رہنا چاہیے۔ پتہ نہیں کب کس روپ میں

آجائیں۔ وہ آئیں اور ہم چوک جائیں تو پچھتاوا ہوگا۔ کہیں پتہ بھی نہ چلے۔ نارائن بار بار نہیں آتے۔ ہمیں پتہ تھا کہ نارائن ہمارے سامنے کھڑا ہے، ہم اسے بٹھا بھی نہیں پائے۔"

"آپ نے انھیں روک کیوں نہیں لیا؟"

"انھیں کون روک سکتا تھا؟ وہ تو رکنے کا موقع آنے سے پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ یہ گھر ان کے لیے نہیں۔ جب وہ بڑے رائے سے ملے تو وہ طے کر چکے تھے کہ انھیں چلے جانا ہے۔ انھیں روکا بھی نہیں گیا۔ میں نے پہلی بار اپنی مجبوری سے آمنا سامنا کیا۔ جگن بابو جیسے گاندھی وادی کو میں اس حویلی سے ایک ایسے آدمی کی طرح باہر جاتے دیکھ رہا تھا جسے ہم شاید پہچان کر بھی ان دیکھا کر دیتے ہیں لیکن وہ نہ دکھی تھے اور نہ سکھی اور نہ انھیں کوئی موہ تھا۔ رحمت اللہ ضرور ان کے پیچھے پیچھے گیا تھا ــــ میں تو یہ بھی نہ کر سکا کہ دروزے کے باہر تک چھوڑ دوں، مجھے لگا کہ میں اپنی انسانی پہچان بھی کھو چکا ہوں۔"

میں نے رحمت اللہ سے پوچھنا چاہا۔ وہ چپ رہا۔ ہاتھ ہلا کر ایک بے معنی اشارہ کر دیا اور باہر چلا گیا۔

کلا کا اور میرا ساتھ بھی بہت لمبا نہ رہا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ اس کے سکھ کا معیار کچھ اور تھا۔ اس نے شاید دل ہی دل میں زندگی کا کوئی خاکہ بنایا ہوا تھا۔ اس کے لیے شادی کا مطلب تھا خاکے کے لیے شوخ رنگ۔ جب شادی ہوئی تو اس نے دیکھا قالینوں، دیواروں پر بنی تصویروں، کرسیوں، میزوں، پردوں اور کپڑوں میں بے شمار رنگ ہیں لیکن زندگیاں ان رنگوں سے محروم اور بدرنگ ہیں۔ بس شام کے دھندلکے والا سرمئی رنگ تھا۔ وہ خاکہ جسے وہ رنگ بھرنے کے لیے ساتھ لے کر آئی تھی رنگوں سے محروم رہ گیا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ وہی سرمئی رنگ ایک سائے کی طرح اس کی شخصیت پر پھیلتا چلا گیا۔ وہ اپنے آپ کو پھڑپھڑاتے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی اکیلے میں اسے پھیلا کر لکیروں کا جائزہ لے لیتی یا آنچل سے جھاڑ پونچھ دیتی ہو ــــ تو بات الگ ہے۔

جیسے جیسے جنگ آزادی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ زمینداروں، جاگیرداروں اور تعلقہ داروں پر دھند لکا چھاتا جا رہا تھا۔ بڑے راجے بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔ مانو پر ان کی گرفت بھی ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ برتری کا مینار جھکنے لگا تھا۔ انگریزوں کی اکڑفوں تو ویسی ہی تھی لیکن انھیں اپنی کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسا نہیں کہ غیر یقینی کا حشاوپ صرف اعلیٰ طبقے پر ہی تھا۔ ادنیٰ طبقے بھی غیر یقینی کے شکنجے میں جکڑے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کیا ہو گا۔ گاندھی یا مرد کا جو روپ سامنے آیا تھا اس سے انگریز گھبرا گئے۔ انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ گاندھی کی عدم تشدد کا مطلب یہ بھی ہے۔ عدم تشدد بھی اتنا شدید ہو سکتا ہے کہ اپنی موت کو سامنے کر کے ملک میں اتنی شدید لاقانونیت کا آغاز کرے۔ چھوٹے راجے میں اندر ہی اندر ایک طرح کا انبساط نظر آنے لگا تھا۔ جدو، بہار اور مانو پر گاندھی کی گرفت مضبوط ہو جانے کی وجہ سے ان پر مثبت ردعمل ہوا تھا۔ انھیں لگتا تھا کہ بھلے ہی وہ عملی طور پر شامل نہ ہوں لیکن کہیں نہ کہیں وہ ان میں گھلے ملے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ باقی سب ذمہ داریوں سے اور زیادہ الگ ہو گئے تھے۔ ان کی ذمہ داریاں بھی اب میرے اوپر آ گئی تھیں۔ زمینداری کا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ کئی کئی دن گھر نہیں آپاتا تھا۔ جب سے اور صوبوں میں لگان نہ دینے کی تحریک شروع ہوئی تھی تب سے یہ فکر بڑھ گئی تھی کہ کہیں اس کی چھوت یہاں بھی نہ پھیل جائے۔ حالانکہ یورپ کے مقابلے 'پچھاں' کے ضلع زیادہ ڈرپوک اور سرکاری عملداری کے سامنے سر جھکانے والے تھے۔ اس سب کے باوجود جنگ آزادی لڑی ہی جا رہی تھی۔ ہمیں وصولی کے لیے آدمی بھی بڑھانے پڑے تھے۔ پہلے تو مانا جاتا تھا کہ حویلی کا کتا بھی چلا جائے تو وہ لوگ، اگر ہو گا تو لگان گلے میں تعویذ کی طرح باندھ دیں گے۔ اب تین تین چار چار آدمیوں کو ایک ساتھ بھیجنا پڑتا تھا۔ وصولی، دگاڑ کا کام زیادہ ہو گیا تھا۔

کلا میری اس طرح کی طویل غیر حاضریوں سے اکثر پریشان ہو جاتی تھی۔ رانی بھی بڑی ہو گئی تھی۔ ارن بھی کافی کچھ سمجھنے لگا تھا۔ چھوٹی چاچی اپنے آپ کو ارن میں سمیٹتی جا رہی تھیں۔ پھر بھی ان کے خلا کا عنصر بھی بڑھتا جا رہا تھا جو چھوا چھوت کی شکل میں سامنے آ رہا تھا۔ وہ میری بچی سونا سے بھی بہت کھیلتی تھیں لیکن چھوا چھوت کے سبب ایک قسم کی

دوری بھی تھی۔ وہ پیشاب کر دیتی تھی تو فوراً کمرہ دھلوایا جاتا تھا۔ کلا کو یہ بات بہت بری لگتی تھی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ سونا کو ان کے پاس کم از کم جانے دے۔ جب سے وہ گھٹنوں چلنے لگی تھی، کھسک کھسک کر اپنے آپ پہنچ جاتی تھی۔ چاچی چاہتی تھیں سونا ان کے سامنے کھیلتی رہے لیکن جو انج ضروری سے فارغ نہ ہو! بس سویرے نہانے سے پہلے وہ تھوڑی دیر اسے گود میں لے کر ضرور کھلاتی تھیں۔ اتنا کھلاتی تھیں کہ سب کچھ بھول جاتی تھیں۔ اس وقت ان کی ساری مامتا سونا میں مرکوز ہو جاتی تھی۔ لیکن نہاتے ہی ان کا وہ روپ ڈھل ڈھلا کر برابر ہو جاتا تھا۔

ایک بار کلا کے منہ سے نکل گیا تھا کہ جن کے اپنے بچے نہیں ہوتے وہ زیادہ چھوا چھوت مانتے ہیں۔ شاید ان کے ذہن میں یہ بات بھی رہی ہو کہ میری بچی کو ذرا دور پر پر۔ ان کے لیے سب کچھ وہ ان سے اپنے کو ماں کہلاتی تھیں۔ ماں کا لفظ سن کر چاچی کے من میں طوفان سا اٹھنے لگتا تھا۔ وہ ان کو اپنے سے اس طرح چمٹا لیتی تھی جیسے ان کے جسم میں حلول کر جائیں گی یا پھر اسے اپنے اندر سمیٹ لیں گی۔ کئی بار ان کا سانس گھٹنے لگتا تھا۔ وہ بات مجھے بھی پسند نہیں تھی۔ ایک آدھ بار میں نے اسے ٹوکا بھی۔ میرا ٹوکنا چاچی کو بالکل پسند نہیں آیا۔ جب سے کلا نے وہ بات کہی تھی، چاچی کے دل میں ایک عجیب سی گانٹھ پڑ گئی تھی۔ بعد میں اس نے ان سے معافی بھی مانگی۔ انھیں سمجھایا بھی کہ اس نے یہ بات چوٹ پہنچانے کے لیے نہیں کہی تھی۔ چھوٹی چاچی نے چپّی سادھ لی۔

اس واقعہ نے گھر کے اندر بھی اک ٹھہراؤ سا پیدا کر دیا۔

کلا کے جب رگھوبر ہونے والا تھا (رگھوبر کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں شاید اس لیے کہ وہ میری حیثیت کا ایک بڑا حصہ ہے) تو وہ بہت فکر مند تھی۔ وہ بار بار ایک ہی سوال کرتی تھی کہ اگر میں نہ بچی تو میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ سونا اور رگھوبر کے بیچ میں بھی اس کے دو بچے ضائع ہو چکے تھے۔ تب بچے کافی ضائع ہوتے تھے۔ بچے کا جنم ماں کا دوسرا جنم سمجھا جاتا تھا۔ جب بچہ صحیح سلامت ہو جاتا تھا تو عورتیں اس بات کے لیے مبارک باد دیتی تھیں کہ چلو، بچے کی ماں اپنے ہاتھوں پیروں سے چھوٹ گئی۔ تب عورتیں ہر بچے کے ساتھ نیا جنم لیتی تھیں۔ چھوٹی

چاچی کبھی کبھی کہا کرتی تھیں عورت ہو کر جو ایک سید حد میں جتی چلی جائے اس کا کیا جینا۔ بنا بار بار جیے اور مرے عورت کا جینا، جینا نہیں ہوتا۔

ہم جیسے لوگوں کی گھروں کی بہوؤں کو بھی یہ سب جھوگنا پڑتا تھا جبکہ اچھی سے اچھی دیکھا بھال ہو سکتی تھی۔ اس بار ڈاکٹرنی نے کلا کو دیکھنے کے بعد اس کے سامنے ہی کہا تھا کہ بچے کا سر بڑا ہے۔ ہو سکتا ہے دلی لے جانا پڑے۔ اس بات نے کلا کو اور بھی زیادہ فکر مند کر دیا تھا۔ اسے یہ ہی رٹ لگ گئی تھی کہ پتہ نہیں لوٹوں گی بھی یا نہیں۔ بھوانی کو پاس بٹھا کر سمجھایا کرتی تھی "میں نہ رہوں تو تم میرے بچوں کا دھیان رکھنا۔ جیسے تم نے اور رانی نے ارن کو پالا ایسے ہی انھیں بھی پالنا۔ رانی تو اپنے گھر باری ہو جائے گی ــــــ تم تو اسی گھر کی ہو۔" مجھ سے کہتی "اگر میں نہ بچی تو دوسری آجائے گی ــــــ میرے بچوں کے ساتھ انصاف کرنا۔ بنا ماں کا سمجھ کے دھتکارنا مت!"

میں ناٹتا تو وہ کہتی "میں جانتی ہوں، شادی تو کرنی ہو گی ــــــ گھر چلانے کو عورت تو چاہیے ہی" ایک بار وہ یہ بھی کہہ گئی "آدمی نہیں رہتا تو کسی کو فکر نہیں ہوتی ــــــ کہ اس کی اتنی بڑی باہر کی دنیا وہ کیسے جھیلے گی۔ عورت نہیں رہتی تو آدمی کے چھوٹے سے گھر کو چلانے کی فکر سب کو ہوتی ہے۔"

اس کی آخری بات مجھے ناگوار گزری تھی۔ اس دن پہلی بار لگا کہ کلا اپنی حد سے باہر جا رہی ہے۔ میں نے اس دن اسے خوب کہا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ جب میں کہہ چکا تو بولی "آپ اتنا ناراض کیوں ہو گئے؟ میری تو اتنی ہی سی غلامی کی زندگی تھی ــــــ اب آزادی کا وقت آگیا۔ اب میں کھلے آسمان میں اڑوں گی ــــــ بھلے ہی میرا ایک پنکھ میرے ان بچوں پر سائے کی طرح پھیلا رہے۔ پھر بھی اڑوں گی۔"

میں ڈر گیا۔ کلا کی پہلی ماں کا قصہ مجھے یاد آگیا جھوٹ تھا یا سچ اس کا فیصلہ کرنا تو میرے لیے مشکل تھا۔ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ویسا قصہ نہ میں نے پہلے کبھی سنا اور نہ بعد میں۔ ایک لمحہ کو لگا، کہیں کلا اسی کے ارادے کی جانب تو اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ لیکن وہ تب ہی ممکن تھا جب ایشور نہ کرے کہ وہ نہ رہے۔ کلا کے باپ نے یہ بات تو مجھے پہلی ہی ملاقات میں بتا دی تھی کہ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی دو سال بعد ہی مر گئی۔ پدم یعنی کلا کے بڑے بھائی کا جنم ہوا تو اس کی پہلی ماں نے آنا شروع کر دیا۔ جب یہ بات سنی تو میں سمجھ

نہیں سکا کہ مرا ہوا شخص واپس کیسے آ گیا؟ وہ بچے کے سرہانے آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ دن بھر وہیں بیٹھی رہتی تھی۔ پدم بہت خوبصورت تھا۔ بعد میں جب وہ بڑا ہو کر ڈرامے میں لڑکی کا پارٹ کرتا تھا تو لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے۔ پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا ـــــ لڑکا ہے یا لڑکی۔ تب لڑکے ہی لڑکیوں کا رول ادا کرتے تھے۔ کاروباری کمپنیوں کی بات الگ تھی، جہاں اس کام کے لیے عورتیں رکھی جاتی تھیں۔ خیر، میں کلا کی پہلی ماں کی بات بتا رہا تھا۔ پدم کی ماں کے کھانے پینے میں بدپرہیزی کے سبب جہاں بچے کی طبیعت خراب ہوئی، اس کی پہلی ماں فوراً بولتی تھی ـــــ تو نے چنے کھائے تھے ـــــ اسی لیے بچے کے پیٹ میں درد ہے۔ اس کی ناف پر ہینگ گرم کر کے لگا دے۔ وہ لگاتی اور بچہ سو جاتا۔ یا کہتی ـــــ تو بچے کو باہر لے کر گئی تھی ـــــ فلاں کی نظر لگ گئی ـــــ نظر اتار دے۔ کئی باتیں تو ایسی کہہ دیتی جو پدم کی ماں کو ہی پتہ ہوتا۔ میں ان باتوں کو سنتا ضرور رہتا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ بولتی کیسی تھی؟ بولتی تھی تو نظر کیوں نہیں آتی تھی؟ اس زمانے میں اس طرح کی باتوں پر شک کرنا غلط سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے میں چپ چاپ سنتا رہتا تھا۔ بعد میں جب پدم بڑا ہو گیا اور اس کی شادی ہوئی تو پہلی ماں کے نام کے پروسے من سنا بھول گئے۔ سویرے پتہ چلا کہ بھنڈارے میں جتنی مٹھائی کی تشتریاں لگی رکھی تھیں سب پیروں سے کچلی پڑی ہیں۔ سب پر کسی کے چلنے کے نشان تھے۔ سب سے پوچھ تاچھ ہوئی، سب نے یہ ہی کہا کہ ہمیں تو پتہ نہیں۔ ویسے بھی بھنڈارے کا تالا بند تھا۔ چابی کلا کے والد کے پاس تھی۔ آخر میں وہ اپنے آپ بولی "میں نے کچلی ہے۔"

"تو نے کیوں کچلی؟"

وہ بولی "میرے بیٹے کا بیاہ، مجھے ہی نہیں پوچھا گیا۔ میں نے رات بھر جاگ جاگ کر پالا۔ یہ تو پڑی سوتی رہتی ہے۔ میں اس کے سرہانے بیٹھی آفات بلیات کو ہانکتی رہتی تھی ـــــ تم لوگ مجھے ہی بھول گئے!"

فوراً تازہ مٹھائی بنوائی گئی۔ اس کے نام کے پروسے منسے گئے۔ دھوتی قمیض وغیرہ پانچوں کپڑے کسی سہاگن کو پہنائے گئے۔ تب کہیں جا کر کام نمٹا۔ جب بہو آئی تو کلا کے والد نے کہا "اب بچے بڑے ہو گئے، ڈریں گے، اب مت آیا کرو۔ ہم تمھارا حصہ برابر نکالتے رہیں گے۔"

اس کے بعد پھر وہ نہیں آئی۔ کلا کی بات سن کر مجھے وہ ساری کی سنائی باتیں یاد آ گئیں۔ حالانکہ میں دل ہی دل میں یہ مانتا تھا کہ یہ سب عورتوں کی من گھڑنت بات ہوگی۔ اس طرح کی باتیں بنانے میں وہ کسی کہانی کار سے کم نہیں ہوتیں۔ ایک بار کلا کے والد نے بھی اس کی تائید کی۔ میں مان تو تب بھی نہیں سکا لیکن حیرت میں ضرور پڑ گیا۔ بھوانی بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ ان پر تو میں نے کبھی یقین ہی نہیں کیا۔ کچہری کا ایک بہت بڑا احاطہ ہے۔ اس میں دو املی کے پیڑ ہیں۔ اس میں سے ایک خونی املی ہے۔ خونی املی کے نیچے سے گزرتے ہوئے کسی انگریز کی آواز سنائی پڑتی ہے۔ وہ چائے بسکٹ مانگتا ہے۔ اگر اس کی آواز سن کر کوئی رک جاتا ہے تو وہ اسے مار ڈالتا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ غدر کے زمانے میں دیسی لوگوں نے کسی انگریز کو اسی املی سے باندھ کر مار ڈالا تھا۔ بعد میں انگریزوں نے اس کی ایک قبر وہیں بنوا دی تھی۔ مجھے بھی رات میں دو تین بار ادھر سے گزرنے کا موقع ملا تھا لیکن اس انگریز نے مجھ سے کبھی چائے بسکٹ نہیں مانگا۔ اگر مل جاتا تو میں اسے ضرور چائے بسکٹ کھلاتا۔

میں نے ہنس کر کلا سے پوچھا "کیا تمھارا اپنی پچھلی ماں کی طرح ان بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں تو ماں ہوں، وہ ماں نہیں بن پائی۔ میرا دعا کرنا ہی کافی ہے۔ ہاں روپا بہن آ جائیں تو تم جانو۔"

"تم بھی تو پڑھی لکھی ہو، تم بھی ایسی کرتی ہو؟"

"پڑھی لکھی تو میں پہلے بھی تھی! کچھ اس حویلی کی چار دیواری نے بھلا دیا اور کچھ زندگی کی بے یقینی اور بچوں کا موہ بھلائے دے رہا ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔

آخر میں کلا کو دلی لے جانا پڑا۔ جب تک وہ ہسپتال میں رہی اسے یہی لگتا رہا کہ زیادہ دن نہیں جیے گی۔ جو نوکرانی ساتھ آئی تھی وہ اسے یہی سمجھاتی رہتی تھی کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے؟ سونا کے کپڑے کہاں ہیں؟ سونا کو کیا پسند ہے؟ کس وقت سوتی ہے اور کس وقت اٹھتی ہے؟ جب آپریشن کے لیے اندر لے جائے جانے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ——— "دیکھو، میں اب لوٹوں گی نہیں۔ لیکن میرا بچہ رہے گا۔ میرا یہ بچہ تمھارے

خاندان کا نام روشن کرے گا ـــــ بڑے رائے سے کہنا کہ اسے اپنی دیکھ بھال میں رکھیں۔ میرے بچوں کو دکھ نہ پہنچانا۔ بن ماں کا سمجھ کر پیار دینا۔ میں کہے دیتی ہوں، میرے بچے دکھی رہے تو یہاں کوئی سکھی نہ رہ سکے گا" وہ جذباتی ہوتی جا رہی تھی۔

ویسے وہ پُرسکون تھی۔ بغیر کسی ہیجان کے اپنی بات کہہ رہی تھی۔ جب وہ آپریشن روم میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک پڑے۔ اندر جانے پر دروازہ بند ہو گیا۔ ایسا لگتا رہا۔ ٹرالی اب بھی چل رہی ہے اور آنکھوں میں دو آنسو ٹکے ہیں پتہ نہیں کب لڑھک پڑیں۔ میرے دونوں ہاتھ اٹھنے کو ہوئے۔ مجھے خیال آیا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے برابر پدم اور چھوٹے رائے بھی بیٹھے تھے۔ چھوٹے رائے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپ تھپایا۔ پدم چپ تھا۔ اس کی ایک ہی بہن تھی، وہی اندر آپریشن ٹیبل پر لیٹی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ویسے ویسے ہم لوگوں کی بے صبری اور بے چینی بڑھ رہی تھی۔ یہ بھی لگنے لگا تھا کہ ہر پل ایک قسم کی بے بسی ہم پر قابض ہوتی جا رہی ہے۔

دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر باہر نکلی۔ یورپین تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولی "مبارک باد، بیٹا ہوا ہے!" وہ یہ کہتی ہوئی تیزی سے چلی گئی۔ اس کے بعد بڑی نرس آئی۔ وہ بھی ولایتی ہی سی تھی۔ میں نے لپک کر اس سے پوچھا "بچے کی ماں کیسی ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خون کافی بہا ہے۔ ہوش میں آنے پر ہی اندازہ ہو گا۔"

"خون تو تھا۔۔۔"

وہ بھی جواب دیے بغیر کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کی کھٹ پٹ میں کسی طرح کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ دفتری ٹائپ مشین کو جیسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس سے ٹائپ ہونے والے الفاظ کس جذبے یا احساس پر مبنی ہیں۔ اس طرح ان کی کھٹ کھٹ سے بھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ پیچھے چھوڑ کر آئے مریض کی ہم لوگوں کے لیے کیا اہمیت ہے۔ ہر قدم پر ایک بے جان سناٹا پیچھے چھوٹ جاتا تھا۔ ہم لوگ گھنٹوں وہیں بیٹھے رہے۔ پدم بیچ بیچ میں یہ کہتا رہا "میری تو وہی ایک بہن ہے۔"

میں خاموش تھا۔ میں کیا کہتا۔ پدم کا ہر جملہ میرے اندر چڑیوں کی چڑ چڑ کی طرح گونجنے لگتا تھا۔ ان میں کلا کے وہ جملے بھی مل جاتے تھے جو کلا نے پچھلے کچھ دنوں میں مجھ سے کہے تھے۔

پتہ نہیں یکایک مجھے کیا ہوا۔ میں نے پدم سے پوچھا "جب تم چھوٹے تھے تو یہ تمھاری پہلی ماں تمھارے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور وکیل کی طرح مجھ سے پوچھا "آپ مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ان بچوں کے لیے؟"

"یعنی؟"

"ماں کی ممتا کہاں تک جا سکتی ہے؟"

اس نے صرف 'ہوں' کیا اور بولا "میں نے سنا تھا ـــــ مجھے تو صرف اپنی شادی کا واقعہ یاد ہے ـــــ ہم چھوٹے تھے، جب ہماری شادی ہوئی تھی۔"

اس نے پھر وہی جملہ دوہرایا "میری دوا یکلی بہن ہے ـــــ اچھی تو ہو جائے گی۔"

میں نے اس سے کہنا چاہا کہ سارے ہی رشتے کیسے ہوتے ہیں اور اس سے ہوتے ہیں جس سے دور بھتے ہیں "تب ہی چھوٹی نرس نے آکر کہا "مریض کو ہوش آگیا ـــــ چل کر مل لیجیے۔"

سب سے پہلے میں گیا تھا۔ کیونکہ میں نے سوچا تھا کہ چھوٹے راے کا جانا مناسب ہوگا۔ وہ بڑے ہیں۔ لیکن بات رشتے کی تھی۔ پھر اس کا بھائی پدم آیا۔ تب چھوٹے راے۔ یہ ہم لوگوں نے بولے بغیر خود ہی طے کیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ پھر بچے کی طرف نظر گھمائی۔ وہ پالنے میں لیٹا تھا۔ تب بھی اس طرح کے ہسپتالوں میں بچوں کو چوبیس گھنٹے ماں سے الگ رکھا جاتا تھا۔ بچہ بہت صحت مند تھا۔ ٹانگیں پھیلا کر سیدھا سو رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں اپنے کان اس کے منہ کے پاس لے گیا۔ وہ بڑبڑائی ـــــ "میرا کام ختم ہو گیا۔ میں نے تمھیں بیٹا دے دیا" میں نے گردن ہلائی پھر کہا "کام کیسے ختم ہو گیا ـــــ اب تو شروع ہوا ہے" اس کی آنکھوں کے کوروں سے آنسو ڈھلک آئے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ آنسو تب سے ابھی تک وہیں لگے تھے۔ پھر لگا جیسے جیسے پیڑ کے آخری دو پتے ٹوٹ کر ہوا میں لہراتے نیچے آرہے ہوں۔ ان کے گرتے ہی جیسے پیڑ کا پیڑ ہونا ختم ہو گیا ہو۔

اس نے مجھے اور قریب آنے کا اشارہ کیا اور بولی "میں اسے ایک بار دودھ پلانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں، ہاں پلانا ــــ تم ہی پلاؤ گی۔"

"نہیں، زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم ان لوگوں سے کہو کہ مجھے اپنے بچے کو ایک بار دودھ پلانے دیں۔"

اس وقت اس کا بھائی اور چھوٹے رائے بھی وہاں آ گئے تھے۔ چھوٹے رائے نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ سر پر آنچل ڈھک دو۔ چھوٹے رائے جذبات سے مغلوب ہو کر بولے "جیسے رانی ویسے تو بھی میری بیٹی ہے۔"

پدم دوسری طرف کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ بات چیت بند تھی۔ کلا نے چھوٹے چاچا سے کہا "ان سے کہیے کہ بچے کو میرے پاس لا دیں" پھر بھائی سے بولی "پتاجی سے کہنا، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ــــ جیسے رکھا ویسے رہی ــــ جیسے جلایا ویسے جی ــــ اب چھٹی۔۔۔"

پدم اپنے کو سنبھال نہیں سکا۔

کلا چوبیس گھنٹے تک اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے تڑپتی رہی۔ بیچ بیچ میں وہ بے ہوش ہو جاتی تھی۔ صرف میں ہی کلا کے پاس تھا چھوٹے رائے اور پدم بیچ بیچ میں آتے تھے، بیٹھتے تھے اور باہر چلے جاتے تھے۔ پدم نے کہا بھی کہ تھوڑی دیر آپ آرام کر لیجیے، میں بیٹھ جاتا ہوں۔ حالانکہ وہ کلا کا بڑا بھائی تھا۔ اس کا حق بنتا تھا۔ چونکہ مجھ سے چھوٹا تھا اس لیے میرے منع کرنے پر چپ ہو جاتا تھا۔ پتہ نہیں کہ میرا جی اسے چھوڑنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ سونا کو بھی یاد کرتی تھی۔ میری بچی کو دکھا دو۔ میرے بعد اس کا کیا ہو گا؟ شام تک چھوٹی چاچی اور سونا بھی آ گئے تھے۔

کلا کو بخار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ انھیں رات بھر میں پانچ سیر پانی پلا دو۔ تب ہی ان کے بچنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ شاید آپریشن کرتے ہوئے چاقو غلطی سے میز پر رکھا رہ گیا تھا۔ بعد میں نرس سے پتہ چلا۔ اس زمانے میں سیر کا باٹ ہی چلتا تھا چیز چاہے رقیق ہو یا ٹھوس۔ ہر آدھے گھنٹے بعد میں اسے توتی سے پانی پلانے کی کوشش کرتا تھا۔ پانی پی لیتی

تھی۔ کبھی آنا کانی کرتی تھی۔ میں نے سویرے تین بجے تک کالا کو سوتے دیکھا تھا۔ پھر پانی یا دوا اسے پیشاب بھی کافی ہو رہا تھا۔ جب سویرے ڈاکٹر راؤنڈ لینے آئی تو بخار چار ڈگری سے گھٹ کر دو ڈگری رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر خوش تھی۔ لیکن چار بجے کے بعد اس نے پانی بند کر دیا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ کالا اس بات پر بضد تھی کہ اس کے بچے کو اس کے پاس لایا جائے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کے جسم میں چیچک ہے۔ ماں کا دودھ پینے سے بچے کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ بڑے رائے کو بھی خبر بھیج دی گئی تھی۔ سویرے سات بجے تک وہ پہنچ گئے۔ چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ ایک تو رات بھر کا سفر کیا تھا، دوسرے ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ کالا کو دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ جانے والی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر بھی رہی تھی لیکن چپ تھی۔ بڑے رائے نے لیڈی ڈاکٹر سے کہا کہ بچے کو اس کی ماں کے پاس لادیں۔

ڈاکٹر بولی "بچے کو انفیکشن ہو سکتا ہے۔"

بڑے رائے نے کہا "دیکھیے ڈاکٹر صاحب، ہماری قسمت میں جو ہونا ہے اسے نہ آپ روک سکتی ہیں اور نہ ہم۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو لکھ دینے کو تیار ہوں —— میری بہو اگر اپنے بچے کو پیار کیے بغیر چلی گئی تو میں زندگی بھر پچھتاتا رہوں گا —— اس کی آتما کو بھی شانتی نہیں ملے گی۔"

ڈاکٹر بڑی مشکل سے دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد بچے کو کالا کے پاس لانے کو تیار ہوئی۔ ڈاکٹر یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ایک سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی اس کی بات کو کیوں نہیں سمجھ رہا۔ آتما کیا ہوتی ہے؟ بڑے رائے نے انھیں سمجھایا کہ ہم ہندو ہیں اور آتما کو مانتے ہیں۔ جب تک متوفی کی آخری خواہش پوری نہیں ہوتی، تو اس کی آتما بھٹکتی رہتی ہے۔ دوسرا جنم نہیں لیتی۔ ہندو ہونے کا مطلب ہے 'پنر جنم' میں وشواس کرنا۔ وہ ہنس دی۔

جب بچے کو اس کے پاس لایا تو کالا ہوش میں تھی۔ اس نے بچے کے لیتے ہی اسے سینے سے چمٹا لیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اس نے اپنا دودھ بچے کے منہ میں دینا چاہا لیکن دے نہیں سکی۔ اس کے ہاتھ ایک طرف کو لڑھک گئے۔

سوناماں اور بھائی کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

نرس نے دیکھا تو وہ دوڑی دوڑی آئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی اور گردن ہلا کر دھیرے سے بولی۔ "ساری! بڑے رائے دونوں ہاتھ پلنگ پر ٹکائے ایسے کھڑے

تھے جیسے کٹا ہوا پیڑ کسی کی اوٹ لے کر گرتے گرتے رک گیا ہو۔ نرس نے بچے کو اٹھا کر پالنے میں لٹا دیا۔ چاچی سونا کو باہر لے گئی۔ کلا کا جسم چادر سے ڈھک دیا گیا۔

دلّی میں ہم باہری آدمی تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ کلا کی لاش کا کیا کیا جائے؟ گھر لے جایا جائے یا یہیں سپردِ آتش کر دیں۔ تب اتنی سہولت نہیں تھی کہ میت کو اتنی جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔ آخر میں یہ ہی فیصلہ کیا گیا کہ جمنا کے کنارے 'داہ سنسکار' کر دیا جائے۔ ہمارے یہاں عجیب رواج تھا۔ شوہر کو بیوی کے ساتھ شمشان نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ حالانکہ ہندوؤں میں شوہر کے ہاتھوں 'داہ سنسکار' عورت کے لیے خوش قسمتی کی بات سمجھی جاتی ہے۔ شاید اس لیے ایسا ہو کہ پہلے بال بچوں کی شادیاں ہوتی تھیں —— موت کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا کب ہو جائے —— یہ ہی سوچا گیا کہ کہیں شوہر کے بچکانہ دل پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ یا کوئی شوہر بیوی کی میت کے ساتھ گیا ہو اور نہ رہا ہو۔ اس وجہ سے یہ رواج شروع ہو گیا کہ شوہر، بیوی کی میت کے ساتھ نہیں جائے گا۔ جو بھی ہو میں سونا کو لے کر دیے پر رہا۔ بچے کے لیے ایک آیا کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ وہ بچے کو لے کر چاچی کے پاس ٹھہری رہی۔

بڑے رائے، چھوٹے رائے اور پدم تین ہی آدمی تھے۔ جمنا تٹ بہت دور تھا۔ نگرانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہمارے برابر میں ایک بمبئی کا خاندان تھا۔ وہ بھی علاج کے سلسلے میں آیا ہوا تھا اس خاندان کے دو لوگ بھی ساتھ ہو گئے تھے لیکن انھیں یہ بات عجیب لگ رہی تھی کہ بیوی کی میت کے ساتھ شوہر کیوں نہیں گیا۔ مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ سونا بار بار میری آنکھوں کی طرف دیکھتی تھی "بابو جی، آپ کی آنکھوں میں پانی کیوں آ رہا ہے؟ وہ سب ماں کو کہاں لے گئے؟ کیا ماں اب کبھی نہیں آئے گی؟" لفظ 'ماں' مجھے غیر متوازن کر دیتا تھا۔ میں جذباتی ہو جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بچی کو کیا بتاؤں؟ بیچ بیچ میں چھوٹی چاچی بھی اس کا دھیان بانٹنے کی کوشش کرتی تھیں۔ رہ رہ کر مجھے کلا کی بات یاد آتی تھی۔ وہ کب سے اپنے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بچے کو اس کے پاس لٹاتے ہی فوراً چلی گئی۔

سونا نے میرا منہ اپنی طرف گھما کر پوچھا "ماں کب آئے گی؟"

میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ اب کبھی نہیں آئے گی۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا "بڑے ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔۔۔ جب بالکل ٹھیک ہو جائے گی تو بڑا ڈاکٹر چھٹی دے گا۔"

"کب ٹھیک ہوگی؟"

میں چپ رہا۔

آپا کی گود میں سوتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "اسے کیوں نہیں لے گئی؟ یہاں ماں کا بچہ ہے نا؟"

"تمہارا چھوٹا سا بھائی —— ماں تمہارے کھیلنے کے لیے چھوڑ گئی ہے۔"

"یہ تو گندہ ہے، روتا ہے۔۔۔" پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی "آپ بھی تو روتے ہو۔" وہ تھوڑا تھوڑا تتلاتی بھی تھی۔

چھوٹی چاچی نے اسے اپنے پاس بلایا "سونا بیٹی، میرے پاس آ جا، اپنے بابو کو تھوڑا آرام کر لینے دے۔"

"نہیں، ہم آپ کے پاس نہیں آئیں گے" وہ میری گود میں اور زیادہ سمٹ آئی۔

سورج ڈھلنے لگا تھا۔ ڈھلتے سورج کی ایک طرح کی دھوپ جیسی چمک —— چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ سب کے سب [illegible] زمین کی طرح چمکنے لگے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے چمک ختم ہونے لگی اور مٹ میلا پن اتر آیا۔ جہاں ہم بیٹھے تھے، لوٹتے سورج کی دھوپ کا ایک بدرنگ سا ٹکڑا تیزی سے سرکتا ہوا باہر کی طرف جا رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ نظر بچا کر کچھ چرا لے اور تیزی سے سرکنے لگے جو لوگ باہر برآمدے میں تیز چل رہے تھے ان کی چال بھی جیسے مدھم پڑنے لگی تھی۔ بچوں کا شور بہت دور سے آتا معلوم ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا۔ میرے کان کم سن رہے ہیں یا سب کچھ مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

میں سونا کو لے کر باہر نکل آیا۔ وہاں اور بھی زیادہ اکتاہٹ اور ٹھہراؤ تھا۔

تانگے میں بڑے رائے، چھوٹے رائے، پدم اور باقی دونوں لوگ اترے مجھے لگا

جیسے کوئی عورت یکا یک نیچے آگری ہو اور بے انتہا دھول آنکھوں اور کانوں میں بھرتی جا رہی ہو۔ دراصل، وہاں تو موت کا مجھے پتہ نہیں چلا تھا۔ کیسا لگتا، کہہ نہیں سکتا۔ لیکن کاکا تو جلتی روشنی کی طرح یکا یک گل ہو گئی تھی۔ جیسے کسی شریر بچے نے پھونک مار کر بجھا دیا ہو۔ بڑے رائے اور چھوٹے رائے کسی بڑے شکستہ جہاز کی طرح چڑھتے، اترتے آرہے تھے۔ پدم پیچھے تھا۔ سامان اٹھوا کر لا رہا تھا۔ وہ دونوں ایسے ساتھ چل رہے تھے کہ بوقت ضرورت ایک دوسرے کو سہارا دے سکیں۔ میں نے بستر کے نیچے سے دری نکال کر بچھا دی۔ داہ سنسکار کے بعد زمین پر بیٹھنے اور نیم کی پتی چبانے کا رواج تھا۔ سب لوگ آکر چپ چاپ دری پر بیٹھ گئے۔ نیم کی ٹہنی ساتھ لیتے آئے تھے۔ سب نے پتی چبائی اور اٹھ گئے۔ شاید بمبئی والے لوگوں کے یہاں نیم کی پتی نہ چبائی جاتی ہو۔ انھوں نے عجیب سا منہ بنایا۔ ان کے منہ بنانے سے لگا کہ یہ پتی اس تلخ تجربے کی علامت ہے جو آدمی کے کھونے پر یا کھونے کے ڈر سے ہوتا ہے۔

میں نے ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا "آپ سب لوگ اپنے مریض کے ساتھ بخیر و عافیت جلدی گھر لوٹیں" میرا گلا بھر آیا تھا۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پکڑے رہا۔ شاید اس کے منہ کی کڑواہٹ ختم ہو گئی تھی۔

زمینداری کا کام ادھر میں دیکھتا تھا اور ادھر منجھلے رائے۔ کئی بار پانی، کھیتوں کی ڈول، نوکروں چاکروں کے بارے میں گرما گرمی ہو جاتی تھی۔ بندھوا نوکر اس زمانے میں زمین سے زیادہ قیمتی مانے جاتے تھے۔ بندھوا نوکروں کو لے کر گھوڑا خرید بہت چلتی تھی۔ اس زمانے میں پاس سو روپے اور کچھ سالانہ اناج میں لوگ ہالی ہو جاتے تھے۔ ہالی بھی ایک طرح سے بندھوا ہی تھے۔ دو چار سو روپیہ بڑھا کر دوسرا فریق ہالی بنا لیتے تھے۔ اس گھوڑ خرید کے سبب ہالیوں کی قیمت بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے اور منجھلے چاچا کے درمیان کہا سنی کا سبب ہالی ہی ہوتے تھے۔ ایسا تب ہی ہوتا تھا جب میں اور منجھلے چاچا آمنے سامنے پڑ جاتے تھے۔ ہمارے دو تین گاؤں مشترک تھے۔

منجھلے رائے کا من ادھر ہم لوگوں کی طرف سے کافی پھر گیا تھا۔ کاکی وفات کے

بعد ان کی یہ تعریف بہت ہی واضح ہو گئی تھی۔ منجھلی چاچی تو دو تین بار آئی بھی تھیں لیکن منجھلے چاچا صرف تیرہویں کے دن فقط رسم نباہنے کے لیے آئے تھے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صرف ایک جملہ کہا تھا "تمھاری ماں کی موت کا مجھے اور تمھاری چاچی کو بہت دکھ ہوا ــــ موت کے سامنے کسی کی نہیں چلتی" بڑے راے سے وہ کچھ نہیں بولے تھے۔ چھوٹے راے سے خود ایک دو باتیں کی تھیں۔ چھوٹے راے نے ان سے کہہ بھی دیا تھا "منجھلے بھائی آپ کو یہ کیا ہو گیا ــــ لگتا ہے کلیجہ پتھر کر دیے ہیں۔ بھابی کی موت پر بھی آپ رسم نباہتے گھوم رہے ہیں۔ آپ کو اور بھابی کو تو بس آ کر رہنا چاہیے تھا۔"

وہ پہلے تو چپ رہے پھر بولے "میں تو آ بھی گیا... بڑے بھائی تو ہماری موت پر بھی نہیں آئے..."

"تم کب بلانے آئے؟"

"کہا تو بھیجا تھا۔"

"اس حیلے سے تو تمھیں خط لکھ کر افسوس کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ اپنوں کو کیا کارڈ بھیجنا ہی کافی ہوتا ہے؟"

وہ بولے "جو اپنے ہوتے ہیں انھیں تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔"

چھوٹے راے کو لگا یہ موقع بحث کرنے کا نہیں ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔ منجھلے راے نے سونا اور رگھوور کے بارے میں پوچھا "دونوں بچے کیسے ہیں؟"

"ابھی تو ٹھیک ہیں۔"

منجھلی چاچی نے رگھوور کے ہاتھ میں چاندی کے دو روپے دینے چاہیے تھے۔ چھوٹی چاچی نے روک دیا تھا "منجھلی دیدی، بعد میں دے دیجیے گا یہ موقع ایسا تھوڑا ہی ہے کہ جس بچے کی ماں مری ہو اس بچے کو آپ روپے دیں۔"

وہ بولیں "دیورانی آپ تو یہاں رہتی ہیں میں کب کب آتی ہوں؟"

چھوٹی چاچی نے اس بات کا تو جواب نہیں دیا لیکن روپے نہیں دینے دیے۔ منجھلی چاچی جھنجھناتی ہوئی چلی گئی تھیں۔

خیر، بات تو زمینداری کی ہو رہی تھی۔ زمینداری کے معاملے میں منجھلے چاچا کھنچے جا رہے تھے۔ دو چار بار ہمارے کاشتکاروں اور نوکروں پر بھی ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ اس سلسلے میں

کافی تناؤ رہنے لگا تھا۔ بڑے رائے اور منجھلے رائے کے درمیان تعلقات قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ منجھلے رائے نے اس کوٹھی کو بھی تڑوا کر اپنے انداز سے بنانا شروع کر دیا تھا جسے بڑے رائے نے اپنے ولایتی مہمانوں کے لیے بہت ذوق شوق سے بنوایا تھا۔ وہ کوٹھی شہر کی گنی چنی عمارتوں میں سے ایک تھی۔ اسے بہت شوق سے سجایا بھی گیا تھا۔ اس زمانے میں جو فوارے لگے تھے وہ اس قسم کے چھوٹے شہروں میں دیکھنے کو نہیں ملتے تھے۔ ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ ایک قطار میں چھوٹے چھوٹے کئی فوارے لگائے گئے تھے۔ ان پر رنگ برنگی روشنی پڑتی تھی جس سے پانی بھی الگ الگ رنگوں میں رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا تب واش بیسن کا رواج نہیں تھا لیکن بڑے رائے نے واش بیسن بھی لگوائے تھے۔ ان میں ٹینکوں سے ٹھنڈا اور گرم پانی آتا تھا۔ منجھلے رائے کے لیے وہ سب انتظام مشکل بھی تھا اور خرچیلا بھی۔ اس لیے وہ اسے تڑوا رہے تھے۔ بڑے رائے کو، گھر کی عزت کو بازار میں نیلام کر کے منجھلے رائے کے خلاف حکم امتناعی لینا پڑا تھا۔ بڑے رائے کو اس بات کا بہت کارنج تھا۔ شاید اپنے بڑے بیٹے کی بہو کی موت سے بھی زیادہ۔ موت تو ایشور کی غلام تھی۔ یہ تو انھیں خود کرنا پڑا تھا۔

منجھلے رائے کی خر دماغی کے سبب ان کی رعایا اور کاشت کار بھی بدظن ہوتے جارہے تھے۔ وہ ان کی کھڑی فصل کٹوا لیتے تھے اور آگ لگوا دیتے تھے۔ کئی بار تازہ کھیتوں میں ہل چلوا دیتے تھے۔ گالی دیے بغیر بات نہیں کرتے تھے 'ابے' تو ان کا تکیہ کلام تھا۔ مرچی چمار ان کا ہالی تھا۔ بعد میں جب اس کی نہیں پٹی تو اس نے بڑے رائے کی زمین جوتنی شروع کر دی تھی۔ اس پر منجھلے رائے اتنا ناراض ہوئے کہ انھوں نے اسے اپنے ڈیرے پر بلوا کر جوتوں سے پٹوایا۔ صرف پٹوایا ہی ہوتا تو بات الگ تھی، یہ بھی سنا گیا کہ اس کے منہ میں بھنگی سے پیشاب بھی کروایا۔ اس وقت تو وہ چلا گیا لیکن اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا "یا تو تم اس کا بدلہ لو یا پھر میرے لیے چتا تیار کر دو، میں اس میں کود پڑوں گا۔ چتا کی آگ اس آگ سے ٹھنڈی ہوگی۔"

مرچی کی گھر والی نے اسے سمجھانا چاہا "تم جا کر بڑے رائے کیوں نہیں کہتے! تمھارے مالک تو وہ ہیں۔ ان کی بے عزتی بھی تو ہوئی ہے۔"

"یہ سب لوگ ظلم کو ظلم نہ کہہ کر سزا کہتے ہیں۔ کسی کا رنگ گہرا ہوتا ہے کسی کا ہلکا رنگ ایک ہے۔ میرے دو جوان جہان بیٹے ہیں یا تو میں ان سے کہوں گا یا اوپر والے سے۔

پتہ نہیں اوپر والا سنے گا بھی یا نہیں۔ تم لوگ تو سامنے ہو۔ بتاؤ ــــ میں کیا کروں ــــ پتہ میں کو دیکھوں یا نہ دور رہوں۔"

دونوں بیٹوں نے ایک ہی بات کہی "تھوڑی مہلت دو بابو!" ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

مرکی نے ان کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ مطمئن ہو کر بولا "ٹھیک ہے۔ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔"

ایک دن تھکے رائے کا گود کا بیمار بچہ روتا روتا ڈیوڑھی پر آیا۔ چھوٹے رائے سے بولا "پتا جی، تاؤ جی کہاں ہیں؟"

"کیوں بیٹا؟"

بابو جی کل زمینداری کے دورے پر گئے تھے۔ شام کو واپس آنے کے لیے کہہ گئے تھے۔ ابھی تک نہیں لوٹے۔"

بڑے رائے پوجا میں تھے۔ چھوٹے رائے ایک منٹ سوچنے کے بعد بولے "تم گھر جاؤ، ہم شام تک پتہ لگوا کر ــــ گھر خبر بھیج دیں گے۔ ہو سکتا ہے آگے نکل گئے ہوں۔"

میں سویرے ہی زمینداری سے لوٹا تھا۔ چھوٹے رائے نے مجھے بلوایا۔ سونا اب بڑی ہو رہی تھی اور سمجھدار بھی۔ رگھوور دیوار کے سہارے کھڑا ہونے لگا تھا لیکن مجھ سے چپکا رہتا تھا۔ ساری مصیبت رانی کی ہی تھی۔ اسے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ سونا تو بوا بوا کر کے اس کے پیچھے لگی رہتی تھی۔ میں نیچے جانے لگا تو رگھوور مانا ہی نہیں۔ میں اسے گود میں لیے نیچے چلا آیا۔ بڑے رائے تب تک پوجا کر کے نکل آئے تھے۔ رگھوور کو گود میں لیے دیکھ کر کڑک کر بولے "تمہاری یہ ہمت کہ بے شرموں کی طرح اپنے بچے کو گود میں لے کر بڑوں کے سامنے آؤ!"

میں نے رگھوور کو ایسے چھوڑا جیسے وہ میرا اپنا بچہ نہ ہو کر چوری کا سامان ہو۔ وہ گر گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ اسے میں روتا ہوا دیکھتا رہا لیکن گود میں اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ چھوٹے رائے نے دوڑ کر اٹھایا، لیکن وہ وہ میرے پاس ہی آنے ضد کر رہا تھا اور میری اس

کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ چھوٹے رائے نے جھوائی کو پکارا اور دھیورد کو اندر حویلی میں لے جانے کے لیے کہا۔ وہ لے گیا۔ بڑے رائے ابھی غصے میں تھے۔

وہ بولے "ہم نے آج تک ویسے بھی اپنے بچوں کو گود میں نہیں لیا —— ماں باپ یا بڑوں کے سامنے لینے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ تم لوگ انگریز بن گئے۔ کیا بچے کو گود میں لے کر بے شرموں کی طرح کھلے عام گھومو گے؟!"

چھوٹے رائے بیچ میں ہی بولے "بھاسکر تمھیں معلوم ہے منجھلے بھیا کہاں ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس پورے معاملے میں منجھلے بھیا کہاں سے آ گئے۔ بولے "وہ کل سے گھر واپس نہیں آئے —— ان کا بیٹا نجن روتا ہوا آیا تھا اور تاؤ جی کو پوچھ رہا تھا۔"

بڑے رائے نے دھیرے سے دوہرایا "کرشن کا بیٹا مجھے پوچھ رہا تھا" چھوٹے رائے نے بڑے رائے کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ مجھ سے پوچھا "تم سے کہا سنی تو نہیں ہوئی؟"

مجھے ان کا یہ پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ کچھ مشتعل ہو کر بولا "آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں! —— مجھ سے ہوتی تو میں بتاتا نہیں؟"

چھوٹے رائے بولے "تو میں دیکھ کر آتا ہوں —— آخر بھائی ہے۔"

"لیکن وہ کہاں سمجھتا ہے!" یہ جملہ بڑے رائے کے درد کی تال میں سے بوند کی طرح اچھلتا تھا۔

چھوٹے رائے ان کے سامنے کم بولتے تھے۔ انھوں نے پھر کہا "بھائی تو بھائی ہی ہے۔"

چھوٹے رائے جانے لگے تو بڑے رائے نے مجھے بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے اسلحہ ساتھ لے کر ان کی زمینداری کی طرف چلے تو دلوں میں ایک طرح کی تشویش اور تناؤ تھا۔ جب سے مرچی کے ساتھ وہ واقعہ ہوا تھا تب سے یہی سننے میں آ رہا تھا کہ لوگ اس معاملے میں مشتعل ہیں۔ ہم لوگوں کو بھی برا بھلا کہا جا رہا تھا اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ ان کا کام چھوڑ کر ہمارے یہاں آنے کا سبب بنا تھا۔ یہ بات دل میں آتے آتے رہ جاتی تھی کہ کہیں ان لوگوں نے کوئی بدتمیزی نہ کر دی ہو۔

حالانکہ زمانہ ابھی اتنا نہیں بدلا تھا کہ چھوٹی ذات کے لوگ زمینداروں کے

ساتھ الجھا سیدھا کریں۔ انگریزی راج ابھی برقرار تھا۔ ہماری گاڑی پکی سڑک کی طرف مڑنے کو تھی تو مجھے سنائی دیا کہ کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہے ـــــ مجھے بچاؤ، میں نے جھانک کر دیکھا تو منجھلے رائے ایک پیڑ کی اوٹ میں بے حال نیم عریاں کھڑے ہیں۔ آنکھیں اور گال سوجے تھے۔ یہاں اس عالم میں دیکھ کر میں چکرا گیا۔ ان کی زمینداری ابھی چار پانچ میل تھی۔ وہ پیدل چھپتے چھپاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ انھوں نے شاید پہلے مجھے ہی گاڑی میں بیٹھے دیکھا۔ میں فوراً اتر کر ان کے پاس گیا۔ وہ بدحواس سے میرے ہاتھوں میں آگرے جیسے وہ کسی سہارے کے انتظار میں ہوں۔ تب تک چھوٹے رائے بھی آگئے تھے۔ ہم نے کوچوان کی مدد سے انھیں گاڑی میں لٹایا۔ کوچوان گھوڑے کی لگام پکڑ کر تھوڑی دور تک گاڑی الٹی چلا کر واپس لایا۔ پھر مین روڈ پر آکر گھر کی طرف موڑلی۔ وہ گھوڑے کافی تیز دوڑا رہا تھا۔

منجھلی چاچی پریشان تھیں۔ نوکر ہر طرف دوڑا دیے گئے تھے۔ چلتے چلتے چھوٹے رائے نے چھوٹی چاچی سے کہہ دیا تھا کہ وہ منجھلی چاچی کے پاس چلی جائیں۔ وہ اکیلی ہیں۔ چھوٹی چاچی ان ہی کے پاس تھیں۔

منجھلے رائے کو دیکھ کر وہ ایسے روئیں جیسے کسی عزیز کی لاش کو دیکھ کر رویا جاتا ہے۔ چھوٹے رائے کو ان کا اس طرح ہو ہو کر کے رونا اچھا نہیں لگا۔ انھوں نے بھی کہا "ایسے کیوں رو رہی ہو، بھابی! ایشور کے فضل سے منجھلے بھائی بخیر و عافیت ہیں۔ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے۔"

منجھلے بھائی نے ہم لوگوں کے سامنے پورے معاملے کی تفصیل نہ بتا کر صرف اتنا ہی بتایا کہ کچھ بدمعاشوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ ان کے الٹنے پلٹنے سے ان کی اندرونی بے چینی کا احساس واضح تھا۔ منجھلے رائے مکمل طور پر اپنا منہ سیے ہوئے تھے حالانکہ ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ منہ تو سوجا ہوا تھا ہی۔ آنکھوں کے ارد گرد سیاہ نشان تھے۔ پیشانی پر نیل ہی نیل تھے۔ ہاتھوں کو حرکت دینے میں تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ پاؤں بری طرح اکڑ گئے تھے۔

ہم لوگ دو تین گھنٹے ان کے پاس بیٹھے رہے۔ منجھلے رائے اندر ہی اندر ابال کھاتے

رہے۔ جیسے سانپ کا منہ پکڑ لیا گیا ہو اور اس کا جسم الٹیت کھا رہا ہو۔ منجھلی چاچی ایک دم خاموش تھیں۔ وہ چھوٹی چاچی سے بھی بات نہیں کر رہی تھیں۔ ان کا بیمار بچہ خوفزدہ سا باہر بیٹھا تھا۔

ان کے بولنے کا کافی دیر انتظار کر کے ہم چلے آئے۔ ہمیں تو انھوں نے ڈاکٹر کو بلانے کی اجازت بھی نہیں دی۔

ہم بیگانے ہی لوٹ آئے۔

منجھلے رائے نے مرچی اور اس کے خاندان پر ۳۰۷ کا مقدمہ ٹھوکا۔ دراصل منجھلے رائے اس رات کو اپنے ڈیرے میں ہی رک گئے تھے۔ انھیں لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک گورکھا سپاہی رہتا تھا۔ وہ ان کا دست راست تھا۔ وصولی کا کام بھی وہی کرتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر ان کا بدن بھی دباتا تھا۔ مالش بھی کرتا تھا۔ اس کے چہرے سے سختی جھلکتی تھی۔ اس سب کے باوجود وہ منجھلے رائے کا معتبر ترین آدمی تھا۔

منجھلے رائے کی عادت تھی کہ رات میں سوتے وقت کھڑکی کھلی رکھتے تھے تاکہ آسمان نظر آتا رہے۔ اس رات بھی وہ کھڑکی کھول اور دروازہ بند کر کے سو گئے۔ دروازے کے باہر والی کوٹھری میں گورکھا سویا تھا۔

وہ لوگ کھڑکی سے آئے۔ منجھلے رائے کی آنکھیں یکایک کھلیں تو انھیں لگا کہ کھڑکی پر کوئی ہے۔ انھوں نے پوچھا "کون ہے؟"

"ہم ہیں فتۃ اور چندن ــــــ مرچی کے بیٹے۔"

"کیا بات ہے؟"

"اپنے باپ کی بے عزتی کا حساب چکتا کرنے آئے ہیں۔"

وہ دونوں لڑکے اندر اتر گئے۔ مرچی کی بیٹی کھڑکی کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ مرچی اور اس کی گھر والی گورکھے کی کوٹھری کے باہر پہرہ دینے لگے۔

منجھلے رائے ان کی یہ بات سن کر بھی کوئی خاص بے چین نہیں ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیں گے۔ انھوں نے انھیں دھمکایا بھی "تم مجھ سے

حساب دکھاؤ گے تو تمھیں کہیں کا نہیں چھوڑوں گا۔ تباہ و برباد کر دوں گا۔"

وہ ان کی بات پر دھیان دیے بغیر لگاتار آگے بڑھتے رہے۔ جب وہ نہیں رکے تو منجھلے رائے کی آواز میں ہلکی سی کپکپی آ گئی "کیا چاہتے ہو؟"

"بدلہ ـــــ جو کچھ تم نے ہمارے باپ کے ساتھ کیا ہے ـــ وہی!"

اس سے پہلے کہ منجھلے رائے کچھ بولتے انھوں نے منجھلے رائے کو دبوچ لیا۔ تکیے کے نیچے رکھے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا تو فتے نے ہاتھ مروڑ دیے۔ وہ کراہ اٹھے۔ ان دونوں نے ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور دروازہ کھول کر اپنے باپو کو اندر لے آئے۔

وہ باپو سے بولے "دیکھتا کیا ہے، اٹھ دھوتی اور موت دے اس کے منہ میں۔"

لڑکوں نے اپنے باپ کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اس کی دھوتی اٹھا دی "اب مت چوک ـــــ جب تیرے منہ میں اس نے سختی سے موتوایا تھا تب اسے پاپ جیسی چنتا نہیں ہوئی تھی ـــــ تو اس کا موت پی کر بھی پاپ جن گا رہا ہے۔"

پہلے تو مرچی کا پیشاب ہی نہیں اترا۔ بیٹے اڑے رہے۔ زور لگانے پر بمشکل تھوڑا سا پیشاب آیا۔ منجھلے رائے کے منہ میں پیشاب گیا یا نہیں یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن ان کا سارا منہ جھیک گیا تھا اور وہ گردن مسلسل ہلا رہے تھے۔ ہاتھ جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسے ہونے کی وجہ سے بول نہیں پا رہے تھے۔ مرچی وہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا لیکن وہ دونوں لڑکے اسے ہٹنے نہیں دے رہے تھے۔

انھوں نے مرچی سے کہا "باپو، تو جا، گاؤں میں رانی لے کر باغ میں مل۔ وہیں اس کی کھال اتاریں گے۔"

مرچی نے سمجھایا "ارے کیوں اس کی اور اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو۔ پھانسی پر لٹک جاؤ گے۔"

"سنا ہے بڑے بڑے جنونی ملک کے لیے پھانسی پر لٹک رہے ہیں۔ ہم اپنے باپ کے لیے لٹک بھی گئے تو کون سی پڑ جائے گی۔ لیکن کمبخت کو تو پتہ لگ جائے گا کہ جتنی اس کی عزت کی قیمت ہے اتنی قیمت مرچی چمار کی بھی ہے۔"

انھوں نے مرچی چمار کو زبردستی، رانی لانے کے لیے بھیج دیا۔ ماں نے گور کھے کی کوٹھری پر دھیرے سے باہر کی کنڈی چڑھا دی تھی۔ دونوں بھائیوں نے منجھلے رائے کے

بستر کی چادر میں ہی ان کی گٹھری باندھ لی اور کھڑکی کے دوسری طرف کھڑی اپنے بہن کے سر پر اتار دی۔ وزن کافی تھا۔ سنبھالنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے دوسری طرف کود گئے اور اپنی بہن سے گٹھری لے لی۔ وہ تینوں منجھلے رائے کو باغ میں لے گئے۔ بیچ بیچ میں اس گٹھری میں کپکپاہٹ سی ہوتی تھی جیسے مرگی کا دورہ پڑ رہا ہو۔ انھوں نے وہاں جاکر گٹھری کھول دی۔ منجھلے رائے نے آنکھیں پلٹ دیں۔ اس وقت تک ماں بھی آگئی تھی۔ گورکھا ابھی تک سو رہا تھا۔ ماں نے دیکھا تو بولی "ارے یہ کیا کر رہے ہو، کہیں منجھلے رائے مر گیا تو سارا گاؤں زندہ جلا دیا جائے گا۔"

چندن بولا "مر جانے دے، کہیں کھود کر گاڑ دیں گے۔"

ماں نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ان میں حرکت ہوئی حالانکہ پورا ہوش تب بھی نہیں آیا تھا۔ بیچ بیچ میں کچھ بدبدائے۔ لڑکی نے غور سے سنا تو اسے رنجن جیسا کوئی لفظ سنائی دیا تھا، وہ سمجھی نہیں۔

مرچی کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ لڑکوں کو فکر ہوئی، گھنٹے دو گھنٹے میں چڑیاں بولنے لگیں گی۔ گاؤں میں جاگ ہو جائے گی تو اسے کہاں چھپائیں گے۔ وہ بہن سے بولے "باپو میں بڑی مایا ہے۔ ابھی تک نہیں لوٹا۔ وہ سمجھتا ہے اسے چھوڑ دینے سے ہم بچ جائیں گے۔ مرنا تو ہر حالت میں ہے —— مار کر بھی اور چھوڑ کر بھی۔ ہم دونوں بھائی راپی لے کر آتے ہیں تو اور ماں یہاں رہو۔ بھاگنے مت دینا۔"

منجھلے رائے کو ہوش آنے لگا تھا۔ ماں کو حاجت محسوس ہونے لگی۔ وہ فارغ ہونے چلی گئی۔ منجھلے رائے نے مرچی کی بیٹی کو منہ میں سے کپڑا نکالنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو وہ جھجکی پھر نکال دیا۔

منجھلے رائے ہاتھ جوڑ کر بولے تو میری دھرم کی بیٹی ہے، میں کبھی کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کروں گا۔ میرا بیٹا چھوٹا ہے —— میں نہیں پہنچا تو وہ رو رو کر پاگل ہو جائے گا۔ میرے بھائی لوگ اسے جان سے مار ڈالیں گے۔"

لڑکی کو ترس آگیا۔ اس نے جلدی جلدی کر کے ان کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ منجھلے رائے کو اٹھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ لڑکی نے سہارا دے کر کھڑا کیا اور کہا "بابو، میرے بھائی تیری کھال اتارنے کے لیے راپی لینے گئے ہیں۔ ماں

جنگل دِشا گئی ہے۔ تو جلدی سے جتنی دور ہو سکے نکل جا ـــــ انھوں نے پکڑ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ماں کو تو میں سنبھال لوں گی ـــــ لیکن یہ کہے دیتی ہوں کہ تو نے بابو کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ پر میرے باپو نے تجھے معاف کر دیا اس لیے میں بھی تجھے چھوڑے دے رہی ہوں۔"

نِکھلے رائے کسی طرح اس گھپ اندھیرے میں گرتے پڑتے، جھاڑیوں میں الجھتے، چھپتے چھپاتے، جان ہتھیلی پر رکھے جلدی جلدی بڑھ رہے تھے۔ وہ لڑکی کچھ دور تک انھیں سہارا دے کر راستے پر چھوڑ گئی تھی۔

جب سب لوگ واپس آئے تو نِکھلے رائے اندھیرے میں گم ہو چکے تھے۔

میری تیسری شادی کی بات شروع ہو گئی تھی۔ اب عمر وہ نہیں رہی تھی۔ لیکن تب شادی تو بڑے بوڑھے بھی کرتے تھے۔ اب خاندان اور پسند کی بات اپنی نہیں رہی تھی۔ صرف شادی کی بات تھی۔ چھوٹی چاچی اب مکمل طور پر پوجا پاٹ میں لگ گئی تھیں۔ بڑا دن برت، تیوہار اور اُدیاپن (برت وغیرہ ختم ہونے پر دھارمک کرم) ہفتے میں دو دن دونوں وقت کھانا کھاتی ہوں، تو کھاتی ہوں۔ ان کو کہیں نہ کہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ میں کس کے لیے اپنا مستقبل بگاڑوں۔ چیز تھی بھی دوسرے کی، کہاں بھی پرائی۔ کیا بھی کوئی اور سوت تیر ایسے؟

جہاں تک میرا سوال تھا میں شادی کر کے دیکھ چکا تھا۔ یہی لگتا تھا کہ تیسری بھی ہو جائے گی کیا فرق پڑے گا۔ من کے رشتے دو بار آدھے ادھورے بن کر ٹوٹ چکے تھے تیسرا رشتہ کیسا ہو گا۔ اس کا کیا پتہ؟ میں نے اس سلسلے میں کشن بابو سے مشورہ کیا تھا۔ کشن بابو اب ایک ہٹ یوگی کی طرح سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ ان کا بیٹا تھوڑا بہت کمانے لگا تھا۔ بیوی اسی کے پاس رہتی تھی۔ کشن بابو نے گھمکڑی اختیار کر لی تھی۔ جب کبھی گھر پر بھیڑ جمع ہوتی تھی تو کشن بابو بھی کام کر لیتے تھے۔ ان کی چوٹی جڑ افیم جاری تھی۔ شام کے چار بجے نہیں کہ وہ افیم کے چکر میں نکلے نہیں۔ کبھی جھانکا نہیں بیٹھتا تھا تو اپنی اسی قدرتی افیم کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ انھیں سب ہی سمجھاتے تھے کہ یہ کام کرنا چھوڑ دو، کسی روز جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

ان کے پاس اس بات کا ایک ہی جواب تھا "جان کون ہماری ہے جس نے دی ہے ــــ وہ ہمیشہ کے لیے تو اسے ہمارے پاس چھوڑنے والا ہے نہیں، پتہ نہیں کب لے لے۔ لینے کے لیے اسے بھی تو کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے ہی ــــ میں کب تک دوسرے کی چیز کی رکھوالی کروں گا۔ دھاگا ہے، ہم چٹکا دیں یا وہ چٹکائے۔ جب بیوی ہی بیوی نہیں رہی، وہ بھی ماں بن گئی۔ ایک وقت کے بعد سب ماں بن جاتی ہیں۔ میرا بیٹا ہے باپ بن گیا ہے۔ سب سے پہلے وہ یہ دیکھتا ہے بابو کو کیا چاہیے؟ بے چارہ جگاڑ کر کے لاتا ہے۔ میں تو کبھی باپ ہو کر بھی باپ نہیں تھا" ان کی بات پر ہنسی بھی آتی ہے اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر اندر ہی اندر رو وگھٹ بھی جاتی۔

کشن بابو رحمت اللہ کی بیماری کی بات سن کر آئے تھے۔ اس کے یہاں ٹھہرے تھے۔ رحمت اللہ کو اچانک کوئی ایسی پراسرار بیماری ہو گئی تھی کہ وہ مستقل سوکھتا جا رہا تھا۔ بھوک ذرا بھی نہیں لگتی تھی۔ بڑے رائے نے اس شہر کے سب سے نامی گرامی ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ انھوں نے یہ ہی بتایا تھا کہ اس کا خون پتلا پڑتا جا رہا ہے۔ جب خون پتلا پڑنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی تو اس نے بتایا خون میں باہر سے آنے والی بیماریوں کا سامنا کرنے کی طاقت کم ہو گئی ہے۔ رحمت اللہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ کبھی کبھی سہارا لے کر دوکان پر آلیٹتا تھا۔ تھوڑا بہت جو کام ملتا، اسے لے جاتا تھا۔ گھر والی کر دیتی تھی۔ بڑے رائے سمجھ گئے تھے کہ رحمت اللہ اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے کئی بار کوشش کی کہ اس کا اور اس کی بیوی کا مستقل انتظام کر دیں لیکن رحمت اللہ اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ یہ ہی کہتا تھا کہ مالک آپ فکر نہ کریں، میں پھر پہلے ہی جیسا ہو جاؤں گا۔ پہلے کی طرح ہی چلتا گھوڑا روک دیا کروں گا۔ اسے یہ فن معلوم تھا وہ صرف ایک ہاتھ اور ایک رسّی سے گھوڑے کو اس طرح روک دیتا تھا کہ کیا مجال ہے جو ایک قدم آگے بڑھ سکے۔ جب لوگ پوچھتے تھے کہ استاد یہ تو بتاؤ کہ فقط ایک رسّی پھینک کر دوڑتے گھوڑے کو کیسے روک دیتے ہو تو وہ صرف ہنس دیتا تھا۔ کبھی کبھی کہتا تھا کہ میرے خاندان کی یہ رسم رہی ہے کہ ہر باپ اپنے بیٹے کو ہی بتاتا ہے۔ میں بھی اپنے بیٹے کو بتاؤں گا۔ لیکن اب وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اب بیٹے کی امید ختم ہو چکی تھی ــــ اس خستہ حالی

میں بیٹی کی تمنا وہ کرے ـــــ

گشن بابو بھی بڑے راستے سے ہی کر یہ سمجھ گئے تھے کہ رحمت اللہ کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ وہ اپنا بیشتر وقت اس کے پاس گزارتے تھے حالانکہ وہ چھوٹا آدمی تھا لیکن اس کا گھر صاف رہتا تھا۔ وہ انھیں جگن آچاریہ کے قصے سنایا کرتا تھا ـــــ وہ بیٹھے جاتے تھے۔ بیٹھتے تھے۔ کتابوں پر کتابیں پڑھتے رہتے تھے، لکھتے رہتے تھے ـــــ یہی کہتا تھا میرے گھر پر اتنا بڑا آدمی آچکا ہے کہ اب اگر میں مر بھی جاؤں تو کوئی ملال نہیں ـــــ گھوڑے کے ساتھ جینے والا ایک سائیس گاندھی جی کے اینٹی کے ساتھ رہ چکا ـــــ گشن بابو جیسا دیوتا اس گھر کا مہمان رہ چکا ـــــ بھاسکر راؤ آچکے۔ میرا تو بیڑا پار لگ گیا بس فکر ایک ہی بات کی ہے کہ اس بے چارے کا کیا ہوگا ـــــ اپنے بڑوں سے اس علم کو سیکھتا کر جاؤں گا۔

آخر میں دوڑتے گھوڑے کو روک دینے والا وہ ہنر اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ ایک نس تھی جس پر زور پڑتے ہی گھوڑا بے دم ہو جاتا ہے۔ اسی پر پھندا پھینکنا ہوتا ہے۔ گھوڑا بے جان ہو کر گر پڑتا تھا۔

شروع شروع میں گشن بابو حویلی پر آتے رہتے تھے لیکن جب سے رحمت اللہ کی حالت خراب ہوئی تھی تب سے انھوں نے اس کے پاس سے ملنا بند کر دیا تھا۔ بعد کے دنوں میں رحمت اللہ کے جسم میں ایک عجیب قسم کا درد ہونے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کی نسیں کھنچ رہی ہیں۔ وہ اس کے پاس بیٹھے اس کا انگ انگ سہلاتے رہتے تھے۔ اس کی گھر والی نساعرف ستابو انھیں ایسا کرنے سے بہت روکتی تھی۔ وہ یہی کہتے تھے کہ ـــــ جب تک میں ہوں، تمھیں کس بات کی فکر! اسے گھر کا تو کام کرنا ہی پڑتا تھا۔ رات رات بھر سلائی بھی کرتی تھی۔ وہ یہی کہتے تھے کہ میں چوبیس گھنٹے خالی پڑا رہتا ہوں۔ نہ کوئی چوبیس گھنٹے خالی پڑا رہ سکتا ہے اور نہ کام کرتے رہ سکتا ہے۔ وہ ان کے سامنے چپ لگا جاتی تھی۔

میں اپنی شادی کی بات کرنے ہی رحمت اللہ کے گھر گیا تھا۔ اکیلا۔ کسی کو ہوا لگنے دیے بغیر۔ رحمت اللہ غنودگی سی کیفیت میں رہتا تھا۔ کبھی ہوش میں رہتا اور کبھی ہوش میں آجاتا۔ میں نے پوری بات گشن بابو کو بتائی۔ وہ سنتے رہے۔ پھر بولے "بھاسکر بابو، میں کیا

بتاؤں۔ تم اپنی ضرورت کو سمجھو!"

"میری اپنی ضرورت تو اتنی نہیں ــــ بس بند گھر کھلنے کی بات ہے۔ بڑے رائے خود تو نہیں کہتے لیکن چھوٹے رائے سے کہلاتے ہیں کہ ہم سب پکے آم ہیں ــ پتہ نہیں کب ٹپک جائیں۔ رانی کا بیاہ ہو جائے گا۔ چاچی پو جاپاٹھ میں رہتی ہیں۔ دونوں بچوں کو ان دیکھے گا سونا اور رگھو ور کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"تمھاری ضرورت کیوں نہیں ــــ ضرورت تو سب کو ہوتی ہے۔ اس کی تکمیل کیسے ہو، یہ دوسری بات ہے۔ تم جانتے ہو کہ اپنے آپ کو آسودہ کرنے کا میرا طریقہ پہلے کچھ اور تھا۔ اب میری ضرورت چار آنے بھر افیم ہے۔ وہ نہ ہو تب بھی اتنا بڑا جنگل ہے، وہاں بنی بالیوں میں میرا نشہ بھرا پڑا ہے۔ اپنی آسودگی کا کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی راستہ ہر ایک کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔"

رحمت اللہ حالانکہ نیم ہوش میں تھا لیکن یہ سب باتیں اس کے دماغ میں درج ہو رہی تھیں۔ وہ بولا "بھیا، آپ ہی گھر کے چراغ ہیں ــــ چراغ کو جلتا رہنے دو۔ خدا ان دونوں بچوں کی عمر دراز کرے ــــ ان کی فکر تو کرنی ہی ہوگی۔ جب سے بڑی مالکن گئیں، حویلی کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ بڑے رائے کہاں تک تن تنہا اس کی لیپا پوتی کریں۔ آپ کو ہی چراغ سے چراغ جلانا ہوگا۔"

کشن بابو تھوڑا سوچ کر بولے "حالات کے پیش نظر تمھیں شادی کر لینی چاہیے۔ ویسے آزادی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ لیکن آزادی کوئی ایسا نسخہ نہیں کہ ہر مرض کا علاج ہو۔ کئی بار ذمہ داریوں کے تحت غلامی بھی آزادی میں بدل جاتی ہے۔ تمھیں بچوں کو پالنا ہے، بزرگوں کو دیکھنا ہے، زمینداری کو سنبھالنا ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو بانٹنا ہی ہوگا۔ بیوی خواہ کیسی بھی ہو، دھیان تو بانٹتی ہی ہے اور اگر گرنے لگے تو ہاتھ بھی تھام لیتی ہے۔ جب میں پہلے یہاں لٹا پٹا گاؤں واپس آیا تو میری گھروالی نے مجھے ایسا سمجھایا کہ میں اس مغالطے کا شکار ہو گیا کہ میرا کچھ بھی نہیں گیا ــــ سب کچھ ہے۔ میں بے پناہ دولت کا مالک ہوں۔ وہ بے پناہ دولت تھی ــــ خود اعتمادی ــــ یہ مغالطے حسین تو ہوتے ہی ہیں، کئی بار ایسی پوشیدہ مصلحت کو سامنے لاتے ہیں جس کو ہم مسلسل نظرانداز کرتے رہتے ہیں۔"

کشن بابو نے اپنی سوچ کے خلاف مجھے راستہ دکھایا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے تھے کہ انسان اپنے آپ فیصلہ کرے مجھے لگتا ہے کہ اندر کوئی چشمہ ہے جو ہماری سوچ کے باوجود انھیں مستقل تر کرتا رہتا ہے اور بے پناہ ہمدردی سے لبریز رہتا ہے۔

رحمت اللہ نے اپنی گرتی ہوئی آواز میں اپنی گھر والی کو بلایا اور کہا "اپنے سب سے چھوٹے رائے کا منہ میٹھا کردے ___ اب یہ ہمارا ملک ہے۔ میرے بھتیجے جی ان کا گھر بس جائے ___ بس ___" پھر کہا "حلوائی کے لڑکے سے کہنا اپنے ہاتھ دھو دے جائے ___ تم مت چھونا۔"

کشن بابو نے میری طرف دیکھا۔ میں فوراً بولا "آپ یہ کہہ رہے ہو، تم اور بہو کیا بیچتے ہیں؟" "ہم لوگوں کے یہاں رعایا کی بیوی کو چاہے عمر میں بڑی ہی کیوں نہ ہو، بہو ہی کہا جاتا تھا۔

کشن بابو کو میری بات شاید اچھی لگی وہ مسکرا دیے اور بولے "اچھا سکھ بابو، اس بات کا بعد میں بھی دھیان رکھنا" اور میری طرف دزدیدہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔

میری تیسری شادی گرمیوں میں ہوئی تھی۔ رگھوبر کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں۔ وہ میرے بغیر گھر پر جوالی اور رانی کے پاس ہی رہ رہا تھا لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ بابو جی کے پاس جاؤں گا۔ بابو جی کو بلاؤ۔ میں پھیروں پر بیٹھا تھا۔ میرے پاس لگاتار خبر پہنچ رہی تھی چونکہ شادی نزدیک ہی تھی اس لیے میں قاعدے قانون کی پرواہ کیے بغیر پھیروں کے بعد رات کو ہی گھر آگیا تھا۔ رگھوبر کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ سونا حیرت زدہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی اور نہیں بھی سمجھتی تھی۔ اتنا جانتی تھی کہ نئی ماں آنے والی ہے۔ نئی ماں کا مطلب بھی اس کے لیے اتنا واضح نہیں تھا لیکن چونکہ اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا اس لیے اسے یہ لگ رہا تھا کہ کوئی دوسری ماں آئے گی جو اس کی ماں سے الگ ہوگی۔ کیسی ہوگی یہ نہیں سوچ پارہی تھی۔

اس شادی کو اب قریب چالیس برس ہوگئے۔ ہوسکتا ہے پینتالیس ہوگئے ہوں۔ کبھی کبھی یہ سوال میرے دماغ میں اب بھی اٹھتا ہے کہ تیسری شادی کرکے میں نے صحیح کیا یا غلط؟ میری یہ شادی بہت ہی کم عمر کی لڑکی سارنگا کے ساتھ ہوئی تھی۔ تب وہ تقریباً ۱۸

برس کی رہی ہوگی۔ گھر بھی چھوٹا تھا۔ یہ سوال میرے ذہن میں اسی وقت اٹھتا تھا جب اس کے من میں بغاوت کی چنگاری بھڑکتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بجھ بھی جاتی تھی۔ خاص طور سے وہ اس وقت بیدار ہوتا تھا جب میرا بیٹا رگھوور اور بیٹی سونا میرے پاس آکر منڈلانے لگتے تھے۔ میری توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کی کوشش کرتے تھے اور میرا دھیان اس کی طرف سے ہٹ جاتا تھا۔ سونا اپنی نئی ماں کو رانی اور اس کی دیکھا دیکھی بھابی ہی کہتی تھی۔ رگھوور کو البتہ بھوانی نے اماں کہنا سکھا دیا تھا۔ شاید وہ سوچتا تھا کہ اماں کہنے سے عورت کا من نرم پڑ جاتا ہے۔ اجنبی سے اجنبی کے بارے میں جذبہ بدل جاتا ہے۔ ویسے دونوں ہی بچے رانی سے زیادہ چپکے رہتے تھے۔ یہ بات اسے بری لگتی تھی۔ ادھر رانی کی شادی کی بات شروع ہوگئی تھی۔ اس کی شادی کے بعد دونوں بچوں کے لیے گھر کو گھر کہنے کے لیے نئی ماں کے علاوہ کوئی بنیاد نہ تھی۔ رگھوور کو ایک فائدہ تھا۔ بڑے رائے اسے اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ چھوٹے رائے اسے بھجن سناتے تھے ـــــ برج کی لتاؤں میں گزارہ کریں گے ـــــ کنھیا کنھیا پکارا کریں گے ـــــ بنائیں گے ہر دوے میں ایک پریم مندر ـــــ اسی میں کنھیا بٹھایا کریں گے۔

گوپال بھیا کی کہانی سناتے تھے کہ کس طرح بیوہ کے بیٹے کی گوپال بھیا نے مدد کی تھی اور ماسٹر جی کی بیٹی کی شادی میں گوپال بھیا کی چھوٹی سی لٹیا سے نکلے دودھ نے ناندوں پر ناندیں بھر دی تھیں پھر بھی دودھ ختم نہیں ہوا تھا۔ کبھی مہابھارت کی کہانیاں سناتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ رگھوور کا من ہمیشہ اندر یعنی زنان خانے سے باہر کی طرف بھاگتا رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کھانا بھی باہر ہی لگ کر جائے۔ سونا اکیلی پڑ جاتی تھی۔

چھوٹی چاچی کام سے کام رکھتی تھی۔ کبھی ہوا تو نئی بہو کو پکار لیا کہ ذرا فلاں کام کر دے۔ وہ آکر کر جاتی تھی۔ سارنگا میں ایک خاص بات تھی کہ وہ کام کر کے خوش ہوتی تھی، اس لیے اس کے بارے میں باقی لوگوں کا کوئی خاص برا خیال نہ تھا۔ لیکن سونا نے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ اپنی ماں کا موازنہ نئی ماں سے کرتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب نئی ماں کہیں مصروف ہوتی تھی تو سونا اپنے بھائی کو کا کے بارے میں بتایا کرتی تھی۔ وہ کتنا اچھا گاتی تھیں۔ کس طرح کپڑے سیتے ہوئے لوری سناتی جاتی تھیں، ان کے دل میں کتنا پیار تھا۔ رگھوور چپ چاپ رہتا تھا۔ اس کے دل میں ماں نام کے رشتے کا کوئی واضح تصور نہ تھا اس لیے

وہ اسے کہانی کی طرح سنتا تھا اور اسی میں سے ماں کا تصور کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ماں کے سامنے کیوں نہیں تھا۔ اب ماں کیوں نہیں ہے؟ وہ ہوتیں تو نئی ماں جیسی ہی ہوتیں یا ان سے مختلف؟

سونا کہتی "ماں تجھے دودھ پلاتے پلاتے چلی گئیں۔"

"ہم ماں کے پاس کب چلیں گے؟"

"مر کر۔"

"مرنا کیا ہوتا ہے؟"

وہ کچھ اس طرح بتاتی جیسے مرنے جینے کی گتھی سمجھ چکی ہو۔ وہ اپنی گردن جھکا دیتی اور پھر کہتی "بس سب اٹھا کر لے جاتے ہیں اور جلا آتے ہیں۔"

"ہم مر جائیں گے تو ہمیں بھی جلا دیں گے؟"

"ہاں ــــــ"

"تو ہم ماں کے پاس نہیں چلیں گے" منا تنا جو گیا ہو۔

"تو مجھے مار دے ــــــ میں ماں کے پاس چلی جاؤں گی۔"

"میں بابا سے کہوں گا، چھوٹا گندی باتیں کرتی ہے۔"

"ماں کے پاس جانا گندی بات ہے؟"

"یہ بھی تو اماں ہیں، تو ان کے پاس رہ۔"

"نہیں، میری تو بھابی ہے، اماں تیری ہوں گی۔ پہلے جہاں سوتی تھیں اب وہاں ماں سوتی ہے" ادھر ادھر دیکھ کر بولی "گندی"

دونوں بچوں کو ایک دن نئی ماں نے باتیں کرتے ہوئے سن لیا تھا۔ شام کو لوٹتے ہی سب سے پہلے اس نے مجھ سے بولنا بند کر دیا۔ ہر بات کا 'ہوں'، 'ہاں' میں جواب دے رہی تھی۔ میں نے جب ڈپٹ کر پوچھا تو بولی "اب میرا یہاں رہنا ممکن نہیں ہے۔"

"کہاں رہو گی؟"

"مجھے میرے گھر بھجوا دو۔"

"کیوں؟"

"یہ دونوں بچے مجھے پسند نہیں کرتے ــــــ آپ مجھے بچوں کے لیے ہی بیاہ کر

اآئے ہیں نا! ہم غریب ضرور ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ۔۔۔" وہ رونے لگی۔

"لیکن ہوا کیا؟"

سونا سے پوچھیے، وہ سمجھتی ہے، میں اس کی ماں کی جگہ آئی ہوں۔ رگھوور ـــــ چھوٹے سے بچے کو میرے خلاف بھرتی ہے ـــــ کہتی ہے ـــــ جہاں ماں سوتی ہے وہاں بھائی سوتی ہے۔"

وہ اس وقت بہت جج و حج کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس جج و حج کو برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے سونا کو بلایا۔ سب سے پہلے چپت رسید کیا۔ بعد میں پوچھا "تم اپنی نئی ماں کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں؟"

رگھوور آکر چپ چاپ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بہن کے چپت لگنے سے سہم گیا۔ پہلی بار کسی کو مار کھاتے دیکھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹا گیا اور جا کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ بالکا سا اسے بھی دانا۔ شاید وہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ سونا کے دل میں نئی ماں کے لیے ہمیشہ کے لیے گانٹھ پڑ گئی۔ وہ کبھی نئی ماں کو اپنی ماں کے مقام پر نہیں بٹھا سکی۔ جزوی طور پر یہ بات رگھوور کے ساتھ بھی ہوئی۔ وہ زبانی تو نہیں ہوا لیکن اس کے باہر رہنے کی عادت پڑ گئی۔ مشکل سونا کی تھی۔ گھر میں رہنا بھی پڑتا تھا اور نئی ماں کو ماں کے طور پر سہنا بھی پڑتا تھا۔ بکری کے لیے کھانا تھا لیکن سنگھ کے سامنے بندھی تھی۔ وہ زیادہ تر چھوٹی چاچی کے آس پاس ہی رہتی تھی۔

چپت کھانے کے بعد وہ سن ہو گئی۔ میں نے پوچھا "ماں کے بارے میں پھر ایسی بات کرے گی؟"

وہ چپ رہی۔ میں نے اس کے کان اینٹھے۔ وہ زور سے رو پڑی۔ وہ غصہ ضبط کرنے کی حد سے آگے نکل چکی تھی۔

رانی دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے دیکھا تو دروازے پر ہی رک گئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اسے مداخلت کرنی چاہیے یا نہیں۔ لیکن اس نے دونوں کو پالا پوسا تھا۔ وہ اور تو کچھ نہ کہہ سکی۔ اوپر اڑتی چیل کی طرح جھپٹے کے ساتھ دونوں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔ چھوٹی چاچی کے حصے میں جا کر بہت روئی "چاچی ان دونوں کو کیا ہو گا ـــــ انھیں کون دیکھے گا؟ بڑے بھیا نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا، آج۔۔۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور آنکھیں

بولتے نیم کی طرح بہہ رہی تھیں۔ زار زار۔

چاچی نے ان دونوں کو سینے سے لگا لیا تھا۔ انھیں بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ اس وقت اپنے کو نہ روک سکی تھیں۔ جب تک رانی کی شادی ہوئی، وہ گھورا اور ہونو کو اپنے سے دور نہیں ہونے دیتی تھیں۔ شادی میں ان کی بہت کوشش رہی کہ وہ ہونو کو اپنے ساتھ لے جائے لیکن چھوٹی چاچی نے اسے بہت مشکل سے سمجھایا کہ "بیٹی دوسرے کی بلا کوئی اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ کچھ دن تو کوئی نہیں بولے گا ____ بعد میں اس کے ساتھ وہی ہونے لگے گا جو یہاں اس کی نئی ماں کے سبب ہوتا ہے" وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

رانی کی شادی کافی بڑے گھر میں ہوئی تھی۔ ان کی بھی اچھی بڑی زمینداری تھی۔ وہ لوگ دو سو بھارکس لے کر آئے تھے۔ ان کی شرط تھی کہ بیلوں کو گھی، چنا اور سرسوں کی کھلی اور بھوسا دیا جائے۔ گھوڑوں کی بات الگ تھی۔ بیل والوں کے لیے انھوں نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی۔ بڑے رائے نے ان کے لیے بھی وہی سب انتظام کیا تھا جو براتیوں کے لیے تھا لیکن وہ تب تک نہیں کھاپاتے تھے جب تک ان کے مالک کہہ نہ دیں یا کھاپی کر آرام کرنے نہ چلے جائیں۔ ان کی آنتوں کو قل ہو اللہ پڑھنے کی پرانی عادت تھی۔ رانی کے سسر کا غصہ دور دور تک مشہور تھا۔ جو لڑکا رانی کو بیاہنے آرہا تھا وہ زمیندار صاحب کی پہلی بیوی کا لڑکا تھا۔ زمیندار صاحب کے بڑے بھائی کنس کے نام سے مشہور تھے۔ ایک دن جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر زمینداری کے دورے پر تھے کسی گوجر نے پیچھے سے ان کی گردن اتار لی تھی۔ گھر والوں نے اس بات کا کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا تھا۔ کہیں لوگوں کے دلوں سے ڈر نہ نکل جائے۔ چپ چاپ داہ سنسکار کر دیا تھا۔ بعد میں جو استحصال کا چکر چلا اسے وہ گاؤں والے اب تک نہیں بھولے۔ تب زمیندار اور گھوڑے اپنی تیزی اور بگڑیل پن کے لیے مشہور ہوتے تھے۔

بڑے رائے ان لوگوں کے مزاج سے واقف تھے اس لیے انھوں نے پیسے کے زور پر جو انتظام کیا جا سکتا تھا، اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس زمانے میں ڈیڑھ لاکھ خرچ ہوا تھا۔ پہلے ہی حویلی کے اتنے اخراجات تھے کہ قرضہ گلے تک پہنچا رہتا تھا۔ لینے اور

اتارنے ـــــ دونوں کا بار میرے شانوں پر تھا۔ اس زمانے میں جہیز مانگنا برا مانا جاتا تھا۔ لیکن لڑکی والوں کے زیادہ سے زیادہ دینا باعث فخر تھا۔ وہ اسی پر مر مٹتے تھے۔ تب نہ مانگنا مناتا تھا اب مانگ منادیتی ہے۔ لیکن جو حالات تھے ان میں پیسے کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ زمین جائیداد کے دام بھی زیادہ نہیں تھے۔ تب زمین کے خریدار کم ہوتے تھے۔ ایک تو کانگریس کا زور۔ لوگ سوچتے تھے کہ کانگریس آگئی اور انگریز چلے گئے تو زمین جائیداد کا کیا ہوگا؟ لوگوں اک خیال تھا کہ کانگریس کے راج میں نہ کوئی بڑا رہے گا نہ چھوٹا۔ یہ گاندھی جی کا اثر تھا۔ گاندھی جی اپنے آپ گاندھی بنے تھے انھیں کسی نے بنایا نہیں تھا۔ اب لوگ گاندھی واندھی نہیں بنتے افسر اور سرمایے دار بنتے ہیں۔ زمین جائیداد کے رہنے نہ رہنے کی بات خیالی کے کام کی طرح ہوتی جا رہی تھی۔ کاٹے اور بیے بغیر سائز طے نہیں ہوتا۔ جنگ کا ماحول تو تھا ہی۔ بس اب نام ہی بچا تھا لوگوں کو تو معلوم تھا کہ ویسے تو بڑے رائے خالی ہیں لیکن ایک بھرم بنا ہوا تھا کہ رائے خاندان کے بڑوں کا سونا چاندی تخزانے میں دبا پڑا ہے۔ اس لیے قرض مل جاتا تھا۔ آگے پیچھے بھی ہوتا رہتا تھا۔ تھوڑی بہت ساکھ برقرار تھی۔ ساکھ دراصل ایسے ہی معاملوں میں زیادہ کام آتی ہے۔

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ بہت کم پیسوں کا انتظام ہوا تھا۔ بڑے رائے بھی اب فکر کے حصار میں آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ بہت سویرے اٹھے اور اکیلے ہی چل دیے۔ ایک تو بڑے رائے پیدل بہت کم نکلتے تھے اور پھر اکیلے۔۔۔ جب سب لوگ سو کر اٹھے اور بڑے رائے کو آداب کرنے گئے تو نہ جوتے تھے نہ بیت۔ کمرہ اور بستر دونوں خالی۔ حجامت بھی نہیں بنائی تھی۔ حقہ بھی تازہ نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے رائے تک کو یاد نہیں تھا کہ ان کی یاد میں بڑے رائے حجامت بنائے بغیر حویلی سے باہر نکلے ہوں۔

پورا گھر سکتے میں تھا۔ بڑے رائے گئے تو کہاں گئے۔ رانی سب سے زیادہ دکھی تھی۔ اسے اندر ہی اندر یہ بات جلائے دے رہی تھی کہ کہیں بڑے رائے اس کی وجہ سے گھر چھوڑ کر نہ چلے گئے ہوں۔ اس کا بے تحاشہ رونا دیکھ کر گھر میں باقی لوگ بھی اپنا دکھ بھول گئے تھے۔ دوپہر تک بڑے رائے کی خاموشی سے تلاش ہوتی رہی۔ جہاں جہاں بڑے رائے کے جانے کے امکانات تھے وہاں وہاں بڑے رائے کی تلاش کی گئی۔ دوپہر بعد بڑے رائے گرد آلود حالت میں لوٹے۔ سب ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ چلتے چلے آرہے تھے۔ وہ

سیدھے اپنے کمرے میں گئے۔ کمرہ بند کیا۔ کپڑے بدلے۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکل آئے۔ تب تک لوگ وہیں کھڑے تھے اور منہ کھولے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ آگے بڑھ کر کچھ پوچھے۔ رانی اندر سے آکر بولی "آپ کہاں چلے گئے تھے بابا، وہ بلک کر رو پڑی۔

بڑے رائے بھی متاثر ہو گئے۔ ان کے منہ سے بول نہیں نکلے۔ کچھ دیر بعد سنبھل کر کہا "رات پتہ چلا تھا کہ ایک سنت آنے والے ہیں... سنا ہے ان کے درشن کا فائدہ تب ہی ہوتا ہے جب کسی کو بتائے بغیر پیدل ان کے پاس جاؤ۔ میں نے سوچا کہ چلو کبھی سنتوں کے پاس نہیں گیا، اس بار چل کر دیکھیں۔ جس کے پاس جاؤ تب اسی کے اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے۔" چھوٹے رائے بولے "میں بھی چلتا..."

وہ ہنس کر بولے "تم تو خود ہی سنت ہو، انھیں دنوں میں سنتوں کی طرح رہتے ہو۔"

وہ نہانے دھونے میں لگ گئے لیکن تجسس نے اب چٹانی شکل اختیار کر لی تھی۔

بڑے رائے کے اس طرح چلے جانے کا یہ واقعہ کافی عرصے تک راز بنا رہا۔ یہ بھی راز ہی تھا کہ کل تک پیسے کا انتظام نہیں تھا، سنت کے پاس جاتے ہی پیسے کا انتظام کیسے ہو گیا؟ ان دنوں شہر میں ایک ہی بینک تھا ——— امپریل بینک۔ بڑے رائے چیک کاٹتے تھے اور پیسہ آجاتا تھا۔ شادی جس دھوم دھام سے ہوئی اسے دیکھ کر لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ شادی میں ایک واقعہ ضرور ایسا ہوا جسے بڑے کبھی بھول نہیں سکے۔ ان کا ایک گھوڑا تھا۔ جارج۔ انھوں نے کسی انگریز کمشنر سے خریدا تھا۔ وہ کمشنر ولایت واپس جا رہا تھا۔ وہ اپنا گھوڑا کسی ایسے آدمی کو دینا چاہتا تھا جو اسے پیار سے رکھے۔ اس کی قدر و قیمت سمجھے۔ علاقے میں بڑے رائے ہی ایسے تھے جو گھوڑوں کے شوقین اور قدرداں تھے۔ انھوں نے بڑے رائے کو بلوا کر کہا "ویل، میں یہ گھوڑا آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا جارج اپنے دل میں یہ نہ سوچے کہ میرے مالک نے مجھے کسی آدمی کو دے دیا جو اس کی وقعت نہیں جانتا۔" بڑے رائے نے جارج کو دیکھا تو وہ انھیں پسند آگیا۔ سفید مُردکا تھا۔ انھیں اپنی پسند کا گھوڑا چاہیے تھا۔ کمشنر صاحب نے ان سے یہ ہی کہا کہ آپ دام دیں یا نہ دیں لیکن اسے کوئی تکلیف نہ ہونے

دیں۔ میں نے اسے اپنے بچے کی طرح پالا ہے۔

گھوڑے کے آجانے کے بعد اس کے نام کا مسئلہ در پیش ہوا۔ اس زمانے میں جارج پنجم تخت نشین تھے۔ اکثر لوگ ان سے یہ ہی کہتے تھے کہ آپ نے گھوڑے کا نام بادشاہ کے نام رکھا ہوا ہے۔ حکومت ناراض ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ لیکن گھوڑا خریدتے وقت کمشنر صاحب نے بھی کاغذ پر گھوڑے کا نام جارج ہی لکھا تھا اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اس کا نام نہ بدلا جائے۔ حالانکہ بڑے رائے نے کئی بار اس کا نام بدلنے کی کوشش کی لیکن نیا نام جارج نے قبول ہی نہیں کیا۔ تھک ہار کر انھیں وہی نام چلانا پڑا۔ جہاں بڑے رائے نے جارج کہہ کر پکارا وہ ناچنے لگتا تھا۔ اگر سواری میں ہوا تو آواز کے اتار چڑھاؤ سے سمجھ جاتا تھا کہ اسے رکنے کے لیے کہا جا رہا ہے یا تیز چلنے کے لیے۔ لگام ڈھیلا چھوڑنے یا کھینچنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

کسی نے رانی کے شوہر کے کان میں پھونک دیا کہ اگر تم بڑے رائے کا گھوڑا جارج مانگ لو تو ہم تمھیں مان جائیں۔ یہ بھی سمجھا دیا کہ جب تک 'ہاں' نہ کہہ دیں، کنگنا مت کھیلنا۔ دولھا جب کنگنے پر آیا تو اس نے نہ ہاتھ اٹھایا اور نہ کنگنا کھیلا۔ بڑے رائے نے خود آکر سمجھایا "کنور جی، آپ چاہیں، میری پوری گھوڑسال لے لیں لیکن جارج کو چھوڑ دیں ـــــ یہ کسی کی امانت ہے" لیکن دولھا ٹس سے مس نہ ہوا۔ سمدھی جی کو پتہ چلا تو وہ بولے "جس شخص کے لیے داماد کی ضد سے بڑا گھوڑا ہے، وہ آگے چل کر ہماری اور لڑکے کی کیا عزت کرے گا۔ چلو واپس، ہمیں نہیں کرنی ایسے لوگوں کے یہاں شادی۔" بڑے رائے نے سنا تو وہ پل بھر کے لیے سناٹے میں آگئے۔ دھیرے دھیرے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولے "بری رائے میں ابھی اتنی قوت ہے کہ اپنی بیٹی کا ڈولا چھوڑ کر جانے والے کو ایک قدم آگے نہ بڑھنے دے ـــــ لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا" انھوں نے کالے کو پکارا "جاؤ جارج کو لے آؤ اور اس کی راس دولھا کے باپ کو تھما دو" دیوان جی سے کہا "ان کے سنہری زیور کا انتظام کر دو کہیں یہ نہ کہنے لگیں کہ ننگا پوجا گھوڑ دے دیا۔ اگر نہ ہو سکے تو پانچ ہزار روپے اس پر رکھ کر دے دو۔"

کالا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ بڑے رائے نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا "رانی

ویدی کے ساتھ ہی تو جا رہا ہے۔۔۔ ہماری بیٹی کا سکھ جب جارج سے وابستہ ہو گیا تو اچھا ہی ہے اس کے ساتھ چلا جائے" پھر بولے "اسے تیار کر کے، حویلی سے ہو کر ہی لے جانا۔"

جب جارج آیا تو بڑے رائے بولے "جارج، میں تمھیں تمھاری بہن رانی کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔۔۔" وہ آگے نہیں بولے۔ اندر آکر انھوں نے سمدھی کے نام ایک خط لکھا:

جناب، من

میں بیٹی کو آپ کی خدمت میں دے رہا ہوں۔ کنور جی نے جارج کی بھی فرمائش کی تھی۔ جارج میرے پاس کسی کی امانت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جارج آپ کی نظر کرم کا حقدار بن سکے گا۔ جب بیٹی آپ کو دے رہا ہوں تو جارج کا موہ کیا کروں۔ حالانکہ یہ لوگ بے زبان ہوتے ہیں اس لیے ان کا درد زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

بس ایک دست بستہ گزارش ہے کہ اگر آپ کو کبھی یہ احساس ہو کہ وہ آپ کے لائق نہیں رہا تو مجھے مطلع فرمادیں۔ میں اسے واپس منگوالوں گا اور اپنی حیثیت کے مطابق دوسرا گھوڑا بھیج دوں گا۔ یا جو نذرانہ مقرر کریں گے وہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

خادم

ہری رائے

بڑے رائے بیٹی کو رخصت کرنے آئے تو رانی ان سے چمٹ گئی "بابا" وہ کمر تھپ تھپاتے ہوئے بولے "اری پگلی، تو روتی ہے —— جارج تیرے ساتھ جا رہا ہے" وہ انھیں دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت تک انھیں معلوم نہیں تھا کہ بابا نے جارج کو اس کے ساتھ کر دیا ہے۔ اس کے منہ سے یکایک دھیرے سے نکلا "بابا یہ کیا کیا؟" پھر وہ چپ ہو گئی۔ اتنی چپ کہ وہ ہم لوگوں سے چمٹ کر ملی ضرور لیکن کہا کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ سونا تو نہیں گئی لیکن جارج چلا گیا۔

بیٹی کی رخصت کے لیے تو سارا گھر بھر تیار تھا۔ سب جانتے ہیں کہ بیٹی من اور تن سے کبھی پیہر کی نہیں ہو پاتی۔ بس پھول کی طرح کھلتی ہے اور خوشبو کی طرح بس جاتی ہے لیکن جارج کی رخصت کے بعد گھر میں کوئی نارمل نہیں رہ گیا تھا۔ بڑے رائے تو بالکل ہی نہیں۔ وہ کسی سے کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن کئی بار جارج انھیں آپ پاس کھڑا نظر آتا تھا۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ جیسے وہ انھیں صرف ایک ٹک رہا ہو ایک سوالیہ نشان کی شکل میں وہ یکا یک الف ہو جاتا تھا۔ رات کو کبھی آنکھیں کھل جاتیں تو انھیں لگتا کہ جارج کھڑکی کے اندر گردن ڈال کر ان پر نظریں مرکوز کیے ہے۔ رات کو تو ویسے بھی انھیں یہاں وہاں دو آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آنے لگتی تھیں۔ کبھی آنسو ڈھال تھوری والے گھوڑے کی طرح اس کی آنکھوں میں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ بال۔ بھوری سے پوری طرح صاف تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ وہ کمرے کے دروازے پر آکھڑا ہوا ہے اور اس طرح پیٹھ رگڑ رہا ہے جیسے مہینوں سے اس کے جسم پر کھر کھرا نہ ہوا ہو یا اسے اوٹنے نہ دیا گیا ہو لوٹنا ہی فقط ایک رشتہ ہوتا ہے گھوڑے کے تازہ دم ہو جانے کا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ اپنے کو سمجھاتے آخر جارج ان کے اپنے اصطبل کا بچہ تو نہیں ہے۔ وہ تو دوسرے گھر سے آیا ہے۔ میں نے تو زبردستی اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ وہ اس سے زیادہ نہیں سوچ پاتے۔ انھیں لگتا کہ وہ کئی جنموں سے ان کے ساتھ ہے۔ بیچ بیچ میں بچھڑ جاتا ہے اور پھر آملتا ہے۔ ان کے درد کو کالے سمجھتا ہے یار حمت اللہ۔ رحمت اللہ کئی مہینوں سے بیمار تھا۔ جارج کے حوالے سے انھیں اس کی اکثر یاد آتی تھی۔

ایک بار انھوں نے اپنے آدمی کو رانی اور جارج کی خبر لینے بھی بھیجا تھا۔ اس نے لوٹ کر بتایا تھا کہ شروع میں تو کئی دن جارج نے نہ کھایا نہ پیا۔ جب رانی کو پتہ چلا تو اس نے اپنی ساس کے پاس جا کر کہا ـــــ ”اگر آپ سسر جی سے کہہ کر جارج کو یہاں منگوا دیں یا مجھے وہاں بھیج دیں تو جارج کچھ کھالے گا۔ پہلے تو کوئی تیار نہیں ہوا۔ بہو گھوڑے کے لیے اصطبل جائے گی۔ لیکن جب رانی نے بھی کھانا پینا قریب قریب بند سا کر دیا تو اس کا شوہر جارج کو ڈیوڑھی پر لوا لایا۔ رانی اس کی حالت دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے بابا

اسے دیکھ رہے ہیں۔ لمبے عرصے سے بیمار آدمی کی طرح اس کی گردن لٹکی تھی۔ جیسے ہی اس نے چھوا ویسے ہی وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کرامت ہو گئی ہو ـــــ لیکن وہ کرامت نہیں تھی فقط ایک اپنائیت سے بھرپور لمس تھا۔ وہ اسی طرح بولی جیسے روٹھ کر ارن کھانا چھوڑ دیتا تھا تو وہ اسے سمجھاتی تھی "جارج بھیا، تو کھاتا کیوں نہیں؟ پاگل ہوا ہے؟ تو نہیں کھائے گا تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔ تو مجھے بھی بھوکا مارے گا۔ لے کھا۔" اس نے جو کھلایا، جارج کھاتا گیا۔ وہ ایک دم ارن میں بدل گیا تھا۔ بڑے رائے آنکھیں بند کیے سن رہے تھے۔ بند پلکوں کے بیچ ایک ڈورا چمک رہا تھا جو مسلسل موٹا ہوتا جا رہا تھا۔

رانی کی شادی کے وقت ہی چھوٹے رائے نے ارن کو گود لینے کی رسم ادا کر دی تھی۔ وہ رسم اسی باغ میں ہوئی تھی جس میں منجھلے رائے رہتے تھے۔ لیکن کئی سال کے مقدمے کے بعد انھیں اس کوٹھی کو چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کوٹھی کی قیمت کا ایک تہائی حصہ انھیں قسطوں میں دے دیا گیا تھا لیکن بڑے رائے نے انھیں پچھلے حصے میں اس وقت تک رہنے کی اجازت دے دی تھی جب تک ان کی اپنی کوٹھی بن کر تیار نہیں ہو جاتی۔ وہ مندر والے میدان میں کوٹھی بنوا رہے تھے۔ گھرے باغ والی کوٹھی کے سامنے والے حصے میں گود لینے کی رسم ہوئی تھی۔ وہاں دعوت اور ناچ گانا ہوا تھا حالانکہ بڑے رائے ناچ گانے کی موافقت میں نہیں تھے لیکن کشن بابو نے اس کا انتظام کر دیا تھا۔ ناچنے والی حمیدہ بائی کافی نامی گرامی فنکار تھی۔ کشن بابو کے پاؤں چھوتی تھی جیسے وہ اس کے گرو ہیں حالانکہ وہ اس کے کچھ نہیں تھے۔ بس اتنا ہی تھا کہ جب وہ گدی نشین تھے تو شراب پی کر بے قابو ہو جانے پر بھی اس کی اتنی ہی عزت کرتے تھے جتنی ہوش و حواس میں ہو۔ اپنی طوائفانہ زندگی میں ایسا شخص اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

چھوٹے رائے نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ بڑے رائے چاہتے تھے کہ سارا خرچ وہیں سے ہو جہاں سے شادی کا خرچ ہوا۔ چھوٹے رائے تیار نہیں ہوئے تھے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے تھے "تھوڑا بہت 'استری دھن' ہے ـــــ وہ چاہتی ہے کہ یہ خرچ اس دھن سے ہو۔ میں تو نکھٹو ہوں" اس بات سے گھر کے سب ہی لوگوں کو جھٹکا لگا تھا۔ ان کے پاس دھن کہاں سے آیا؟ دراصل چھوٹی چاچی کے پتا تھوڑا روپیہ ہر فصل پر اپنی بیٹیوں کے نام جمع کرتے

تھے۔ یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔ وہ جاتی تھی یا چھوٹے رائے۔ چھوٹے رائے کو بھی زمینداری کا روپیہ ملتا ہی تھا لیکن وہ اسے گھر پر ہی ختم کر دیتے تھے۔ نہ کبھی چھوٹی چاچی نے انھیں ٹوکا اور نہ چھوٹے رائے نے 'استری دھن' کے بارے میں چھوٹی چاچی سے پوچھا۔

منجھلے رائے بھی گود کی اس رسم میں شریک ہوئے تھے۔ وہ تھوڑا کھڑے ہوئے تھے۔ منجھلی چاچی کے منہ سے اچانک نکل گیا تھا کہ یہ تو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ چھوٹے رائے ارن کو ہی گود لیں گے۔ ہم نے تو یہی سوچا کہ ایسے بچے کو گود لینے سے کا فائدہ، جس کے پاس پہلے سے ہی سب کچھ ہو۔ بھرے تالاب میں کتنا پانی اور ڈالیں گے؟ ایسے بچے کو لو جس کا ہمارے سوا کوئی اور نہ ہو۔ کیا بھی لگے۔ ورنہ جو اصلی ہوتا ہے وہی سگا ہوتا ہے۔ جو کرتا ہے وہ نقلی ہو کر رہ جاتا ہے۔ چاچی کا من دکھ گیا تھا۔ چھوٹے رائے نے انھیں سمجھا دیا، بچہ، بچہ ہوتا ہے اسے جانور پیار کرے تو وہ جانور کا ہو جاتا ہے۔ ہم تو آدمی ہیں۔ ہم نے اسے شروع دن سے پیار کیا ہے۔ یہ کسے پتہ ہے کہ آگے چل کر کون کیسا نکلے۔ چاہے اپنا ہو یا پرایا۔ لیکن چاچی کے من میں بات کی گانٹھ پڑ گئی تھی۔ بات ایسی ہی ہے جو ہوا تک میں گانٹھ لگا دیتی ہے بشرطیکہ موقع پر کہی گئی ہو چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ انھیں یکا یک لگنے لگتا تھا کہ ہم تو فقط متبادل ہیں۔ ارن ان سے بہت زیادہ وابستہ تھا اس لیے وہ گانٹھ زیادہ نہیں بڑھ سکی۔ اس کے بھولے پن اور چاچی کے پیار میں وہ دھیرے دھیرے کھلتی گئی۔

ادھر میری نئی بیوی کے ساتھ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن بچوں کے بارے میں ہم اس سے وہ سب کچھ چاہتے تھے جو شاید کسی بھی عام انسانی کے برتاؤ کے موافق تھا۔ شاید یہی رواج بھی تھا۔ کیکئی اسی لیے رقیب ہے کیونکہ اس نے اپنے بیٹے کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ ہمارے یہاں کبھی کسی دوسرے کے نظریے سے دیکھنے اور سوچنے کی گنجائش ہی پیدا نہیں ہونے دی گئی۔ باتیں ضرور کیں۔ بڑے رائے کی یہ کوشش رہتی تھی کہ دونوں بچوں کے بارے میں ان کے پاس پل پل کی خبر پہنچتی رہے۔ جہاں تک ہوتا تھا رگھوور تو ان ہی کے پاس رہتا تھا۔ بعد میں تو شاید وہ ان ہی کے پاس سونے لگا تھا۔ سونے کے ساتھ ذرا بھی کچھ ہوتا تو بڑے رائے کی گرج پوری حویلی سر پر اٹھا لیتی تھی۔ سارنگا کبھی کبھی غصے میں آجاتی تھی اور کچھ کا کچھ کہہ

شنتی تھی "بڑے رائے سمجھتے ہیں کہ میں ان کے پوتے کو زہر دے دوں گی ـــــ پوتی کو بھوکا مار ڈالوں گی۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ سونا کو بھی اپنے پاس رکھ لیتے۔ اسے تو لڑکی ہونے کی وجہ سے مجبوراً زنان خانے میں رہنا ہے ـــــ کاش! بھگوان انھیں یہ طاقت دے دیتا کہ وہ سونا کو لڑکا بنا سکتے!"

میں اسے سمجھاتا "دیکھو زبان سے نکلا ایک بھی اوچھا لفظ بہت کچھ کر دیتا ہے۔ تم مجھے ہی دل کی اچھی ہو لیکن دل تو وہی دیکھ سکتا ہے (جو دیکھ سکتا ہے) زبان کا کہا تو سب سنتے ہیں۔ تم سے کس نے کہا کہ بڑے رائے سونا کو لڑکا بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں؟ اپنے کو اور اپنی باتوں کو عقل سے بھی وابستہ کرنے کی کوشش کیا کرو۔ جذبے کو دلدل نہ بناؤ جس میں پھنس گئے تو پھنس گئے۔"

"جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہو ـــــ چاہے اس میں عقل لگاؤ یا دل سے اسے کیسے ان دیکھا کر دوں۔ سوتیلی ماں چونے کی یا سونے کی، سوتیلی ہی رہے گی نا۔ تمھاری لاڈلی سب سے کہتی ہے کہ میری ماں مر گئی ماں تو مر گئی لیکن کیا ملا کی طرح چلا چلا کر اسے جلائے گی؟ بس چھوٹی چاچی کے حصے میں گھسی رہتی ہے۔"

میں کئی بار سونا کو ڈانٹ چکا تھا۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ جس بچے نے اپنی ماں کو مرتے دیکھا ہے وہ بھلا کیسے نہ کہے کہ اس کی ماں مر گئی؟ جو اس کی جگہ ہو وہ یہ کیسے نہ سمجھے کہ بچہ اسے نظر انداز کر رہا ہے۔ کیا زبردستی اس کا منہ بند کر کے ان کے سوچنے پر بھی قابو پایا جا سکتا تھا؟ یہ باتیں الجھن آمیز تھیں کہ ان کے درمیان زندگی کا راستہ بنانا مشکل نظر آتا تھا۔ یہ شاید بچے کے لیے بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ مان لے کہ اس کی ماں سارنگ کی شکل میں زندہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی اتنا ہی بڑا سچ تھا کہ جتنی بار سونا اپنی ماں کے مرنے کا اعلان کرتی تھی سارنگا کے دل پر اتنے ہی زخم بن جاتے تھے۔

زخم دھیرے دھیرے پکتا تھا، سڑتا تھا اور بدبو دینے لگتا تھا۔ کبھی کبھی رگھوور بھی اس کی زد میں آ جاتا تھا جیسے وہ بھی سارنگا کو گھائل کرنے کے لیے کمان سے چھوٹا ایک تیر ہو۔

جب سارنگ بار بار رگھوور کو سونے کے بارے میں کونچتی رہی تو مجھے بڑے رائے کی موجودگی میں رگھوور سے کہنا پڑا "آج سے تم اندر حویلی میں سویا کرو۔ دادا جی کو پریشانی

ہوتی ہے۔"

بڑے رائے شاید سمجھ گئے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہتے کہتے رک گئے۔ اگر کہتے تو شاید یہ ہی کہتے کہ نہیں، مجھے کوئی پریشانی نہیں، تم میری پریشانی کی فکر نہ کرو۔ انھوں نے یہ سب کہنے کے بجائے دوسری طرف منہ گھمالیا۔ اسکے باوجود میں اس رات رگھوور کو اندر حویلی میں لے گیا۔ اتنے سے وہ مطمئن ہوگئی۔ رگھوور رات بھر روتا رہا۔ سارنگا سوگئی تھی۔ میں بار بار اٹھ کر رگھوور کو دیکھتا رہا۔ جب بھی دیکھا لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ کروٹ بدلتا یا ہلتا ڈلتا ملا۔ ایک بار میں نے چاہا بھی کہ اسے اپنے پاس لٹالوں پھر پتہ نہیں کیوں میں رک گیا۔ میں نے سارنگا کی طرف دیکھا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ کاش! میں رگھوور کو اپنے پاس لٹالیتا بیٹے کو لٹالینے پر بھلا کوئی یہ کہہ سکتا تھا۔ کہتا بھی تو دیکھا جاتا۔ یہ کیسی بات تھی کہ رگھوور کو گھر کے اس حصے میں آکر اچاٹ اور بیگانگی محسوس ہو رہی تھی جو اس عمر کے بچوں کے لیے سب سے بے تکلف اور اپنا ہوتا ہے۔ شاید افراد کا بدل جانا ہی جگہوں کو ایسا بنا دیتا ہے۔ میں تو وہی تھا لیکن شاید میرے اندر بھی اسے بیگانگی کی بو آنے لگی تھی۔ کلا ہوتی تو وہ اس سے چپٹ کر سوتا۔ تب شاید وہ بھی مجھے اس نظر سے نہ دیکھتا۔ ہم تینوں میں ایک دوسرے کی بو سمائی رہتی۔ بو کی تعدیل اب بدلی ہوئی تھی۔ ماحول کی بھی اپنی ایک گرفت ہوتی ہے اپنائیت اور غیریت ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کانچ کی جھلی جیسی بٹوارے کی ایک پرت ہوتی ہے پتہ نہیں کب تڑخ جائے۔ کس کا پلڑا بھاری پڑ جائے۔ وہ تڑخ گئی تھی اور غیریت نے دوسرے فریق کو دبالیا تھا۔ میں بھی اس میں جذب ہوگیا تھا۔ جذب چاہے نہ بھی ہوا ہوں لیکن مجھ میں اس کی آمیزش تو ہو ہی گئی تھی۔

جب روپ مری تھی تو بس اکیلی روپا ہی مری تھی باقی سب ویسے کے ویسے ہی بنے رہے تھے کہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں بلاوجہ رنڈووں کی گنتی میں آگیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ایک خلاء بنا تھا پھر وہ بھی خلاء میں گم ہوگیا تھا۔ لیکن کلا کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ اس کی موت کے ساتھ ماحول کو بھی چوٹ آئی تھی۔ وہ بھی ادھر مرا سا ہوگیا تھا۔ رشتے بھی ٹوٹے تھے۔ جیسے نمک کے روے چٹختے ہیں، نئے بننے والے رشتوں پر بھی ایک دباؤ آگیا تھا۔

کلا کے مرنے پر لگا تھا کہ آدمی نہیں مرتا، اس کے ساتھ اور بھی کئی کی موت ہوتی ہے۔ شاید چیز کہنا مناسب نہ ہو، بہت کچھ مرتا ہے! ماحول اس کا سب سے بڑا شکار ہوتا ہے۔ غیر محفوظ ہونے کا احساس اندر ہی اندر توڑ پھوڑ کرتا رہتا ہے۔ احساسات کے نئے نئے پہلو ملتے رہتے ہیں۔ جب میرے والد یعنی بڑے رائے مرے تھے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ جتنے رائے ان سے پہلے ہوئے تھے اور جتنے رائے تب تھے وہ سب کے سب مر گئے تھے۔ مجھے ہی ان میں سے ایک دو جسمانی طور پر زندہ ہوں۔ آخری رائے انھیں رایوں میں کتنا ہی ناچیز کتنا ہی نچیز رائے کیوں نہ ہوؤں جب میں مروں گا تو ایک بار پھر سب کے سب رائے مریں گے۔ اس کے بعد کوئی رائے نہ بچے گا اور نہ جیے گا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی رسم ختم ہو جائے گی جیسے سوکھے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ نئے نئے نکلتے رہتے ہیں تو پیڑ پھر ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔ لیکن پتوں کے آخری طور پر جھڑ جانے پر کبھی کوئی پیڑ، پیڑ نہیں رہا۔ نئی شروعات ہمیشہ نئی اور بہتر ہوتی ہے۔ شاید کلا کے مرنے کا بھی کوئی مطلب نہ ہوتا لیکن وہ ماں تھی۔ ماں کے چاروں طرف صدیوں سے جو ایک خلا تعمیر ہوتا چلا آیا ہے اس نے ایک ناقابل شگاف دیوار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ کسی کے لیے بھی اس میں شگاف ڈالنا آسان نہیں چاہے باپ ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ یہ خلا اس کی کسی طاقت یا صلاحیت کے سبب نہیں۔ صرف اس کی ممتا، ایثار، قربانی اور اپنے بچوں کو تحفظ عطا کرنے کی ناقابل سرکوبی ہمت کے سبب ہے۔ جسم ٹوٹ جاتا ہے لیکن ماں نہیں ٹوٹتی۔ ٹوٹتی نظر آتی بھی ہے تو وہ اس ٹوٹ کو اپنی قربانی اپنے ایثار سے لیپ پوت کر جیسا کا تیسا کر دیتی ہے، ماں چلی بھی جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی انداز میں پودکاری کر جاتی ہے، ہماری ماں مری تھی تو ارن چھوٹا تھا وہ رانی کی شکل میں اپنی پودکاری کر گئی۔ جن کو ماں نے پیار دیا تھا وہ بھی ماں کا نمونہ بن کر ہی ارن کو پالتے رہے تھے۔ باپ تب کہاں تھے خیر ہوں گے کہیں۔

اس رات کو میں کئی بار اٹھا۔ جب تک رگھوور سویا نہیں، میں یہی سوچتا رہا کہ کہیں اس کی بیگانگی کا سبب میں ہی تو نہیں۔ سونا چھوٹی چاچی کے برابر والے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ کمرہ اسے ایسا لگتا تھا جیسے پلا توکتے کی طرح دونوں پیروں پر بیٹھے اسے تاک رہا ہو۔ بیچ بیچ میں چھوٹے رائے اور چھوٹی چاچی اسے دیکھ جاتے تھے۔

کبھی کبھی اسے غصہ بھی آتا تھا۔ وہ ہی اکیلی کیوں سوتی ہے؟

سویرے اٹھے تو سارنگا کو رات کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ رات میرے اور رگھوور کے درمیان ایک لڑائی کی طرح گزری تھی۔ رگھوور اٹھ کر جا چکا تھا۔ بھوانی سویرے سویرے رسوئی کھولنے آتا تھا۔ تب نل نہیں ہوتے تھے۔ بہشتی کنویں سے پانی لا لاکر رسوئی میں رکھی ناندوں میں بھرتے تھے۔ رسوئی حالانکہ کمرے سے دور تھی۔ لیکن ناندوں کے مانجنے اور یکے بعد دیگرے بالٹیوں کے دھول دھول کر کے الٹے جانے کی آوازیں ان صبحوں کو خاموش نہ رہنے دیتی تھیں یا تو رگھوور کی آنکھ ان آوازوں سے کھل گئی ہوگی یا وہ اس وقت تک جگا ہوا ہوگا۔ وہ اٹھا ہوگا اور بھوانی کے ساتھ نیچے چلا گیا ہوگا۔

بڑے رائے نے رگھوور کے چلے جانے کے باوجود اس کا بستر بچھوایا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ رگھوور کا من نہ لگے اور رات میں ہی نیچے آنے کی ضد کرنے لگے۔ وہ آئے اور بستر بچھا دیکھ کر کہیں اسے یہ نہ لگنے لگے کہ بڑے رائے نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ بڑے رائے نے کروٹ لی تو انھوں نے رگھوور کو بستر پر سوتے ہوئے پایا۔ مونچھوں ہی مونچھوں میں لکتی چھپتی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ایک خود اطمینانی تھی۔ ویسے ہلکی پھلکی مسکراہٹ کا جھبے دار مونچھوں میں پتہ ہی نہیں چلتا۔ لیکن انبساط کا وہ جذبہ ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے کی طرح پھیل گیا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ پُل کی طرح۔

بڑے رائے نے بھوانی سے پوچھا "رگھوور کب آیا ہے۔" بھوانی نے بتایا کہ جب وہ جانوروں کو دہانے کے برتن لینے اور پانی بھرنے کے لیے رسوئی کھولنے گیا تھا تو رگھوور بھیا چھوٹی مالکن کے کمرے کے باہر کونے میں دبکے کھڑے تھے۔ بولے بھوانی کاکا، مجھے بابا کے پاس لے چلو۔ 'میں کیا کرتا سرکار؟' انھوں نے صرف 'ہوں' کیا۔

باہر آنے کے لیے دو تین زینے، ایک لمبا چوک، اور ایک دہلیز پڑتی تھی۔ ان میں روشنی تو جلتی رہتی تھی لیکن جن کونوں میں اندھیرا پڑتا تھا وہاں سے گزرتے ہوئے رگھوور کو لگتا تھا کوئی دبکا بیٹھا ہے جو ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ اکیلا ہی دوڑ آیا ہوتا۔ دوسرے، رات میں زنانے کا پھاٹک بند ہو جاتا تھا۔ بھوانی ہی جاکر کھولتا تھا۔ دہلیز کے

پیچھے لگا سر کا نام از کم اس کے بس کا نہیں تھا۔

بڑے رائے اسے بے حد چہ سوتے دیکھتے رہے۔ وہ خود ماضی تھے اور گھنو رائے خاندان کا مستقبل۔

میں چپ رہا۔ سارنگا نے طعنہ دیا، اگر میں اس کی ماں ہوتی ہوتی تو کیا وہ اس طرح چپ چاپ بھاگ جاتا! یہی بات میں نے دوسری طرح سوچی تھی۔ اگر کا! ہوتی تو کیا وہ بھی ماں کو چھوڑ کر جاتا یا گھنو رات بھر روتا رہتا، اور وہ پڑی سوتی رہتی؟ وہ کہتی رہی "اس کا من تھوڑا ہی لگتا ہے؟ بڑے رائے کی شہہ ملی ہوئی ہے۔" میں چپکے سنتا رہا تھا۔ آخر مجھے یہ کہنا پڑا "دیکھو سارنگا ــــــ یہ گھر بہت پرانا ہے۔ اس کی روایت بھی اس گھر کے ساتھ ساتھ پرانی ہوئی ہیں۔ ہمیں ان کا دھیان رکھنا ہے۔"

اس دن پہلی بار پتہ چلا کہ وہ زبان کی کافی مضبوط ہے۔ وہ بولی "لیکن میں تو پرانی نہیں۔۔۔ اور نہ اتنی پرانی ہو سکتی ہوں۔۔۔ جب تک پرانے پن کو نئے پن کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جائے گا، تمہارے اس گھر کا پرانا پن دیمک کھائے پلاسٹر کی طرح بھر بھرا کر گر جائے گا۔ میں تمہارے، تمہارے بچوں اور تمہارے گھر والوں کی کا دھیان رکھوں گی تو میری خوشی کا دھیان آپ سب کو بھی رکھنا ہوگا۔ ورنہ مجھے لگے گا کہ میں اس گھر کی باندی ہوں۔ میں اس گھر کی بہو بن کر آئی ہوں۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ میں حویلی کے جتنے علاقے میں رہتی ہوں اس پر مجھے مکمل اختیار ملنا چاہیے۔ مجھ پر اعتبار ہونا چاہیے۔۔۔ چاہے بچے ہوں یا گھر۔۔۔ جیسے میں گھر میں آگ نہیں لگاؤں گی ایسے ہی زہر دے کر بچوں کو مار نہیں ڈالوں گی۔"

مجھے لگا کہ ایک پارٹی کی لڑائی تب ہوئی تھی جب منجھلے رائے نے نئی منجھلی چاچی سے شادی کر کے اپنے آزاد کے ہونے کا اعلان کیا تھا۔۔۔ دوسری جنگ جب ہوئی تھی جب لاوارث بچے کو گود لے کر گھر کے سارے عقائد و نظریات تہس نہس کر دیے۔۔۔ شاید تیسری جنگ ہونے والی تھی، آزادی کی آواز بھی اپنے میں اتنی تیکھی ہوتی ہے کہ سامنے کھڑے اقتدار میں شگاف ڈالنے کی تفنگ و تیر گولے بارود کی ضرورت نہیں پڑتی۔ الٹے اقتدار

کو اس سے اپنے تحفظ کے لیے اسلحہ جات کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ میں اندر تک کانپ گیا۔ نہیں یہ کبھی نہیں ہوگا۔ میں آپ کو بتادوں۔ یہ کہنے کے دوران سارنگا کی آواز ذرا سی بھی نہیں تھرتھرائی۔ پھر بھی گھر قائم رہا۔ گھر تب ٹوٹا جب ارن انجینئر بن کر لوٹا اور چھوٹے رائے اس ڈوبتے ہوئے جہاز کو چھوڑ کر ارن کے ساتھ کنارے جا کھڑے ہوئے۔ بڑے رائے جہاز کے کپتان کی طرح اس جہاز کے ساتھ ساتھ وقت کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتے چلے گئے۔ ایسے بہت سے تھے جنھوں نے بہاؤ کا رخ دیکھ کر اپنے جہازوں کو کناروں کی طرف موڑ دیا تھا اور آزادی کی زندگی بچاؤ کشتیاں کا سہارا دے کر منجھدار سے نکل آئے تھے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہوا۔ سوکھے پتے وقت کی رفتار کے ساتھ بہت دور تک نہیں اڑ پاتے۔ اڑتے ہیں تو ٹھہر جاتے ہیں! وقت کو تو انھیں مسلنا ہی تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا ـــــ اس واقعہ کے بعد منجھلے رائے دفعہ ۳۰۷ میں مرچی چمار کے پورے خاندان کے خلاف رپٹ درج کرائی تھی۔ حالانکہ انھوں نے اس کی بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ انھوں نے اتنا کہا تھا کہ اس لڑکی کا پورا معاملہ گول کر دیا تھا۔ لیکن مرچی، اس کی گھر والی اور اس کے بیٹوں سمیت سب پر الزام لگایا تھا کہ وہ ان کی کھال اتارنے کے لیے راپی لینے گئے تھے اور اسے مار ڈالنا چاہتے تھے۔ لیکن وہاں سے گزرنے والی کسی عورت کو ان پر ترس آ گیا اور اس نے انھیں چھوڑ دیا۔ وہ عورت کون تھی؟ کہاں سے آئی؟ اس نے کیوں آزاد کیا؟ بیان میں ان باتوں کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ رپٹ میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ لوگ میرا قتل تو کرنا ہی چاہتے تھے، انھوں نے میرا دھرم بھی بھرشٹ کیا ـــــ منہ میں پیشاب کرنے کی بات بھی گول کر گئے تھے۔ مقدمے کے دوران ان سے پوچھا بھی گیا آخر ان کا دھرم بھرشٹ کرنے کی کیا کوشش کی گئی تھی؟ تو انھوں نے یہ ہی بتایا تھا کہ وہ ایک ایسی شرمناک بات ہے جسے میں یہاں کچہری میں نہیں کہہ سکتا۔ جرح کے وقت وکیل نے پوچھا ـــــ کیا کچھ کچھ ویسا ہی واقعہ تھا جیسا آپ کی موجودگی میں مرچی کے ساتھ سا وقت ہوا تھا جب اس کے منہ میں پیشاب کیا گیا تھا! منجھلے رائے نے صرف اتنا ہی کہا تھا ـــــ میں اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

منجھلے رائے جب مر پتی، اس کی گھر والی اور بیٹوں پر عائد کردہ الزامات ثابت کر رہے تھے تو فریق ثانی کے وکیل نے کئی بار پوچھا ـــــ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ عورت کون تھی جس نے آپ کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔'' منجھلے رائے ہر بار یہی کہہ رہے تھے کہ ''میں اسے نہیں جانتا'' مر پتی کی لڑکی وہیں بیٹھی تھی۔ وہ وہیں سے بولی ''ارے رائے تو کیا جانے گا ـــــ جس نے تیرے بچے کے نام پر تجھے معاف کر دیا تو اسے نہیں پہچانتا ـــــ واہ رے رائے ـــــ وعدہ کر کے مکر گیا۔ تیری زبان چم کی ہے یا گھوڑے کی لید سے بنی ہے! اپنے باپ کی بے عزتی کرنے والے کو میں نے تب بھی معاف کر دیا تھا لیکن اب بھی تو پیاس سے تڑپتا ملا تو پانی کی ایک بوند بھی تیرے منہ میں نہیں ڈالوں گی۔''

کورٹ نے اسے خاموش کرا دیا ''تمھیں جو بھی کہنا ہے کٹہرے میں کھڑے ہو کر کہنا۔'' وہ بدبدائی ـــــ ''جیسے یہاں سے بولا جھوٹ ہو اور وہاں سے بولا سچ! ہمیں چاہے جہاں کھڑا کر لو سچ سچ رہے گا۔'' مر پتی نے اسے ڈپٹ کر بٹھا دیا لیکن جب مر پتی کی باری آئی تو اس نے اچھا خاصا ناٹک کیا ـــــ ''حضور، یہ ہمارے مالک ہیں۔ ہماری نسوں میں پیڑھی در پیڑھی رایوں کا نمک خون بن کر بہہ رہا ہے۔ یہ ہمیں مارتے پیٹتے ہیں تو چھاؤں میں بھی ڈالتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے منہ میں متوایا۔ ہم نے سوچا مالک، مالک ہے، رعایا رعایا ہوتی ہے ـــــ اپنے ہی بھائی کا موت ہے، دشمن کا تو نہیں۔''

منجھلے رائے اس کا بیان برداشت نہ کر سکے۔ جھنجھلا کر بولے ''یہ رعایا ہے جس نے میرا ایمان خراب کیا ـــــ جو میرے خون کا پیاسا ہے ـــــ '' مر پتی ہاتھ جوڑ کر بولا ''سرکار ایسا نہ کہیے ـــــ ہم کچھ بھی کریں رہیں گے تو رعایا ہی۔ غصہ تھوک دیں۔''

لیکن لڑکے نے کہا ''حضور زیادتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جب تک درد برداشت ہوتا ہے، آدمی کراہ کر کاٹ دیتا ہے، جب نہیں سہا جاتا تو مر جاتا ہے۔ اگر زیادتی ہو گی تو یا تو مر جائیں گے اور مرا نہیں گیا تو مار ڈالیں گے۔''

بڑے رائے نے مجسٹریٹ سے جا کر کہا، میں جانتا ہوں، اس میں میرے بھائی کی غلطی ہے اگر یہ سب بے داغ چھوٹ گئے تو ہم لوگوں کا زمیندار رہنا اور زمینداریاں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ مجسٹریٹ نے ان کی بات بغور سنی اور بولے ''رائے صاحب، زمانہ سر کے بل کھڑا ہو گیا ہے۔ نظام کبھی بھی بدل سکتا ہے۔ انگریزوں کے پاس اپنا ایک ملک ہے، بستر

باندھ کر چل دیں گے۔ ہمیں تو یہیں رہنا ہے۔ آگے آنے والی سرکار کے سامنے سب برابر ہوں گے اس لیے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ اپنی ہی عزت کراتے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ دوسروں کی بھی عزت کرنی ہوگی۔ کرشن رائے نے جن گواہوں کو پیش کیا وہ سب ان کے ملازمین تھے۔ ماتحت کبھی اچھے گواہ نہیں ہوتے۔ چونکہ وہ منع نہیں کر سکتے اس لیے اتنا ہی کہتے ہیں جتنا گنگا جا کر گنگاداس اور جمنا جا کر جمناداس بنے رہنے میں مدد کر سکے۔ وہ جرح کے سامنے ذرا بھی نہیں ٹک سکے۔ ویسے بھی پیشاب خواہ کسی کے منہ میں کیوں نہ جائے، ہوتا تو پیشاب ہی ہے۔ انسان کتنا ہی مرا ہوا کیوں نہ ہو کبھی کبھی تو اس کا ضمیر جاگتا ہی ہے۔"

بڑے رائے نے کسی افسر کے منہ سے کبھی اتنی لمبی نصیحت نہیں سنی تھی۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے تھے۔ چلتے ہوئے بولے "کرشن رائے میرا بھائی ہے ــــــ لیکن وہ خود مختار ہے۔ میں اس کے معاملے دخل نہیں دے سکتا۔ صرف خاندان کی عزت مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی تھی۔ اب چلتا ہوں۔"

"آپ تو خود آنریری مجسٹریٹ ہیں ــــــ خاندان کی عزت انصاف میں ہے یا گناہ ثابت نہ ہونے پر بھی کسی کو گناہگار قرار دے کر سزا دلانے میں۔۔۔"

بڑے رائے نے گردن جھکالی۔ لیکن جب سزا بولی گئی تو دونوں لڑکوں کو دو دو سال کی قید بامشقت سنائی گئی۔ باقی سب کو بری کر دیا گیا۔ اوپر جا کر وہ دونوں بھی بری ہو گئے۔ جب دونوں لڑکے چھوٹے تو مرچی لڑتے لڑتے اتنا تھک گیا تھا کہ رام کو پیارا ہو گیا۔ اس کے گھر کا ایک ایک چھلا بک گیا تھا۔ ساری زمین جو کھو مقدمے میں لگ گئی تھی۔ بچے ہوئے سب ہی لوگ مزدوری کرنے شہر چلے گئے۔ پھر کبھی گاؤں نہیں لوٹے۔ اس کی بہن جس نے اس رات منجھلے رائے کو چھوڑا تھا، ابھی کچھ دن پہلے مری ہے۔ وہ یہ ہی کہتی تھی کہ میرے اندر معاف کر کے دیکھنے کی ہونس (شدید خواہش) جگ گئی تھی ــــــ ہم چھوٹے لوگوں میں جتنی سائی ظلم برداشت کرنے کی ہے، اتنی ہی دیا کرنے کی بھی ہے یا نہیں۔ اس ہونس نے مجھے اپنے سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے بھائیوں نے اسے کبھی معاف نہیں کیا۔ اس کا آدمی البتہ اس پر فخر کرتا تھا۔

دونوں بھائی باعزت بری ہوئے تھے۔ باعزت لفظ منجھلے رائے کو گہرائی تک متاثر کر گیا تھا۔ ان لوگوں کی عزت ہوگئی اور ہماری کوئی عزت ہی نہیں رہی۔ انھیں لگا کہ ان کے باعزت بری ہونے سے وہ بے عزت ہوئے ہیں حالانکہ مجسٹریٹ کا قول ان کے دماغ میں گونجتا رہتا تھا۔ جرم ثابت نہ ہونے کے باوجود اس مجسٹریٹ نے ان کے کہنے سے دو لڑکوں کو سزا سنائی تھی پھر بھی منجھلے رائے کا خیال تھا کہ ان کو باعزت بری کرانے میں بڑے رائے کا ہاتھ تھا۔ وہ یہ بات سب سے کہتے گھومتے تھے۔ خاندان، سماج، افسران ـــــ سب لوگ ان کی بات نمک کی چٹکی کی طرح لیتے تھے پھر بھی مزہ لینے کے لیے کرید کرید کر پوچھتے تھے ـــــ بڑے رائے نے آپ کے خلاف پیروی کیوں کی؟ منجھلے رائے کے پاس ایک دلیل تھی کہ وہ میرے بیٹے سے جلتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں لاوارث مر جاؤں۔ ان کے بچے میری جائیداد کے وارث بنیں۔ ویسے وہ رحم اور ہمدردی کے اوتار بنے گھومتے ہیں۔ لیکن انھیں اس سے کیا مطلب؟ میں رحم کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں نہیں بانٹتا۔ جسے دیتا ہوں، پورا دیتا ہوں۔ میں نے ایک بچے کو گود لیا ـــــ اسے ضرورت تھی۔ اس نے مجھے آزاد کیا اور اپنے کو بھی یہ ہی اس کی خوبی ہے۔ انھیں میرے بچے کو دیکھ کر دنیا بھر کے بچوں کا خیال نہیں آتا۔ صرف خیالی گناہ کا خیال آتا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ اس سے اس بچے کا کیا مطلب؟ بچہ کیا گناہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو دنیا بھر کے بچے اسی گناہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ چاہے کسی نے بھی کیا ہو۔ شادی کی قانونی قبولیت اسے بدل سکتی ہے تو پیار کیوں نہیں بدل سکتا؟

لوگ یہ باتیں بڑے رائے سے بھی جاکر کہتے۔ بڑے رائے بیچ میں ہی ٹوک دیتے ـــــ اس کی بات نہ کرو۔ مجھے اس دلدل میں نہ کھینچو۔ چھوٹے رائے نے بھی سمجھانا چاہا لیکن منجھلے رائے کو ان دونوں کی باعزت رہائی کے پس پشت بڑے رائے کا ہاتھ نظر آنا بند نہیں ہوا۔

ایک واقعہ اور ہوا جس سے رائے خاندان کو اروب میں ڈال دیا۔ رائی کی شادی کے کچھ عرصے

بعد ایک روز سب نے دیکھا کہ بڑے رائے کے چہرے سے مونچھیں غائب ہیں۔ بڑے رائے اپنی مونچھوں سے پیار کرنے والے گنے چنے لوگوں میں شامل تھے۔ وہ ان کے لیے ولایت سے خضاب منگوایا کرتے تھے۔ ایک زمانے تک لوگوں کو پتہ ہی نہیں تھا کہ بڑے رائے اپنی مونچھیں رنگتے ہیں۔ انھیں مونچھیں سنوارنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگتا تھا۔ رگھوور کہتا ہے کہ مونچھوں اور پگڑی کا پیار دراصل جاگیردارانہ ہے۔ بال سب ایک سے۔ مونچھوں سے ڈاڑھی کے بال کیا کسی قدر کم ہیں؟ پھر بابا انھیں دو دو بار کیوں چھیلا کرتے ہیں؟ اب تو وہ ہیں نہیں، کوئی کچھ بھی کہے۔ وہ ہوتے تو یقیناً معقول جواب دیتے۔ تیسرے چوتھے دن حجام آتا تھا۔ مونچھوں کے بالوں کو برابر کرتا تھا۔ موٹے یا لمبے بال نکالتا تھا۔ ایک بھی بال اونچا یا نیچا ہو جائے تو حجام کی جان آفت میں آ جاتی تھی، جب تک بڑے رائے آئینہ دیکھ کر مسکرا نہیں دیتے تھے اس وقت تک نائی کو لگتا تھا جیسے شیر کے سامنے کھڑا ہو۔ اب کھایا تب کھایا۔ اس لیے وہ دل لگا کر ایک دم گول کاٹتا تھا۔ مونچھوں کی وہ گولائی ان کے چہرے کو ایک نیا انداز دیتی تھی۔

ان کی مونچھیں مونڈنا ــــــ جیسے شہر میں زلزلہ سا آ گیا۔ بڑے رائے مونچھوں کو ایسے ہی مونڈواتے نہیں۔ کہیں انھوں نے بولا ہوا تو نہیں تھا کہ بیٹی کی شادی ہو جائے تو حلوہ پوری کے ساتھ اپنی مونچھیں چڑھا دیں گے۔ کچھ لوگ انھیں جارج کے جانے سے وابستہ کرتے تھے۔ جب وہ اس گھوڑے کو نہیں بچا سکے جسے وہ اپنی شان سمجھتے تھے تو مونچھیں کس بنیاد پر رکھتے؟ مخالف لوگ دبی زبان سے زیر لب، یہ سب بڑبڑا کر اپنی کمتری کو کم کرتے تھے کہ جارج ان کا باپ تھا ــــــ وہ گیا تو مونچھیں بھی منڈ گئیں۔

بڑے رائے اس بارے میں خاموش تھے۔ بلکہ ساکت و صامت ہو گئے تھے۔

اس ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل اس دن ہوئی جب ان کے پرانے دوست رادھیکا بابو دیر رات کو اپنی گاڑی میں سوار ہو کر آئے۔ رادھیکا بابو پہلے تو اکثر آتے تھے لیکن بیچ میں ان کا آنا کم ہو گیا تھا انھیں دیکھ کر بڑے رائے کے چہرے پر جو جذبہ آیا وہ ان کے چہرے پر اس وقت بھی نہ آتا اگر جارج بہ نفس نفیس اپنے پورے کروفر کے ساتھ سامنے آ کھڑے ہوتے۔ ایک پل کے

لیے ان کے خون کی روانی اس طرح تھم گئی جیسے کہا جاتا ہے چوبیس گھنٹے میں ایک پل ایسا آتا ہے جب ساری ندیاں بہنا بند کر کے ستاتی ہیں، وہ پل ہم لوگ نہیں دیکھ پاتے۔ ستاتی ہیں یا نہیں یہ تو بھگوان جانے۔ لیکن جب ہم ستاتے ہیں تو وہ بھی ستاتی ہوں گی۔ دوسرے ہی لمحے دوران خون پھر شروع ہو گیا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر رادھیکا بابو کو گلے لگایا۔

رادھیکا بابو نے دھیرے سے کہا "آج سوامی جی کے آنے کا دن تھا، وہ تو نہیں آئے، مجھے بھیجا ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔"

"تمھاری امانت ساتھ لایا ہوں۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"کیا تم اسے تھوڑا روک رہ سکتے ہو؟"

"ہاں، اس وقت تو یہ لاکھوں کی ہے لیکن آج کے بعد یہ کوڑی کی ہو جائے گی۔ اس کی قیمت زبان کی قیمت کے ساتھ وابستہ ہے۔"

بڑے رائے نے ایک پل کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بولے "تم ٹھیک کہتے ہو، آؤ میرے ساتھ۔"

وہ انھیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ دروازہ بند کر لیا۔ کمرے کے اندر ایک تجوری تھی۔ کبھی کسی نے اسے کھلے نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے اسے کھولا اور بولا "رادھیکا، یہ خاندان کی وہ دولت ہے جسے ہمارے بزرگوں نے سیکڑوں سال سے محفوظ رکھ چھوڑا تھا ـــــ جائیداد بنتی گئی لیکن یہ نہیں بٹی۔ یہی مانتا رہا کہ جب خاندان پر مصیبت کی گھڑی آئے تو اس خزانے کا سہارا لینا ـــــ شاید یہ وہی گھڑی ہے ـــــ جتنے میں تمھارا قرض چکتا ہو، لے جاؤ ـــــ"

"یہ کہہ رہے ہو ہری رائے؟ یہ تو تمھارے خاندان کی لکشمی ہے!"

"ہے تو، لیکن لکشمی کا مزاج ٹکنے والا نہیں ہوتا ـــــ اتنے دن ٹکی رہی یہ ہی کیا کم ہے؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"اس کے لیے تم آئے بھی نہیں۔ پھر بھی مانیں گے تو سمجھ لینا۔ میں وقت کو پہچان رہا ہوں۔ اسے لے جاؤ۔ ہو سکے تو بحفاظت رکھنا۔ کبھی میرا بندوبست ہوا تو چھڑا لاؤں گا۔ سوامی جی سے کہہ دینا کہ اگر انھوں نے میری لاج رکھی تو میں نے ان کی بات چھوٹی نہیں ہونے دی۔"

"نہیں ہری رائے! میرا اس خاندان سے قریبی رشتہ ہے ــــــ!"

"اس کی بات چھوڑو! قریبی رشتہ تو اسدن ختم ہو گیا تھا جب میں تمھارے پاس گیا تھا اور تم نے کہا تھا 'ہری رائے، کون جانے نظام بدلنے کے بعد اس زمین جائیداد کو کوئی پوچھے گا بھی یا نہیں؟' سونا ہولے آؤ۔ اس وقت میں الجھن میں پڑ گیا، ہمت نہیں کر سکا کہ اس خزانے کو رہن رکھ دوں۔ اس دن جب میں سوامی جی کے پاس گیا اور تمھاری موجودگی میں ان کے منہ سے نکلا "ہری رائے، گھبراتا کیوں ہے، تیری اس مونچھ کا ایک بال ہی لاکھوں کی قیمت کا ہے" پتہ نہیں کیسے تمھارے منہ سے یکایک نکل گیا کہ 'ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔' میں نے تمھیں اپنی مونچھ کا بال دے دیا، تم نے روپیہ۔ کیسا گڑیوں جیسا کھیل تھا۔ میں نے بعد میں سوچا 'ہری رائے، جو مونچھ گروی ہوں، انھیں کب تک عزت کا نشان بنائے گھومو گے؟'"

"مجھ سے غلطی ہوئی ہری رائے!"

"شاید نہیں! انسان کی پہچان ایسے ہی موقعوں پر ہوتی ہے۔ تم اگر خود میری مدد نہ کرتے تو بیٹی کی شادی کیسے ہوتی؟ اگر مونچھیں گروی نہ رکھتا تو تکلیف کا اتنا بھی احساس کیسے ہوتا؟ کچھ بھی کہو، جائیداد میری ہوتے ہوئے بھی میری نہیں تھی۔ کیونکہ وہ کبھی بھی کسی کی ہو سکتی ہے۔ مونچھیں مکمل طور پر میری اپنی تھیں۔ ان کا درد نہ کہا جا سکتا تھا اور نہ برداشت کیا جا رہا تھا۔ جب تک زندہ ہوں، وہ درد قائم رہے گا۔"

رادھیکا بابو نے مخمل کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھا دی۔ انھوں نے اسے کھولا، دیکھا اور واپس اسی میں رکھ دیا۔ دھیرے سے بولے "رادھیکا، میں تمھارا احسان مند ہوں کہ تو نے اس ناچیز کو اتنی عزت بخشی ــــــ میری عزت کو سونے کی ڈبیہ میں سنبھال کر رکھا۔ یہ کسی دیوتا کا مقدس بال نہیں تھا۔ دنیا کے تھپیڑوں میں ٹوٹتے بنتے آدمی کا حماقت آمیز بال تھا۔

کھاتے ہوئے منہ میں آجائے تو لقمہ تھوک دیتا ہے۔ یہ پرواہ نہیں کرتا کہ کس کی قسمت کا ایک لقمہ کم ہو جائے گا۔"

رادھیکا بابو کو جتنا لگا کہ ان کے قرض کی ادائگی کر دے گا، اتنا زیور لے لیا۔ وہ اسے لے کر اٹھے تو لگا کہ وزن اٹھا نہیں سکیں گے۔ بڑے رائے نے سہارا دیا۔ دونوں باہر آئے تو چاروں طرف آنکھیں تھیں۔ بڑے رائے سیدھے دیکھ رہے تھے، رادھیکا بابو نیچے۔ باقی سب حیران تھے۔

ادھر رادھیکا بابو گئے۔ ادھر بڑے رائے نے سب کو بلایا۔ جس راز کو انھوں نے دل کی گہرائیوں میں چھپا رکھا تھا انھوں نے سب کے سامنے اس سے پردہ اٹھا دیا۔ چھوٹے رائے کچھ بولے بغیر سنتے رہے۔ اس دن وہ پہلی بار بولے "بڑے بھیا جب آپ نے مونچھیں گروی رکھ کر اتنا قرض لیا تب نہیں بتایا، خاندان کا سینکڑوں سال پرانا خزانہ اس سود خور کو سونپا تب نہیں پوچھا —— یہ سب اب کیوں بتا رہے ہیں... اب تو سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ اب بھی نہ بتاتے تو بہتر ہوتا —— کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہم، یہ جائیداد اور خاندان کا وہ خزانہ جس میں سب نے کچھ نہ کچھ جوڑا ہوگا —— آپ کی مونچھوں کی نذر ہونے کے لیے تھے۔"

مجھے چھوٹے رائے کی بات کہیں چبھی۔ میرے منہ سے یکایک نکلا "ہم اس جائیداد کا ایک حصہ بیچ کر اس خزانے کو چھڑا لیں گے۔"

بڑے رائے، ابھی تک چھوٹے رائے کی چوٹ سے سنبھل نہیں سکے تھے۔ چھوٹے رائے نے ایک چھوکا اور لگایا "بھاسکر، ویسے تو جو بڑے بھیا نے چاہا وہ ہوا، میرے حصے کی جائیداد بھی تم سب کی ہی تھی۔ لیکن اس کا اصلی مالک ارن ہے۔ میں نے پوری جائیداد اس کے نام کر دی ہے۔ میں اسے چھونے کا اختیار کھو چکا۔ اگر تم اس جائیداد کا حصہ بیچو تو مت بیچنا یا ارن سے پوچھ لینا۔ وہ تمھارا ہی بھائی ہے۔"

بڑے رائے نے نظر اٹھا کر پہلی بار ان کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اپنے کیے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان کے کہے کے بارے میں سوچنے لگے۔ ان کی آنکھوں کی باریک باریک نسیں جو پہلے کبھی نظر نہ آئی تھیں، یکایک لال ہو کر ابھر آئیں۔ چھوٹے رائے

کی گردن اب اس طرح اٹھی ہوئی نہیں تھی جیسے پہلے رہتی تھی۔ دوسرے پر لٹا کر دیکھنے میں اور دوسرے سے بچا کر دیکھنے میں فرق آجاتا ہے۔

بڑے رائے بولے ”تو تم اسی دن کا انتظار کر رہے تھے ـــــ ارن بڑا ہو اور تم نظر بدلو!“

بڑے رائے ہارنے پر بھی ایک جاگیردار کی طرح ہار نہیں مان رہے تھے! بلکہ چوٹ کھائے سانپ کی طرح پھنپھنا رہے تھے۔ چھوٹے رائے چپ تھے۔

ارن انجینئرنگ میں پڑھ رہا تھا۔ اس وقت اس کی پڑھائی کے بارے میں سب کے دل میں ایک عجیب سا جوش تھا۔ جیسے نئے بننے والے گھر کی چھت کا ڈھلاؤ ڈلواتے ہوئے گھر والوں کو ہوتا ہے۔ میں بھی اس سے اچھوتا نہیں تھا۔ ارن کا ذکر آتا تھا تو میں چھاتی پھلا کر کہتا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی ارن اس شہر کا پہلا انجینئر ہوگا۔ پہلے تو لوگ سب اوورسیری کا امتحان پاس کر کے آتے تھے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے انجینئر ہو جاتے تھے۔ لیکن ارن اصل انجینئر ہوگا۔ ڈگری یافتہ۔ پورے شمالی ہند میں ایک ہی انجینئرنگ کالج تھا۔ تھامسن انجینئرنگ کالج، رڑکی۔ اسی طرح ایک ہی میڈیکل کالج بھی تھا۔ کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ۔ وہ تو ابھی بھی کالج ہی ہے۔ جبکہ تھامسن کالج رڑکی یونیورسٹی میں بدل گیا۔ دونوں ہی نے جو انجینئرنگ یا ڈاکٹر پیدا کیے جن کا نام دور دور تک پھیلا۔ لیکن وہ سب بڑے لوگ تھے نیچے کے لوگ تعمیر میں کام کرنے والے مزدور ہوتے تھے۔ ارن بھی اسی تعلیم کا حصہ تھا۔ ہم لوگ اس کے بارے میں یہ ہی خیال کرتے تھے کہ ارن نگر کا بڑا صاحب ہوگا، دورے پر آیا کرے گا تو اس کے پیچھے پیچھے نہر کے دوسرے صاحب لوگ گھوڑوں پر چلا کریں گے۔ چھوٹے لوگ گھوڑے کے پیچھے پیچھے پیدل دوڑا کریں گے۔ اگر بڑے صاحب کا گھوڑا لید بھی کرے گا تو اسے اپنے دوشالے میں لے لیں گے۔ دراصل، تب اس انجینئرنگ کالج میں سول انجینئرنگ کی ڈگری اور ڈپلوما کی پڑھائی ہوتی تھی۔

حالانکہ ارن انٹر میں ایک سال فیل ہوا تھا۔ پھر بھی بڑے رائے کی بھاگ دوڑ کے

جب اسے ڈگری کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ تب انگریزوں کے لڑکے بھی انٹیر تک پڑھنے وہیں آتے تھے۔ تیراکی، گھوڑسواری، کھانے کا ڈریس الگ، کلاس میں جانے کا ڈریس الگ ـــــ بالکل صاحب بن کر نکلتے تھے۔ اپنی زبان بھی توڑ مروڑ کر بولنا سیکھ جاتے تھے۔ استاد بھی زیادہ تر انگریز تھے۔ اس پر بھی ہم لوگوں کو فخر تھا کہ ان کے استاد انگریز ہیں۔ اس کے صاحب پن نکلنے میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں تھا۔ چھوٹے رائے پر جب بھی گاندھی جی سوار ہوتے تھے تو وہ ضرور یہ کہا کرتے تھے کہ پتہ نہیں گاندھی جی، جواہر لال، سبھاش یا کسی طرح ان کا نیچے کے لوگوں سے کوئی تعلق ہو گیا نہیں؟ پھر وہ اس سوال کو بیچ میں ہی چھوڑ کر ان پر فخر کرنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب وہ ان کی بڑائی کرتے ہوتے تھے اور ان کا کوئی پرانا کانگریسی ساتھی گزر جاتا تھا تو ٹوک دیتا تھا "راگھو بھائی، کہاں تو تم سب چھوڑ کر گاندھی کے چیلے بننے پر آمادہ تھے، اور کہاں تم اپنے بیٹے کو صاحبی کے پیچھے دوڑا بنتے جا رہے ہو۔ ارے راگھو بھائی، یہ سب تو انگریز ہمارے ہی سینے پر بیٹھ کر ہمارے دشمن تیار کر رہے ہیں۔ اس بات کا تب پتہ چلے گا جب اصلی انگریز چلے جائیں گے اور ہندوستانی انگریز رہ جائیں گیا انگریز کی ٹھوکر چاہے جتنی تکلیف دیتی ہو لیکن ان ہندوستانی انگریزوں کی ٹھوکر کا گھاؤ ـــــ دیکھ لینا ـــــ ناسور بن کر رہے گا۔"

چھوٹے رائے کو ہلکا سا جھٹکا لگتا لیکن وہ بات کو سنبھال لیتے "ٹھیک کہتے ہو! ہم کب تک ان کی ٹھوکریں کھائیں گے؟ وہ ٹھوکر بھی ماریں گے اور پیٹ پر سو کھنے لیے بھی ڈالیں گے۔ اپنا مرے گا تو چھاؤں میں ڈالے گا۔ ویسے بھی ان بڑے رائے کے سنسکار لے کر پیدا ہوا ہے۔ جو میں بننا چاہتا تھا وہ تو نہیں بن سکا۔ جو کچھ اب آکر ہاتھ لگا ہے کیا سے بھی چھوڑ دوں؟"

وہ لوگ ہنس دیتے۔ "تم ہار مان گئے! جس راہ پر چلے ہی نہ ہو اس میں چور بتی کی روشنی میں راہ کہاں تک دکھائی دے سکتی ہے؟ چلے ہوتے تو کافی منزل طے کر چکے ہوتے۔ ملک آزاد ہونے کے بعد جب ملک خود مختار ہو گا سب برابر ہوں گے، سب اپنے ملک سے جانے پہچانے جائیں گے، تمھارے بیٹے کو تب ان صاحبوں کے لیے نہیں، ملک کے عوام کے لیے، گاؤں، کوٹھوں میں سڑکیں بنانی ہوں گی۔۔۔ نہریں کھودنی ہوں گی۔ نہ کوئی مزدور ہو گا، نہ مالک سب کام کرنے پڑیں گے۔"

چھوٹے رائے ہنس دیتے "جتنا ہم سوچتے ہیں اس میں بہت سا تو چربی کی طرح ہوتا ہے ـــــ جو وزن اٹھانے کے لیے کام آتا ہے۔ کچھ ہی ہوتا ہے جو طاقت میں بدلتا ہے۔"

کئی لوگ ان کی اس بات سے ناراض ہو جاتے "ہم جانتے ہیں تم دراصل جاگیر دار ہو ـــــ وہ تو فیشن کے تحت ہماری طرف چلے آئے تھے۔ کبھی کہنے کو ہو گا کہ ہم بھی پانچ سواروں میں تھے۔"

تب وہ ناراض نہیں ہوتے تھے۔ ہنس کر کہہ دیتے "تم سمجھتے ہو کہ اب ایسے لوگ نہیں ہیں اور کیا وہ ملک آزاد ہونے کے بعد بالکل نہیں رہیں گے؟

ہم لوگ ارن کی امکانی صاحبی سے دلچسپی تو لیتے ہی تھے۔ کب ارن پڑھائی ختم کر کے آئے گا اور کب اس قدیمی خاندان کی شان و شوکت میں چار چاند لگیں گے۔ جو بنیادیں متزلزل نظر آ رہی ہیں، وہ پھر مضبوط ہو جائیں گی۔ جب افسران دیکھیں گے کہ رائے خاندان نے بھی ایک اعلیٰ افسر پیدا کر دیا تو ان کی نظروں میں عزت کی مٹھاس اور زیادہ گھلنے لگے گی۔ ایک صاحب جتنا دوسرے صاحب کے لیے رعایت کرتا ہے اتنا ہی ہم لوگوں کے لیے بھی کرے گا۔ جب ارن چھٹی میں آتا تھا تو بڑے رائے اسے اپنے ہمراہ کلب لے جاتے تھے۔ صاحبوں سے ملاتے تھے "یہ میرا چھوٹا بیٹا ہے، رڑکی میں انجینئرنگ پڑھ رہا ہے۔"

ہندوستانی حکام اوپر سے خوش ہوتے تھے لیکن اندر سے حسد محسوس کرتے تھے۔ انگریزوں کا رخ بالکل دوسرا ہوتا تھا۔ وہ یا تو اسی طرح دیکھتے تھے جیسے کوئی پادری تبدیلی مذہب کے لیے آئے ہوئے کسی دوسرے دھرم کا سہارا لینے والے کو دیکھتا ہے۔ دیر تک ہاتھ ملاتے رہتے تھے۔ ایسی باتیں پوچھتے اور بتاتے تھے کہ ارن کو بھی مزہ آتا تھا، اسے یہ ذرا بھی احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ملک کے حکمرانوں میں ہیں اور وہ ان کی رعایا ہے۔ اس سے کہتے تھے تمھیں انگلینڈ جا کر مزید تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ تب بڑے گھروں کے لڑکوں میں ولایت جانے کی شدید آرزو ہوتی تھی۔ اب ہر آدمی ولایت جانا چاہتا ہے۔ جاتا بھی ہے۔ تب ولایت انگلینڈ ہی تھا لیکن اب ولایت کا مطلب کافی وسیع ہو گیا۔ امریکہ، جرمنی، فرانس، روس وغیرہ کا نام عالمی جنگ میں لوگوں نے جانا تھا۔ بڑے گھروں کے بچوں کے بیرون ملک

جانے کا ایک اور سبب تھا۔ نہاتی ہوئی، کتوں کو نہلاتی ہوئی، بھائیوں کے ساتھ ناچتی ہوئی، پیانو بجاتی ہوئی میموں کے فوٹو سب لوگوں کے گھروں میں ٹنگے رہتے تھے۔ جیسے ہی صاحبوں کو خوش رکھنے کے لیے ٹنگے رہتے ہوں لیکن وہ فوٹو ان کے دلوں کو بھی متاثر کرتے تھے اور انھیں اپنے ساتھ ان خوابوں کی دنیا میں بھی لے جاتے تھے جہاں دور حتی تھیں یا جہاں سے کبھی کبھی ان کے سپنوں میں آتی تھیں۔ گھروں میں تب بھابیوں، چاچیوں، ممانیوں، دادیوں اور ماؤں میں یہ کہنے کا رواج تھا کہ "دیکھنا میرا لال تو میم بیاہ کر لائے گا" حالانکہ جن گھروں میں میمیں آئی تھیں وہاں سب سے پہلے جہاد بھی ان ہی ماؤں اور دادیوں نے چھیڑا۔ میموں کا بار بار نام آنا بڑے گھروں کے لڑکوں کے لیے جلاب کا کام کرتا تھا۔

ارن کے دل میں بھی ولایت جانے کا خوشہ پھوٹ پڑا تھا۔ حالانکہ ہماری حویلی ہی ایسی تھی جہاں ولایتی میموں کی تصویریں بالکل نہیں تھیں۔ البتہ اس کوٹھی میں قسم قسم کی تصویریں تھیں، جس میں منجھلے رائے جا کر رہے تھے۔ ایسا نہیں کہ ارن وہاں بالکل نہ جاتا ہو، جاتا تھا اور ان تصویروں پر ڈھکے روئی کے غلاف اٹھا کر دیکھتا تھا۔ جتنی بھی آدم قد تصویریں تھیں ان سب پر روئی کے لال تگے ہوئے غلاف ڈھکے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ شیشوں پر بھی۔ کوئی تقریب ہوتی تھی تو انھیں اٹھا دیا جاتا تھا اور تصویروں کو جھاڑ پونچھ کر ٹھیک ٹھاک کر دیا جاتا تھا۔ دوسرے بڑے رائے کے ساتھ وہ میموں کا انٹرویو بچپن سے ہی کرتا آرہا تھا۔ بچپن میں اس کی دوستی ایک انگریز جوائنٹ مجسٹریٹ کی بیٹی سے بھی تھی، جوائنٹ مجسٹریٹ کے والد ہندوستان میں پادری رہ چکے تھے اس لیے ان کا خاندان تھوڑی بہت اردو سمجھتا تھا۔ بولتا بھی تھا۔ تب اردو کا ہی چلن تھا، بھلے ہی بولتے ہندی ہوں۔ وہ جوائنٹ مجسٹریٹ بعد میں برطانیہ عظمیٰ کا وزیر بھی ہوا۔ سنا ہے اس کی بیٹی میری، اکثر ہندوستان آتی تھی۔ ایک دوبار ارن سے بھی ملی۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے، تب تو بات اتنی ہی تھی کہ ارن کے دل میں میری کی بھی ایک شبیہہ تھی جو ولایت سے پکارتی تھی۔

جوائنٹ مجسٹریٹ اور بڑے رائے دونوں بچوں کے بارے میں کبھی کبھی معصوم مذاق بھی چلا کرتا تھا۔ وہ بڑے رائے سے کہا کرتا تھا "ویل مسٹر ہری رائے، آپ ہماری بیٹی میری کو اپنی بہو بنائے گا؟"

بڑے رائے ہنس دیتے تھے "آپ کی یہ چڑیا بیٹی ہمارے بیٹے کو گھونسلے کے تنکے کی

طرح پونچھ میں دبا کر پتھر سے اتر جائے گی۔"

جوائنٹ مجسٹریٹ بہت ہنستا۔ یہ مکالمہ بھی کہیں نہ کہیں ارن کے دل و دماغ پر اپنی جگہ بنائے ہوئے تھا۔ مجموعی طور پر ان سب معاملات کی اس کے دل میں تہہ سی لگ گئی تھی۔ انجینئرنگ کالج میں جاکر اور صاحبوں کی بے تکلفی دیکھ کر وہ کھلتی چلی گئی۔ انجینئرنگ پاس کرتے ہی اس نے ولا کی بات اٹھائی۔ اس بات نے ہم سب کو آپس میں اس طرح پھاڑ دیا جیسے دودھ میں لیموں نچوڑ دیا گیا ہو۔ جو بات اندر تھی وہ اوپر نظر آنے لگی۔

چھوٹے رائے کا من چاہے جتنا بھی ارن نواز ہو گیا ہو لیکن حب وطن والی وہ دھارا ابھی سوکھی نہیں تھی۔ بڑے رائے دور اندیش تھے انھیں لگتا تھا کہ ہم چاہے جتنے بھی کھاتے پیتے اور خوش حال ہوں، ولایت بادشاہوں کا ملک ہے، وہاں کی شان و شوکت، خوبصورتی اور خوب سیرتی اسے ہم سے دور کر دیں گے۔ سنا ہے وہاں چھوٹے گھروں کی میمیں ولایت جانے والے سب ہی ہندوستانیوں کو راجکمار سمجھتی ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھیں پھانستی ہیں۔ رائے بہادر چندریکا پرشاد کے بیٹے کی کہانی یاد کر کے وہ تھرا جاتے تھے۔

رائے بہادر کا لڑکا وہاں آئی۔ سی۔ ایس بننے گیا تھا۔ آئی۔ سی۔ ایس تو نہیں بنا ایک میم کے جال میں ضرور جا پھنسا۔ گھر سے پیسہ منگاتا رہا۔ گھر والے پیسے بھیجتے رہے۔ وہ میم اس پیسے کے بل پر اس کی شریک حیات بن کر مستی کرتی رہی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ میم اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی گئی۔ حالانکہ اس زمانے میں کسی کو چھوڑنے کا مطلب بھاگ جانا ہی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے سماج میں شوہر کو چھوڑ کر دوسرا گھر بسانے کا تصور ہی نہیں تھا۔ تھا تو چھوٹے طبقے کے لوگوں میں، انھیں شادی کا بندھن روایتی انداز میں توڑنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ بس اتنا کرنا پڑتا تھا کہ پنچایت کو جرمانہ اور ذات برادری کو بھوج دینا پڑتا تھا۔ پھر چاہے جو کرو۔ اس زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سزا کم بڑی سزا نہیں تھی۔

رائے بہادر کا بیٹا جب واپس لوٹا تو وہ محض ٹوٹ اور بکھر کر خالی ہوا بھانڈ تھا۔ اس کی آنکھوں کی

پتی بجھے ہوئے دیے کا لال پھول لگتی تھی۔ رائے بہادر کو اس شہرتی اور کنارے پر بہت بڑی رقم خرچ کرنی پڑی تھی۔ وہ بالکل الگ رہتا تھا۔ کئی بار لگتا تھا کہ مخفی ہولی۔ دائن سے بچا دھواں دیتا ہوا لکڑی کا کندہ ہے۔ اس کی شادی کا سوال اٹھا تو برادری کے قریب قریب سب لوگوں نے منہ پھیر لیا۔ یہ سب باتیں سوچ کر بڑے رائے کے اندر ایک خوف سا پھیل جاتا تھا۔ چاچی رو رو کر پاگل تھیں۔ انھیں لگتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ارن ولایت میں ہو اور میں چل بسوں وہ مجھے آگ بھی نہ دے سکے۔ بعد میں ہوا بھی یہی تھا۔ میں ارن کے ساتھ تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری بات اور تھی، مجھے تو پڑھنے ہی نہ دیا۔ ارن پڑھا ہے، انجینئر بنا ہے تو اسے اپنی پسندیدہ منزل تک پہنچنے کا پورا حق ہے۔

وہ میرے پاس آیا اور بولا "بھیا! کیا مجھے ان ہندوستانی صاحبوں کی غلامی کرنے کے لیے انجینئر بنایا تھا؟ کیا میں اپنے کو ان بزرگوں کے توہمات کا شکار ہو جانے دوں؟ میں دنیا میں ایک ایسا انجینئر بننا چاہتا ہوں جسے ہندوستان کی سب سے شاندار عمارت بنانے کا فخر حاصل ہو۔ اگر میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو میرا زندہ رہنا بیکار ہے ـــــ"

مجھے یہ بعد میں پتہ چلا کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ صرف الفاظ کا پلندہ تھا۔ اس وقت میرے سامنے آخری سانس لیتی ہوئی ماں آکھڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے ارن کو مجھے اور رانی کو سونپا تھا۔ تمھارے بابا کو تو نہ کبھی فرصت رہی ہے اور نہ رہے گی۔ زمینداری کے لیے گھر ان کا سامراج ہوتا ہے۔ گھر کی مالکن ہونے کے باوجود وہ بند تو امز دور سے بدتر تھیں۔ وہ یہی بولیں ـــــ تم گھر کو دیکھنا۔ ارن کو بیٹے کی طرح پالنا۔ بڑا بھائی پتا ہوتا ہے اور بڑی بہن میں ماں بستی ہے۔ جب ماں نہیں رہی تو ارن رانی اور بھوانی سے چمٹا رہتا تھا۔ رحمت اللہ کی دوکان پر بیٹھ کر کبھی بڑے رائے کا، کبھی چھوٹے رائے کا اور کبھی میرے آنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ شام ہوتے ہوتے رانی کی گود میں سر رکھ کر اس طرح سو جاتا تھا جیسے اس کے سپنوں کا سارا سنسار اسی کوکھ گود میں سمٹ آیا ہو۔ وہ کلا کو سب سے زیادہ پیارا تھا۔ روپا کی گود میں وہ شاید ایک ہی بار گود بھرنے والی رسم کی ادائیگی کے لیے بیٹھا تھا۔ جب تک رگھوور نہیں ہوا اس وقت تک کلا یہی کہا کرتی تھی ـــــ ہمیں کیا فکر، ارن بھی تو ہمارا بیٹا ہی ہے۔ رگھوور کے ہونے کے بعد تو وہ جی ہی نہیں۔ ادھر رگھوور ہوا اور ادھر وہ چل بسی۔ مجھے لگا کہ جیسے کلا پوچھ رہی ہے کہ اگر تمھارا رگھوور کبھی کوئی ضد کرے گا تو کیا تم اسے دھتکار دو گے؟ پتہ نہیں اپنے آپ

باکا کے اس سوال کے جواب میں یکایک میرے منہ سے نکلا "تم جاؤ گے ـــــ ضرور جاؤ گے۔"

ارن مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے لگا رگھوور یکایک بڑا ہو گیا ہے۔

کبھی کبھی رانی کی چٹھی آتی تھی تو وہ اپنے چھوٹے بھائی اور بھتیجے بھتیجی کے بارے میں تفصیل سے پوچھتی تھی۔ ارن کے بارے میں وہ خاص طور پر لکھتی تھی "ارن اکیلا پڑ گیا۔ اس کا خیال رکھیے گا۔ بھابی سے بھی کہیے گا کہ بنا ماں کا بچہ ہے ـــــ بنا ماں کے تو سونا اور رگھوور بھی ہیں۔ پھر بھی بھابی ان کی ماں ہے۔ ارن کی ماں تو میں ہی بچی تھی۔ میں یہاں چلی آئی۔ ایسی بندھ گئی کہ نکلنا مشکل ہے۔ وہ پچھلی بھیا دوج پر بھی نہیں آئی۔ لکھ دیا پڑھائی بہت ہے۔ بے رحم ہوتا جا رہا ہے۔ میں اس سے کیا کہوں؟ میں ہی کیا کر پاتی ہوں۔ لڑکیوں کا تو یہ ہی ہوتا ہے۔ تعلقات کی ایک زمین سے اکھڑ کر دوسرے تعلقات کی زمین میں ایسے جم جاتی ہیں کہ مرنا تیری گلی میں جینا تیری گلی میں۔"

ارن کو بھی سونا کی بہت یاد آتی تھی لیکن وہ اس کے گھر جانے سے بچتا تھا۔ رانی کے دو بیٹے تھے۔ بہنوئی چونکہ زمیندار کے بیٹے تھے کام کرنے سے بچتے تھے۔ انھیں دن رات گھر میں پڑے رہنا ہی پسند تھا۔ باہر کی دنیا میں رہنے کے بجائے پینے پرونے کھانے بنانے وغیرہ میں زیادہ دلچسپی تھی۔ رانی نے پیہر میں مردوں کو ہمیشہ گھر کے باہر ہی دیکھا تھا۔ وہ رانی پر ہاتھ تک اٹھا دیتے تھے۔ رانی سب کچھ چپ چاپ برداشت کرتی تھی۔ یہ سب جان کر بڑے رائے کے منہ سے کبھی کبھی نکل جاتا تھا ـــــ جس کی بیٹی دکھی اس کا جہان دکھی۔

ان سب باتوں کا بہت بعد میں پتہ چلا۔ جب ایک بار رگھوور اپنی بوا کے گھر گیا تو اس نے پھوپا کو بوا کو پیٹتے ہوئے دیکھا۔ وہ اتنا ڈر گیا کہ رونے لگا۔ رانی کے سسر کے پاس روپیہ تو بہت تھا لیکن رانی کے خاندان کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بہت ہوا تو سال بھر کی رسد بھجوا دیتے تھے۔ باقی کا سارا انتظام رانی کے شوہر کو کرنا پڑتا تھا۔ کبھی اپنے حصے کی زمین بیچ کر اور کبھی قرض لے کر۔ جب سے بڑے رائے کو پتہ چلا تھا تب سے وہ بھی ماہانہ کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے تھے۔ جب بھی رانی آتی تھی تو وہ بڑے رائے اور مجھ سے مل کر بہت روتی تھی جیسے شکایت کر رہی ہو۔ مجھے اکثر وہی لائن یاد آتی تھی۔ "بھائی کو دینے محل دو محلے، ہم کو دیا

پر چلتی اور دوڑتی رہتی حویلی میں چلی جاتی تھی جہاں دیوار کے ایک ایک چپّے پر اس کے ہاتھوں کی چھاپ تھی اور زمین پر پیروں کے نشان تھے۔ اب وہ سب اسے اجنبی لگتے تھے۔ باپ کے گھر اس گھروندے سے اسے ڈر لگتا تھا جو اس نے وہاں چھوڑا تھا۔ اس پر اس کا حق ہے بھی یا نہیں؟ کہیں چھونے سے چھوت نہ لگ جائے!

رانی کا بڑا بیٹا راج موہن اکثر کہا کرتا تھا "ہمارے باہری بیٹھک کے پیچھے ایک کوٹھری ہے۔ اس میں شب و روز گھی کا چراغ جلتا رہتا ہے۔ اسی کوٹھری میں بابا کا دھن رہتا ہے۔ جب وہ اندر جاتے ہیں تو سر جھکا کر جاتے ہیں۔ پھر دانت کچکچا کر کہتا ہے "جب بڑا ہو جاؤں گا تو بابا کو مار کر ان کا سارا روپیہ نکال لوں گا۔ چھوٹے چاچا کو وہ پیسے دیتے ہیں اور اسے باوری کو نہیں دیتے۔" "میں چھوٹے چاچا کا دوش کرتا تھا وہ ان کی موجودہ دادی کے بیٹے تھے۔ وہ زندہ تھیں۔ اس کے پتا اور بڑے چاچا کو باپ نے تھوڑی تھوڑی زمین دے کر الگ کر دیا تھا۔ بڑے رائے نے جس شان سے رانی کی شادی کی تھی، رانی کی زندگی پر اس کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا تھا۔ انھیں اس بات کا ملال تھا۔ خاندان کا بٹوارا ہو گیا۔ مشترکہ سماج بھی چھوٹا اور بیٹی کی زندگی دکھی کی دکھی رہی۔ چھوٹے رائے کو منجھلے رائے جب بھی ملتے تھے تو انھیں سمجھاتے تھے کہ بیٹی کی قیمت اتنی مت دینا کہ بڑا ہو کر وہی بیٹا مفلس ہو جائے۔ چھوٹے رائے میں ایک اور خاص بات آ گئی تھی۔ وہ منجھلے رائے کے سامنے چپ لگا جاتے تھے۔ اتنا ضرور ہو گیا تھا کہ بڑے رائے کے خلاف کہی گئی باتیں ان کے من پر اتنا نشان ضرور چھوڑ دیتی تھیں جتنا سوکھی زمین پر گھسٹتے جاتے ہل کی نوک سے کھنچی لکیر۔

ارن ولایت چلا گیا تھا۔ اس کے لیے مجھے بڑے رائے اور چھوٹے رائے دونوں کی ناراضگی برداشت کرنی پڑی تھی۔ چھوٹے رائے میں عرصے میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ جب بھی ارن کو روپے بھیجنے کا سوال اٹھتا تھا تو وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتے تھے کہ ہم دونوں بھائیوں نے تو منع کیا تھا —— اب تم جانو، تمھارا کام جانے۔ میرے سامنے یہ سوال تھا کہ میں کہاں سے لاؤں؟ میں میرا انحصار تو ان دونوں کی زمینداری پر تھا۔ مالک تو وہ دونوں بھائی تھے۔ میرے پاس اپنا کیا رکھا تھا۔ میری تو کوئی تنخواہ تک نہیں تھی۔ بس جو ضرورت ہوتی تھی وہ مل جاتا

تھا۔ میں نے ارن کو ولایت بھیجا تھا تو ان دونوں بھائیوں کے بل بوتے پر۔ آخر دونوں ہی اپنی اپنی طرح اس کے والد تھے۔ کہیں نہ کہیں وہ بھی بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے اندر خوف تھا۔ میں نے حامی بھر کر ایک طرف کر دیا تھا۔ اگر وہ نہ چاہتے تو کیا وہ ولایت جا پاتا؟ بڑے رائے میری مصیبت کو سمجھتے تھے۔ چھوٹے رائے کے کئی کاٹ جانے پر وہی ارن کو بھیجنے کے لیے پیسے کا بندوبست کراتے تھے۔ اوپر سے یہ ہی پتہ چلتا تھا کہ ان کا اس سے کیا واسطہ۔ اس کی ڈھائی۔ پھوٹی کے بیچ میں چوپائیں ہی تھا۔

ارن کا جب خط آتا تھا تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوتی تھی۔ سب کو بتاتا تھا کہ ولایت سے میرے چھوٹے بھائی کا خط آیا ہے۔ پتہ نہیں کیوں یہ سوچ بیٹھا تھا کہ ارن واپس لوٹا نہیں اور ہمارے گھر کا بحران ٹلا نہیں۔ وہ ایک بڑا انجینئر بنے گا۔ روپیہ ایسا برسے گا جیسے لکشمی خود چھن چھن کر ناچ رہی ہو۔ سارا قرض اتر جائے گا۔ سب سے زیادہ فکر قرض کی تھی۔ زیادہ تر کاغذات پر میرے ہی دستخط ہوتے تھے۔ پہلے دیوان جی کیا کرتے تھے۔ فکر اس خزانے کی بھی جو راوجی کا بابو لے گئے تھے۔ کبھی اس طرح کی باتیں بھی سوچنے لگتا تھا کہ ارن جب لوٹے گا تو اپنے ساتھ بڑے رائے اور چھوٹے رائے کے لیے ایک ایک کار لے کر آئے گا۔ اگر لے کر نہ آیا تو یہاں آکر خرید دے گا۔ میرا کیا میرا کام تو گھوڑا گاڑی یا سائیکل سے بھی چل جائے گا۔ ان دنوں کاریں گنتی کے لوگوں کے پاس تھیں۔ تب تک موٹر کلچر پنپا نہیں تھا۔ اسے معتبر سواری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جانور کو باندھ جکڑ کر یا مار پیٹ کر قبضے میں کر بھی لو لیکن کل پرزوں کا کیا بھروسہ۔ پتہ نہیں کب کہاں اینٹھ جائے۔ خود بھی جائے اور بیٹھنے والی بھی جائیں۔ یہاں جلدی پہنچاتی ہے تو وہاں بھی جلدی پہنچا دیتی ہے۔ گھوڑے سے گر گئے تو لوگ کہیں گے ـــــ شہ سوار ہی گرتے ہیں میدانِ جنگ میں ـ ـ ـ کار تو خود بھی گرے گی اور دوسروں کو بھی گرائے گی۔ اس کے بارے میں تو کوئی کہاوت بنی ہی نہیں گھوڑا سوار کو پہچانتا ہے یہ ناقص سواری تو خدا کو بھی نہیں پہچانتی جیسی میم ویسی موٹر۔ جس کے نیچے کل، اسی کے کہے پر چل۔ دوسرا رخ تھا کہ موٹر چلے تب کھائے؟ جانور تو کھڑا بھی کھاتا ہے اور چلتا بھی۔ یہ منہ چلائے اور نہ جگالی کرے اور نہ گندگی پھیلائے۔ کچھ بھی کیسے کار مجھے پسند تھی۔

یکایک مجھے لگتا کہ یہ سب کیوں سوچنے لگتا ہوں، ابھی تو وہ دن دور ہے جب ارن

آئے گا، کاشی چھن چھن ناچے گی اور ہماری مصیبت کے دن کٹیں گے۔ سارنگا اس معاملے میں زیادہ سمجھدار تھی۔ یہ بات میں نے بعد میں محسوس کی۔ پہلے تو وہ چپ چاپ سنتی رہتی اور پھر کہتی "اتنی دور کی مت سوچا کیجیے ــــ چھاتی پر پڑنے والی کرنوں کو بادل کا ایک چھوٹا ٹکڑا بھی ڈھک لیتا ہے۔ بھائی بند کا چوٹ کھایا ہوا اور کتے کا کاٹا ہوا زیادہ پیاسا مرتا ہے" اس کی بات مجھے احمقانہ زیادہ لگتی تھی۔ وہ موقع بے موقع اس جملے کے بول دیا کرتی تھی۔ بعد میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی کہ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا۔ کبھی کبھی یہ بھی لگتا تھا کہ وہ کسی ذہنی گتھی کی شکار ہے۔ چاہے وہ بڑے رائے کے بارے میں ہو یا ان کے بارے میں یا پھر رگھوور کے بارے میں۔۔۔

سونا بس اسکول جاتی تھی اور باقی وقت گھر میں ہی رہتی تھی۔ اس زمانے میں ہر وقت گھر میں ہی رہنا کتنا دشوار ہوتا ہوگا۔ یہ بات کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ اب تو سب کی سمجھ میں آنے لگا ہے۔ تب یہ ہی لگتا تھا کہ عورتوں کی جگہ وہیں ہے۔ اب تو رگھوور کی بیٹی لکشمی میری پوتی کو بھی لگتا ہے کہ باہر کی دنیا جتنی لڑکوں کے لیے ہے اتنی ہی لڑکیوں کے لیے۔ رگھوور بڑے رائے کے پاس رہتا تھا۔ اسی کا بستہ، اس کے کپڑے، کھیل کا سامان ــــ ان ہی کمرے میں رکھے جاتے تھے۔ بھوانی کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ ایک تو اس عرصے میں نوکر چاکر بھی کم ہوئے تھے۔ دوسرے گھر کے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے کی ذمہ داری سنبھالنا آسان نہیں تھا۔ گھر کے باقی لوگ بھی بھیڑ ہونے پر بھوانی کو آواز دیتے تھے۔ مہمان خصوصی آتے تھے تو ان کی خاطر مدارات کا کام بھی اسی کو کرنا ہوتا تھا۔ وہ سب کی ضرورتوں سے واقف تھا۔ کس کو کس وقت کیا چاہیے۔ بھوانی گھر کی عزت کا نشان بھی بنتا جا رہا تھا، سہولیات اور آسانیوں کا وسیلہ بھی۔ جذباتی ضرورت تو بن ہی گیا تھا۔ ہر دکھ اور ہر سکھ اسے اتنا ہی متاثر کرتا تھا جتنا گھر کے دیگر افراد کو۔ اگر سارنگا سونا کو کچھ کہتی تو اسے لگتا تھا کہ وہ خود ہی سونا ہے۔ بڑے رائے اور چھوٹے کے درمیان کچھ ہو جاتا تھا تو اسی طرح محسوس کرتا تھا جیسے پھانس خود اس کے چبھی ہو۔ میرے اور سارنگا کے درمیان کہا سنی ہو جاتی تھی تو اس کا چہرہ سب سے پہلے مرجھا جاتا تھا۔

چھوٹی چاچی بیمار تھی وہ وقت نکال کر دونوں وقت چاچی کے پاس جا کر بیٹھتا تھا۔ ان کے تلووں پر تیل لگاتا تھا، سر دباتا تھا۔ حالانکہ ہمارے یہاں نوکرانیاں ہی عورتوں کا کام کرتی تھیں۔ لیکن اس کے جذبہ خدمت نے اسے صرف مرد ہونے کی حیثیت سے اوپر اٹھا دیا تھا۔ کسی دن اس کی حالت بگڑ جاتی تھی تو وہ رات بھر جاگتا تھا۔ بھلے ہی دن بھر کام کرنا پڑے۔ جب موقع ملتا تھا تب ہی جھپکی لیتا تھا۔ کسی نے پکارا نہیں کہ پھر مستعد۔ وہ گھر بھر کے دکھ درد کا بوجھ ڈھونے والی اس کھونٹی کی طرح تھا جو اونچے مکانات پر آسمانی بجلی کنٹرول کرنے کے لیے لگی ہوتی ہے۔ بجلی کتنی بھی کڑک کے، گرتے ہی اسے جذب کر لیتی ہے۔

چھوٹی چاچی کی بیماری کافی بڑھ گئی تھی۔ سونا اور سارنگا دونوں اکیلے پڑ جاتے تھے۔ سارنگا کی عمر بھی کم ہی تھی۔ کہنے کو وہ مالکن تھی لیکن مالکن بن جانے سے عمر تھوڑی بڑھ جاتی۔ جہاں تک مجھے خیال ہے کہ سارنگ اور سونا کی عمر میں دس بارہ سال کا فرق تھا۔ سارنگ ابھی تک یہ طے نہیں کر سکی تھی کہ سونا اس کی بیٹی ہے یا بہن کی طرح ہے۔ بہن ہونا اور بیٹی کی طرح ہونا زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ بیٹی ماں کے حقوق کا جزو ہوتی ہے اور ماں بیٹی کے۔ بیٹی کی طرح ہونا کئی بار ماں کے حقوق پر سوالیہ نشان لگانے لگتا ہے۔ ایک عجیب کشمکش تھی۔ سونا کو لگتا تھا کہ سارنگا نے اس کی ماں کی جگہ ہتھیالی ہے جو شاید اس کے لیے اتنی مقدس تھی کہ اس پر اس کی ماں کا حق ہو سکتا تھا۔ بھلے ہی ماں مر گئی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جب ماں کو ہٹا دیا تو اسے اور اس کے بھائی کو بھی ہٹا کر اور دو بچوں کو بٹھا دیا جائے گا۔ کئی بار کوئی شخص فرائض سے زیادہ حقوق کے بارے میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ ایک دن سارنگا نے سونا کو کافی برا بھلا کہا۔ سونا کچھ زیادہ باتونی تھی۔ پہلے تو وہ سنتی رہی پھر اس طرح بولی جیسے اس نے سارنگا پر بہت بڑی چوٹ کی ہو ـــــ اگر ماں ہوتی تو کیا یہ کہتی کہ تم دونوں میرے سر پر لاد دیے گئے۔ سارنگا چپ ہو گئی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ غصے میں بولی "تم دونوں بھی اس کے ساتھ کیوں نہیں چلے گئے؟"

بھوانی چاچی کے پاس تھا۔ پہلے تو چاچی وہیں سے دونوں کے نام لے لے کر پکارتی رہی۔ پھر بھوانی کو بھیجا ـــــ دیکھ کر آ کیا ہو رہا ہے؟ میں آنکھ موند لوں گی تو سونا کو کیا ہوگا؟ وہ دکھی ہو گئیں۔ بھوانی نے سارنگا کو یہ سب کہتے ہوئے سن لیا تھا۔ وہ بولا "بہو جی، آپ کے بچے ہیں، ایسا مت کہیے۔ ان کو آپ کی دعا اور پیار چاہیے۔"

سونا شاید بہت ناراض تھی۔ اس نے جواب نہیں دیا تو وہ بولی "یہ بچے ان کے نہیں، ہم تو اپنی ماں کے بچے ہیں۔"

سارنگا کو کچھ اور تو سوجھا نہیں، ایک چپت رسید کر دی۔

جوانی کو جیسے بچھو ڈس گیا۔ وہ بولا "بھوجی، آپ نے مونی بیٹا کو مار کر ٹھیک نہیں کیا ___ اس گھر میں کبھی کسی نے بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔"

سارنگا جیسے بپھر پڑی "تم نوکر ہو، نوکر کی طرح رہو۔ تم نے میری بے عزتی کرنے کی ہمت کیسے کی؟ اس گھر میں تم رہو گے یا میں! ایسوں کو جتاتے ہو!"

"ایسا نہ کہیے بھوجی۔" اس کا دل بھر آیا۔

جب میں واپس آیا تو سارنگا کا منہ حسب معمول چڑھا ہوا تھا۔ وہ سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ یہ اس کے ساتھ اکثر ہوتا تھا۔ جب وہ ناراض ہوتی تھی تو اس کی آواز مریل سی ہو جاتی تھی جیسے کئی دن سے کھانا نہ کھایا ہو۔ فوراً سمجھ میں آ جاتا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ حالانکہ یہ بات سمجھ میں آنے لگی تھی کہ ازدواجی تعلقات میں موسم کا فرق بعد میں جا کر محسوس ہوتا ہے۔ میں نے کئی بار پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ بہت دیر تک یونہی کہتی رہی کہ کچھ نہیں۔ وہ میری بے چینی میں اضافہ کر رہی تھی۔ خواتین محض کمزوریوں کا پتلا ہی نہیں ہوتیں اپنی طاقت سے بھی بخوبی واقف ہوتی ہیں۔ بھلے ہی طاقت محدود ہو لیکن اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے میں ماہر ہوتی ہیں جبکہ مرد اپنی طاقت کو چھلکا چھلکا کر دکھایا تو کرتا ہی ہے ضائع بھی کرتا ہے جب وہ سمجھ گئی کہ میں جاننے کے لیے بے چین ہوں اور میری بے چینی نقطہ عروج پر پہنچ چکی ہے تو وہ پھٹ پڑی "آپ پوچھتے ہیں کیا ہوا؟ ___ مجھے آپ لوگ ___ نوکرانی سے بھی گئی بیتی کوئی چیز ہو وہ بنا کر لائے ہیں ___ آپ بڑے لوگ ہیں۔ آپ کے لیے اپنی ہی عزت، عزت ہے۔ بھلے ہی چھوٹے گھر سے آئی ہوں، لیکن وہاں بھی مجھے بھر پیٹ روٹی مل جاتی تھی۔ یہاں میں کوئی موتی نہیں چگتی، لیکن انسان کی جتنی بے قدری یہاں ہے وہاں اتنی چھوٹے لوگوں میں نہیں ہوتی۔ تمھاری بیٹی کہتی ہے کہ تم میری ماں نہیں ہو، تم دشمن ہو ___ تمھارے نوکر میری بے عزتی کرتے ہیں ___ مجھے جتاتے ہیں کہ میں غلطیوں کا پلندہ

ہوں ــــ پتہ نہیں میرے ماں باپ نے مجھے اس گھر میں کیوں دھکیل دیا ــــ یہاں کیا دیکھا تھا؟ دھن دولت، کوٹھی، اناج کے بھنڈار، ــــ ان کا میں کیا کروں؟ چھوٹے گھر کا چھوٹا سکھ بڑے گھر کے بڑے سکھ سے کہیں اچھا تھا۔"

سارنگا جس انداز میں باتیں کر رہی تھی اس نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ میں نے کچھ سوچا، نہ سمجھا، سونا کو پکارا۔ سونا ڈرتی ہوئی آئی۔ میں بولا "تم نے اپنی ماں کو دشمن کہا! تم زبان دراز ہوتی جا رہی ہو ــــ میں آج ہی کاٹ کر چھوٹی کر دوں گا۔"

اس نے ڈر کے مارے کانپتے ہوئے کہا "نہیں پتا جی، میں نے یہ نہیں کہا۔ انھوں نے ہی کہا تھا ــــ تم دونوں اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں چلے گئے۔"

میں یہ سن کر بھنا گیا۔ سارنگا بیچ میں بولی "تجھے جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی ــــ میری لڑکی ہوتی تو کھود کر دھرتی میں گاڑ دیتی۔"

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا! میں ان دونوں پر ایک ساتھ پل پڑا۔ میں نے دو ہاتھ سارنگا کی پیٹھ پر رسید کیے اور ایک ہاتھ بچی کی پیٹھ پر۔ سونا کی آواز بند ہو گئی تھی۔ سارنگا بولتی جا رہی تھی "مجھے اسی لیے لائے تھے، مار ڈالو۔ جان سے مار ڈالو۔"

میں انھیں روتا چھوڑ کر نیچے چلا گیا۔ دہلیز سے بھوانی کو پکارا۔ جیسے ہی دہلیز میں گھسا میں نے دو چپت اس کے رسید کیے "تمھاری اتنی جرأت کہ تم گھر کی عورتوں کے منہ لگو۔ تم نے سمجھا کیا ہے۔"

بھوانی نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔ وہ خاموش تھا لیکن رو رہا تھا۔ وہ اپنے رونے کی حد بھی سمجھتا تھا۔ اسے یہی ملال تھا کہ سب سے چھوٹے رائے اور وہ ساتھ ساتھ کھیلے اور بڑے ہوئے ــــ پوچھتے تو سہی ــــ مارا تو کوئی بات نہیں ــــ لیکن ایسا الزام لگایا! اگر بڑے رائے کو پتہ چلے گا تو کیا سوچیں گے۔

میں پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں بیل ہوں جو کانچ کی دوکان میں گھس گیا ہے سب کچھ تہس نہس کر کے ہی دم لے گا۔ تب تک باہر سے چھوٹے رائے آ گئے۔ بھوانی روتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ بے سہارا شخص کا رونا ہی سہارا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی زیادتی کرنے

کی حالت میں ہو تو وہ اپنی اس صلاحیت کو اپنی سب سے بڑی طاقت سمجھتا ہے۔ دوسرا جتنا بے سہارا ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی دوسرے کی زیادتی کرنے کی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ اگر کوئی جواب دینے کی حالت میں ہو تو اس کی اس ہوس پر لگام لگ جائے۔ چھوٹے رائے اسے زبردستی لوٹا لائے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بار بار یہی کہہ رہا تھا "مجھے جانے دیجیے۔ میری قسمت میں اس گھر کی اتنی ہی سیوا لکھی تھی۔"

رگھوور بھی چھوٹے رائے کے ساتھ ہی تھا۔ وہ ان کے ساتھ چہل قدمی کر کے آیا تھا۔ جھونی کو روتے دیکھ کر اس نے بھی رونا شروع کر دیا "جھوانی کاکا مت روؤ ـــــ مت روؤ" کہتا جا رہا تھا اور روتا جا رہا تھا۔ چھوٹے رائے نے جھوانی کو بٹھایا، پچکارا، پانی منگوا کر پلایا۔ اس نے نہ میرے خلاف کچھ کہا اور نہ سارنگ کے خلاف۔ وہ کہتا رہا "اب میں اس گھر کی سیوا کرنے کے لائق نہیں رہا۔ میں نے غلطی کی، بھیا سرکار نے ٹھیک سزا دی۔ میں کون ہوتا ہوں گھر کے معاملات میں بولنے والا۔ نوکر آدمی!"

چھوٹے رائے سمجھ گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بات بڑے رائے کے کانوں تک پہنچے۔ حالانکہ دونوں کے درمیان تناؤ کی باریک سی پرت تھی۔ ارن کو گود لینے کے بعد سے چھوٹے رائے نے اپنا پرایا کرنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے رائے شروع سے ہی سب کچھ اپنا ہی مانتے آئے تھے۔ بڑے رائے کی زمین کے ساتھ ساتھ چھوٹے رائے کے حصے کی بھی کافی زمین بک چکی تھی۔ اس دن جب ان کے منہ سے زمین نہ بیچنے والی بات نکل گئی تھی تو تناؤ کی وہ پرت اسی دن بن گئی تھی۔ چھوٹے رائے کے من میں بھی اس کا ملال تھا۔ وہ بڑے رائے سے کہہ بھی چکے تھے کہ "بڑے بھیا، پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے اس وقت آپ کے سامنے اول فول بولتا چلا گیا۔ شاید ارن کے موہ میں۔ ارن بھی آپ کا ہی بیٹا ہے۔ میرے لیے تو صرف یہ دل کا اطمینان ہے کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو آپ کی جگہ رکھ کر دیکھا، شاید یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔" بڑے رائے نے چھوٹے رائے کا کندھا تھپ تھپا دیا تھا۔ پہلے بڑے رائے ان کی کمزوری تھے اب ارن ہو گیا تھا۔

چھوٹے رائے نے مجھے بلایا۔ میں ان کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکا۔ بس مجھے یہی لگا کہ میں نے یہ کیا کیا۔ اتنا پاگل کیوں بن گیا کہ بغیر پوچھے گچھے یہ ہنگامہ کر بیٹھا۔ چھوٹے

رائے سونا کو بلا لے گئے۔ اس نے ساری بات جوں کی توں بتادی۔ سونا کی پیٹھ لال ہوگئی تھی۔ بچی کی اتنی لال پیٹھ دیکھ کر چھوٹے رائے اپنا توازن کھو بیٹھے۔ وہ دیر سے بدبدائے "یہ دنیا بھی عجیب گورکھ دھندہ ہے۔ جس کے اولاد نہیں وہ اولاد کو روتا ہے، جس کے اولاد ہے وہ اس کی قدر نہیں کرتا" مجھ سے بولے "اگر تم اتنے ناراض تھے اور سب کو مجرم سمجھتے تھے تو پٹائی کرنے سے پہلے ایک بار سوچتے تو سہی کہ اس کا اثر کیا ہوگا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں بہو کی تکلیف کو نہیں سمجھتا۔ خوب سمجھتا ہوں۔ تمہاری دقت بھی جانتا ہوں لیکن تمہارے اس برتاؤ کے بعد سونا اور بھوانی پر کیا اثر پڑا ہوگا، تصور کر کے کانپ کانپ جاتا ہوں۔ بچے کو کچھ نہیں کہہ سکتے اور نوکر کو بھی ——— بس ایک بات ہو سکتی ہے کہ بے سہارا ہونے کا احساس ان کے پیار کو نفرت میں بدل دے۔ میں بہو سے بات کروں گا۔ اگر ہو سکے تو تم سونا اور بھوانی کو سمجھادو۔ ان کے دل پر چوٹ لگی ہے۔ جذبات کی مرہم پٹی مشکل سے ہوتی ہے۔"

اس دن سونا مجھ سے نہیں بولی۔ جب میں نے بھوانی کو ہمیشہ کی طرح پکارا تو وہ چپ چاپ آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پوچھا "بھوانی کیا تو مجھ سے اتنا ناراض ہے کہ میری وجہ سے گھر چھوڑ کر چلا جائے گا؟! غلطی تو میری ہے اوروں کی تو نہیں۔"

وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر بولا "ایسا مت کہیے بھیا ——— نرک میں مت دھکیلیے۔"

اب مجھے لگتا ہے کہ انسان جذبے کا الفاظ سے بھی استحصال کرتا ہے۔

رگھوور اس دن جلدی ہی سو گیا۔

چھوٹے رائے نے پردے کے پیچھے بیٹھ کر سارنگا سے بات کی۔ سارنگا سنتی رہی۔ سب کچھ یکطرفہ تھا۔ سمجھانے کا پورا انداز ہی یکطرفہ ہوتا ہے۔ چھوٹے رائے کہتے جارہے تھے ——— "بہو یہ دونوں بن ماں کے بچے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں تمہاری تکلیف نہیں سمجھتا لیکن کیا تم اپنی تکلیف کا علاج ان بچوں کو تکلیف دے کر کر سکتی ہو؟! اگر تم بچوں کی ہنسی میں اپنی ہنسی ملا سکو ——— ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف بنا سکو تو تمہیں لگے گا کہ تمہارے اندر ایک ایسی ماں بیدار ہو رہی ہے جس کے لیے دنیا بھر بچے اس کے اپنے بچے ہیں۔ ایک ایسی ماں بن جانا عورت کا سب سے بڑا خواب ہوتا ہے ——— سونا اور رگھوور کو یہ نہ لگنے دو کہ تم ان

کی کوئی نہیں۔ تم اس گھر کے سب لوگوں کی ماں ہو۔ بچے، بوڑھے، نوکر چاکر سب کی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم پر اتنی بڑی ذمہ داری ڈال کر میں تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔ تمہارے کھانے کھیلنے کی عمر ہے۔ لیکن یہ اس گھر کی مجبوری ہے ہمارے سب کی غرض ہے اگر یہ زیادتی ہے تب بھی تمہیں اسے قربانی سمجھ کر برداشت کرنا ہوگا۔ دروپدی سے تم تک ہر عورت کو پیکر ایثار سمجھا جاتا ہے کیونکہ سب کا مفاد اسی میں تھا۔ حالانکہ میں یہ جانتا ہوں کہ اپنے آپ قربانی کی الف ب پ نہ جانتے ہوئے دوسرے کو قربانی سکھانا استحصال ہی ہے۔ بھوانی بھی ہم سب لوگوں کی ماں کا مقام لیتا جا رہا ہے۔ اس کے دل میں اتنا پیار ہے کہ ہم سب اس میں گلے تک ڈوب سکتے ہیں۔ بیٹی میں تمہارے چچا سسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ تمہارے والد کی حیثیت سے یہ سب باتیں کہنے آیا ہوں۔ جنم دینے والے تو ماں باپ ہوتے ہیں لیکن لڑکیوں کے معاملے میں وہ بھی ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو انھیں بعد میں اپناتے ہیں۔ ہم نے تمہیں اپنایا ہے۔" رک کر بولے "تمہاری چاچی بھی آخری سانس گن رہی ہے۔ اس کا بیٹا ولایت میں ہے۔ اس کا سکھ اور دکھ تم ہی لوگ ہو۔ اسے یہ محسوس ہونے دو کہ یہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ احساس ہی انسان کی عمر کم کر دینے کے لیے کافی ہے۔ مرتا ہوا بوڑھا اور بڑھتا ہوا بچہ ہمیشہ اپنوں کا سہارا کھوجتا ہے۔ تمہارا شوہر ہم لوگوں کو اسی طرح سنبھالے ہے جیسے دیوار پر اگے پیپل کی جڑوں کی دیوار سنبھالتی ہے۔"

سارنگا بیچ میں کھنکھارتی جاتی تھی اور یہ جتاتی تھی کہ وہ ان کی بات سن رہی ہے۔

جب تک بڑے رائے واپس آئے تب تک گھر میں اٹھا طوفان شانت ہو چکا تھا۔ سونا جاگ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ بڑے رائے اس سے پوچھیں اور نئی ماں کو ڈانٹیں۔ لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔ سونا کے لیے کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دادا کے بولنے کا انتظار کرتی کرتی سو گئی۔

سویرا ہوا ہی تھا۔ ویر بہادر آئی۔ سی۔ ایس کے والد چودھری کھیم راج سنگھ اچانک آ پہنچے۔ ان

کا بڑے رائے کے پاس آنا بہت کم ہی ہوتا تھا۔ قریب قریب نہ کے برابر۔ انھیں دیکھ کر بڑے رائے اچانک اٹھ کھڑے ہوئے "آیئے بھیّے!"

سب انھیں بھیّے کہتے تھے۔ وہ بھی اپنے قریبی لوگوں کو بھیّے کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ شاید اسی لیے ان کا نام بھیّے ہی پڑ گیا تھا۔ وہ آتے ہی تھکے ہوئے سے دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک خدمت گار ان کا سفری سامان لیے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس میں سے ایک بکس کافی بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اسے سر پر لادے تھا۔ سامان مہمان خانے میں رکھوا دیا گیا۔ بڑے رائے نے فکر مند لہجے میں پوچھا "بھیّے، تم اتنے سست اور پریشان کیوں ہو؟ کوئی خاص بات ہے؟" وہ ایک منٹ خاموش رہے پھر بولے "بوڑھاپا بگڑ گیا بھیّے۔ کب سوچا تھا کہ میرے مرنے سے پہلے میرا بیٹا اپنے پرکھوں کے منہ پر کالک پوت دے گا۔ بیر بہادر نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں ـــــ وہ تو لاکھوں میں ایک ہے۔"

میں بھی خام خیالی میں جی رہا تھا ـــــ چھوا نہیں سماتا تھا لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے نطفے سے نہیں پیدا ہوا۔ پتہ نہیں کس بدذات کا تخم ہے۔ اگر گھر والی زندہ ہوتی تو میں اس سے پوچھتا کہ جس کا تخم تو نے نو مہینے پیٹ میں رکھا تھا وہ کون تھا۔

"آخر بتایئے تو کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، آشنائی میں عورت کا خون کر کے صاحبزادے جیل میں بند ہیں۔ آئی۔ سی۔ ایس نہ ہوتا تو سڑک پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے ہوتے۔"

"لیکن کیسے؟"

"کسی عورت کا خون کوئی کیوں اور کیسے کرتا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کسی سازش میں پھنسایا گیا ہے۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا ـــــ بہو کے ساتھ اس کے پیہر سے دو باندیاں آئی تھیں۔ ان میں سے ایک بڑے ہو کر کافی خوبصورت نکلی۔ بس"

"بہو کہاں ہے؟"

"وہیں ہے۔"

میں خاموش تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بڑے رائے ماتھا پکڑے بیٹھے

تھے۔ مجھے بار بار بہادر کی بیوی شانتی کا چہرہ یاد آ رہا تھا۔ جیسے وہ کواڑ کے پیچھے کھڑی بلا رہی ہوں — یہاں آؤ — تم اتنے بڑے ہو گئے — بال بچوں والے — ہم تو اب بھی ویسے ہی ہیں — ہم سے اچھے تو تم ہی رہے — اور ہنس رہی ہیں۔ ان کی آنکھیں، ان کی مسکراہٹ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ میں سوچنے لگا — ان کی نوکرانی! کون سی نوکرانی؟ کیا وہی جو چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی۔ ان کے پیچھے کھڑی رہتی تھی۔ اس کا ناک نقشہ تیکھا ضرور تھا — رنگ پکا تھا۔ چھب اچھی تھی۔ بدن گٹھا ہوا تھا — لیکن وہ خود تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔

چودھری صاحب بولے "بھیّے، آپ میرے پرانے دوست ہیں — میں صرف ایک مدد مانگنے آیا ہوں۔ مقدمے کی پیروی آپ کریں۔ اس سے کہیں کہ جتنا روپیہ لگے لگائے — اس کی فکر نہ کریں۔ اس داغ کو دھو دیں۔"

"آپ چلیے — میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

وہ بجھی سی ہنسی ہنسے "نہیں جا سکتا تو کیا نہ جاتا؟ آپ کے پاس کیوں آتا؟ وہ چھوٹ بھی گیا تو بوڑھا اس کی شکل نہیں دیکھے گا۔ قانون تو لکھت پڑھت اور سنت کا ہوتا ہے — بحث کا نہیں۔ کئی بار سچائی جھوٹ ہو جاتی ہے اور جھوٹ سچ میں بدل جاتا ہے۔ سچائی جاننے والا بھلے ہی گنہگار کو سزا نہ دے سکے لیکن معاف نہیں کر پاتا۔ میرا فیصلہ تو قانون کے فیصلے سے پہلے ہو چکا۔ آپ پوچھیں گے پھر میں مقدمہ لڑنے کا سوانگ کیوں کر رہا ہوں — چونکہ پتا ہوں۔ وہ فرض نبھانا ہے اوپر جا کر اس کی ماں نے پوچھا تو کیا جواب دوں گا۔ حالانکہ میرے پاس بھی ان سے پوچھنے کے لیے چند سوالات ہوں گے۔"

بڑے رائے پہلے چپ رہے، پھر بولے "بھیّے، جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ لیکن ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں جب آپ سورگباشی بھائی کے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں تو زندہ بیٹے کے بارے میں کیوں نہیں کرتے؟"

بڑے رائے، ہم دونوں ایک ناؤ پر سوار ہیں — جب خاندان کچھ اچھا یا برا ہوتا ہے تو کیا تم رائی کو یاد نہیں کرتے۔ ان کی طرف دیکھ کر یہ نہیں پوچھتے کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہوتی تو وہ بھی اتنی ہی لاچار ہوتی جتنے تم خود ہو۔ بیوی ہمیشہ شوہر سے بڑی ہوتی ہے۔ شوہر ہمیشہ بیوی کے سہارے ہی جذباتی امیدیں کرتا ہے۔ ٹھیک

ویسا ہی جیسے بچہ اپنی ماں سے ذمہ داری سمجھتا ہے، کیونکہ وہ اسے وقتاً فوقتاً وعدے کرتا، نبھاتا اور توڑتا رہتا ہے۔ جھوٹ سچ بولتا ہے۔ معافی کے لیے قصیدے پڑھتا ہے اور اپنی غلطیوں کے لیے انھیں ہی ذمہ دار ٹھہراتا ہے ــــ وہ سب جانتی بوجھتی، سمجھتی رہتی ہے۔ بچوں سے باپ کیا لیتا ہے ــــ کچھ نہیں ــــ سوائے باپ ہونے کے سکھ کے۔ جب ان کا ذمہ داری اٹھانے کا وقت آتا ہے تو وہ اٹھانے یا نہ اٹھانے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ اگر بیر بہادر میری ذمہ داری سمجھتے تو شادی یہ دن اس شکل میں نہ آیا ہوتا۔ میں اس کی ماں کے لیے ذمہ دار ہوں ــــ وہ میرے بارے میں ذمہ دار تھی۔ اگر ہمیں کبھی آمنے سامنے کھڑا ہونا پڑا تو دونوں اپنا اپنا دردبیان کریں گے۔ گلے شکوے کریں گے اور چپ ہو جائیں گے۔" ان کی آواز تھرتھرا گئی تھی۔

بڑے رائے نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ دونوں کے دونوں جذبات کی ایک اونچی لہر پر سوار ہو گئے تھے جو انھیں مسلسل اوپر لے جا رہی تھی۔ جو کچھ جیسے نے کہا تھا اس کی سچائی بڑے رائے کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اسی لہر پر سوار رہے۔ جب اترے تو بڑے رائے بولے "بیسے، ضرور آؤں گا۔ بھاسکر کو بھی لے جاؤں گا۔ جب بیر بہادر اور کرشن رائے مئو میں پوسٹیڈ تھے تو بھاسکر بہو کے پاس گیا تھا۔ اس کے ساتھ جانے سے بہو سے بات کرنے میں آسانی رہے گی۔"

ٹھاکر صاحب نے اپنا بکسا وہیں منگایا۔ جنیو میں بندھی چابی سے کھولا۔ اس میں اٹھ ماسیاں، چاندی کے روپے اور کچھ نوٹ تھے۔ زیورات بھی تھے۔ وہ بولے "بڑے رائے، تم اسے رکھ لو۔ جتنا خرچ ہو کرنا ــــ باقی لوٹا دینا۔"

بڑے رائے نے ایک نظر دیکھا اور بولے "ٹھاکر صاحب، مجھے اتنا ذلیل نہ کیجیے۔ جب ضرورت ہو گی منگا لوں گا۔ اب اتنا جوکھم اٹھانے کی حالت نہیں رہی۔ کسی کی امانت اسی وقت رکھنی چاہیے جب بوقت ضرورت اپنے پاس سے لوٹانے کی طاقت ہو۔ اب اس گھر کی دیواریں بھی متزلزل ہو گئی ہیں۔ بنیادیں ہل گئی ہیں۔ کڑی کھڑی کانپتی ہیں۔ اس حالت میں اسے اپنے پاس رکھوں یہ ممکن نہیں۔"

ٹھاکر صاحب نے بہت ضد کی لیکن بڑے رائے نے ان کی ایک نہ مانی۔ پھر بھی وہ ایک نوٹ چھوڑ گئے۔ وہ اپنے سے ہی ڈر رہے تھے۔ اس قسم کا ڈر انھیں پہلی بار محسوس ہوا تھا۔

بڑے رائے کے ساتھ میں بھی لکھنؤ گیا۔ وہاں جا کر پورے قصے کا پتہ چلا۔ قصہ سن کر میں اندر تک دہل گیا۔ دراصل جہیز میں آئی اس کنیز کو گولی لگی تھی۔ وہ رات کے وقت گھر میں اکیلے تھے۔ رات میں جب بیر بہادر لاش لے جانے کی تیاری کر رہے تھے اسی وقت ان کا ایک ساتھی جو پڑوسی بھی تھا، ان سے ملنے آیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور چلا گیا۔ بیر بہادر کو شک تھا کہ ان کی اس کنیز کا تعلق ان کے اس پڑوسی کے ساتھ ہے۔ وہ خود بھی اس کنیز کو پسند کرتے تھے۔ ایک رات اسے بستر سے غائب پا کر وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ عورت انھیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ ان کا وہ ساتھی غیر شادی شدہ تھا۔ اکثر ان کے یہاں آتا جاتا تھا، اٹھتا بیٹھتا تھا، کھاتا پیتا تھا۔ اسی دوران وہ نوکرانی اس کی نظر چڑھ گئی تھی۔ اس نے ان کے گھر کی طرف سے گولی چلنے کی آواز سنی تو باہر جھانک کر دیکھا، وہاں کچھ نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیسے اسے لگا کہ یہ آواز بہادر صاحب کے کمرے سے آئی ہے۔ بہادر صاحب اس سے بہت سینئر تھے۔ وہ ان کے بدلے ہوئے رویے سے کئی دن سے چونکنا تھا۔ وہ ہمت کر کے ان کے گھر تک آیا۔ اسے دیکھ کر بیر بہادر چونکے ضرور تھے لیکن انتظامیہ تجربے نے انھیں اتنا ماہر کر دیا تھا کہ وہ اپنے چہرے کے ہر احساس کو اندر ہی اندر گھونٹ گئے تھے اور اس کے چہرے کو پڑھ رہے تھے۔ وہ آ کر بیٹھا اور پوچھا "سر، بھابی جی کب آئیں گی؟" بیر بہادر نے مسکرا کر کہا "ان کی فکر تو مجھے ہونی چاہیے، لیکن فکر مند آپ ہیں؟" وہ پہلے گھبرایا پھر ہنس دیا۔

جب رات ہو گئی تو پھر آیا۔ اس وقت مسٹر بہادر اپنے ایک پرانے نوکر کی مدد سے لاش ڈگی میں لادنے کے چکر میں تھے۔ اس بار انھوں نے اسے جھڑک سا دیا ——— "آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے ——— سو ریسٹ لیس! (SO RESTLESS)" بعد میں لگا کہ بھول کر گئے۔ اس کے جانے کے بعد لاش ڈگی میں رکھی اور تقریباً آٹھ دس میل دور سیتاپور روڈ پر لے گئے۔ اس وقت وہاں مکمل سناٹا تھا۔ لاش ایک بھاری پتھر کے ساتھ باندھ کر پل پر سے ندی کے بیچوں بیچ ڈھکیل دی۔ چھپاکا ہوا۔ پانی کتنی دور تک اچھلا اندھیرے میں اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پل پر کھڑے ہونے سے یہ ہی فائدہ ہوا کہ بیر بہادر اس وقت تو چھینٹوں سے بچ گئی جو وزنی چیز گرنے سے اکثر اوپر آتے ہیں ——— اس چھپاکے کے بعد پھر

سناٹا ہو گیا۔ یہ سناٹا زیادہ بھیانک تھا۔ انھوں نے جانچ کر دیکھنا چاہا۔ جتنا اندھیرا تھا اس پل کے نیچے اتنا ہو گیا تھا۔ کچھ نظر نہیں آیا۔ دور موڑ پر جہاں ندی گھومتی تھی ـــــ آگ جل رہی تھی ـــــ اپنی کی لہروں پر روشنی کی سیڑھی نما شکل بنی ہوئی تھی۔ پانی ان سیڑھیوں پر سے ہو کر بہہ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر اندھیرا تھا۔

بیر بہادر کو اتنی سی بات پر غصہ آیا تھا کہ بیوی کی عدم موجودگی میں انتہائی نازک لمحات میں، جب انھوں نے اس رات کی بات پوچھی اور جاننا چاہا کہ وہ کہاں گئی تھی اور اس کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں؟ اس نے ڈر کی وجہ سے ہر چیز سے انکار کر دیا۔ یہ ہی انکار کرنا اس کی موت کا سبب بن گیا۔ انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ اس کے پیٹ میں ان کے اسی ساتھی کا بچہ ہے ـــــ یہ بات کسی موقع پر ان کی طرف منسوب ہو گئی تو کیا ہوگا!

بیر بہادر کے گھر سے لوٹ کر ان کا وہ آئی۔ سی۔ آیس پڑوسی کافی دیر تک ٹہلتا رہا تھا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ مسٹر بیر بہادر رات گئے اپنی کار سے کہیں گئے ہیں تو اس کا شک پکا ہو گیا وہ عورت اکثر بتاتی تھی کہ مالک کا اس پر شک ہے۔ وہ ناراض ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بھی وقت بے وقت اس نوکرانی سے اپنی ہوس پوری کرتے ہیں۔ جب وہ گولی کی آواز سن کر ان کے گھر گیا تھا تو اسے وہاں سب کچھ اڑا اڑا سا لگا۔ کچھ انہونی ہوئی تھی۔ پورا گھر پانی سے دھلا ہوا تھا اور گیلا تھا۔ رات کو جب بیر بہادر لوٹے وہ اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ جب وہ اپنی گاڑی گیرج میں کھڑی کر کے باہر آئے تو اپنے اس پڑوسی کو سامنے کھڑا دیکھ کر چونک گئے۔ انھیں لگا کہ وہ انھیں مارنے آیا ہے۔ انھوں نے فوراً اپنا ریوالور نکال لیا۔ وہ بولا ''میں ہوں یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ مارنا چاہتے ہیں؟'' پھر دھیرے سے کہا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ آپ کو آتے دیکھا تو سوچا پوچھ آؤں سب خیریت تو ہے۔''

وہ جواب دیے بغیر اندر چلے گئے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ گھر آیا۔ کپڑے بدلے اور پولس کپتان کے پاس جا کر بولا ''مجھے شک ہے کہ مسٹر بیر بہادر آئی۔ سی۔ ایس نے اپنی نوکرانی کو قتل کر دیا ایک ذمہ دار انسان کی حیثیت سے آپ کو یہ بتانے آیا ہوں۔ آئی۔ جی سے رابطہ قائم کیا گیا۔ چیف سکریٹری کو فون ہوا پھر گورنر سے بات کی گئی۔ سب سے پہلے نوکر کو حراست میں لیا گیا۔ پوچھ کے دوران دباؤ بڑھا تو نوکر نے سب کچھ قبول کر لیا۔

بڑے رائے کسی طرح اجازت لے کر ان سے جیل ہی میں ملے۔ انھیں دیکھ کر ویر بہادر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں نیچی تھیں۔ بڑے رائے نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے "بیٹا، برا وقت ہر ایک کی زندگی میں آتا ہے۔ اس کا سامنا دو طرح کیا جا سکتا ہے یا تو سینہ تان کر ہٹ جاؤ یا دوب کی طرح جھک جاؤ اور طوفان کو گزر جانے دو۔ دونوں ہی طریقوں کے اپنے اپنے نقصانات بھی ہیں اور فائدے بھی۔ تم خود سمجھدار ہو۔ وکیل صاحب نے کہلایا ہے کہ جتنا خرچ ہو ـــــ اور اس داغ کو دھو دو۔"

ویر بہادر نے پرسکون آواز میں کہا "چاچا جی یہ لڑائی باہر کی ہوتی تو میں طاقت اور پیسے سے اسے جیت لیتا ـــــ بدقسمتی تو یہ ہے کہ اندر زیادہ ہے ـــــ وہاں نہ طاقت چاہیے اور نہ پیسہ۔ اپنے ضمیر کے سامنے تو بڑے سے بڑا طاقتور بھی بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ آپ کی بہو بھی اپنے سارے زیورات لے کر یہی کہنے آئی تھی۔ میں نے اس سے بھی یہی کہا ـــــ کنور انی، میری یہ لڑائی زیور اور پیسے سے نہیں جیتی جا سکتی۔ جیت بھی گیا تو اس بار کو کیا کروں جو میرے اندر مسلسل سیلاب کے پانی کی طرح بڑھ رہی ہے۔ میں تب ہی جیت سکوں گا جب جج بن کر میں اپنے گناہوں کی سزا اپنے آپ کو سناؤں گا۔ اس کے لیے نہ گواہ کی ضرورت ہوگی، نہ وکیل کی۔ سب کچھ مجھے ہی ہونا ہے۔"

بڑے رائے پہلے چپ رہے، پھر بولے "اس سب کے باوجود لڑنا تو ہے ہی۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جسم میں فلاں مقام پر ایک بھدا نشان ہے۔ ہم کپڑے پہنتے ہیں اور اسے ڈھکنے کی کوشش کرتے ہیں، کھول کر نہیں گھومتے۔ قانونی تحفظ بھی ایک لباس کی طرح ہوتا ہے ـــــ" رک کر کہا "ہم اپنے کو کبھی بھی کھول سکتے ہیں۔"

"اس کام کو جلدی کیوں نہ کر لیں؟ کبھی کا انتظار کیوں کریں؟"

"انتظار کرنا جلد بازی میں شمار ہوتا ہے، برخوردار!"

"ضمیر پر پڑنے والے اس دباؤ سے نجات تو ملے گی۔"

"کیا ایسا کر کے باقی سب دباؤ سے بھی گلو خلاصی ہو جائے گی؟"

"گھر کے باقی لوگ بھی تو ہیں ـــــ"

"ہم ان سب کے لیے دعا کریں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں، جب دوا کا راستہ کھلا ہے تو دعا کا راستہ کیوں اپنایا جائے۔ جس سے دعا کرو گے وہ بھی تو یہ دیکھے گا کہ دوا کے راستے پر چلنے سے پہلے ہی دعا کرنے کیوں بیٹھ گیا! سیدھے دعا پر اتر آنا کیا ذمہ داری سے فرار نہیں ہے؟"

بیر بہادر چپ ہو گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر پوچھا "باپو کیسے ہیں؟"

بڑے رائے نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بیر بہادر ہی بولے "آپ ان سے اتنا کہہ دیجیے کہ انھوں نے خود نہ آکر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ ورنہ ان کے سامنے میری آتما مجھے کھڑا نہ ہونے دیتی۔ نوچ کھاتی کہ تو اس شخص کا بیٹا ہے ــــ"

بڑے رائے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انھوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"کبھی قدم بھٹک کر کیچڑ میں پڑ جاتا ہے اور کپڑوں پر چھینٹے آجاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پورا جسم ناپاک ہو گیا۔ جب چھینٹے پڑ ہی جاتے ہیں تو تو انھیں دھونے کی تدبیر کی جاتی ہے۔ خطرہ تب ہوتا ہے جب چھینٹوں کی پہچان ہی ختم ہو جائے۔ کیچڑ اور ہم میں کوئی فرق نہ رہے۔ تمھارا ضمیر شیشے کی طرح ہے۔ وہ چھینٹا جو تم پر پڑا ہے وہ تمھیں صاف نظر آرہا ہے اور پریشان کر رہا ہے۔ میرے من میں تمھاری عزت اور بڑھ گئی۔"

میں کمرے کے باہر سن رہا تھا۔

ہم لوگ مسٹر بہادر کی بیوی سے مل چکے تھے۔ پہلے میں ہی ان کے پاس گیا تھا۔ چہرہ سکڑ گیا تھا اور آنکھیں ایسے آئی تھیں جیسے حلق سوکھ گیا ہو اور کیچڑ بھرے کسی ڈبرے میں دو مرجھائے کنول اب بھی ہل رہے ہوں۔ انھیں اچھا لگا یا نہیں لیکن اتنا ضرور لگا کہ جیسے تنکے کو سہارا مل گیا ہو۔ وہ دیکھتے ہی بولیں "سنا ہے بڑے چاچا بھی آئے ہیں؟"

"باہر ہیں۔"

وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئیں۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ بولیں "مجھے بتا تو دیتے۔ چلو، ان کے قدموں کی دھول تو لے لوں۔ ایسے میں کون آتا ہے۔"

وہ باہر کمرے میں آئیں۔ آنچل میں بڑے رائے کے پاؤں کی دھول لی۔ آنسوؤں

کی خبر بھی لگ گئی۔ بڑے رائے نے دھواں بن جانی "تم تو اتنی دور کی سوچتی ہو۔ مصیبت سے جو جھنا تو تمھیں وراثت میں ملا ہے۔ تم ہمت ہار دو گی تو باقی سب کا کیا ہوگا؟ تمھارے بوڑھے سسر کس کا منہ دیکھیں گے؟ تم ہی اب اپنے شوہر کی روشنی ہو۔"

بہو نے تب تا —— "انھوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا بڑے رائے نے کیا تھا۔ بڑے رائے بولے "میں اسی لیے تو آیا ہوں بڑے سے بڑا وکیل کروں گا۔ اس مقدمے کو آخر تک لڑنا ہوگا۔ وہ میرا اپنا بیٹا ہے —— اپنے اور دوست کے بیٹوں میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہوتا۔"

"باپو کیوں نہیں آئے؟" بڑے رائے کو جواب سوچنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ بولے "ان کا معاملہ جو ٹھہرا —— اس بات کو تم زیادہ سمجھ سکتی ہو۔"

بہو نے "ہوں" کیا اور بولی "میرے باپو نے بھی کہا ہے کہ روپیہ چاہے جتنا خرچ ہو، فکر مت کرنا۔ لیکن بیٹی اس لڑائی میں تیرے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکوں گا۔ کوئی اور بات ہوتی تو —— " وہ ٹھٹھک کر رک گئیں اور اپنے آپ سے بولیں "کوئی اور بات ہوتی تو مجھے کسی کا سہارا تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ چاہے جو بھی ہوا ہو —— ہے تو میرا شوہر ہی۔ میں اس کے پاپ ان دونوں کی حصے دار ہوں۔ مجھے ہی ور لوگ اپنی آن بان کو ٹھکرا دیں لیکن میرا تو سب ان کے ساتھ ہی ہے۔ میں کسی لائق ہوتی تو اس کلموہی کی طرف ان کی نظر ہی کیوں جاتی —— "

"بہو میں تمھارے ساتھ ہوں۔" بس اتنا ہی کہا۔

انھوں نے پہلی بار چہرے پر پڑے پردے کا تنکا آنکھوں پر سے ہٹا کر، بڑے رائے کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

ہم لوگ لوٹے تو ان کی خبر آئی ہوئی تھی۔ اس نے روپیہ منگایا تھا۔ تار میں لکھا تھا کہ تار ملتے ہی روپیہ بھیج دیں۔ بڑے رائے تار پڑھ کر آگ بگولہ ہو گئے "یہاں کیا ٹکسال کھلی ہوئی ہے جو اشرفیاں ڈھلوا کر اسے بھیج دوں۔ اس لڑکے کے آثار مجھے ٹھیک نظر نہیں آتے۔"

بڑے رائے کے ایک انگریز دوست تھے۔ وہ پہلے ہی کلکٹر رہ چکے تھے۔ کئی

موقعوں پر انھوں نے مدد کی تھی۔ بڑے راے کے ساتھ ان کی خط و کتابت ابھی تک تھی۔
بڑے راے کئی بار سوچ چکے تھے کہ انھیں ارن کے بارے میں لکھ دیں۔ ہر بار ٹل جاتا تھا۔
فوراً خط لکھنے بیٹھ گئے:

پیارے ایڈورڈ!

میں نے کئی بار سوچا کہ تمھیں اپنے چھوٹے بیٹے ارن کے بارے میں لکھوں۔ پر یہی سوچ کر چپ ہو گیا کہ آپ لوگ ریٹائرمنٹ کو بہت ذوق و شوق اور سنجیدگی کے ساتھ جیتے ہیں، زندگی بھر محنت کر کے، آرام کے لیے کمایا ہوا وقت مانتے ہیں۔ ارن کے بارے میں لکھ کر میں تمھاری اس بے فکری میں خلل انداز نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ادھر مجھے لگنے لگا ہے کہ ارن کے اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں کچھ دن پہلے اسے روپے بھیجے تھے پھر اس کا تار آ گیا۔ اگر ارن سے رابطہ قائم کرنا زیادہ دشوار نہ ہو تو ایک بار اس کے بارے میں خود جا کر یا کسی اور ذریعہ سے معلومات کر لیں۔ اگر واقعی ضرورت ہو تو اس کا بندوبست کر دیں، میں روپیہ تمھیں بھیج دوں گا۔

دراصل ہم لوگ ایک ایسے ملک کے رہنے والے ہیں جہاں ہر چیز ایک بند صندوق کی طرح ہے۔ یہاں سے جانے والے نوجوان جب آپ کے ملک کا کھلا پن دیکھتے ہیں تو اپنے سنسکاروں کا کینچل اتار کر اس میں ایسے رم جاتے ہیں جیسے پتہ نہیں کب سے اس میں ڈوبے ہوں۔ چونکہ وہاں پر ہر چیز کی افراط ہے — چاہے خوبصورتی ہو، عیش و عشرت ہو یا پیسہ ہو — ہم نہ اس طرح اسے بھوگ سکتے ہیں اور نہ اس میں ڈوبے رہ سکتے ہیں۔ ایک چھوٹے تال کی مچھلی کی طرح ہمارا اس بڑے سمندر میں کھو جانا فطری بات ہے۔ بھلے ہی اس خوشحالی کا ذریعہ ہمارا ملک ہو۔ ہم لوگ اپنی حدود کو نہ سمجھ کر تم لوگوں کی نقل کریں گے تو کہاں جائیں گے؟ بربادی کی طرف نا! تم جانتے ہی ہو کہ عقل پر ایک پیسہ خرچ نہیں ہوتا لیکن بھوگ کچھ نہیں چھوڑتا۔ تمھیں یاد ہو گا کہ راے بہادر کا بیٹا آئی۔ سی۔ ایس کرنے

ولایت گیا تھا اس کا کیا ہوا؟ ویسے بھی یہاں روپے کی قیمت گرتی جا رہی ہے۔ وسائل گھٹتے جا رہے ہیں۔ سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ پتہ نہیں کب کیا ہو جائے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے میں تمھیں یہ زحمت دے رہا ہوں۔

مسز ایڈورڈ کو سلام کہنا

تمھارا

ہری رائے

خط لکھنے کے باوجود بڑے رائے اور چھوٹے رائے کو چین نہیں مل رہا تھا۔ اس بار انھیں اندر سے لگ رہا تھا کہ ہو نہ ہو ارن کسی ایسے چکر میں پھنس گیا ہے جہاں سے وہ شاید کبھی نہ نکل سکے۔ اگر ایسا ہو گیا تو رائے خاندان کا کیا ہوگا۔

رائے خاندان ایک اور مصیبت کا سامنا کر رہا تھا۔ چھوٹی چاچی کافی بیمار تھیں۔ ان کی حالت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ ویسے بھی ہمارے یہاں عورتوں میں شرح موت زیادہ تھی۔ مردوں کی عمر اوسط سے زیادہ لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ عورتوں کی عمر کم ہونے کی وجہ شاید ان کا محدود دائرہ اور ماحول کی کثافت تھی۔ وہ اس میں اٹھتی بیٹھتی تھیں، سانس لیتی تھیں۔ وہی دھیرے دھیرے انھیں چاٹ جاتا تھا۔ زندگی اور موت کا شاید ماحول سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ میں چوراسی پار کر چکا تھا۔ میرے بھی جانے کا وقت قریب آتا جا رہا ہے پھر بھی میری صحت اتنی نہیں گری۔ دیکھتے دیکھتے دنیا بدل گئی۔ عورتوں کی حالت میں فرق آگیا۔ آج کی سوچ میں اور اس زمانے کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے سمجھتے تھے کہ عورت نے ڈیوڑھی سے باہر پاؤں نکالا نہیں کہ چھوت لگی نہیں۔ خیر چھوٹی چاچی اس نقطے کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھیں جہاں انسان کے چلو سے زندگی کا رس تیزی سے بہنا شروع ہو جاتا ہے اور پیچھے بیٹھی موت کی گدھ اوپر آنے لگتی ہے۔

چھوٹی چاچی نے اپنا سارا زیور چھوٹے رائے کے سپرد کر دیا تھا۔ انھوں نے اسے ارن کی بہو کو چڑھانے کے لیے جمع کر رکھا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ بہو کا منہ دیکھ کر

مریں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ بیٹی اور بہو کو اپنا زیور پہنے دیکھ کر ماں اور ساس کو لگتا ہے کہ وہ خود اس میں سمائی ہیں یا ان کا گزرا وقت لوٹ آیا ہے۔ وقت کم ہوتا جارہا تھا۔ ان کے پاس انتظار کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔

جس دن چھوٹی چاچی چل بسیں اسی دن انگلینڈ سے مسٹر ایڈورڈ کا خط آیا تھا۔ اس لفافے پر دلی کی مہر لگی تھی۔ ہو سکتا ہے مسٹر ایڈورڈ نے ہندوستان آنے والے اپنے کسی دوست کو یہ سوچ کر لفافہ دیا ہو کہ بھارت سے پوسٹ کرنے میں خط جلدی پہنچ جائے گا۔ خط چونکہ میرے ہاتھ لگا تھا میں نے اسے سنبھال کر رکھ دیا۔ سب لوگ چھوٹی چاچی کی موت سے دکھی تھے۔ چھوٹے رائے تو جیسے ایک دم اکیلے پڑ گئے تھے۔ سارا رس نچڑ گیا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے یکایک ایسے رونے لگتے تھے جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی ان کو اوپر کھڑکی سے جھانکتے دیکھ کر مچلنے لگتا ہے۔ بڑے رائے بھی کم مغموم نہیں تھے۔ انھیں لگتا تھا کہ بڑی رانی کے جانے کے بعد سے ایک ایک کرکے گھر کی کتنی ہی چھوٹی بڑی بہوئیں چلی گئیں۔ کرشن رائے کی پہلی بیوی، بھاسکر کی دو بہوئیں، اب راگھو کی گھر والی بھی چھوڑ گئی۔ پھر بھی بڑے رائے چھوٹے رائے کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ''دیکھو راگھو! ہم سب ہی اسی بدقسمتی کا شکار ہو چکے ہیں ــــــ تم، میں، کرشن رائے، حتی کہ بھاسکر بھی۔ موت ہی ایسی چیز ہے جو ہمیں صبر کرنا سکھاتی ہے۔ دھن چلا جاتا ہے تو انسان پھر محنت کرتا ہے اور کما لیتا ہے لیکن آدمی اوپر جا کر واپس نہیں لوٹتا۔ وہ اصلی صبر ہے۔ باقی سب تو آنے جانے والے ہیں۔ سب سے زیادہ چھوٹی بہو نے دیا۔ وہ پھر تمھیں ملے گی۔ اگر تم اس طرح رنجیدہ رہ کر بے عملی میں ڈوبتے چلے جاؤ گے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کی آتما خوش ہو گی؟ اس کی خوشی کی بھی تو سوچو۔ سکھ دکھ کا اوسط تب ہی بیٹھتا ہے جب ہم دونوں کو برابر کر کے دیکھیں۔''

وہ بڑے رائے کی بات سنتے رہتے تھے۔ کئی بار بڑے رائے انھیں اپنے ساتھ گھمانے لے جاتے تھے۔ وہ جاتے ضرور تھے لیکن انھیں گھر میں بیٹھے رہ کر چھوٹی چاچی کے بارے میں سوچنا اچھا لگتا ہے۔

میرا دماغ ارن کے بارے میں پریشان تھا۔ ابھی تک نہ روپیہ بھیجا گیا اور نہ اسے مطلع کیا گیا تھا۔ چھوٹی چاچی کے کام کے خرچے کا بوجھ اوپر سے آپڑا تھا۔ حالانکہ یہ پورا خرچ چھوٹے راے نے خود اٹھایا تھا۔ میرے من میں رہ رہ کر آتا تھا کہ ڈپٹی صاحب کی نولی کی کچھ اشرفیاں نکال کر ارن کو روپیہ بھیج دوں۔ وہ نولی جیسی ٹھاکر صاحب چھوڑ گئے تھے، ویسی ہی رکھی تھی۔ ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

جب ارن کو چھوٹی چاچی کی موت کی خبر دینے کی بات چلی تو مجھے اچانک ایڈورڈ صاحب کا خط یاد آ گیا۔ پہلے میں نے خود پڑھا۔ اس میں لکھا تھا:

پیارے ہری راے!

میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں کہ صاحب فراش ہو گیا ہوں اور تمھارے بیٹے کی کوئی خبر نہ لے سکوں۔ تم نے ایک مدت کے بعد مجھے کسی کام کے لیے لکھا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہاں مجھے رشک کرتے تھے۔ تم ہندوستانی معلوم نہیں کہ ہم لوگوں کو کیا سمجھتے ہو جیسے خدا نے خاص طور سے بنا کر بھیجا ہو۔ ہم بھی تمھاری طرح کھاتے ہیں، سوتے ہیں، اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں ـــــ وہ سب گندے کام بھی کرتے ہیں جو انسان کرتا ہے یعنی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ میں ہندوستان میں بھی تمھیں سمجھایا کرتا تھا کہ ہمیں بھگوان مت بناؤ، اپنے جیسا انسان سمجھو۔ تم لوگوں میں بھی تو پھر بھی روحانیت ہے، ہم تو وہاں بھی صفاچٹ ہیں۔ فقط مادیت پرست دشمن کو ختم کر کے ہاتھ میں ہاتھ پھنسا کر عورتوں کے ساتھ ناچنے والے، جسے تم سب سے زیادہ ناپسند کرتے تھے۔ سچ پوچھو تو تم لوگوں کے بچے یہاں اسی لیے آتے ہیں۔ آدمی پر اس کی کمزوریاں جلدی ہی حاوی ہو جاتی ہیں۔

تمھیں یاد ہے میں تم سے کہا کرتا تھا کہ میں تمھارے لیے ایک میم کا انتظام کیے دیتا ہوں۔ تمھاری پاکیزگی متوازن ہو جائے گی۔ لیکن تم چاہتے

ہی نہیں تھے۔ تم نے تو میری بات نہیں سمجھی لیکن تمہارے بیٹے نے انجانے اس پر عمل شروع کر دیا۔ خیر وہ کھیل میں ابھی کچا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا۔ وہ سمجھ بھی گیا۔ دراصل، وہ لڑکی ہی اس کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ مجھے اسے بھی دھمکانا پڑا۔ وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ آخر ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس کا تھوڑا بہت رتبہ تو ہوتا ہی ہے۔ دھمکانے کی بھی اچھی خاصی ٹریننگ ہو جاتی ہے۔

میں تمہارے بیٹے کو فی الحال اپنے پاس لے آیا ہوں۔ اسے اب روپے بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کا کام لگوا دیا ہے۔ اتنا پیسہ مل جائے گا کہ مزے میں رہ سکے۔ میں اس سے اپنے گھر کا پورا کرایہ لوں گا ورنہ وہ گھر کی قدر نہیں سمجھے گا۔ انسان جب پیسہ دے کر سہولیات خریدتا ہے تو وہ سمجھتا ہے یہ اس کا حق ہے۔ اپنی محنت سے کمایا ہے حالانکہ تم لوگوں میں یہ جذبہ ابھرنے میں دیر لگے گی۔ ہمارے یہاں تو وزیر اعظم کے بچے بھی کام کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ بس ہم نے اپنے بادشاہ اور اس کے خاندان کو اس عمومیت سے آزاد رکھا ہے۔ وہ ہی ہماری 'سامنتی' کی ایک پہچان ہے۔ ہم انھیں 'سامنت' ہی بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کافی حد تک مزدور ہو چکے۔ کم از کم تم لوگوں سے زیادہ ہی۔

تمہارے بھائی کرشن کا کیا حال ہے؟ اب تو تنگ نہیں کرتا۔ وہ تم سے زیادہ چالاک اور لبار رہا ہے۔ اپنا بھلا برا زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ارن تم لوگوں کو یاد کرتا ہے، میری بڑھیا سے بہت پٹنے لگی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ اس کو نہ لے اڑے لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہاں، کہو تو تمہارے لیے ایک میم پارسل سے بھیج دوں۔ تمھیں ایک دم جوان بنا دے گی۔ لیکن تم کیا جانو میم کیا ہوتی ہے!

مسز ایڈورڈ تمھیں بہت سلام بھیج رہی ہیں۔ کرسمس آنے والا ہے۔ بازار سجنے لگے ہیں۔ کرسمس آتے آتے لندن پھولوں سے سج جائے گا۔ سب چیونٹیوں کے جھنڈ کی طرح سڑک پر نکل جائیں گے۔ مجھے ہر

چھوٹے راجے کو پھر خط کو پڑھتے دیکھنا پڑا۔ ان کا چہرہ دیکھ کر آسانی سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کس نقطے پر ہیں۔ وہ تیزی سے بدل رہے تھے۔ بیچ بیچ میں ان کے منہ سے کوئی غیر واضح جملہ نکل جاتا تھا۔ پہلا جملہ یہ ہی نکا 'ارن، یہ تو نے کیا کیا۔' پھر بولے 'دنیا میں بھلے لوگ بھی ہیں۔' تیسرا جملہ تھا 'انگریزوں میں بھی شرافت ہوتی ہے' چوتھے جملے میں کہا 'ایڈورڈ صاحب کے مذاق کرنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی' آخر میں کہا 'وہی سب باتیں بڑے بھیا کو لکھ سکتے ہیں۔'

پھر وہ میری طرف مخاطب ہوئے "تم نے ہی ضد کر کے بھیجا تھا —— برباد ہونے میں کسر ہی کیا بچی تھی۔"

میں جانتا تھا کہ سارا قصور مجھ پر ہی آئے گا۔ میں چپ رہا۔

جب سے چاپتی نہیں تھیں بھوانی نے حویلی میں جانا بند کر دیا تھا۔ وہ نیچے ڈیوڑھی سے ہی آواز دے کر کسی نوکرانی کو پکار لیتا تھا اور کام بھی بتا دیتا تھا۔ یا پھر جب جاتا تھا جب یا تو میں اندر ہوتا تھا یا بچے ہوتے تھے۔ سارنگا اس تبدیلی کو بھانپ گئی تھی۔ سارنگا دل کی اتنی بری نہیں تھی۔ البتہ زبان کی فضول خرچ ضرور تھی۔ مجھے اس دن کے واقعے کا صحیح اندازہ ہو گیا تھا۔ میں سونا اور بھوانی دونوں کے سامنے اندر ہی اندر ندامت محسوس کرتا تھا۔ فرق اتنا ہی تھا کہ سونا میری بیٹی تھی اور بھوانی نوکر۔ دونوں کے سامنے اس طرح سے غلطی کا اعتراف کرنا میرے سامنتی سنسکاروں کو چوٹ پہنچاتا تھا۔ یہ بات بہت بعد میں سمجھ میں آئی کہ غلطی مان لینے پر انسان چاہے بڑا بھی نہ ہو لیکن آزاد ضرور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ جو باتیں سارنگا نے مجھے بتائی تھیں وہ جھوٹ تھیں۔ لیکن سارنگا نے کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ میرے سامنے سچائی قبول کر لے۔ میں نے کبھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں کے درمیان تکلف کی ایک گانٹھ پڑ گئی۔ اس واقعہ کے بعد رگھوبر کافی دنوں تک سہا رہا تھا۔ سارنگا اور اس کے درمیان ایک ان کہی دوری بن گئی تھی۔ وہی حساب تھا کہ قاضی مارا، ترکی کا نپا۔ بچے سونا

اور جھوائی تھے اور رگھوبر کے ہوش فاختہ رہنے لگے تھے۔ میں اندر یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ رگھوبر میں ایک قسم کی خاموش بغاوت پنپ رہی ہے۔ وہ جن بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا وہ یا تو عمر میں چھوٹے ہوتے تھے یا حیثیت میں۔ جھوائی اسے سمجھاتا تھا "ایسا مت کرو، بڑے رائے کو پتہ چل گیا تو بہت ناراض ہوں گے۔ اپنے برابر کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرو۔"

میں اس کی بات کا یہ مطلب لیتا تھا کہ جھوائی اسے اس کے دوستوں سے کاٹ رہا ہے۔ وہ اس سے الٹے سیدھے سوال کرنا شروع کر دیتا تھا۔ اپنے برابر کے بچوں سے کیا مطلب؟ ان کے ساتھ کھیلنے میں کیا حرج ہے؟ ان کے مکانات اتنے چھوٹے کیوں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

جھوائی اس کے ان سوالات کا کئی طرح سے جواب دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن رگھوبر ان کے جوابوں کو منہ بچکا کر اڑا دیتا تھا۔ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ رگھوبر کے پاس ان کے تمام سوالات کی ایک ہی وضاحت تھی کہ یہ ان کے پچھلے جنم کے کھوٹے کرموں کا پھل ہے۔ وہ پھل کے بارے میں شروع ہو جاتا۔ پھل تو کیلا، امرود، بادام، انگور، مر دوو غیرہ ہوتے ہیں ـــــ انھیں تو آدمی چٹ پٹ کھا جاتا ہے۔ نہیں کھاتا تو سڑ جاتے ہیں، چھوٹی دادی جی کے لیے پھل آتے تھے ـــــ وہ کھاتی نہیں تھیں تو کئی بار رکھے ہی رکھے گل جاتے تھے۔ جب اس کے سوالوں کا جواب جھوائی کے پاس نہیں رہتا تو وہ ہار مان لیتا۔ اپنے کان پکڑنے لگتا "بس چھوٹے بھیا، ہم اب تم سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہمیں جو پتہ تھا وہ آپ کو بتا دیا ـــــ آپ سوال پر سوال پوچھے جا رہے ہیں!"

رگھوبر ہنس پڑتا۔ اسے جھوائی کا اس طرح روٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

گھر میں بھی وہ سوناسے اسی طرح بحث کرتا تھا۔ کبھی کبھی سارنگا سے بھی الجھ جاتا تھا۔ اگر وہ چپ رہتا تو بڑے رائے اور میرے سامنے۔ اتنا ضرور تھا کہ اگر بڑے رائے کوئی بات کہہ دیتے تھے تو وہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن جب کسی آسامی کی پٹائی ہوتے دیکھ لیتا تھا تو بگڑ جاتا تھا۔ توڑ پھوڑ شروع کر دیتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ سب اس کے ساتھ ہوا ہے۔ کئی بار تو وہ کھانا کھائے بغیر سو جاتا تھا اور بار بار جگانے پر بھی نہیں جاگتا تھا۔ اس کا برتاؤ کم از کم

میرے لیے باعث تشویش بنتا جا رہا تھا۔ اوروں کے لیے بھی تھا لیکن باپ ہونے کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں، میرا واسطہ زیادہ تھا۔

اس میں ایک تضاد سا پنپ رہا تھا۔ جب کوئی بڑا آدمی بڑے رائے سے ملنے آتا تھا تو وہ سمجھتا تھا جیسے وہ اسی سے ملنے آیا ہو۔ کپڑے بدل کر وہ بھی وہیں جا بیٹھتا تھا۔ جب مہمان صاحب کو پتہ چلتا تھا کہ بچہ بڑے رائے کا پوتا ہے تو وہ اسے گود میں بٹھا لیتے تھے، پیار کرتے تھے، اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھتے تھے۔ مہمان مسلمان ہوتا تھا تو اس سے مصافحہ کرتا تھا۔ یہ باتیں اسے خوش کر دیتی تھیں۔ بعد میں شیخی بھی بگھارتا تھا۔ ہم فلاں سے ملے۔ فلاں ہمارے گھر آئے، وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن بڑے رائے نے اس سے پوچھا "رگھوبر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟"

تب جوش سے بولا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ بڑے اور چھوٹے آدمی میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

اس دن تو انھوں نے اس بات کو ہنسی میں لے لیا لیکن کچھ دن بعد اس کے پاس ان کے پرانے دوست سر ڈی۔ پی۔ آئے۔ وہ رہنے والے تو پورب کے تھے لیکن مسوری جاتے ہوئے اپنے پرانے دوست سے ملنے کے لیے رک گئے تھے۔ رگھوبر اس وقت کہیں پاس ہی گیا تھا۔ اسے پتہ چلا تو دوڑا ہوا آیا۔ کپڑے بدلے اور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پہنچ گیا۔ بڑے رائے نے اس کی طرف دیکھا تو اس پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا لیکن جب اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے جھمپی کے بیٹے کو دیکھا تو ان کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن رگھوبر ان کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ اپنے دوست کا ہاتھ پکڑے چلا آ رہا تھا۔

سر ڈی۔ پی نے رگھوبر کی طرف دیکھ کر پوچھا "یہ ہی بھاسکر کا بیٹا؟"

"جی آپ کا پوتا!"

"آؤ بیٹے ــــ یہاں آؤ" وہ جھٹ ان کے پاس پہنچ گیا۔

انھوں نے اسے گود میں بٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بولا "یہ میرا دوست ہے پہلے اسے بٹھائیے۔"

سر ڈی۔ پی نے اس بچے کی طرف دیکھا۔ خوبصورت تو تھا ہی جھمپی لوگ ویسے بھی کافی خوبصورت ہوتے ہیں۔ گندہ بھی زیادہ نہیں تھا لیکن شکل سے لگ رہا تھا کہ چھوٹے

طبقے کا ہے۔ ان کے ہاتھ رک گئے۔

بڑے رائے نے اس دن پہلی بار رگھبیر کے کان پکڑے "چلو، باہر کھیلو۔ جب بڑے لوگ بات کر رہے ہوں تو اس طرح کسی کو بھی لے کر اندر نہیں آنا چاہیے۔"

ساتھ والا بچہ بری طرح سہم گیا تھا۔ رگھوبیر نے بڑے رائے کی غصے سے تھرتھراتی مونچھوں کو دیکھا اور بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر نکل گیا۔

بڑے رائے کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگا۔ اعتدال پر آنے پر انھوں نے سر ڈی۔ پی سے کہا "معاف کیجیے گا ـــــ"

"نہیں، کوئی بات نہیں۔ بچہ ہے۔ لگتا ہے ابھی سے بہت ہوشیار ہے۔ آج کل بچوں میں یہ ہوا بہت چل رہی ہے۔ ہم لوگوں کے گھروں کے بچے برابر کی سطح کے بچوں سے دوستی کرنے کے بجائے اپنے سے چھوٹے گھروں کے بچوں سے دوستی کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں نے ولایت بچوں کے نفسیات کے ماہرین سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بچے یکساں ماحول میں رہتے رہتے اوب جاتے ہیں، اس لیے وہ مختلف طبقے کے لوگوں کی طرف دوڑتے ہیں ـــــ دوسرے ان کے جذبہ فخر کی تسکین ہوتی ہے ـــــ تیسرے چھوٹے طبقے کے بچوں سے توجہ زیادہ ملتی ہے۔ وہ ان کی ہر چیز کو تحسین و ستائش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ـــــ ان کی کسی بھی چیز کو یہ کہہ کر چیلنج نہیں کرتے کہ ان کے پاس بھی ویسی ہی چیز ہے لیکن اس سب کے باوجود سب سے بڑے خطرے کی بات یہ ہے کہ سلسلہ اسی طرح چلا تو دنیا میں چھوٹا بڑا کوئی نہیں رہ جائے گا۔ ساری دنیا میں گاندھی کا راج قائم ہو جائے گا۔ سنا ہے روس میں بھی اس طرح کا نظام قائم ہو چکا ہے ـــــ جہاں سب برابر ہیں لیکن کیا سب برابر ہو سکتے ہیں؟"

بڑے رائے نے اس بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ان کے دماغ ابھی تک وہی سین تھا۔

سر ڈی۔ پی نے بات چیت کا موضوع بدل دیا اور بیر بہادر کا ذکر شروع کر دیا۔

"مسٹر بہادر حالانکہ میرے ذاتی دوست تھے ـــــ لیکن انھوں نے آئی۔ سی۔

ایسی لوگوں کی امیج (IMAGE) بہت خراب کی۔ دنیا کا سب سے نایاب نوکر شاہی نظام ہمارے یہاں کا ہے۔

بڑے رائے نے صرف گردن ہلا دی "بجا فرمایا آپ نے۔"

"میں نے سنا ہے کہ آپ ان کی طرف سے پیروی کر رہے ہیں۔"

"ہاں ان کے والد میرے پرانے دوست ہیں۔ وضعدار انسان ہیں۔"

"اس سے آپ کی شہرت پر آنچ آئے گی۔"

"ہو سکتا ہے ـــــ لیکن اب تو میں نے وعدہ کر لیا۔"

"آپ سمجھتے ہیں وہ چھوٹ جائے گا؟"

کہہ نہیں سکتا۔ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ ویسے انگریز انصاف پسند قوم ہیں۔"

"انصاف کا پلڑا جب تک ایک طرف نہیں جھکتا پتہ نہیں چلتا انصاف کس کے حق میں ہوا۔ فیصلہ بیر بہادر کے حق میں بھی جا سکتا ہے اور خلاف بھی۔"

"میں حق والی بات کو تخیل کی پرواز مانتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے آپ کی یہ بات درست ہو ـــــ لیکن اسے بحث کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔" انھوں نے بات وہیں ختم کر دی۔

جاتے وقت سر ڈی۔ پی نے رگھوبر کو بلوایا۔ رگھوبر ناراض تھا۔ پتہ نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ آیا نہیں۔ بڑے رائے کو لگا وہ جان بوجھ کر نہیں آیا۔ وہ چلے گئے۔ بڑے رائے کو رہ رہ کر لگ رہا تھا کہ ان ہی کے گھر میں ان کے پوتے نے منہ پر کالک پوت دی ہے۔

منجھلے رائے کے بیٹے کی مسیں بھیگ گئی تھیں۔ جوانی کی ڈیوڑھی میں قدم رکھ رہا تھا یار رکھ دیا تھا۔ اس کی دوستی درو غاؤں سے زیادہ تھی۔ انکی دیکھا دیکھی وہ بھی منجھلے رائے کے ریوالور کی پٹی گلے میں ڈال کر، اس میں کارتوس بھر کر گھوما کرتا تھا حالانکہ توشہ دان خالی رہتا تھا۔ لوگ ہنستے تھے۔ جسم سے موٹا تازہ تھا۔ لڑکے اسے موٹا کہہ کر چڑاتے تھے۔ پڑھنے لکھنے میں بالکل من نہیں لگتا تھا۔ ایک ایک کلاس میں دو دو بار فیل ہوتا تھا۔ چونکہ ماں باپ دونوں کا لاڈلا تھا اس لیے انھیں اس کا فیل ہونا کچھ دیر کے لیے تو برا لگتا تھا بعد میں سب اعتدال پر

آجاتا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اسے شیخی بگھارنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

وہ منجھلی چاچی کے پاس روز آکر نت نئے قصے سناتا تھا۔ چاچی کوئی سوال کیے بغیر اس کی بات جوں کی توں مان لیتی تھیں۔ ان کا ایک دوست تھا سیتارام۔ اس کا ایک کلاس میں تین تین سال پڑا رہتا تھا۔ منجھلے رائے جب کبھی اسے ڈانٹ دیتے تھے کہ اچھے لڑکوں کے ساتھ رہا کرو تو رنجن اپنی ماں کو سیتارام کے خاندان کے بارے میں ایک سے ایک قصے سنانا شروع کر دیتا تھا۔ اس نے ایک کردار بنا لیا تھا۔ اس کردار کا نام تھا کنور۔ اس قصے میں کنور کا رول سیتارام کے بڑے بھائی کا تھا۔ کنور راجستھان میں کہیں پولس کپتان تھا۔ اس کی بیوی بھی بہت جدید اور تعلیم یافتہ تھی۔ کنور کے پاس اسٹوڈ بیکر کار تھی۔ ان دنوں وہ کار بہت مشہور ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے یکساں ہوتی تھی۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کدھر سے چل رہی ہے۔ آگے سے یا پیچھے سے۔ وہ کار اکثر اس کی بیوی چلایا کرتی تھی۔ وہ لوگ اکثر راجستھان سے اپنی اسٹوڈ بیکر میں بیٹھ کر آتے تھے۔ سیتارام کی بھابی اور بھائی رنجن کو بہت مانتے تھے کیونکہ زمیندار خاندان کا تھا اس لیے اس میں افسر پرستی زیادہ تھی۔ کانگریسی اسے غلامانہ ذہنیت کہتے تھے۔ حالانکہ آزادی ملے اب تقریباً پچیس سال ہونے کو آئے۔ وہ وزیر اعظم فوت ہو چکے تھے لیکن وہ ذہنیت جسے کانگریسی غلامانہ ذہنیت کہتے تھے، بڑھتی ہی گئی کم نہیں ہوئی۔ مساۃ وزیر اعظم کے دور حکومت میں تو اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مجھے لگتا ہے تب عزت نفس یعنی خودداری زیادہ تھی۔ بڑے رائے ہی انگریز افسروں سے لڑ جاتے تھے اس طرح کی مثالوں سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔

بات رنجن کے اس کردار کی ہو رہی تھی جسے وہ ہمیشہ زرہ بکتر کی طرح استعمال کرتا تھا۔ جب کبھی پڑھائی لکھائی کی بات ہوتی تو وہ دوسری طرح سیتارام کے نام نہاد بھائی پولس کپتان کنور کو لے آتا اور کہتا کہ بھائی کے کنور کہہ رہے تھے کہ رنجن تو فرسٹ کر ـــــ میں تجھے پولس انسپکٹر نامزد کرا دوں گا۔ اس بات سے منجھلے چاچا اور منجھلی چاچا مطمئن ہو جاتی تھیں۔ منجھلے چاچا چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا کچھ ایسی چیز بنے جس سے حویلی والوں پر ان کا دبدبہ رہے۔ منجھلے چاچا کو اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اپنے تاؤ جی کی طرح رنجن بھی بڑے بڑے افسروں سے تعلقات قائم کرنے لگا ہے۔ منجھلی چاچی اس بات کو دوسرے انداز میں سوچتی تھیں۔ وہ عورتوں میں بیٹھ کر شیخی بگھارنا شروع کر دیتی تھیں۔ ہمارے رنجن کو تو فرصت ہی

نہیں ملتی۔ بڑے بڑے افسروں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ آخر ہے تو اپنے ہی باپ کا بیٹا۔ وہ خود اتنے بڑے افسر تھے۔ ہم تو ایک بات جانیں، جس نے ہمیں تنگ کیا اس نے بھگوان نے تنگ کروا لا۔ ان کا صاحب آئی۔ سی۔ ایس تھا ـــــ اس نے انھیں تنگ کیا تو اب خود قتل کے مقدمے میں پھنسا پڑا ہے اپنی جس نوکرانی سے پھنسا ہوا تھا اسی کو گولی مار دی۔ ہمارے بڑے اس کی پیروی میں گھومتے پھر رہے ہیں۔ اپنے بھائی کے وقت جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا تھا۔''

عورتیں جب چالاکی کرنے پر اتر آتی ہیں تو ان کا جواب نہیں ہوتا۔ جب منجھلی چاچی کو نیچا دکھانا ہوتا تھا تو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگتیں یا کوئی ایک آدھ جڑ بھی دیتی تھیں 'کیوں نہیں سنگ ساتھ اور ماں باپ کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔'

دوسری کہتی ''رنجن کا چہرہ مہرہ تو اچھا ہے ـــــ پتہ نہیں اسے دیکھ کر مجھے اس بیوہ مہاجن کا خیال کیوں آجاتا ہے ـــــ جوانی میں بہت خوبصورت رہی ہوگی۔ رنجن سے بہت ملتی ہے۔''

منجھلی چاچی کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ جاتا تھا۔ چہرہ تمتما جاتا تھا۔ وہ اس سے نفرت کرتی تھیں۔ کئی بار گھر سے نکلوا چکی تھیں۔ جب رنجن چھوٹا تھا تو اکثر آ دھمکتی تھیں ''او بہو جی، مجھے دو میں کھلا لاتی ہوں، آپ کو بہت تنگ کر رہا ہے'' شروع میں تو وہ دے دیتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے اسے اپنا دودھ اس کے منہ میں دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تب سے پتہ نہیں انھیں کیا ہوا کہ اس کی جان کی دشمن ہو گئی تھیں۔ اس نے بہت خوشامد کی لیکن نہیں مانیں۔ اس قصے کا کئی لوگوں کو پتہ تھا۔

اس بات کا منجھلی چاچی کے پاس ایک جواب ہوتا تھا'' سنا ہے بھگوان اس دنیا میں صرف دو آدمیوں کو ہم شکل بناتا ہے۔'' عورتیں ہنس دیتیں ''بھگوان کا تو تمھیں ہی پتہ ہوگا۔ ہم تو اتنا ہی جانتی ہیں جتنا نظر آجاتا ہے۔''

منجھلی چاچی یہاں تو وہاں سے کھسک لیتیں یا کبھی کبھی ناراض ہو کر ایک دو جھاڑ پلا دیتیں۔

رنجن کو اسکول میں اس قسم کے حملے اکثر برداشت کرنے پڑتے تھے۔ کبھی جب وہ شیخی بگھارتا ہوتا یا کسی سے بھڑ جاتا تھا لڑکوں میں سے کوئی آواز لگا دیتا ''مسٹر پاپا!''

رنجن یکایک بجھ سا جاتا جیسے کسی نے دوڑتے دوڑتے اس کی ٹانگیں توڑ دی ہوں۔ تب وہ منجھلی چاچی کے پاس جا کر رہتا تھا۔

وہ ایک داروغاؤں کو رنجن نے ہیرو بنا رکھا تھا۔ وہ ان کے قصے بھی ماں کو اسی طرح سنایا کرتا تھا جیسے پولس پٹنان کنور کے قصے سنایا کرتا تھا۔ دونوں قصوں کی سب سے اچھی سامع تھیں۔ رنجن بھی جب تک ماں کے پاس رہتا تھا بہت زندہ دل اور خوش خرم نظر آتا تھا۔ ایک دلیر سنگھ داروغہ تھا۔ تھا بھی یا نہیں کہنا مشکل ہے لیکن رنجن یہ مان کر چلتا تھا کہ وہ ہے۔ ایک دن دلیر سنگھ داروغہ اور ملک داروغہ نے شرط لگائی جو کھڑے ہوئے گدھے کو ایک لات مار کر گرا دے تو اسے دوسرا دو سو روپیہ دے گا۔ دونوں پولس کلب میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ رنجن کا کہنا تھا کہ کھڑے ہوئے گدھے کو ایک لات میں الٹ دینا بہت مشکل کام ہے۔ پہلے ملک نے اپنی لات آزمائی۔ گدھا ریکتا ہوا ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہ دراصل گدھا نہیں گدھی تھی۔ پھر دلیر سنگھ کا نمبر آیا اس نے لات ماری تو گدھی الٹ گئی۔ الٹنے کے ساتھ ساتھ پیچھے کی طرف سے خون بھی بہنا شروع ہو گیا۔ وہ بری طرح ڈکرانے لگی۔ اس کے پیٹ میں گدھے کا بچہ تھا۔ اس بات پر منجھلی چاچی بولیں "گدھی تھی تو پیٹ میں گدھے کا بچہ تو ہوگا ہی۔"

رنجن کو ان کا اس طرح ٹوکنا ٹھیک نہیں لگا۔ چاچی سمجھ گئی۔ وہ پھر بولیں۔

"پھر کیا ہوا؟"

"ہوا کیا — ملک سے دو سو روپے وصول لیے۔"

"اور گدھی کا؟"

"گدھی تو گدھی ہی تھی — مر مرا گئی ہوگی۔ مجھے کیا پتہ۔ میں کیا اس کے پیچھے پیچھے گھوم رہا تھا؟"

ایسے میں چاچی چپ ہو جاتی تھیں۔ وہ اسے کبھی کبھی سمجھاتیں "بیٹا رنجن، مجھے تیری فکر رہتی ہے — تو کب پڑھ لکھ کر کچھ بنے گا؟"

رنجن فوراً پلٹا لیتا اور کنور پر آ جاتا "کنور بھائی اور بھابی آئے ہوئے ہیں۔ کل

انھوں نے پولس لائن سے گھوڑ سواری کے لیے تین گھوڑے منگوائے۔ مجھ سے کہنے لگے تم بھی چلو گھوڑ سواری کے لیے۔ گھوڑ سواری نہیں سیکھو گے تو انسپکٹری کیسے کرو گے۔ میں بس تمھارے ڈر کے مارے نہیں گیا۔ کنور بھائی تو بہت ضد کرتے رہے۔ پھر وہ دونوں چلے گئے۔ تیسرے گھوڑے پر سائیں گیا" پھر بولا" سنا تاؤ جی بھی تو بہت اچھے گھوڑ سوار تھے!"

ایسے میں منجھلی چاچی کوئی جواب نہیں دیتی تھیں۔ وہ کہتا جاتا" سائیں بتا رہا تھا کہ ہم نے بڑے بڑے انگریز افسروں کی گھوڑ سواری دیکھی ہے ـــــ لیکن کپتان صاحب اور میم صاحب جیسے گھوڑ سوار نہیں دیکھے۔ لوٹتے ہوئے کالی ندی سے گزرے۔ پل پر بھیڑ تھی۔ میاں بیوی میں شرط لگ گئی۔ کون ندی پھلانگے گا۔ پہلے میم صاحب نے ایڑ لگائی اور سٹ سے دوسرے کنارے پر پہنچ گئیں۔ پھر صاحب نے لگائی ـــــ پار تو ہو گئے لیکن کنارے پر پاؤں پڑتے ہی گھوڑے کا پاؤں مڑ گیا، گھوڑا گرا تو وہ بھی گر گئے۔

منجھلی چاچی کو کنور کے گرنے کا بہت افسوس ہوتا۔ وہ چ۔۔۔چ۔۔۔چ کرنے لگیں اور بولیں" اتنا بڑا پولس کپتان تو گر گیا اور اس کی عورت پار ہو گئی! اسے پار ہونے کی کیا پڑی تھی کہ اپنے آدمی کو نیچا دکھا دیا ـــــ وہ ہی گر جاتی تو کیا بگڑ جاتا۔ آدمی کی عزت سے ہی عورت کی عزت ہے۔"

رنجن ان کی باتیں سن کر خوش ہوتا تھا کہ اس کی بات سولہ آنے فٹ بیٹھ رہی ہے۔ منجھلے چاچا کو وہ کبھی اپنے یہ قصے نہیں سناتا تھا وہ اسے جھڑک دیتے تھے ـــــ پڑھو لکھو گے تو نہیں البتہ جھوٹے سچے قصے سنا کر بھانڈ گیری کرتے رہو گے" حالانکہ منجھلی چاچی ان کی طرفداری کرتیں" بچہ ایک تو شوق سے سناتا ہے اور تم ہو کہ اسے ڈپٹ دیتے ہو!" وہ اور زیادہ گرما جاتے، رنجن چپ ہو جاتا اور دل ہی دل میں منجھلے چاچا کو کوسنے لگتا۔ اسی لیے تو ڈانٹتے ہیں کہ وہ عمر میں بڑے ہیں۔ کسی برابر والے کو تو ڈانٹ کر دیکھیں۔ مجھے بڑا ہو جانے دو تب نہ بتایا تو میرا نام بھی رنجن نہیں۔ زیادہ ڈانٹ دیتے تو دل ہی دل میں گالی دینے لگتا ـــــ مریں نہ موت آئے ـــــ جب دیکھو مجھ پر تو تاتے رہتے ہیں۔ جب دماغ ٹھنڈا ہوتا تو سوچ دوسری طرف گھوم جاتی ـــــ میں نے یہ کیا سوچ لیا ـــــ مر گئے تو تاؤ جی مجھے گدی سے اتار کر گھوبر کو بٹھا دیں گے تب میں کیا کروں گا؟ پھر وہ دل ہی دل میں ہاتھ جوڑ کر کہتا ـــــ بھگوان کہا سنا معاف کرنا ـــــ اب ایسا کبھی نہیں سوچوں گا۔ وہ سب

اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے تھے جو مسٹر پیدا کر پڑاتے تھے۔

ادھر کارتوسوں کی پیٹی بھرے رکھنے کے چکر میں وہ دروغاؤں سے ہوئی ربط ضبط رکھنے لگا تھا۔ حالانکہ منجھلے رائے کے پاس ریوالور کا لائسنس تھا اور کارتوس بھی تھے۔ لیکن وہ ان سب کو الماری میں رکھتے تھے۔ دو دو چار چار کارتوسوں کی لالچ میں اسے دروغاؤں کے پاس جانا پڑتا تھا۔

ایک دن رنجن اسی چکر میں کسی غلط دروغہ کے پلے پڑ گیا اس کے دو تین دانت ٹوٹ گئے۔ منجھلے رائے نے سنا تو انھیں اتنا غصہ آیا کہ رنجن کو اسی حالت میں لے کر وہ پولس کپتان کے پاس چلے گئے۔ پولس کپتان نے داروغہ کو فوراً معطل کر دیا لیکن منجھلے رائے سے کہا تھا کہ آپ اپنے لڑکے کو ہدایت دے دیں کہ وہ دروغاؤں کے پاس نہ جایا کرے۔ ان لوگوں کا کام ہی ایسا ہوتا ہے کہ نازک احساسات دھیرے دھیرے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی وہ کارتوسوں کی پیٹی وغیرہ بھی اٹھا کر رکھ لیں۔ آپ تو خود تحصیلدار رہے ہیں۔ اس کے قانونی پہلو کو سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے دل میں ناکامی کا جذبہ پیدا کرنا اپنے آپ میں بہت بڑا جرم ہے۔ اس کی وہ پیٹی اتروا دی گئی تھی اور تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ دروغاؤں اور دیوانوں کے پاس نہیں جائے گا۔

رنجن کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ منجھلی چاچی پوچھتی رہ گئی تھیں کہ اسے اتنی چوٹ کیسے لگی؟

رگھوبر کا ربط ضبط رنجن سے بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ رنجن اس سے بڑا تھا۔ اسکول میں رنجن کی وجہ سے رگھوبر کو لگتا تھا کہ وہ سلامتی سے ہے۔ اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے سب ہی بچوں کے لیے کھیل کود کا انتظام اسکول کی طرف سے ہوا کرتا تھا۔ کئی بار رگھوبر کھیل کے میدان میں رنجن کے ساتھ ہی لوٹتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس بات کا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ ادھر رگھوبر حویلی سے باہر بھی کافی آنے جانے لگا تھا۔ اس کے وہی سب دوست تھے جن

کے ساتھ رہنے کو اسے منع کیا جاتا تھا۔ ایک آدھ بار اسے ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی لیکن وہ ڈھیٹ ہوتا جا رہا تھا۔ گھر والے دھیان رکھتے تھے کہ اس کی کم از کم باتیں بڑے رائے کے پاس پہنچیں۔ جتنی پہنچتی تھیں وہ اس سے پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کے من میں یہ بات گھر کرتی جا رہی تھی کہ ان کا ایک ہی پوتہ ہے اور وہ بھی ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ یا تو وہ اسے اپنے ساتھ رکھیں یا پھر گھر کا کوئی بڑا آدمی اس پر نظر رکھے۔ اس کے لیے ایک چھوٹا لڑکا بھی نوکر رکھ دیا گیا تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ بھی اس کا دوست ہو گیا تھا۔ رگھوبر اپنی روزانہ کی سیروں پر اسی کو ساتھ لے کر نکلتا تھا۔

بھوانی نے رگھوبر کو اس نوکر کے ساتھ کئی بار اٹھتے بیٹھتے، ہنسی مذاق کرتے دیکھا تھا۔ وہ رگھوبر سے تو کچھ نہیں کہہ سکا لیکن ایک دن اس لڑکے کے دو چار تھپڑ رسید کر کے بھگا دیا۔ رگھوبر، بھوانی سے کئی دنوں تک منہ پھلائے رہا۔ بھوانی اسے دھیرے دھیرے راستے پر لایا۔ اس عرصے میں اس کا آنا جانا رنجن کے پاس ہو گیا۔ ہمارے سارے گھر کا خیال تھا کہ رنجن بگڑا ہوا لڑکا ہے۔ درونا والے واقعے سے اس کے بارے میں یہ رائے اور بھی پختہ ہو گئی تھی۔ سب لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا تھا کہ اس طرح کے بچوں کو گود لینے کا یہ ہی انجام ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کس کا بچہ ہے؟ لوگوں میں یہ بات بھی اڑی ہوئی تھی کہ وہ کسی بیوہ کا بچہ ہے ___ اگر وہ اسی بیوہ کا بچہ ہے جس سے اس کی شکل ملتی ہے تو اس کے سنسکاری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جب یہ پتہ لگا کہ رگھوبر بھی رنجن کے ساتھ گھومنے لگا تو ہم لوگ اندر ہی اندر دہل سے گئے۔ کہیں رگھوبر اسی راہ پر نہ چل پڑے۔ کہیں وہ بھی اسی گروہ کے چکر میں نہ پھنس جائے جو لڑکیوں کی طرح چھوٹے لڑکوں کو پھنسانے کا کام کرتا ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کے بہت سے گروہ تھے جو سنبھلنے سے پہلے ہی لڑکوں کو غلط عادتوں میں ڈال دیتے تھے اور پھر وہ زندگی بھر راہ راست پر نہیں آ پاتے تھے۔

جب پتہ چلا تو پہلے تو چھوٹے رائے نے رگھوبر کو سمجھایا پھر میں نے ڈانٹا پھٹکارا۔ دو چار چپت بھی لگائے۔ اس نے ایک دن براہ راست مجھ سے سوال کیا کہ رنجن چاچا میں ایسی کیا بات ہے جو آپ لوگ مجھے ان کے ساتھ ملنے جلنے سے منع کرتے ہیں۔

میں نے اسے سمجھانا چاہا ”وہ گندے آدمیوں کے ساتھ رہتا ہے، اس کی

عادتیں خراب ہیں ـــ وہ تمھیں غلط راہ پر ڈال دے گا۔"

"کون ہیں وہ گندے آدمی؟"

"تم ان سب کو نہیں جانتے؟"

"آپ جانتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"رنجن چاچا کے ساتھ کون رہتا ہے آپ کو کیسے معلوم؟ آپ لوگ تو ان سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے۔ میں جس کے پاس بھی آتا جاتا ہوں وہی آپ کو گندے آدمی لگتا ہے۔"

"اپنے ساتھ کے لڑکوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟"

"کیسے رہوں؟"

"کیوں؟"

وہ سب آپ کو چھوٹے اور نیچ لگتے ہیں۔ رنجن چاچا میری اسکول میں مدد کرتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مجھ کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

"ہم ماسٹر جی سے کہہ دیں گے ـــ وہ تمھارا خیال رکھیں گے۔"

ماسٹر جی تو کلاس میں رہیں گے ـــ مجھے تو کلاس کے باہر بھی لڑکوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔"

وہ لگاتار بحث کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں۔ غصے سے میرے منہ سے نکل گیا "ایسے ہی لڑکوں کے ساتھ رہ کر تمھاری عادتیں بگڑ گئی ہیں۔ اگر تم ان ہی چکر میں پڑے رہے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔"

پتہ نہیں اسے کس نے بتایا تھا۔ وہ گرم جوشی سے بولا "آپ بھی تو اسکول میں ـ"

میں نے اس کے منہ پر زوردار چپت رسید کی۔ اس کا جملہ آدھا ہی رہ گیا۔ سر کرسی سے ٹکرایا۔ یہ میرا پہلا موقع تھا جب میں نے رگھوبر کو اتنی زوردار چپت ماری تھی۔ اس کے چہرے پر انگلیاں ابھر آئیں اور آنکھیں لبالب بھر آئیں۔ لیکن آنسو باہر نہیں آنے دیے۔ یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ اسے اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے اسے مارا ہے لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ سچ یہ ہی ہے کہ میں نے اسے مارا۔ اس کا اپنی لاچاری کا یہ پہلا

تجربہ تھا۔ بچے کو اس قسم کا احساس ہی شاید گستاخ بناتا ہے۔ چپت لگا کر مجھے بھی محسوس ہوا تھا کہ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔ وہ سارنگا سے تو کھنچا ہی رہتا تھا مجھ سے بھی کھنچ جائے گا۔ تب اس کی بے بسی اور بڑھ جائے گی۔ میں نے اپنی آواز ملائم بناتے ہوئے کہا "کیا کوئی بچہ اپنے باپ کے لیے ایسی بات کہتا ہے!"

وہ گرم جوشی سے بولا اور بیٹے کے لیے ـــــ ؟" وہ آگے نہیں بول سکا اور پھپھک کر رو پڑا۔ وہ بری طرح مجروح تھا۔ اسے روتے دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی گوریا اپنے بچے کو جھاڑی میں پھنسا دیکھ رہی ہو اور نکال نہ پا رہی ہو۔

اس کے باوجود اس نے رنجن کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ رنجن اس کے رہبر کی طرح ہو گیا۔ تب کرکٹ کے کھیل کا زیادہ چلن نہیں تھا۔ انگریزی اسکولوں میں کھیلا جاتا تھا۔ اس دن کرکٹ کا میچ تھا۔ وہ میچ دیکھنے چلا گیا جاتا کہہ کر گیا تھا۔ لیکن یہ اندازہ کسی کو نہیں کہ پورا دن لگ جائے گا، وہ گھر سے اس کی سب سے پہلی لمبی غیر حاضری تھی۔ میچ دیکھتے ہوئے اسے بار بار گھر کا خیال آ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ڈر سے کانپ جاتا تھا۔ رنجن نے بھی اس سے کہا "تم گھر جاؤ" گھر پر سب فکر مند ہوں گے۔ لیکن وہ اور بھی بچوں کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ مست ہو کر کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب بھی وہ جانے کی سوچتا تھا اسے یہ ہی لگتا تھا کہ ان سب کے بھی تو گھر اور گھر والے ہیں۔ وہ یہ ہی سوچ کر بیٹھا رہا۔

دریں اثنا بڑے رائے کئی بار پوچھ چکے تھے رگھوبر کہاں ہے؟ پہلے تو سب ٹالتے رہے۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے وہ لوگ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ اسکول گیا ہے۔ آخر جب پانچویں چھٹی بار پوچھا تو انھیں کہنا پڑا کہ رگھوبر کرکٹ کا میچ دیکھنے اسکول کے میدان گیا ہے جب انھیں پتہ لگا کہ اس نے کھانا تک نہیں کھایا تو وہ اور زیادہ ناراض ہو گئے۔ انھوں نے بھی کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ بڑے رائے نے کھانا نہیں کھایا تو کوئی اور کیسے کھاتا۔ سارنگا کو البتہ پرانی نوکرانی امرتی نے کہہ سن کر کھانا کھلا دیا۔ گرور ہونے والا تھا۔ دراصل گرور میرا دوسرا بیٹا ہے یعنی سارنگا کا بیٹا۔ شروع میں سارنگا کافی بیمار رہی تھی۔ کافی لمبا علاج چلا تھا۔ دلّی کے اس یوروپین اسپتال میں جس میں کلا کا انتقال ہوا تھا۔ اس کا بھی ایک

چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑا تھا۔ پہلے تو سمرتا وہاں جانے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بہت سمجھانے بجھانے پر مانی تھی۔ اس لیے اسے ہر ہفتے پٹنہ جانا پڑتا تھا۔

رگھوبر شام تک نہیں آیا۔ بڑے رائے کا کلب جانے کا وقت ہو گیا۔ اس دن وہ پیدل ہی کلب گئے گاڑی واپس کر دی حویلی پر تاکید کر دی گئی کہ جیسے ہی رگھوبر گھر آئے ویسے ہی گاڑی بھیج کر بلوا لیا جائے۔ یہ بات کرجن کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ آج کچھ ایسا ہونے والا ہے جیسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔

گلی سے نکل کر مین روڈ پر پہنچے تھے۔ جیسے ہی وہ گلی پار کر کے مین روڈ پر پہنچے، رگھوبر رنجن کے ساتھ آتا ہوا نظر آیا۔ وہ اتنے غصے میں تھے کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ چھوٹتے ہی رگھوبر کے بیت رسید کر دی۔ ایسا لگا جیسے بہتے پانی میں یکایک کوئی باندھ اٹھ گیا ہو۔ ادھر کے لوگ ادھر اور ادھر کے لوگ ادھر رک گئے تھے۔ ایک تو پہلے ہی کسی نے بڑے رائے کو عام آدمیوں کی طرح سڑک پر اس طرح آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ دوسرے وہ اپنے پوتے پر سڑک پر ہی بیت پھٹکار رہے تھے۔ حیرت اور خوف سے جو جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ انھیں روک سکے۔ وہ فوراً الٹے پیروں لوٹ پڑے۔ رگھوبر کو آگے کر لیا۔ رنجن سے انھوں نے صرف اتنا ہی کہا "کرشن سے کہنا میں نے بلایا ہے" اس کے چہرے پر بھی گھبراہٹ اور حیرت تھی۔ گلی کے اندر داخل ہوتے ہی بڑے رائے نے رگھوبر کے ایک اور بیت رسید کی۔ ان کا جبڑا کسی فولادی شکنجے کی طرح کسا تھا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ان کی ساری شرافت جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

رگھوبر کے جسم میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ جیسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ بڑے رائے کو گھوم گھوم کر دیکھتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔ اسے رفیق کی یاد آ رہی تھی۔ رفیق اس کے اسکول کا چپراسی تھا۔ رفیق کا بیٹا رحمن چور تھا۔ ایک ایسا چور نہیں جو کسی کا سامان چراتا ہو یا گھر میں سیندھ لگاتا ہو۔ بس اسکول کے باغیچے میں پیڑوں پر چڑھ جاتا تھا پھل توڑ کر پہلے خود کھاتا تھا پھر دوسرے بچوں کو دیتا تھا۔ اس کے باپ کو اسکول سے صرف بارہ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ دس آدمیوں کا خاندان تھا۔ وہ جو کماتا تھا تو پیٹ بھرنے کا اس کے پاس ایک ہی طریقہ بچتا تھا۔ اسی سے اس کا نام رحمن چور پڑ گیا تھا۔ اسے سمجھاؤ کہ ایسا نہ کیا کرو تو وہ لن ترانی ہانکنے لگتا تھا۔ پیڑ اپنے پھل خود تو کھاتے نہیں ـــ پھر ہنس کر کہتا ـــ جیسے

ہم اپنا میلا نہیں کھاتے۔ اسے اس طرح کی باتیں کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ بچے اس کی بات سن سن کر تھو تھو کرنے لگتے تھے۔ وہ جُھنس کر کہتا ـــــ 'ابے منہ میں آ گیا کیا؟' اور پیڑ ہلا دیتا۔ پھر کہتا ـــــ 'ہماری خالہ بتاتی ہیں کہ کسی کو اپنی گندگی اچھی نہیں لگتی ـــــ دوسروں کی لگتی ہے اگر ہمیں پیڑوں کی گندگی پھلوں کی شکل میں اچھی لگتی ہے تو مالی کی چھاتی کیوں جلتی ہے؟ مالی اس کی کئی بار پٹائی کر چکا تھا۔ ایک دو بار وائس پرنسپل کو بھی بلا چکا تھا۔ وہ رفیق کو ڈانٹ چکے تھے کہ یا تو اپنے بیٹے کو سنبھالو ورنہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اس دن بھی یہ ہی ہوا۔ وائس پرنسپل نے کہا 'تمھارے لڑکے کو اور تمھیں اسکول سے نکالا جاتا ہے۔ تم لوگ چور ہو۔ نوکری سے نکالی جانے والی بات رفیق کے لیے تو حادثہ تھی ہی۔ لیکن چور قرار دیا جانا اس سے بھی بڑی ذلت تھی۔ رفیق نے لڑکے کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیا جو ہاتھ میں آ جاتا تھا اسی سے مار رہا تھا، حتیٰ کہ وہ گنڈاسا اٹھا کر لپکا۔ تب وائس پرنسپل صاحب نے اسے روکا "تم پاگل ہو گئے ہو" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "ہمارے یہاں چوری کرنا حرام ہے حضور! اس کی وجہ سے مجھے چور بننا پڑ رہا ہے حضور، میں اپنے اس بیٹے کو ایمانداری کے نام پر قربان کر دوں گا۔" خیر کسی طرح پرنسپل صاحب نے بیچ میں پڑ کر معاملہ نپٹایا۔

بڑے رائے کے پیٹنے میں فرق اتنا ہی تھا کہ وہ دانت اس طرح بھینچ رہے تھے جیسے دانتوں کا سرمہ بنا ڈالیں گے۔ بول کچھ نہیں رہے تھے۔ رفیق مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے مارنے میں ایک کھلا پن تھا اور بڑے رائے کے مارنے میں ایک طرح کی شرافت اور ذوق دولت مندی۔ جیسے ہی حویلی کے دروازے میں داخل ہوئے، بڑے رائے کو بینت اٹھائے میرے پیچھے آتے دیکھ کر سب سن رہ گئے ـــــ آج ضرور غضب ہو جائے گا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس وقت مجھے رحمت اللہ کی یاد آئی۔ وہ ایسا شخص تھا جو بگڑیل گھوڑے کی راس پکڑنے کا دم رکھتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو کہتا 'مجھے روند ڈالیے۔ اس بچے کی جاں بخش دیجیے۔' اس میں ان کی بینت پکڑنے کی ہمت تھی۔ دراصل اس نے بڑے رائے سے کبھی کچھ مانگا نہیں تھا اور نہ ان کا دیا اس طرح قبول کیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے کو چھوٹا بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ چھوٹے رائے تک تھرا گئے تھے۔ کمرے میں لے جا کر انھوں نے رگھوبر کی اچھی طرح پٹائی کی بولے بھی خوب "اس لفنگے رنجن کے ساتھ گھومتا ہے جسے فعلی بد فعلی تک کا خیال نہیں۔ بتا تجھے کیا چاہیے؟ سچ سچ بتا کہاں گیا تھا؟" ان کی ساری شائستگی اس

وقت ہوا ہو گئی تھی۔

انھیں شک تھا کہ وہ مچ مچ میں جانے کے بجائے کہیں اور گیا تھا۔ جس طرح کے الفاظ کا وہ استعمال کر رہے تھے، وہ سن کر سب حیرت زدہ تھے۔ وہ اپنے سارے نقاب اتار کر پھینک چکے تھے۔ رگھوبر دم بخود ہو گیا تھا۔ وہ یہ تک نہیں کہہ رہا تھا کہ اس بار معاف کر دیجیے اب کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ بڑے رائے کا ہاتھ نہیں رک رہا تھا۔ انھیں کبھی کسی نے اس بے رحمی سے مارتے نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ چھوٹے لوگوں کو بھی نہیں۔ میری اتنی شیطانیوں کے باوجود انھوں نے کبھی مجھے اس طرح نہیں مارا تھا۔ تب بھی نہیں جب ٹک سے کلکٹر کی میم کو چوٹ آئی۔ اسکول میں پتا تو چلا بابا کشن بابو کے پاس جانے کے بارے میں انھیں پہلی بار اطلاع ملی۔ رگھوبر تو ان کا سب سے زیادہ دلارا تھا۔ اگر انھیں کبھی جھوٹ کا بھی پتہ لگ جاتا تھا کہ میں نے یا سارنگ نے اسے کچھ کہا ہے تو وہ فوراً پیار کر لیتے تھے ـــــ دیکھو تو رگھوبر کیوں رو رہا ہے۔ کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟ لیکن اس دن ان پر پاگل پن سوار تھا ـــــ پاگل پن کیا، بلکہ خون۔ یہ سب کی فہم سے بالاتر بات تھی کہ آخر انھیں ہو کیا گیا ہے۔ کسی اوپری ہوا کا اثر تو نہیں؟ آخر اتنے ناراض کیوں ہیں؟ وہ بھی اس بچے سے؟ میرے اندر کا باپ جو بڑے رائے کا بیٹا ہونے کے بوجھ سے دبا تھا، کلبلانے لگا تھا۔

سارنگا اندر تھی۔ جب سونا روتی ہوئی پہنچی تو اسے پتہ لگا کہ بڑے رائے رگھوبر کو مار ڈالنے پر آمادہ ہیں تو پتہ نہیں اسے کیا ہوا کہ وہ تیزی کے ساتھ باہر آئی اور سب کے دیکھتے دیکھتے بڑے رائے کے کمرے میں گھس گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ بہو ساری روایات توڑ کر اس طرح مردانے میں آئے اور بڑے رائے کے کمرے میں گھس جائے۔ بڑے رائے کی موجودگی میں بڑے رائے کا کمرہ ـــــ اس کے لیے ممنوعہ علاقہ تھا۔

وہ جا کر رگھوبر سے لپٹ گئی۔ بڑے رائے کا ہاتھ رک گیا۔ بڑے رائے زور سے دہاڑے ـــــ "بہو بہو ـــــ تم حویلی کے باہر کیسے آئیں؟"

سارنگا رگھوبر کو دبوچے کھڑی تھی۔ بھوانی دوسرے نوکروں کے ساتھ کھڑا ٹسر ٹسر رو رہا تھا۔ وہ اس سے بولی "بھیا، رگھوبر کو اندر لے چلو۔"

"نہیں یہ نہیں جائے گا" بڑے رائے گرجے۔

وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اسے آنچل سے ڈھک لیا۔ بڑے رائے مجھ سے بولے "بہو سے کہو کہ اندر جائے، ورنہ آج غضب ہو جائے گا۔"

اس نے گھونگھٹ میں سے سر ہلا دیا۔ چھوٹے رائے جو اب تک چپ چاپ کھڑے اپنی ناک سڑک رہے تھے، آگے آ کر بولے "بڑے بھیا، آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے جس سے آپ کی نسل چلے گی اسی کو جڑ سے کاٹنے پر اتارو ہیں۔ کوئی کب تک نہیں بولے گا۔ بہو یہاں اس لیے نہیں آئی کہ وہ حکم عدولی کرے یا بے پردگی کرے ـــــ وہ رگھوبر میں اپنے آنے والے بچے کا مستقبل دیکھ رہی ہے۔ اب بس کیجیے۔ رنجن بھی اسی خاندان کی ایک شاخ ہے۔ بھاسکر اور ارن کا بھائی۔ جیسے بھاسکر کو سنبھالا وہ ولایت میں بیٹھے ارن کا بچایا ـــــ ویسے ہی اسے بھی سنبھالا جا سکتا ہے ـــــ اسے سنبھالنا ہمارا فرض ہے۔ نفرت کرنا نہیں۔"

بڑے رائے تیزی سے باہر چلے گئے۔ رگھوبر کو کپکپی سی آئی اور بے ہوش ہو گیا۔

وہ رات سب ہی کی جاگتے گزری۔ کھانا کھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ رگھوبر کو کچھ دیر بعد ہی ہوش آ گیا تھا۔ اسے ذہنی صدمہ پہنچا تھا، ایک ایسا حادثہ ہو گیا تھا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ بڑے رائے اسے ہمیشہ اپنی پناہ گاہ کہتے تھے۔ انھوں نے یکایک اپنا رول بدل دیا تھا۔

بڑے رائے کمرے سے نکل کر سیدھے کلب گئے۔ وہ دیکھنے کے لیے بھی نہیں رکے کہ رگھوبر کی طبیعت کیسی ہے؟

وہ برج کے اچھے کھلاڑی تھے۔ بہت کم ہارتے تھے۔ ہر شخص ان کا پارٹنر بننے کا مشتاق رہتا تھا۔ لیکن اس دن وہ یکے بعد دیگرے ہر گیم ہار رہے تھے۔ تیسرے گیم کے بعد وہ یکایک اٹھ گئے۔ ایس۔ پی افضل صاحب ان کے اچھے دوست تھے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے باہر آئے اور پوچھا "رائے صاحب، آپ آج بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ آپ تو ان کھلاڑیوں میں ہیں جو ہارنا بھی چاہیں تو نہ ہاریں۔ پھر کیا ہوا؟ میں نے تو سنا ہے کہ ایک بار آپ لفٹیننٹ گورنر کی میم سے ہارنا چاہتے تھے ـــــ لیکن ہارتے ہارتے بھی جیت گئے تھے۔"

کوئی اور وقت ہوا ہوتا اور کوئی ان کے سامنے اس جملے کو دوہراتا تو شاید وہ پھولے

نہ جاتے۔ اس کے لیے کچھ بھی کر ڈالتے۔ اس طرح کے واقعات ہی ان کی زندگی کی بیش قیمت یادیں تھے۔ سنہرے خواب اور تاریخ بھی۔ جب بھی کوئی ان واقعات کا ذکر کر دیتا تھا تو ان کی یاد بکھرے دودھ کی طرح ان کی ذہنی سطح پر دھیرے دھیرے پھیلتی جاتی تھی۔ لیکن ان سے نہ مسکرایا گیا اور نہ اس دن وہ اپنی یاد کے اس سنہرے ورق کو کھول سکے۔ دھیرے سے بولے "آج میں نے غصے میں پہلی بار اپنے پوتے کو اس قدر پیٹا ہے کہ میں اپنے آپ کو گناہ گار محسوس کر رہا ہوں۔"

افضل صاحب بھی نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہنس کر بولے "ارے آپ یہ کیا فرما رہے ہیں ـــــ زمیندار اور پولس والوں کے یہاں تو یہ بڑا کام ہر وقت ہی ہوتا رہتا ہے۔ ان پر تو اس کا اثر نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ گھر کی بات دوسری ہے لیکن آپ جیسے شائستہ حضرات گھر میں بھی یہ کام شروع کر دیں گے تو۔۔۔" اور جملہ مکمل کیے بغیر کچھ ایسا منہ بنایا جیسے کہہ رہے ہوں ـــــ تو پھر سوچنا پڑے گا کہ ہم پولس والے کیا کریں۔

ان کی بات بڑے راجے کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ وہ بولے "مجھے لگتا ہے کہ ہم لوگوں کے دماغوں میں رعونت کی بو اتنی بس گئی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو بھی اپنی رعایا سمجھنے لگے ہیں۔ ابھی تک ہمارا رویہ غیروں کے ساتھ تھا اب حکومت کی اس ہوس کا شکار ہمارے چھوٹے سے بچے بھی ہونے لگے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جب اورنگ زیب نے شاہجہاں کو گرفتار کیا ہوگا ـــــ بھائیوں کا قتل کیا ہوگا تو اس کے پس پشت حکومت کا یہی غرور رہا ہوگا جو آج مجھ پر سوار تھا۔"

افضل صاحب ان کی شکل کی طرف دیکھنے لگے "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں ـــ آپ کا مطلب ہم لوگ اپنے بچوں کے بھی حاکم ہیں ـــــ شاید نہیں ـــــ ہم ان کی سزا ان کی بھلائی کے لیے دیتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں نہ نہیں اس کا بغیر اجازت میچ دیکھنے جانا مجھے اپنی انا کو چیلنج دیتا ہوا محسوس ہوا ـــــ ورنہ کیا کوئی اپنے بچے کو اتنی بڑی سزا دے سکتا ہے۔"

"کیا یہ ذمہ داری کا رد عمل نہیں ہو سکتا؟"

"آپ نہیں جانتے وہ بن ماں کا بچہ، مجھ میں اپنی سلامتی تلاش کرتا تھا۔ میں نے اس پر قہر برپا کر دیا ـــــ بچایا اس انسان نے جس سے وہ خود پٹتا تھا۔ شاید اس پر اپنی طاقت کی

آزمائش کرنی چاہی جو در زندگی کی پہچان ہوتی ہے۔"

"شاید آپ بجا فرمارہے ہوں۔ مجھے اس مسئلے پر از سر نو غور کرنا ہوگا۔ ہم پولس والے کافی کوڑھ مغز ہوتے ہیں ــــــ ہمیں ان موضوعات پر اتنی گہرائی سے سوچنے کی عادت نہیں ہوتی۔"

بڑے رائے گاڑی میں آ بیٹھے۔

گھر پہنچے تو اندر ہی اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ رگھوبر سو چکا تھا۔ اس دن بھی وہ ان ہی کے کمرے میں سویا تھا۔ سب لوگ کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے اٹھ کر گئے تھے۔ بھوانی اس کے پلنگ کا سہارا لے کر اونگھ رہا تھا۔ دراصل مجھے اور چھوٹے رائے کو اس نے ہی زبردستی بھیجا تھا۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے انداز میں بے چین تھے۔ لیٹے لیٹے پتہ چل رہا تھا کہ بڑے رائے کی گاڑی آکر رکی، بڑے رائے اندر آئے ــــــ ان کی ہیئت کی تکور میں ذرا سا بھی ڈھیلا پن نہیں تھا، اتنی ہی چست۔ میں نے سوچا اٹھ کر چلا جاؤں لیکن مجھے ڈر سا لگا۔ کہیں ان کا غصہ اب بھی برقرار نہ ہو۔ وہ دھیرے دھیرے اندر گئے۔ بھوانی جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بڑے رائے سیدھے اپنے ڈریسنگ روم یعنی کپڑے بدلنے کے کمرے میں گئے۔ وہ کمرہ ان کا بالکل اپنا تھا۔ اگر خفیہ کہنا چاہیں تو وہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی میں وہ تجوری تھی جس میں رائے خاندان کا وہ خزینہ احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ قیمتی کاغذات اور بیش قیمت کپڑے تو تھے ہی۔

بھوانی ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ آئے تو شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

بھوانی نے پوچھا "کھانا ــــــ"

"بھوک نہیں ــــــ" پھر پوچھا "رگھوبر نے کھالیا؟"

بھوانی کے منہ سے نکلا "جی۔" انھوں نے چین کا سانس لیا۔ حالانکہ اس نے یہ بات ان سے اس لیے کہی تھی کہ بڑے رائے بھی کھانا کھالیں۔ دوپہر کو رسوئی ایسی ہی اٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد پوچھا "رگھوبر ناراض تھا؟ کچھ کہا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"اچھا تو تم بھی جاؤ۔ کھانا کھا کر سو جاؤ۔"

کچھ دیر رکا رہا لیکن اس کے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ مجھ سے زیادہ دیر لیٹے نہیں رہا جا سکا۔ اٹھ کر نیچے آ گیا۔ میں نے بھوانی سے پوچھا "کیا بڑے راے اب بھی غصہ ہیں؟"

"سونے جا رہے ہیں۔"

"اور کھانا ـــــ"

"منع کر دیا۔"

"کیوں؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔ اتنا ہی کہا کہ وہ بولے 'جاؤ کھانا کھا کر سو جاؤ' وہ چلا گیا۔ میں ان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پائیدان بھر روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا وہ رگھوبر کے سرہانے بیٹھے رو رہے تھے "بیٹا معاف کرنا۔۔۔" اس کے چاروں طرف بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ شاید وہ کلب سے لوٹتے ہوئے بازار سے لیتے آئے تھے۔ انھیں کسی کے لیے اس طرح روتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔

میری ہمت نہیں پڑی کہ دخل دوں۔ حالانکہ ایک میرے والد تھے اور ایک میرا بیٹا۔

رام لیلا کمیٹی کے صدر ہمیشہ بڑے رائے ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا۔ تب رام لیلا ہمارے ہی چوک میں ہوتی تھی۔ خرچ بھی ہمارے یہاں سے دیا جاتا تھا۔ رام لیلا کرانا ایک سماجی کام زیادہ تھا بہ نسبت کام کے لوگوں کا ملنا، اس میں رمنا، اس سے سبق لینا بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا اس سے ملنے والا ثواب۔ ایک کوٹھار میں اس زمانے کے ملبوسات، پکھوائیاں، پردے وغیرہ ابھی تک پڑے تھے، جن میں سے بیشتر گل کر کھاد ہو گئے تھے۔ آزادی کے بعد بھی کافی عرصے تک رام لیلا کا خرچہ ہمارے یہاں سے جاتا رہا۔ لیکن جیسے

جیسے مہنگائی بڑھتی گئی، زمینداری گھٹتی گئی رام لیلا کا خرچہ اٹھانا مشکل ہوتا گیا اور ایک دن بڑے رائے نے سب ہی کو بلا کر واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ دیکھیے زمانہ بدل رہا ہے، آمدنی کم ہو رہی ہے، ہم لوگ رام لیلا کا خرچہ دو چار سال سے زیادہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ اگر رام لیلا کمیٹی اپنی آمدنی کا بروقت انتظام نہیں کرے گی تو آگے چل کر رام لیلا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ایک دم لوگ چندہ دینے سے بھی گریز کریں گے۔ آپ ابھی سے تھوڑا تھوڑا چندہ لینا شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چار برسوں میں رام لیلا کمیٹی کے پاس اپنی جمع پونجی بن گئی تھی۔ حتیٰ کہ جہاں رام لیلا ہوتی تھی اس ٹیلے پر لنکا، اشوک واٹیکا، کشن گندھا وغیرہ مقامات کی تعمیر کرائی گئی تھی۔ بڑے رائے نے کلکٹر صاحب سے کہہ کر رام لیلا کے لیے زمین بھی مخصوص کرا دی تھی۔ اس پر رام لیلا کمیٹی کا دخل بھی ہو گیا تھا۔ جب ہماری طرف سے رام لیلا کا خرچہ بند ہوا تو رام لیلا کمیٹی کو کسی طرح کی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ نہ مالی طور پر اور نہ جگہ کے لحاظ سے۔ کسی تنظیم کا اتنا آسان سا بندوبست شاید ہی کبھی ہوا ہو۔

بڑے رائے نے بھی اسی سال رام لیلا کمیٹی کا صدر رہنے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے کافی اصرار کیا، مختلف قسم کی کوششیں کیں لیکن ایک بار انکار تو آخر تک انکار ہی رہا۔ چھوٹے رائے سے کہا گیا تو وہ بھی رضامند نہ ہوئے۔ منجھلے رائے کو صدر بننے کا ضرور شوق تھا۔ کمیٹی والے مشکل میں پڑ گئے۔ کیونکہ رائے خاندان کم از کم ایک صدی سے رام لیلا کراتا آرہا تھا۔ ان کے ساتھ مذہبی مسئلہ یہ تھا کہ انھوں نے ایک ایسے لڑکے کو گود لے لیا تھا جس کی ذات کا پتہ تھا اور نہ ماں باپ کا۔ نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کسی کی جائز اولاد ہے یا ناجائز۔ ایسے مقدس کام کے ساتھ ایسے شخص کو وابستہ کرنا جس نے بے دھرمی کا کام کیا ہو، رام لیلا والوں کو گلے میں پھنسی ہڈی کی طرح لگ رہا تھا۔ صرف ایک ہی شخص نے منجھلے رائے کی تائید کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جس شخص نے بے سہارا بچے کو اپنا پیار دیا، چھت دی اور اپنا بیٹا بنایا، اسے دھرم کے کسی ٹھیکے دار سے سرٹیفکٹ لینے کی کیا ضرورت۔ لیکن اس کی بات کسی نے نہیں سنی اور یہ ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے رام لیلا کمیٹی تک سے استعفیٰ دے دیا۔ بڑے رائے بھی یہ ہی چاہتے تھے وہ ان کی جگہ لیں۔ وہ اس دن کی بات سے بھی ناراض تھے جب انھوں نے رنجن کے ذریعہ منجھلے رائے کو بلوایا تھا اور وہ نہیں آئے تھے۔ اگر بڑے رائے چاہتے تو اس سب کے باوجود منجھلے رائے رام لیلا کمیٹی کے صدر چن لیے

جاتے۔ کمیٹی کا اس بات پر زور تھا کہ رام لیلا کمیٹی کا صدر، رائے خاندان کا فرد بنے گا۔ ویسے چھوٹے رائے نے بڑے رائے سے کہا تھا کہ اگر وہ منجھلے رائے کا نام پیش کر دیں تو ــــ !
بڑے رائے نے بیچ میں ان کی بات کاٹ دی تھی ــــ دیکھو اتمو، میں اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔ میں نہ نام پیش کروں گا اور نہ مخالفت کروں گا۔ تم چاہو تو کمیٹی کے اراکین سے بات کر لو۔ بڑے رائے کا اشارہ واضح تھا۔ چھوٹے رائے پھر کچھ نہیں بولے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں، مجھے ہی پکڑ لیا گیا۔ اس بات سے منجھلے رائے اور بھی زیادہ خفا ہو گئے۔ انھیں لگا کہ میں اس سب میں شامل ہوں۔ میرا ایشور جانتا تھا کہ میں اس میں ذرا بھی قصوروار نہیں تھا۔ بڑے رائے کے بعد میں کئی برسوں تک رام لیلا کمیٹی کا صدر بنا رہا۔

مجھے یاد تھا کہ کشن بابو اپنے یہاں رام لیلا کراتے ہیں۔ ان کے یہاں اچھے اچھے فنکار بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی رام لیلا بول چال کی زبان میں لکھوائی ہے۔ میں نے کمیٹی کے سامنے تجویز رکھی تو لوگ برافروختہ ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ رام لیلا، رام چرت مانس کی ہی بنیاد پر ہوگی۔ وہی ایک واحد مستقل اور مقدس صحیفہ ہے۔ سنت تلسی داس اور بول چال کی بان میں لکھنے والے کسی بھانڈ کی کیا برابری۔ کشن بابو نے ایک بار اپنی رام لیلا مجھے سنائی تھی۔ اس میں لے تال، گائیکی وغیرہ اتنی باندھنے والی تھی کہ اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ تب رحمت اللہ زندہ تھا۔ کشن بابو رام لیلا کے زمانے میں رحمت اللہ کو بھی بلا لیتے تھے۔ اس کی آواز میں اتنا سوز تھا کہ ایک بار سن لو تو سنتے ہی رہ جاؤ۔ راج تلک کے دن وہ کپڑے پہن کر بھانوں کی پوشاک میں کرتال بجاتے ہوئے 'رام استوتی' (ثنا) گایا کرتا تھا ــــ رام رما، شمن، بھو تاپ، بھیا کل پاہی جنم، اس استوتی کو کشن بابو اور رحمت اللہ دونوں مل کر گاتے تھے، جو دشوار ہوتا تھا اسے کشن بابو اٹھا لیتے تے۔ اپنے زمانے میں ایک بار میں نے بھی اس 'استوتی' کے لیے کشن بابو کی جوڑی کو بلا لیا تھا۔ حالانکہ رحمت اللہ بہت ڈرا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ لوگوں کو پتہ چل گیا تو فضیحت ہو جائے گی۔ جب ذرا سی بات کے لیے انھوں نے منجھلے رائے کو کمیٹی کا صدر نہیں بننے دیا تو مجھے کیسے برداشت کریں گے۔ اس بات کو خفیہ رکھا گیا تھا۔ 'استوتی' کی ذمہ داری میں نے اپنے اوپر لے لی تھی۔

راج گدی کے دن دونوں کو ایسے سجایا گیا تھا جیسے وہ کوئی کنز یا بھیل ہوں۔ اس بھیس میں کوئی انھیں پہچان نہیں پایا۔ ہم نے یہ اعلان کرایا کہ انھیں راجستھان سے بلایا گیا ہے۔ حالانکہ تب راجستھان نہیں تھا۔ رجواڑے تھے۔ جب رحمت اللہ نے الاپ لیا اور کڑے بجائے تو لوگ جھوم اٹھے۔ میڈل اور روپیوں کی بارش ہونے لگی۔ ان دنوں چاندی کے میڈل اور روپے ہی انعام دیے جاتے تھے۔ حالانکہ مکندہ حلوائی بھی اس 'استوتی' کو بہت اچھا گاتے تھے لیکن رحمت اللہ نے انھیں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں کئی سال رام لیلا کمیٹی صدر رہا لیکن رحمت اللہ والا سماں کبھی نہیں بندھا۔

رحمت اللہ نے گایا بھی نہیں اور گانے کے لیے رہا بھی نہیں۔ جب لوگوں کو رحمت اللہ کے بارے میں پتہ چلا تو تب صدر کوئی اور تھا اور زمانہ بھی بدل گیا تھا۔ حتیٰ کہ رام لیلا میں طوائفیں بھی آنے لگی تھیں۔

ان دنوں کے کچھ واقعات ایسے ہیں جو اچانک مجھ سے متعلقہ بن گئے ہیں۔ رام لیلا کا کام کافی ہوتا تھا۔ سب سے اہم کام تھا چندہ جمع کرنا۔ جب تک بڑے رائے صدر رہتے۔ چندے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ دوسرے جس کا جی چاہے دے اور جس کا جی نہ چاہے، نہ دے۔ بڑے رائے نے چونکہ اپنے زمانے میں ہی چندہ لینا شروع کر دیا تھا اس لیے لوگ خود ہی دے جاتے تھے۔ تب دو روپے یا پانچ روپے فی گھر سے زیادہ چندہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب جمع میں ہی جاتا تھا۔ دوسرا بڑا کام سروپوں کا تھا۔ نگر یا تراؤں کا انتظام بھی کرنا پڑتا تھا حالانکہ یہ سب کام مجھے نہیں کرنے پڑتے تھے۔ لیکن میں یہ کوشش ضرور کرتا تھا کہ سب پر نظر رکھوں۔ رام لیلا کمیٹی کی میٹنگ بھی ہمارے والا یتی مہمان خانے میں ہی ہوتی تھی۔ بڑے رائے صرف دسہرہ وغیرہ میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی انتظامیہ سے متعلق کوئی مسئلہ ہوا تو ضلع انتظامیہ سے کہہ سن دیتے تھے۔

سروپ ہمیشہ برہمن خاندانوں کے لیے جاتے تھے۔ ان کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ جہاں عمر زیادہ ہوئی، سروپوں کا رول دینا بند کر دیا جاتا تھا۔ شاید اس لیے ایسا کیا جاتا ہو کہ اس کے بعد مسیں بھیگنے لگتی ہیں۔ بھگوان رام کے پیرانہ سالی سے آزاد تصور

کو نہیں لگتی تھی۔ تصویروں میں بھی بال تو ہوتے ہی ہیں لیکن داڑھی نہیں دکھائی جاتی۔ رام لیلا والوں کا ماننا تھا کہ چودہ پندرہ برس کی عمر تک معصوم بچے ہوتے ہیں اس لیے ان پر سروپ ہمیشہ خود اتر آتے ہیں۔ خیر جو بھی ہو۔ ان میں سے ایک لڑکا دو تین سال سے رام کا رول نبھا رہا تھا۔ عمر کی مقررہ حد پار کر گیا تھا۔ اسے کوئی اور رول دے دیا گیا تھا۔ گزشتہ سال والے لچھمن کو رام بنا دیا گیا تھا۔ سیتا لچھمن ہو گیا تھا۔ بھرت اور شتروگھن وہی رہے تھے۔ سیتا کا نیا انتخاب کرنا پڑا تھا۔ سیتا کے رول کے لیے تب بھی لڑکے ہی چنے جاتے تھے۔ آج بھی چنے جاتے ہیں۔ سیتا ہی کیوں تقریباً سارے ہی نسوانی کردار مرد ہی ادا کرتے ہیں چاہے منڈوری کا ہو یا کیکئی کا۔ کھاتے پیتے برہمن خاندان اپنے بچوں کو سروپ بننے سے بچاتے ہیں۔ ضرورت مند والدین کو سروپوں سے کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس سستے زمانے میں بھی رام لیلا کے دوران سروپوں کو تین چار سو روپے مل جاتے تھے۔ ملبوسات وغیرہ بھی خوب ملتے تھے۔ چڑھاوے میں بھی حصہ ملتا تھا لیکن ان پانچ بچوں کو پوری رام لیلا کے دوران ایک وقت اُپ واس کرنا پڑتا تھا۔ پھل، دودھ، دہی، مٹھائی، میوہ وغیرہ کھانے کو دیا جاتا تھا۔ بس شام کو کچوری، پوری، کھیر وغیرہ کا بھوگ لگتا تھا۔ تقسیم بھی کیا جاتا تھا۔ سروپ بھی کھاتے تھے۔ کئی بار بھوک کے مارے رونے لگتے تھے۔ انھیں بہلا کر دودھ وغیرہ پلا کر چپ کرایا جاتا تھا۔ زمین پر سونا، اپنے برتن آپ صاف کرنا، گھر نہ جانے دینا، دونوں وقت اسنان کرنا، تنہائی میں بھوگ لگانا، کافی نظم و ضبط اور پاکیزگی سے رہنا وغیرہ کئی بندشیں تھیں۔ سروپوں کا سارا انتظام سکریٹری صاحب خود دیکھتے تھے۔ کئی بار ان سروپوں کے والدین وہیں سو جاتے تھے تاکہ چھوٹے بچے گھبرائیں نہیں۔

اس سال جس بچے کو سیتا کا رول ملا تھا وہ کافی خوبصورت تھا۔ پانچ سو میں طے ہوا تھا۔ اس کی ماں بیوہ تھی۔ ماں کی یہ شرط تھی کہ وہ بھی بچے کے ساتھ ہی رہے گی۔ کھانا بھی وہیں کھائے گی۔ سکریٹری نے ساری شرطیں مان لی تھیں۔ تلسی داس نے مانس میں سیتا کو کم از کم بلوایا ہے۔ رام ہی زیادہ بولتے ہیں۔ لیکن لڑکا اتنا بھی نہیں بول پاتا۔ بھوک اس کی بھی کمزوری تھی۔ جب اسے بھوک لگتی تو شور مچانے لگتا۔ ماں بھی شروع ہو جاتی۔ کئی بار الگ لے جا کر اسے کھلا بھی دیتی۔ جو پنڈت سروپوں کی خدمت میں رہتے وہ بہت ناراض ہوتے۔ وہ عورت اپنے بیٹے کے لاڈ میں رام لیلا کی پاکیزگی برباد کر رہی ہے۔ اسے سیتا کے روپ میں

جو خدائی طاقت عطا ہونے والی ہے وہ اسے سادھنا کی کمی کے سبب حاصل نہ کرسکے گا۔ میں چپ رہتا تھا۔ وہ سب باتیں میری سمجھ میں اتنی آتی بھی نہیں تھیں لیکن بعد میں سمجھ میں آیا کہ ناظرین باقی سارے کرداروں کی غلطی پر ہنستے تھے لیکن کردار بھلے ہی مکالمہ بھول جائیں وہ چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ انھیں ان کے فلاحی روپ سے مطلب تھا، اداکاری سے نہیں۔

'دھنش بھنگ' کے دن لکشمن۔ پرشورام مکالمہ تھا۔ اسی دن سیتا کی 'پشپ واٹکا' میں رام سے پہلی ملاقات بھی تھی۔ سیتا کو نیند آرہی تھی۔ جب سیتا کو کھڑا کیا گیا، پہلے تو اس نے جماہی لی۔ ایک آدھ جملہ تو ٹھیک ہوا، پھر بھولنے لگا پر ''پنگ چل رہی تھی۔ اس نے اے اے کہنا شروع کر دیا۔ بچے ہنسنے لگے۔ ماؤں نے بچوں کو ڈانٹا، سیتا ماتا پہ ہنسو گے تو پاپ لگے گا۔ دیکھو کیا روپ آیا ہے ایسا روپ ماں کی 'کرپا' کے بغیر نہیں آتا فوراً سیتا ماتا کی جے کا نعرہ لگ گیا۔

اسی رات ایک واقعہ اور بھی ہوا۔ رام اور لکشمن کے درمیان کس کر مار پٹائی ہو گئی۔ وہ دونوں سیتا کو اپنے پاس سلانا چاہتے تھے۔ سیتا کا رول کرنے والا لڑکا ڈر کے مارے رو رہا تھا۔ اس کی ماں اس دن کسی کام سے گھر چلی گئی تھی۔ نیچے جو دو چار لوگ سو رہے تھے انھوں نے شور سنا تو اوپر پہنچے۔ انھوں نے جو حالت دیکھی تو چکرا گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور سیتا رو رہا تھا۔ بھرت اور شتروگھن بھی بچے ہی تھے وہ ایک کونے میں دبکے تھے۔ ان میں سے ایک رام کا چھوٹا بھائی تھا۔ دوسرا لکشمن کا۔ سیتا کے کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔

چونکہ حویلی نزدیک تھی چوکیدار دوڑا ہوا میرے پاس آیا۔ شاید پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہو۔ لیکن بڑے رائے کے زمانے میں بات ان تک پہنچانے کی کسی میں ہمت نہیں پڑتی تھی۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ میں بڑی رائے تو تھا نہیں، لہٰذا رات کو ہی جانا پڑا۔ مجھے دیکھ کر پانچوں نے رونا شروع کر دیا۔ غصہ تو اتنا آیا کہ رام اور لکشمن بنے لڑکوں کو دو دو چپت رسید کروں اور رام لیلا سے باہر کر دوں۔ پھر خیال آیا یہ تو سروپ ہے بھگوان کا روپ۔ خیر میں نے آدمی بھیج کر سکریٹری صاحب کو بلوایا۔ سیتا کی ماں کو بلوایا گیا۔ جب غصہ کم نہیں ہوا تو دونوں سے

اٹھک بیٹھک لگوائی۔ حالانکہ لوگوں میں اس بات کا کافی چرچا ہوا کہ میں نے سرویوں کو سزا دے کر دوسری طرح سے اصل جگوانوں کی بے عزتی کی ہے۔

رگھوبر کا دن بھر غائب رہنا، اتنی دیر سے رنجن کے ساتھ لوٹنا اور بڑے رائے کا اسے اتنا پیٹنا کئی طرح کے سوالات سبب بن رہے تھے۔ رام لیلا کے سرویوں والا وہ واقعہ بھی اس معاملے میں بے ساختہ یاد آ گیا تھا۔ حالانکہ اس واقعہ کو کتنا وقت بیت چکا تھا۔ بڑے رائے نے کہیں اسی طرح کی کوئی بات تو نہیں دیکھ لی؟ چھوٹے رائے اور بڑے رائے کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ شاید ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ ادھر ان چھوٹے رائے کے علاوہ کسی کو خط نہیں لکھتا تھا۔ مجھے تک خط لکھنا بند کر دیا تھا۔ ایڈورڈ کی مہربانی سے اس کی پیسے کی ضرورت ختم ہو گئی تھی۔ ایڈورڈ صاحب البتہ بڑے رائے کو خط لکھتے رہتے تھے۔ بڑے رائے بھی ان ہی کے ذریعہ ان کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ پھر بھی بیچ بیچ میں روپے بھیجے بغیر دل نہیں مانتا تھا۔ چوتھے پانچویں مہینے کچھ نہ کچھ بھیج ہی دیتے تھے۔ روپوں کی وصولیابی کے بارے میں ان بھی کبھی رسمی خط لکھ دیتا تھا اور کبھی گول کر جاتا تھا۔

چھوٹے رائے بھی بڑے رائے کی اس بے رخی سے اندر ہی اندر مغموم تھے۔ ایک دن انھوں نے خود جا کر بڑے رائے سے بات کی ''آخر میں نے ایسی کون سی خطا کی ہے جو آپ کا رخ میری طرف سے بدل گیا ہے؟''

بڑے رائے صرف اتنا ہی بولے ''مجھے لگتا ہے مجھ میں کہیں کوئی بہت بڑی کمی ہے۔ میں نے اپنی اسی کمی کے سبب کرشن کو کھو دیا، لگتا ہے اب دھیرے دھیرے تمھیں بھی کھوتا جا رہا ہوں لیکن جہاں میں ان کے دور ہونے سے دکھی ہوں وہیں اس بات سے خوش ہوں کہ اس نے میری جگہ پر تمھیں مکمل طور پر قبول کر لیا ہے۔ تم ایک ہونہار بیٹے کے باپ ہو۔

اس کے برتاؤ سے مجھے بیچ سے ہٹ جانے میں بہت مدد ملی ہے ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا ـــــ میں اس سے بندھا بھی بیٹھا رہ سکتا تھا۔'' چھوٹے رائے رو پڑے ''باپ تو وہی ہوتا ہے جو جنم دیتا ہے ـــــ یعنی بچے کی پیدائش میں حصے داری کرتا ہے ـــــ''

''نہیں، وہ بھی باپ ہے جو بچے کے دل و دماغ میں باپ ہونے کے احساس کو ایک یقین سے بدل دیتا ہے ـــــ حقیقی باپ شاید وہی ہے۔''

بڑے رائے اٹھ گئے۔ بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ ایسی حالت میں چھوٹے رائے سے بھی میری یہ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بڑے رائے سے پوچھیں کہ کیا اس دن انھوں نے رگھوبر کو رنجن کے ساتھ ایسی ویسی حالت میں دیکھ لیا تھا۔

میں اس دن کے واقعہ کو رام لیلا والے واقعہ سے الگ نہیں کر سکا تھا۔ وہ واقعہ ایک بار پھر میرے دل و دماغ پر چھا گیا تھ۔ مجھے اپنا اور کشن بابو کا زمانہ بھی یاد تھا۔ میں رگھوبر کو اپنے تجربے سے مستفید کرنا چاہتا تھا یا نہیں یہ کہنا تو دشوار ہے لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ میرے اندر ایک شک بار بار سر اٹھاتا تھا۔ میں اس کی سرکوبی نہیں کر پاتا تھا۔ ایک دن میں نے خود ہی اس سے پوچھا ـــــ ''رنجن کے ساتھ کیوں گھومتے ہو؟''

وہ بولا ''رنجن چاچا مجھے اچھے لگتے ہیں ـــــ گھر سے باہر وہ ہی میرے مددگار ہیں۔''

''تمھیں معلوم ہیں کہ وہ کون ہیں؟'' میں نے ذلالت پر اترتے ہوئے کہا مجھے بیٹے کے کردار کی فکر اتنا پریشان کر رہی تھی کہ میں نیک و بد کی تمیز کھو بیٹھا تھا۔

اس نے گرمجوشی سے کہا ''منجھلے بابا کے بیٹے!''

''نہیں، وہ چاچا نہیں ہیں۔''

میں نے سوچا کہ رگھوبر مجھ سے پوچھے گا تو میں حقیقت بتا دوں گا۔ ہو سکتا ہے اس کا من بدل جائے۔ لیکن اس نے کچھ بھی پوچھنے کے بجائے اتنا ہی کہا ''چاچا ہی ہیں ـــــ سب یہ ہی کہتے ہیں۔'' اور چلا گیا۔ میں تب بھی یہ سمجھ سکا کہ وہ جس یقین سے جواب دے رہا تھا اس میں شک کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ہو سکتا ہے میرا ماضی بیچ میں کہیں پھانس کی طرح کھٹک رہا ہو۔

گھر بالکل بدل گیا تھا۔ مشرق کی جانب نہ ہو کر رو بہ مغرب ہو گیا تھا۔ وہ وقار ختم ہوتا جا رہا تھا جو کچھ دن پہلے تک تھا۔ حتیٰ کہ دو گھوڑے یکے بعد دیگرے مر گئے تھے۔ صرف دو گھوڑے

بچے تھے۔ ان میں سے ایک کافی بوڑھا ہو گیا تھا۔ بگھی میں تو وہ چل لیتا تھا، گھوڑ سواری میں ہانپ سا جاتا تھا۔ اس کے گھٹنوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بچھڑے کا صرف سواری ہی پہ لگتا تھا۔ ادھر یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ رانی کے سسر نے جارج کو کسی سواری کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ جب سے اس بات کا پتہ چلا تھا بڑے رائے بے چین تو تھے ہی اور پھر بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ انھوں نے کالے کو رانی کے گھر بھیجا کہ وہ پتہ لگا کر آئے کہ گھوڑا کسے بیچا گیا ہے۔ جسے بیچا گیا ہے اسے منہ مانگے دام دے کر خرید لیں حالانکہ منہ مانگی قیمت دینے کی بات بھی اپنے میں ایک خواب سا ہی لگتی تھی۔

جب کالا رانی کے گھر پہنچا تو رانی اسے دیکھ دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنے آپ ہی بولی ——— ”میں نے بہت کہا جارج کو مت بیچو ——— اسے بڑے رائے کے پاس بھیج دو ——— جو دام کہو گے میں ان سے لا کر دے دوں گی ——— یہ تو ان کے سامنے بول ہی نہیں پاتے! بس سویرے کپڑے پہن کر نکل جاتے ہیں ——— میں نے سسر جی سے بھی منہ کھول کر کہا۔ وہ بولے ”تم شادی کر کے اتنے سال بعد بھی اپنے پیہر میں ہی بولی ہو ——— یہاں کب آؤ گی؟ تمھارے باپ نے اس گھوڑے کے بارے میں میرے بیٹے اور اپنے داماد کی ذرا سی بات ٹھکرا دی تھی ——— وہ تو میں برات واپس لے کر آنے کی بات نہ کہتا تو تمھارے باپ میرے بیٹے کی بات پر دھیان بھی نہ دیتے، میرے لیے اس آدمی کی بات میں کوئی وقعت نہیں۔ جہاں تک دام دینے کا سوال ہے ——— اپنے باپ سے کہلا دو کہ کبھی اپنی زمینداری رہن رکھنے کی ضرورت پڑے تو یہاں چلے آئیں۔“ اس نے لمبی سانس لے کر کہا ”میں کچھ نہیں کر سکی ——— جارج میرے دیکھتے دیکھتے چلا گیا۔ میں کھڑکی سے بے بس جھانکتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ”یہ میرا تیسرا بیٹا ہو گیا تھا ——— راجو، موجو کی طرح۔“

کالے نے پتہ لگانے کی بہت کوشش کی لیکن پتہ نہیں چلا کہ اسے کون خرید کر لے گیا۔ رانی کی سسرال کے قصبے کے سب ہی لوگ جارج کو پہچانتے تھے، اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ جب وہ سواری میں گردن ٹیڑھی کر کے چلتا تھا تو لگتا تھا کسی رجواڑے کی سواری ہے۔ جب کالے خالی ہاتھ گھر لوٹا تو بڑے رائے کے منہ سے دیر تک کوئی بول نہیں پھوٹا۔ وہ کافی دیر بعد بولے ”کالے مجھے لگتا ہے کہ میرا جارج کسی میں پھنسا ہے۔ اس کی

بد دعا کے سبب ہمارے دو گھوڑے یکے بعد دیگرے چلے گئے۔ اب اس تھان کے خالی ہونے کا وقت آ گیا۔"

چھوٹے رائے نے ایک کار خریدنے کا مشورہ دیا تو بڑے رائے بولے "ضرور خریدو۔ لیکن میں تو جانوروں کے درمیان رہا ہوں ــــ میں کل پرزوں کے ساتھ زندگی شروع کرنا نہیں چاہتا ــــ ان ہی ہمسفروں کے ساتھ زندگی کاٹ دینا چاہتا ہوں۔"

جب کئی طرف سے گاڑی خریدنے کی بات کہی گئی تو وہ بولے "موٹر پر تو میری لاش ہر دوار لے جانا۔ زندگی میں تو میرا باقی وقت ان ہی گھوڑوں کیساتھ کٹے گا۔ ورنہ جو بھگوان کی مرضی!"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑوں سے ان کی رغبت اور بڑھ گئی۔ شاید انسان بھی ان کے لیے اتنے ضروری نہیں رہے تھے۔ ساری توجہ ان دو گھوڑوں پر مبذول رہتی تھی۔ ان میں سے کسی کی بھی ذرا سی طبیعت خراب ہوئی نہیں کہ وہ اسے حویلی پر ہی بلوا لیتے اور رات رات بھر نیچے رہتے تھے۔ خود علاج کرتے تھے۔ سویرے نہانے سے پہلے دو گھنٹے گھوڑوں کو دیکھتے تھے۔ کسی کو خریدنا ہو تو بال بھوری کا خیال کرنا ــــ ماچین، آنسو ڈھال، پنج کلیان، پتہ نہیں کیا کیا عیب، خوبیاں دیکھتے تھے۔ اگر انھیں یہ پتہ چل جاتا تھا کہ کوئی اچھی نسل کا گھوڑا اتنا بیمار ہے کہ اسے لایا نہیں جا سکتا تو خود ہی اسے دیکھنے چلے جاتے تھے۔ اب یہ ہی ان کا شغل رہ گیا تھا۔

رگھوبر نے انجانے میں ہی ان سے ایک سوال پوچھ لیا تھا "بابا آپ کے پاس گھوڑے ہی کیوں آتے ہیں، آدمی کیوں نہیں آتے۔" بڑے رائے کا چہرہ ایک پل کے لیے سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن فوراً ہی ہنس کر بولے "چونکہ میں خود آدمی نہیں رہا۔"

سارنگا کا بیٹا گرمیوں میں پیدا ہوا تھا۔ باقاعدہ خس کی ٹٹیاں لگادی گئی تھیں تاکہ زچہ اور بچہ کو گرمی نہ لگے۔ سونا نانی کے گھر ہوئی تھی۔ پدم ماما وکالت کرتے تھے۔ نانا ریٹائر ہو گئے تھے۔ ہم

لوگوں کے اور ان کے سنسکاروں میں فرق تھا۔ ان کے گھر میں 'پتھر' و یعنی 'انڈی پیوز' سن سب کچھ کھایا جاتا تھا۔ ہمارا خاندان 'نیچ' ماننے والا تھا۔ اس لیے بچوں کو وہاں بھیجنے میں سب کو جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ہم لوگ بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ رگھوبر تو تقریباً جاتا ہی نہیں تھا۔ تب ہی جاتا تھا جب میں ساتھ میں ہوتا تھا۔ اسے ان کے گھر میں بدبو سی آتی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے بچے کانونٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ اپنے ماں باپ کو ڈیڈی ممی کہتے تھے۔ یہ بات بھی بالکل پسند نہیں تھی۔

خیر گرودر کی پیدائش کی اچھی خاصی خوشی منائی گئی۔ بڑے راجے کے من میں یہ بات بار بار آتی تھی کہ سب بھائیوں میں ان ہی کی نسل چل رہی ہے۔ ہم نے ایک بیٹا راگھو کو دے دیا۔ بھگوان نے ہمیں دوسرا بیٹا دے کر ہماری کمی پوری کر دی۔ رگھوبر بھی بہت خوش تھا۔ اس کی خوشی بڑے راجے کی خوشی سے الگ تھی۔ جب وہ سویرے اٹھا تو پتہ چلا کہ رات میں نئی ماں بچہ ہوا ہے۔ بچہ ہوتے ہی سوتک لگ گیا تھا۔ پردہ ڈال کر کمرے کی تقسیم کر دی گئی تھی۔ وہ آدھا کمرہ جس میں ماں اور بچے تھے 'خاص دھارا' سے بالکل الگ تھا۔ دائی کو چھوڑ کر جو بھی اندر جاتا تھا اسے نہانا پڑتا تھا جب تک نہا نہیں لیتا تھا اس وقت تک وہ کسی چیز کو چھو نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ ہسپتالوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔

جب رگھوبر ہوا تو کلا کی حالت کافی خراب تھی۔ ڈاکٹر بار بار آ جا رہی تھی۔ ہم لوگوں میں سے ہر ایک کو آنا جانا پڑتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا بھی تھا کہ کیا آپ ہر بار نہاتی ہیں؟ وہ ہنس کر بولی تھی "ارے ماں اور بچہ تو خدا کا فضل و کرم ہیں —— ہماری ڈاکٹری میں تو جب جب بچے کے پاس جاؤ تب نہا دھو کر صفائی کے ساتھ جاؤ۔ باہر زیادہ چھوت ہوتی ہے۔"

مجھے اسی کی بات یاد آ رہی تھی۔

چھوٹی چاچی تو مر ہی چکی تھیں۔ منجھلی چاچی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی ٹہلتی ٹہلاتی آ جاتی تھیں تو آ جاتی تھیں اسی لیے رانی کو بلوانا پڑا تھا۔ اس کے من میں بھی جارج کے بیچ جانے کے سبب ابھی تک افسوس اور شرمساری تھی۔ اس بات کا وہ بھولے سے بھی ذکر نہیں کرتی

تھی۔ رانی کے بچے بھی ساتھ ہی آئے تھے۔ قصبے میں رہنے کی وجہ سے دونوں میں گنوار پن زیادہ تھا۔ بالکل اجڈ، ہر وقت لڑنا، گالی دینا، مارنا پیٹنا۔ ان کے طرز عمل کی وجہ سے رانی کو شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ حالانکہ رانی بیچ بیچ میں تیج تیوہار پر آتی رہتی تھی۔ تب بچے چھوٹے تھے اس لیے تب اتنی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس بار بچوں کے برتاؤ نے اسے اپنی نظروں میں نیچا کر دیا تھا۔ وہ یا تو ماما سے ڈرتے تھے یا بڑے ماما سے۔ چھوٹے رائے سے وہ زیادہ خوش رہتے تھے۔ بڑے رائے میں ایک بات اور دیکھنے میں ملی تھی۔ وہ ان دونوں بچوں کے مقابلے رگھوبر کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے تھے۔ وہ طرف داری بھی رگھوبر کی ہی کرتے تھے۔ رانی کو یہ بات دل ہی دل میں بری لگتی تھی۔

بچے یعنی گرور کی تب تک شدھی نہیں ہوئی تھی۔ رگھوبر حالانکہ اچھا خاصا بڑا تھا۔ لیکن ایک دن اسے نہ جانے کیا جھک سوار ہوئی کہ وہ 'سوتک' میں اندر جانے کی ضد کرنے لگا۔ وہ بچے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ پنڈتائن نے ترکیب نکالی کہ وہ کپڑے اتار کر اندر جائے اور پھر آکر فوراً نہائے۔ کسی طرح اس بات پر فیصلہ ہوا کہ وہ تولیہ باندھ کر اندر جائے گا اور تولیہ جمعدار کو دے دیا جائے گا۔ وہ اندر گیا۔ بچے کو گود میں لٹا کر بیٹھا رہا۔ ان دنوں زچہ خانے میں صرف تیل کا دیا جلتا تھا۔ مانا جاتا تھا کہ تیز روشنی سے زچہ و بچہ کی آنکھوں پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اس روشنی میں اسے اس کی شکل صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ رانی بوا باہر کھڑی ہنس رہی تھیں "ارے اتنا بڑا ہو گیا اور چھوٹے بچوں کی طرح ضد کر کے اندر گیا ہے۔"

جب وہ اٹھنے لگا تو اس کا تولیہ اس کی اپنی ہتھیلی کے نیچے دب کر کھل گیا۔ اس نے سنبھالنا چاہا لیکن ممکن نہ ہو سکا۔ وہ ننگے پن کا مطلب تو سمجھتا ہی تھا اس طرح اچانک اس طرح تولیہ کھل جانے کے واقعہ نے اسے سن کر دیا۔ سارنگا ہنس پڑی اور جانے انجانے یہ جملہ منہ سے نکل گیا "ارے تو تو اپنے پتا جتنا ہو گیا۔"

اسے لگا کہ زمین کھو کھلی ہو گئی اور وہ اس میں کسی سلنڈر یا پائپ کی طرح اترتا جا رہا ہے۔ اس کیفیت سے نجات حاصل کرنے میں اسے کچھ وقت لگا۔ اس نے اپنے اوپر نظر ڈالی۔ نئی ماں کی طرف دیکھا۔ تولیہ اٹھایا، لپیٹا اور بھاگتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ گھستے ہی زور سے دروازہ بند کر لیا۔ نئی ماں کی ہنسی اور ان کے وہ الفاظ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں جا پہنچے تھے۔

اس واقعہ کے بعد وہ کئی دنوں تک حویلی میں نہیں گیا۔ حالانکہ وہ راجو سے عمر میں بڑا تھا لیکن والے طرح طرح سے چڑھاتے تھے۔ ایک بار کیا تھی بھی ہوئی اور بیکا بیکی تھی۔ دماغ میں ایک ہی سوال گھومتا رہتا تھا ماں نے ایسا کیوں کیا؟

زمانے میں زبردست تبدیلی آرہی تھی۔ جو ہیروں کی طرح چمکتے تھے وہ بے آب لگنے لگے تھے، ناچیز ہوتے جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں ایک دوسری تبدیلی بھی تھی۔ مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان دوری بڑھ رہی تھی۔ گاندھی اکیلے شخص تھے جو فرقہ واریت کے خلاف چٹان بن کر کھڑے ہوئے تھے۔ گیتش شنکر ودیارتھی کا بلیدان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ گاندھی جناح کو پہلے یہ تجویز پیش کر چکے تھے ملک بانٹو، چاہے سرکار بناؤ۔ کانگریس تھوڑا سا تھ دے گی اس تجویز پر کانگریس گونگی ہو گئی تھی۔ بس ایک رٹ تھی کہ اگر ایسا ہوا تو ملک میں خون خرابہ ہو جائے گا۔ گاندھی کے خاص اخاص بھی گاندھی جی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی بھی عمر بڑھ رہی تھی۔ انہیں بھی فکر تھی کہ کہیں حکومت میں بیٹھے بغیر ہی نہ چلے جائیں۔ گاندھی جی کیا کریں؟ وہ تقسیم ٹالنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ملک تقسیم نہیں ہوا تو راستہ نکل آئے گا۔ لیکن راستہ نکالنے کی خواہش کس میں تھی؟ گاندھی جی اکیلے پڑ گئے تھے۔ سب جلدی میں تھے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ پہلے نیک نیت ہو۔ آزادی تو آ ہی جائے گی۔ ان کے لیے گاندھی جی کا استعمال اتنا ہی تھا کہ آزادی مل جائے اور وہ اقتدار میں آجائیں۔ گاندھی جی مریں یا جئیں۔ ملک کٹے یا بچے۔

میں تو سیاست میں نہیں تھا لیکن جو دیکھتا سنتا تھا اس سے سب اندازہ لگتا تھا لیکن اب جب گنگا میں اتنا پانی بہہ چکا اور میں بھی اپنے سفر کے آخری دور میں ہوں مجھے لگتا ہے اگر اس وقت تھوڑا خون خرابہ اور ہو گیا ہوتا تو ملک کی تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو ملک کی تقسیم ہو جانے کے بعد اب نفرت کا جو یہ پرنالہ گر رہا ہے وہ نہ گرتا۔ ملک بھی تقسیم ہو گیا اور نفرت کی سیاہی اور زیادہ گاڑھی ہو گئی۔ اس وقت گاندھی جی تو ایک پاگل بڈھے تھے یا مسیحا۔ زمینداروں کا طبقہ ان کو سنکی اور غیر عملی آدمی ہی سمجھتا تھا۔ ہندوستان بھلے ہی ایک سیکولر قوم رہا ہو لوگوں کو تب بھی لگتا تھا اور شاید اب بھی لگتا ہے کہ وہ ہندو راشٹر ہیں۔ یہ ہی اس

ملک کی بدقسمتی ہے کہ اسے وہی کہا گیا جو وہ کبھی نہیں رہا۔ ویسے ایک سوال یہ بھی ہے کہ اگر ہندو راشٹر نہیں تھا تو جواہر لال اور پٹیل نے گاندھی جی بات کیوں نہیں مانی! حکومت کی باگ دور جناح کو کیوں نہیں سنبھالنے دی؟ کئی طرح کے سوالات ہیں جو لوگوں کے ذہن میں بیدار ہوتے ہیں۔ چند ہی برس پہلے جب جواہر لال چین کے دورے پر گئے تھے تو رفیع احمد قدوائی نے کہا تھا کہ میں جواہر لال کی جگہ اس طرح لے سکتا ہوں کہ لوگ جواہر لال کو بھول جائیں گے۔ ادھر کہا اودھر قدوائی صاحب انتقال فرماگئے۔ اندرا گاندھی بھلے ہی جواہر لال کی بیٹی ہوں لیکن فیروز سے شادی کے بعد پارسی تو مانی ہی جانے لگی تھیں اور پھر بھی وزیراعظم تھیں۔

خیر، جب بٹوارے کا طے ہوا تو ملک میں تشدد کی آندھی چلی۔ ہمارے شہر میں کئی مسلمان خاندان تھے۔ ان میں سے کئی ایک ہماری حویلی کے ارد گرد رہتے تھے۔ پہلے زمانے میں جیسے دارالسلطنت ندی کے کنارے بسائے جاتے تھے۔ اسی طرح لوگ کسی حویلی یا گڑھی کے آس پاس بسنا پسند کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ پاکستان جانے کی تیاری میں لگ گئے تھے۔ اس کے پس پشت ان کا یہی خیال تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ ان کا ملک ہوگا تو پاکستان۔ ویسے بھی پاکستان بننے کے بعد ہندو غصہ کریں گے۔

حسن میاں شہر کے کافی اچھے وکیل تھے۔ ہماری زمینداری کے بیشتر مقدمے ان کے پاس ہی جاتے تھے۔ ان کا پورا نام تھا علی حسنین۔ سید تھے۔ مسلمانوں میں سید ہندوؤں میں برہمن ایک طرح کے مانے جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اور پابند مذہب۔ ان کے دو بھانجے تھے اختر اور شوکت۔ وہ دونوں ارن کے جگری دوست تھے۔ اختر خاص الخاص تھا، شام کو ارن اور اختر ساتھ ساتھ کھیلتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ گھر لوٹتے تھے۔ ان دونوں لڑکوں کے والدین شاید بچپن میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ ماموں نے پالا تھا۔ پڑھنے میں دونوں بہت ذہین۔ اختر تو بعد میں آئی اے ایس ہوا، شوکت جج۔ اختر کی شادی نواب رامپور کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اختر کا انتقال دو سال پہلے ہی دل کے دورے سے ہوا۔ دراصل بیگم بڑے خاندان کی تھیں۔ اختر نیچے سے اوپر اٹھے تھے۔ کچھ ایسی ہی وجوہات پیدا ہوگئی تھیں۔ اختر نے بہت زیادہ پینا اور باہر رہنا شروع کردیا تھا۔ شوکت تو اب لندن میں جاکر بس گئے۔ ان کے دونوں بچے ان ہی کے ساتھ ہیں۔ جانے سے پہلے ایک بار ملے تو میں نے پوچھا

"جب آپ کو جانا چاہیے تھا تب تو آپ نہیں قیام پذیر رہے اور جب رہنا چاہیے تو جا رہے ہیں۔" بولے بھائی جان۔ "پاکستان اب بھی نہیں جا رہا ہوں" اور ہنس دیے۔

علی حسنین کا جب پاکستان جانا طے ہو گیا تو ایک روز حویلی پر آئے۔ بڑے راجے کو ان کے جانے کا بہت افسوس تھا۔ انھوں نے حسن میاں سے پوچھا "آپ اپنے ملک کو چھوڑ کر پاکستان کیوں جا رہے ہیں ـــــ وہاں آپ کا کون بیٹھا ہے؟ ہم سے کوئی خطا سرزد ہوئی یا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک مذہب کو ماننے والے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں، دوست احباب کچھ نہیں ہوتے؟ یہاں اتنے ہندو ہیں کیا سب میرے آپ سے زیادہ اپنے ہیں؟"

یہ سوال ان کے لیے کچھ مشکل ثابت ہوا۔ پھر بھی وہ بولے "جب ہم نے اپنے لیے ایک الگ ملک تقسیم کر لیا تب ہمارا کیا منہ رہ گیا کہ ہم اس ملک پر بھی اپنا عمل دخل رکھیں ـــــ کیا یہ ایمانداری سے باہر نہ ہوگا؟ کل تک ہندوستان ہمیں اکلوتا ملک لگتا تھا ـــــ اب دو ملکوں کو اپنا ملک کیسے کہیں؟ ضمیر کی طرح انسان کا ملک بھی ایک ہی ہوتا ہے۔"

بڑے راجے ہنس دیے "حسن بھائی، جنھوں نے بانٹا وہ جانیں۔ آپ اور ہم ایک دوسرے سے کیوں الگ ہوں۔ آپ کی جڑیں تو یہاں ہیں۔ پودے کو تو آپ ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں، درخت کو اکھاڑ کر کیسے لے جائیں گے؟ کیا نئی زمین اسے اپنائے گی؟ کیا وہ درخت اس آب و ہوا میں سرسبز و شاداب رہ سکے گا؟ میرے خیال میں ابھی کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا؟"

علی حسنین نے سنجیدگی سے کہا "آپ جانتے ہیں کہ میں تقسیم ملک کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتا رہا۔ لیکن ملک تقسیم ہو گیا ـــــ میری غیرت اب یہ گوارہ نہیں کرتی کہ میں یہاں رہوں۔"

"میں آپ کی اس رائے سے متفق نہیں۔ یہ ملک ہم سب لوگوں کا ہے۔ ہم اسی ملک کی سرزمین پر پلے بڑھے ہیں۔ چڑیاں جب شام کو بسیرے کے لیے لوٹتی ہیں تو ہمارے گھر پر سے اڑتے ہوئے ہمارے نام لے کر پکارتی ہیں ـــــ کہو ٹھیک ہو! سیٹی بجا کر بتاتی ہیں اب ہم جا رہے ہیں ـــــ شب بخیر۔ خدا حافظ۔ کل ملیں گے۔ گاندھی جی نے ایک ہی بات عقلمندی کی کی اور کہی "ملک بھلے ہی بٹ گیا پر ہندوستان سب کا ہے۔ جو چلے گئے ہیں میں ان

کو بھی واپس لے آؤں گا۔" علی حسنین نے رندھی آواز میں کہا "رائے صاحب سب ہی گاندھی جی نہیں ہیں" پھر بولے "میں ایک خاص وجہ سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ کی مدد چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے، اب تو آپ جارہے ہیں ـــــ میں کب آپ کے کسی کام آسکوں گا اور پھر آپ کب کسی کام کے لیے یاد کریں گے! میں آپ کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"میرے دو بھانجے ہیں اختر اور شوکت۔ میں اور میری اہلیہ سمجھا سمجھا کر ہار گئیں لیکن وہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں ہمارا کون ہو گا اور یہاں سب اپنے ہیں۔ میں ان پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ ان بے ماں باپ کے بچوں کو کہاں چھوڑ کر جاؤں؟ بس، آپ کا ہی سہارا نظر آتا ہے۔"

بڑے رائے چپ ہو گئے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ علی حسنین انھیں بغور دیکھتے رہے، پھر بولے "رہنے دیجیے، آپ پریشان نہ ہوں"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ اختر اور شوکت کو اپنے پاس رکھ کر مجھے خوشی ہو گی لیکن میری مالی حالات اب ایسی نہیں رہی کہ میں صحیح تعلیم دلوا سکوں۔ ارن کو بھی ولایت میں گزارے کے لیے کام کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ دونوں ہونہار بچے ہیں۔ میں ان کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ نہیں کرنا چاہتا، میرا اشش و پنج بس اتنا ہی ہے۔"

علی حسنین بولے "میری بہن ان دونوں بچوں کی پڑھائی لکھائی کے لیے پچاس ہزار روپیہ وقف کر گئی تھیں۔ چونکہ شریعت میں سود حرام مانا گیا ہے۔ اس لیے روپیہ میرے ہی پاس جمع ہے۔ کچھ زیورات بھی ہیں۔ اب تو میں شاید ہی کبھی اپنے بھانجوں کے کام آسکوں ـــــ اس لیے میں اپنے پاس سے بھی پچاس ہزار ملا دوں گا۔ کل ایک لاکھ روپیہ ہو جائے گا۔ ویسے زمانہ بدل رہا ہے ـــــ اسلامی ملکوں میں بھی بینک کھلے ہیں ـــــ آپ چاہیں تو وہ روپیہ بینک میں جمع کر دیں ـــــ اس کا جو سود آئے گا وہ گزارے کے لیے کافی ہو گا۔ میں انھیں علی گڑھ یونیورسٹی کے بورڈنگ میں داخل کروا دوں گا۔ بس یہ ہی چاہتا ہوں کہ ان کا راستہ اور اعمال درست رہیں۔ بس روزِ قیامت، بہن اور بہنوئی کے سامنے مجھے گردن نیچی نہ کرنی پڑے۔ جب تک یہ خود مختار نہ ہوں ـــــ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر نہ کھڑے

ہوں تب تک روپیہ اور زیور آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔"

بڑے رائے نے بہت شائستگی سے کہا "آپ جانتے ہیں کہ میں ہندو ہوں۔۔۔ دوسرے میری مالی حالت بھی کمزور ہے۔ نیت میں فرق آجانے کی پوری گنجائش ہے۔"

علی حسنین ہنس کر بولے "کچھ لوگ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان ۔۔۔ مالی حالت کمزور ہونے سے ضمیر کمزور نہیں ہوتا اور اگر بھاسکر بابو اور ان رائے کی حق تلفی ہوگی تو ان دونوں کی بھی ہو جائے گی ۔۔۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

ان دونوں کے رہنے کا انتظام حویلی کے پاس ایک چوبارے میں کر دیا گیا تھا۔ اوپر کے حصے میں ایک کمرہ، ایک باورچی خانہ اور برآمدہ تھا۔ نیچے بڑا ہال جو بند رہتا تھا۔ حسنین میاں کے سامنے ہی ان کا پیسہ امپیریل بینک میں جمع کرا دیا گیا تھا۔ پیسہ نکالنے کے لیے بڑے رائے کے دستخط ضروری تھے۔ جہاں تک زیور کا سوال ہے وہ علی حسنین کو ہی واپس کر دیا گیا تھا۔ ان دنوں سونے کا بھاؤ شاید پچیس یا تیس روپے تھا۔ بڑے رائے نے انھیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ جب اختر اور شوکت کی شادی ہوگی تو وہ ضرور تشریف لائیں گے۔ شادی ان کی سرپرستی میں ہوگی۔ اسی وقت زیور بھی بہوؤں کو چڑھا دیں۔

جب وہ دونوں علی گڑھ سے آتے تھے تو اسی چوبارے پر ٹھہرتے تھے۔ ماحول کو دیکھتے ہوئے بڑے رائے کے ذہن میں ان کے تحفظ کے بارے میں برابر تناؤ بنا رہتا تھا۔ نفرت کے اس سیلاب میں وہ یہ ہی مانتے رہتے تھے کہ ان کی آن برقرار رہے۔ یہ دونوں بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور اپنی امانت کی خود دیکھ بھال کریں۔ جن دنوں وہ شہر میں رہتے تھے، چوبارے پر کوئی نہ کوئی چکر لگاتا رہتا تھا۔ ان کے لیے بھی صبح شام حویلی کا چکر لگانا ضروری تھا۔ بڑے رائے پڑھائی کے بارے میں کافی سختی سے پوچھ کرتے تھے۔

شروع میں تو یہ ہی طے ہوا تھا کہ جب وہ شہر میں رہیں گے تو دونوں وقت حویلی پر ہی کھانا کھائیں گے۔ کچھ دن تو یہ سلسلہ جاری رہا، بعد میں بند ہو گیا۔ ان کے برتن الگ تھے۔ کھانے کے وقت آدمی بھیج کر دونوں کو بلوایا جاتا تھا تاکہ انھیں یہ احساس نہ ہو کہ ان کا خیال نہیں۔ دونوں بھائیوں کا کھانا قاعدے سے ان کے برتنوں میں لگ کر آتا تھا۔ وہ کھانا کھا کر

برتن کنویں کے پاس رکھ دیتے تھے۔ ان میں آگ ڈال دی جاتی تھیں۔ بعد میں مہری مانجھ کر رکھ دیتی تھی۔ ایک دن دونوں بچوں نے بڑے رائے کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کہا "اباجی ـــــ "وہ دونوں ان کے رشتے سے بڑے بھائی اور چھوٹے رائے کو بڑے ابا اور چھوٹے ابا کہتے تھے "ہم چاہتے ہیں کہ ہم کھانے کا انتظام وہیں کرلیں۔"

بڑے رائے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "میں نے تم لوگوں کو اس لیے اپنے قریب رکھا کہ جب تم شہر میں رہو ـــــ اس بات کا اطمینان رہے کہ تمھیں کھانا ٹھیک ٹھاک مل رہا ہے یا نہیں۔ اگر ہمارے ہوتے ہوئے تمھیں کھانے کے بندوبست خود کرنا پڑا تو ہمارے ہونے کا کیا فائدہ!"

وہ چپ کھڑے رہے۔ ان کے اس طرح کھڑے رہنے سے وہ سمجھ گئے کہ ان جواب ان کا ارادہ بدلنے کے لیے ناکافی ہے۔ وہ خود ہی بولے "خیر، اگر کوئی اور وجہ ہے اور تم خود انتظام کرنا چاہتے ہو تو کر کے دیکھ لو ـــــ ویسے یہ گھر تمھارے ہمیشہ کھلا ہے ـــــ"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سلام کر کے لوٹ آئے۔

ہمارا شہر ہی ایسا تھا جہاں ابھی تک فسادات نہیں ہوئے تھے۔ علی گڑھ کا ماحول کافی بگڑا ہوا تھا۔ دونوں کو علی گڑھ سے بلا لیا گیا تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ ماحول کا اثر نہ پڑ رہا ہو۔ اندر ہی اندر ایک طرح کا تناؤ تھا۔ ان دونوں بچوں میں ایک طرح کا احساس عدم تحفظ بیدار ہو رہا تھا۔ سڑک پر چلتے تھے تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے۔ محلّہ کھالہ پار میں ایک دو واردتیں ہو چکی تھیں۔ اس کا جواب سرد ٹ گیٹ پر دیا گیا تھا۔ ان دونوں نے گھر سے نکلنا کافی کم کر دیا تھا۔ بس حویلی تک آتے تھے۔ رات میں بھی ایک سوتا تھا اور دوسرا جاگتا تھا۔ حالانکہ لوگ جانتے تھے کہ وہ چوبارہ رائے خاندان کا ہے۔ کبھی کبھی انھیں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت ان کی قربانی ہو سکتی ہے۔ اختر اس معاملے میں زیادہ باہمت تھا۔ وہ شوکت یہ ہی سمجھاتا تھا ـــــ دیکھ شوکت اگر ہم مار بھی دیے گئے تو ہمیں لگے گا کہ مرنے کا فیصلہ ہمارا اپنا ہے، ہم یہاں پلے بڑھے ہیں، اسی مٹی کے کام آجائیں گے۔ ویسے ایسا کچھ نہیں ہوگا ـــــ آخر بڑے رائے کی سرپرستی ہے۔

شوکت نے ایک بار جواب میں کہا "ان کی نظر میں بھی تو ہم مسلمان ہی ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے لیے برتن کیوں الگ رکھے جاتے۔"

اختر ایک منٹ چپ رہا۔ بولا "یہ دو نمبروں کی بات ہے ــــــ جب ماموں ہندوؤں کا کھانا کھایا کرتے تھے تو اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ انھیں ہندوستانی کھانا کھلایا جائے ــــــ برتن یا پتل الگ رہیں۔ کوئی انھیں چھوئے نہیں۔ تمھیں یاد ہے ماموں سے بڑے رائے نے کیا کہا تھا کہ ہم ہندو ہیں ــــــ ماموں بولے تھے۔ کچھ لوگ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان۔ بڑے رائے ان ہی لوگوں میں سے ہیں ــــــ باہری چیزوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لینا کئی بار غلط ہو جاتا ہے۔ ماموں اگر یہ جانتے ہوتے تو ہمیں ان کی نگرانی میں کبھی چھوڑ کر نہ جاتے۔"

"وہ تو بالکل تیار نہیں تھے ــــــ ہم لوگوں نے ہی ضد کی۔"

"اللہ نے چاہا نے تو ہمارا فیصلہ غلط ثابت نہیں ہوگا۔ ہوگا تو ــــــ انسان کو اپنے فیصلوں کا خمیازہ بھگتنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے ــــــ ماموں کہا کرتے تھے کہ فیصلے بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں ــــــ پرورش میں غلطی ہو جائے تو نتیجے بھی غلط ہو جاتے ہیں۔"

اس سب کے باوجود شوکت کا ڈر اختر کے دل میں کلبلانے لگتا تھا لیکن وہ شوکت سے بڑا تھا۔

شہر کے کئی محلوں میں چاقو کی وارداتیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ افواہیں طوفانی ہواؤں کی طرح چل رہی تھیں۔ وہ دونوں چوبارے پر اکیلے تھے۔ ڈرے ہوئے۔ بڑے رائے انھیں خود لینے گئے۔ اس وقت وہ کمرہ اندر سے بند کر کے پیچھے کی طرف باورچی خانے میں غالیچہ ڈالے بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ شوکت رہ رہ کر پوچھتا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ اختر زیادہ بول تو نہیں پا رہا تھا لیکن اس کا کندھا تھپتھپا دیتا تھا ــــــ اللہ بڑا کارساز ہے!

میں نے دروازہ پر دستک دی۔ پہلے تو انھوں نے کھولا نہیں۔ جب کھولا تو مجھے دیکھ کر چونک گئے۔ بڑے رائے باہر گاڑی میں ہی تھے۔ شوکت نے فوراً دروازہ پہلے کی طرح

بند کردیا۔ مجھے برا لگا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ دروازے پر میری موجودگی نے انھیں خوف زدہ کردیا۔ تب تک بڑے رائے اتر کر آگئے تھے۔ شوکت اختر کو بلا لایا تھا۔ اختر نے ہم دونوں کو دیکھا تو فوراً دروازہ کھول دیا۔ اس کے چہرے پر بھی یہ سوال تھا کہ کرفیو میں کیسے آنا ہوا۔ وہ ہم لوگوں کی موجودگی کے بارے میں اتنے مطمئن نہیں لگ رہے تھے جتنا ہونا چاہیے تھا یا ہمیشہ ہوتے تھے۔ میں چپ تھا۔

شوکت کے چہرے پر خوف کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔ اختر نے ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

بڑے رائے نے اختر کو پاس بلایا ''یہاں آؤ اختر بیٹے'' وہ دونوں ہی ساتھ ساتھ بڑھے۔ بڑے رائے نے ہنس کر کہا۔ ''ڈرو نہیں، سارے شہر میں کرفیو لگا ہے۔ میں تمھیں لینے آیا ہوں۔''

''نہیں، ہم یہیں ٹھیک ہیں، بڑے ابا۔''

بڑے رائے ہنس دیے ''ڈرو نہیں، تم مجھے حسن میاں ہی سمجھو۔ میں جانتا ہوں ایسے ماحول میں قریبی سے قریبی آدمی شک کے دائرے میں آجاتا ہے۔ تمھارے ماموں تمھیں میری سرپرستی میں چھوڑ گئے ہیں ــــــ وہاں بیٹھے بیٹھے بھی وہ تمھارے اور میرے درمیان کے رشتوں کے بارے میں ہی سوچ رہے ہوں گے۔''

''لیکن ــــــ''

''لیکن ویکن کچھ نہیں بیٹے، تم اگر یہ سوچ رہے ہو کہ ماموں کے ساتھ چلے گئے ہوتے تو صحیح سلامت رہتے ــــــ وہ بھی ٹھیک ہے ــــــ اگر یہاں ہو تو بھی اتنا ہی ٹھیک ہے۔'' شوکت کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ رونے لگا۔ اختر سے چمٹ گیا۔

بڑے رائے کو اس کے اس برتاؤ سے ویسا ہی جھٹکا لگا جیسے مجھے دروازہ کھول کر پھر بند کر دینے پر لگا تھا۔ کہیں اس ذرا سے فساد نے انھیں اتنا تو نہیں ڈرا دیا کہ اپنے محافظوں کو بھی قاتل سمجھ رہے ہوں۔ اتنے دنوں کی دیکھ ریکھ کا کیا یہی صلہ ملا؟ کچھ دیر وہ یہ ہی سوچتے رہے، پھر بولے ''تم ڈرو نہیں۔ جیسے یہ سارا ملک ہے جہاں سب لوگ سینکڑوں سال سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں، ویسی ہی یہ حویلی بھی ہے۔ جس طرح ملک ملک ہوتا ہے اسی طرح گھر گھر ہوتا ہے۔ جب تک میں ہوں ــــــ تمھارا ماموں ہوں۔ چلو ہمارے ساتھ۔''

وہ اندر چلے گئے۔ اختر نے شوکت کو سمجھایا "ہمت سے کام لو۔ فساد اگر ہمیں وہاں نقصان پہنچا سکتا ہے تو یہاں بھی پہنچا سکتا ہے۔ خدا کو حافظ مانو —— اس کے آگے نہ موت کر پائے گی اور نہ انسان۔ موت تو اسی کا ایک ہتھیار ہے۔ موت اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔"

وہ اپنا ضروری سامان لے کر آگئے۔ حویلی پر پہنچ کر وہ دونوں بڑے رائے کے پیچھے پیچھے ڈرے ہوئے سے چل رہے تھے۔ ہرن کی طرح چوکنے۔ ایک ہی دن میں ہم سب کی نظروں میں کانٹے نکل آئے تھے۔ ہم سب بھی انھیں عجوبے کی طرح دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار آئے ہوں۔ صرف رگھوبر نارمل تھا۔ وہ آگر بڑے رائے کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ بڑے رائے نے بھوانی کو پکارا "جاؤ ان کا سامان میرے برابر والے کمرے میں رکھ دو —— یہ لوگ اس وقت تک یہیں رہیں گے جب تک شہر میں امن چین قائم نہیں ہو جاتا۔ اس دوران انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

رگھوبر سے وہ دونوں کافی بڑے تھے۔ وہ گرمجوشی سے کود کر ان کے پاس پہنچ گیا جیسے انکا ہمجولی ہو۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بھی ہلکی سی چمک آئی۔ تب ہی ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بڑے رائے یکایک بولے "ان لوگوں کے برتن الگ نہ کیے جائیں —— جیسا رگھوبر ویسے یہ۔"

اس بات سے یکایک مخالفت پیدا ہو گئی۔ اس وقت تو سب چپ رہے لیکن بعد میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بڑے رائے پر کسی کی نہ چلی۔ لیکن نوکروں سے لے کر گھر کے نوکروں تک سب اختر اور شوکت کے خلاف ہو گئے حالانکہ ان دونوں کو دیکھ کر لگا جیسے انھیں ایک طرح کی راحت ملی ہو۔

سارنگا مجھ سے بار بار کہتی تھی کہ بڑے رائے کو بڑھاپے میں کیا ہو گیا۔ اتنے پوجا پاٹ کرنے والے ہو کر بھی دھرم۔ کرم بگاڑ رہے ہیں۔ کون پیئے گا اس گھر کا پانی۔ ایسا تو سماجی بھی نہیں کرتے۔ سارنگا چپ چاپ ایک کام کرتی تھی جب جھوٹے برتن آتے تھے تو ان میں آگ ڈلوا دیتی تھی۔ گنگا جل سے دھلواتی تھی۔ اس بات کا مجھے اور بھوانی کو ہی پتہ تھا۔ بڑے

رائے انھیں کھانا اپنے سامنے ہی کھلواتے تھے۔ جہاں کوئی کمی نظر آئی نہیں کہ انھوں نے سب کو ڈانٹا پھٹکارا نہیں۔

ان دنوں گھر میں پیسوں کی تنگی میں اضافہ ہو گیا۔ چھوٹے رائے نے سادھو مسلک اختیار کر لیا تھا۔ بڑے رائے ان سب باتوں سے کوئی مطلب نہیں رکھتے تھے۔ ان پر نظر بھلے ہی رکھتے ہوں۔ انتظام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔ ایک رات کو مجھے سوتے سوتے خیال آیا کہ ان دونوں کا اتنا روپیہ ہے کیا فی الحال ہمارے کام نہیں آسکتا؟ میں اس چکر میں ان کے کمرے کی طرف چل دیا۔ ان کے کمرے کا ایک دروازہ پیچھے کی طرف کھلتا تھا۔ میں ادھر سے ہی گیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ شوکت سو رہا تھا اور اختر جاگ کر ایک طرح سے پہرے پر تھا۔

اس نے دھیرے سے دوسرے کو جگایا اور بولا! "لگتا ہے پیچھے کوئی ہے" وہ دونوں لیٹے لگے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ شاید میں انھیں ڈرانا چاہتا رہا ہوں لیکن سب کچھ بڑے رائے کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے دونوں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بعد میں مجھے اپنے آپ پر تعجب ہوا۔ میں اتنی رات گئے وہاں کیوں گیا؟ کیا اسے مارنا چاہتا تھا؟ مجھے لگا نہیں۔ صرف ڈرانا چاہتا رہا ہوں گا۔ دوسروں کو ڈرانا اور دباؤ میں رکھنا شاید انسان کی خصلت ہوتی ہے۔ لیکن کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ خود اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ میرا ڈرانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

مجھ سے جب اپنا یہ کارنامہ برداشت نہیں ہوا تو میں نے اگلے دن صبح ان سے پوچھا، "اختر، تم حویلی میں بھی اتنا ڈرتے ہو؟" وہ سٹپٹا گیا "نہیں بڑے بھیا" وہ دونوں مجھے بڑے بھیا کہتے تھے "میں رات تمھیں دیکھنے گیا تھا کہ تم ٹھیک ہو ــــ شوکت سویا ہوا تھا اور تم جاگ رہے تھے۔ تم نے یہ کہہ کر اسے بھی جگا دیا کہ پیچھے کوئی ہے۔ میں چپ چاپ لوٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے دیکھ کر کہیں اس دن کی طرح تمھارے دل میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ نہ جائے۔"

وہ دونوں کچھ شرمندہ سے ہوئے۔ اختر نے یہ بات ضرور کہی "بڑے بھیا، پتہ نہیں کیوں کبھی کبھی اپنے سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ شاید یہ ہماری اپنی بے اطمینانی ہے یا آپ کی اور ہماری تعداد کا فرق" قصوروار میں ہی تھا۔

کچھ دن بعد فسادات کم ہو گئے۔ شہر میں امن قائم ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی چاقوزنی کی کوئی واردات ہو جاتی تھی لیکن اس سے کوئی مرا نہیں تھا۔ ان دونوں نے بھی اپنے چوبارے پر جانا شروع کر دیا۔ رات میں سوتے حویلی میں ہی تھے، دن میں چوبارے پر چلے جاتے تھے۔ علی گڑھ میں ابھی تناؤ تھا۔ یونیورسٹی بند تھی۔

ایک روز بڑے رائے نے دونوں کو بلا کر کہا "بیٹے، فساد کے دوران مجھے لگا کہ تم لوگوں کے دل میں ڈر ہے۔ فطری بھی تھا۔ حالانکہ ہم لوگوں نے پوری کوشش کی کہ تمھارے دلوں سے یہ ڈر نکال دیں — حالات ایسے تھے کہ اسے نکالنا شاید ممکن نہیں تھا۔ میں تم لوگوں سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، اگر تم دونوں اپنے ماموں کے پاس پاکستان جانا چاہتے ہو تو میں اس کا انتظام کر دوں — ڈرے دل سے رہنا، رہنا نہیں — بے بس ہو کر ڈر کو بھوگنا۔ جہاں بھی رہو، بے خوف ہو کر رہو، تب ہی اسے رہنا کہا جائے گا۔ ویسے موت کی شکل وہاں بھی وہی ہے جیسی یہاں ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ وہاں کوئی دوسرا چہرہ لگا کر سامنے آئے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں تحفظ اور اطمینان کا احساس رہے گا۔"

اس وقت تو وہ چپ رہے۔ انھوں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دو چار دن بعد آ کر بولے "ہم یہیں رہیں گے — پتہ نہیں ہم کیوں اتنا ڈر گئے تھے۔ شاید بچپن سے سنتے رہے ہیں کہ ہندو مسلمان کے دشمن ہیں۔ یہی بات خوف بن کر ہم پر حاوی ہو گئی تھی لیکن آپ کی محبت نے وہ خوف ہمارے دلوں سے پوری طرح نکال دیا۔ ہم نے ماموں کو بھی لکھ دیا ہے۔"

میں بولا تو کچھ نہیں لیکن رات والی بات مجھے یاد آ گئی۔ میرے اوپر ضرور شیطان حاوی رہا ہوگا۔ اگر اس دن میں کوئی حرکت کر بیٹھتا تو ان کے دلوں میں بویا ہوا ہندوؤں کے لیے نفرت کا وہ بیج درخت بن جاتا۔ دراصل ذرا کا رائی برابر بیج پلک جھپکتے گھیم شحیم درخت میں بدل جاتا ہے۔ اسے نہ سینچنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ روپنے کی۔

میں نے ان کے کندھوں کو دھیرے سے تھپتھپایا۔ بڑے رائے کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک آ گئی۔

ان ہی دنوں لندن سے ایڈورڈ صاحب کا خط آیا۔ ایڈورڈیا کسی بھی انگریز دوست کا خط آتا تھا تو بڑے رائے کی عمر میں ایک سال کی کمی کر دیتا تھا یا کہیے کہ انھیں ایک سال جوان بنا دیتا تھا۔ انھیں لگتا کہ ایڈورڈ جیسے لوگ برطانوی تاج کی اب بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا رعب داب اب بھی ویسا ہی ہے جیسا تب تھا حالانکہ ان ملک تقسیم ہو گیا تھا۔ دیسی حکمران گدی نشین ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں جب انگریز افسران کا تبادلہ ہوتا تھا یا وہ واپس ولایت جاتے تھے تو چارج رپورٹ کی شکل میں ایک خفیہ نوٹ چھوڑ جاتے تھے جس میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ مقامی لوگوں کے بارے میں پوری تفصیل ہوتی تھی وہی یہ طے کرتی تھی کہ آنے والا افسر مقامی لوگوں کے ساتھ کیا اور کیسا رشتہ قائم کرے۔ کون برطانوی حکومت کا دوست ہے اور کون دشمن؟ کون لالچی ہے، کون فراخ دل، کون چپکو ہے کون الست۔ یعنی کہ ہر آدمی کی خاصیت اس نوٹ میں درج رہتی تھی۔ جب تک نئے افسر کا اپنا تجربہ اس تحریر کردہ سے مختلف نہیں ہوتا تھا وہ اسی تحریر کو مذہبی صحیفہ مانتا تھا۔ برطانوی حکومت کی نصف کامیابی ان نوٹس کی وجہ سے تھی۔

بڑے رائے اور منجھلے رائے کے درمیان جب تک اختلاف ہوا تھا تب سے افسران ان تعلقات کے بارے میں کافی مزہ لیتے تھے۔ بڑے رائے کے بارے میں کلکٹر اور پولس کپتان تو اپنی رپورٹ لکھتے ہی تھے۔ گورنر بھی جاتے وقت صوبے کے اہم لوگوں میں ان کا نام رکھا کرتے تھے۔ ہر نیا لاٹ جب آتا تھا تو انھیں یا تو دعوت نامہ بھیج کر بلواتا تھا اور اگر ادھر دورے پر ہوا تو ملاقات کرنے والوں میں اس کا نام سرفہرست ہوتا تھا۔

ایڈورڈ کے خطوط میں بھی اپنے پرانے دنوں کی کئی باتیں لکھی ہوتی تھیں۔ ایسا نہیں کہ بڑے رائے کو ہی ان دنوں کی یاد تنگ کرتی تھی۔ یہ بات ان صاحبوں کے ساتھ بھی تھی جو لندن چلے گئے تھے۔ ان کے خطوط سے لگتا تھا کہ وہ ہندوستان کی یاد اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ بڑے رائے نے ان کے خطوط اور ان کی تحریر کردہ اسناد نکالیں۔ بڑے رائے کے پاس ان اسناد کی پوری فائل تھی۔ ایڈورڈ نے سرٹیفکٹ میں لکھا تھا "ہری رائے ایک نایاب اور وضعدار انسان ہیں اس شہر کے ہی نہیں بلکہ صوبے کے معزز لوگوں میں شمار

ہے۔ اس عظیم ہستی کے ساتھ میں اور مسز ایڈورڈ نے جو طویل عرصہ گزارا ہے اسے ہم دونوں کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ ہری رائے پکا ہندو ہے لیکن اس کے دل میں نفرت کسی کے لیے نہیں۔ چاہے وہ کسی بھی قوم یا مذہب کا کیوں نہ ہو۔ بس اس کی دکھتی رگ ایک ہی ہے۔ وہ ہے اس کا چھوٹا بھائی کرشن رائے۔ جب سے ہری رائے کے تعلقات کرشن رائے کے ساتھ کشیدہ ہوئے تب سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ کرشن رائے اپنے بڑے بھائی کا دل دکھانے کے لیے اسی طرح نئے نئے طریقے سوچتا ہے جیسے ہمارے یہاں طلاق سے پہلے عورتیں اپنے شوہر کو چڑھانے کے نئے نئے راستے نکالا کرتی ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ہری کو اس افسوس ناک صورت حال سے نجات ملے۔'' سرٹیفکیٹ چونکہ انگریزی میں تھا اس لیے نام سے پہلے مسٹر لکھنے کے علاوہ سب کچھ واحد صیغے میں لکھا تھا جسے ہم 'تو تڑاخ' کا نام دیتے ہیں۔

انھیں یہ سرٹیفکیٹ پڑھ کر ہمیشہ سکون ملتا تھا۔ کرشن رائے جو کبھی ان کی جان سے وابستہ تھا ایک بے جان حصے کی طرح کٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ لیکن نشان باقی تھا جیسے جسم کا کوئی حصہ کٹ جانے پر پیچھے چھوٹا ہوا گوشت اور کھال کھرنڈ کی طرح ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ہاتھ پھیرنے پر کھرکھراتے ہیں، بالکل ویسے ہی جب سب کچھ کٹ کر الگ ہو گیا تھا تو پھر نشان ہی کیوں ہے؟ اس کی یاد ہی کیوں آتی ہے؟ کیا اسے جڑ سے ختم نہیں کیا جا سکتا؟ لیکن کہاں تک کاٹا جائے گا؟ جہاں تک کاٹو گے اس کے بعد کا حصہ پھر اسی طرح کھرنڈ جائے گا ــــ ان کے منہ سے نکلا ــــ کرشن رائے!

وہ ایڈورڈ صاحب کا خط ایک بار سرسری طور پر پڑھ چکے تھے حالانکہ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی پھر بھی انھوں نے اسے دوبارہ پڑھا۔

پیارے ہری رائے!

اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ حالانکہ میرے دل و دماغ میں تمھاری وہی شکل نقش ہے جو ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت دیکھی تھی۔ اس لیے مجھے اب بھی لگتا ہے تم اتنے ہی جوان اور آب و تاب والے ہو گے۔ جہاں تک میرا سوال ہے مجھے لگتا ہے کہ کچھ مہینوں یا سال بھر میں

ہندوستانی صوفیوں کی طرح اپنے محبوب سے وصال ہو جائے گا۔ وہ کیسا برتاؤ کرے گا، یہ وہ ہی جانے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ مٹی کتنی مہربان ہوتی ہے۔ پہلے ہم چھوٹے سے کتراتے ہیں بعد میں ہم اس کی آغوش میں کھو جاتے ہیں جیسے اس کے بچے ہوں۔ وہ ہماری گندگیوں کو اپنے وجود کا حصہ بنالیتی ہے کچھ بھی ضائع نہیں ہونے دیتی۔ اپنے بھوکے بچوں کی دعوت کر دیتی ہے یعنی کیڑے مکوڑے سب چھک کر کھاتے ہیں۔ تم نہیں سمجھو گے۔ تم لوگ تو آگ کے سپرد کر دیے جاتے ہو۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں اچانک یہ بکواس کیوں کرنے لگا؟ کچھ ہی دن پہلے ایلس یعنی مسز ایڈورڈ وغا دے گئی۔ پتہ نہیں اسے اتنی جلدی کیا تھی۔ لگتا ہے اسے نئے عاشق کی ضرورت تھی۔ اگر ارن نہ ہوتا تو میں اکیلا بوڑھا کیا کرتا۔ میں جانتا ہوں تمھارے دماغ میں ایلس کی وہی تصویر ہوگی جو ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت دیکھی تھی۔ جوانی میں فوت ہوئے یا بچھڑے شخص ہمیشہ جوان بنے رہتے ہیں۔ تم نے ایلس کو بڑھاپے میں نہیں دیکھا۔ وہ جیسے جیسے بوڑھی ہوئی ویسے ویسے اس کی خوبصورتی بڑھتی گئی۔ جب ہم تمھاری بات کرتے تھے تب ہم بھی خیالوں میں اتنے نوجوان ہو جاتے تھے جتنے تم لگتے تھے۔ تصور کتنی عجیب و غریب شئے ہے۔ حقیقت کی نگاہ سے ایلس مر گئی۔ تصور میں وہ اب بھی اتنی ہی حسین اور جیتی جاگتی ہے۔

جہاں تک دونوں بچوں کا سوال ہے، تب وہ بہت چھوٹے تھے۔ ان کا انحصار ہم پر تھا۔ ارن کے برابر ہی رہے ہوں گے۔ جب تم آتے تھے تمھاری گاڑی پر بیٹھ کر گھوما کرتے تھے۔ بڑے والے کو چوان کے پاس بیٹھ کر گھوڑا ہانکنے کا شوق تھا۔ وہ کوچ بکس پر بیٹھتا تھا۔ چھوٹا ڈرتا تھا۔ وہ کبھی میں گدی کا سرہانہ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا اور اپنے بھائی کو پکارتا رہتا تھا — ملکی تم آجاؤ — آجاؤنا ملکی۔ لیکن وہ مجھے بھول گئے۔ ان سے میرا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں تمھاری تکلیف کو اب سمجھ گیا

ہوں۔ جب کرشن رائے نے تم سے منہ موڑا تو تم کو کتنا دکھ ہوا تھا۔ خیر، میں اس بات سے خوش ہوں کہ میرے دونوں بیٹے اپنی اپنی زندگی کے مالک ہیں اور ایک حد تک خوش بھی ہیں۔ کتنی بھی خوشی کیوں نہ مل جائے، کھیتوں کی بات سب کی ایک میںڈھ ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں تمھاری جیسی روایات نہیں ہیں کہ غیر مفید اور بوڑھے ماں باپ کو کوئی بھی بچے تا زندگی سنبھالتے ہیں۔ اس معاملے میں تمھارا ملک ایک بہت امیر ملک ہے۔

میں بھی اب ہندو ہو گیا۔ ہندو ہونے کا مطلب یہ کا مُن لگا نہیں۔ ہندو ہونے کا مطلب ہمیں اتنا جو گنا ہے جتنا کیا ہے ____ اچھایا برا۔ اگر جنم ہوتا ہے تو تمھارے ملک میں جنم لوں۔ ارن نے بہت سہارا دیا۔ میں یہی دعا کرتا ہوں کہ اسے اپنی پسندیدہ زندگی جینے کا موقع ملے۔ وہ انسان کو پیار کرنا جانتا ہے۔ اس کا کورس چھ ماہ بعد ختم ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس درمیان میں بھی اپنا پڑاؤ پورا کر لوں۔ اسی کے قیام کے دوران میری روانگی ہو جائے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا آخری خط ہو۔

بہت پیار اور آداب۔

تمھارا

ایڈورڈ

اختر اور شوکت الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے تھے کمپٹیشن کے نقطہ نگاہ سے الہ آباد ان دنوں سب سے سرسبز و شاداب چراگاہ مانا جاتا تھا۔ الہ آباد نے اس زمانے میں بڑے بڑے ماہرین پیدا کیے۔ ملازمت پیشہ، ادیب اور سیاست داں بھی۔ ہم لوگوں نے پہلے ارن کو الہ آباد ہی بھیجنے کے لیے سوچا تھا۔ بڑے رائے کی یہ شدید خواہش تھی کہ ارن ڈپٹی کلکٹری میں آجائے۔ وہ اسے الہ آباد بھی لے گئے تھے۔ لیکن ارن وہاں بیٹھنے کو تیار نہیں ہوا۔ اسے لگا کہ اسے اتنے سال گھر سے باہر رہنا پڑے گا۔ تب ہائی اسکول کے بعد رڑکی کے تھامسن انجینئرنگ کالج میں داخلہ ہو جاتا تھا۔ جتنا وقت اسے ڈپلوما لے کر باہر جانے اور انجینئرنگ کرنے میں لگا اتنے ہی

میں اختر آئی۔ اے۔ ایس ہو گیا تھا۔ اختر کا پہلا یا دوسرا بچہ رہا ہوگا۔ شوکت نے قانون کی ڈگری لی تھی۔ اس دن کچھ دن پریکٹس کی پھر منصفی میں چن لیا گیا۔

ارن جب ہندوستان آیا تو اختر لکھنؤ میں تعینات تھا۔ وہ اس سے ملنے لکھنؤ گیا۔ اختر بڑے رائے اور رائے خاندان کی جتنی تعریف کر سکتا تھا اتنی کی۔ ارن چپ چاپ سنتا رہا۔ اختر کو تعجب بھی ہوا۔ وہ ہنسکر بولا "یار، ارن، اگر کوئی میرے والد کی اتنی تعریف کرتا تو میں خوشی سے پاگل ہو گیا ہو جاتا۔ تم ایسے ٹھنڈے بنے بیٹھے ہو جیسے میں کسی اور کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

ارن پہلی بار کھلا "ہمارے فادر دنیا کے حاتم طائی ہیں لیکن پہلے اپنے بھائیوں کے لیے۔۔۔" اس نے جملہ وہیں ختم کر دیا کچھ دیر بعد بولا "میرے چاچا یعنی چھوٹے رائے نے مجھے گود لیا ہے۔ وہ میرے بڑے چاچا یعنی منجھلے رائے کی طرح کسی بھی ہما شما کو گود لے کر پال سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے بچے کو ترجیح دی۔ بڑے رائے نے ان کے ساتھ کیا کیا تمھیں معلوم نہیں۔ ان کی دعوتوں اور رئیسی کو چلانے کے لیے جب انھوں نے اپنی زمین بیچنے کو منع کر دیا تو وہ بدظن ہو گئے۔ جب تک وہ اپنی جائیداد ان پر لٹاتے رہے تب تک ان کے لیے چھوٹے رائے جیسا کوئی نہ تھا ـــــ ان کا اپنا بیٹا تک نہیں۔ جب چھوٹے رائے نے یہ کہہ دیا کہ یہ جائیداد اب ارن کی ہے آپ اس فروخت نہ کریں تو میرے والد اور بڑے بھائی دونوں ان کے دشمن نظر آنے لگے۔ ان کی دی ہوئی قربانی کو پیشاب کی دھار پر بہا دیا۔ وہ دوسرے کی جائیداد کیسے ہڑپ کر سکتے تھے؟

اختر سمجھ نہیں سکا کہ ارن کو یہ کیا ہو گیا۔ وہ بولا "ارن بھائی، ہم تو والد والدہ نام کی شئے سے واقف ہی نہیں۔ بچپن میں ماموں نے سہارا دیا اور پاکستان چلے جانے کے بعد بڑے ابا، چھوٹے ابا اور بڑے بھائی نے سہارا دیا۔ ہم دونوں بھائیوں نے بالا بالا یہ طے کر لیا تھا کہ ہم پاکستان نہیں جائیں گے۔ اس بعد کی چوٹ ہماری ممانی اور ماموں کے دل پر بعد تک رہی۔ ہم نے ایسا کیوں کیا کہ یہ ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ ملک کی وجہ سے یا تمھاری دوستی کی وجہ سے۔ ہماری ضد ماموں نے بھی رکھی اور تمھارے گھر والوں نے بھی۔ ایک بار جب فساد ہوا تو ہم دونوں کے دل میں یہ بیٹھ گیا کہ یہ ہندو ہیں ـــــ کہیں مار نہ ڈالیں۔ سوچ کر آج بھی سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ جو درخت ہمیں اپنے سائے سے نواز رہا تھا اسی کے خلاف

ہمارے دل و دماغ میں یہ نیا شک خیال کیوں آیا جاتا کہ ماموں نے چلتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم تمھیں ایک فرشتے کی سرپرستی میں دے کر جا رہے ہیں ـــــ زندگی کے خوف نے ہمیں اتنا بھی موقع نہیں دیا کہ ماموں کے قول کو ایک ہی بار دوہرا لیتے۔ شاید یہ خوف ہر ملک کی اقلیتوں کا مقدر ہوتا ہے۔ ماموں پچھلے سال ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انھوں نے ہم دونوں کی شادیوں میں شرکت کی تھی۔ انھوں نے خود یہ مانا تھا ان کا پاکستان جانے کا فیصلہ جذباتی تھا۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں محبوب اور طارق کو صحیح جگہ نہیں لگا سکے تھے۔ پاکستان کے لوگ اب بھی ان لوگوں کو پوری طرح اپنا نہیں پائے۔ وہاں پنجابیوں کی اکثریت ہے۔ یو۔ پی کے مسلمان ان کے لیے کچھ کم تر مسلمان ہیں۔"

اختر شاید بولتا جاتا لیکن بیگم نے ان دونوں کو کھانے پر بلا لیا۔ کھانے کے کمرے میں بڑے رائے کی ایک بڑی تصویر لگی تھی۔ ماموں کی چھوڑی۔

ارن نے چٹکی لی "تصویر لگانا تو شریعت کے خلاف ہے!"

وہ ہنس دیا "ہاں لیکن کچھ شخصیتیں خدا کا نور ہوتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اماں یار، بات کو بات رہنے دو، بگاڑو مت۔ میں جانتا ہوں کہ تم ولایت سے پڑھ کر آئے ہو۔"

بیگم ہنس دیں۔

کچھ ہی بعد ارن کی شادی ہو گئی۔ اس کی سسرال والے کافی مالدار لوگ تھے حالانکہ خاندانی رئیسوں کی گنتی میں نہیں آتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انھوں نے ٹھیکیداری میں خوب کمایا تھا اسی لیے بیٹی کی شادی میں خرچ کرنے میں انھوں نے اچھے اچھے رؤسا کو مات دے دی تھی۔ بڑے رائے بھی اپنی طرف سے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا لیکن جب برات دروازے پر پہنچی اور سمدھی کی ملائی ہوئی تو بڑے رائے اور میں پیچھے کھڑے تھے۔ چھوٹے رائے نے اپنی ہی 'ملائی' کرائی تھی۔ بڑے رائے کہیں نہ کہیں سوچتے تھے کہ 'ملائی' کے وقت راگھو انھیں آگے کرے گا۔ وہ یہ بھی طے کر چکے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو وہ منع

کر دیے گئے لیکن نہ چھوٹے رائے انھیں آگے کیا اور نہ ہی انھیں منع کرنے کا موقع ملا۔ آدمی بھی عجیب و غریب شئے ہوتی ہے وہ کہا کر منع کرنے میں جس قدر لطف اندوز ہوتا ہے، ہاں کرنے میں نہیں۔ بھونے بھی پہلے چھوٹے رائے کے پیر ہی چھوئے۔ چھوٹے بڑے رائے کے اور میرے بھی ـــــ لیکن بعد میں۔ ارن نے تو وہ بھی نہیں کیا۔ بڑے رائے سکڑتے ہی چلے گئے۔ انھیں یہ ہی لگتا رہا کہ اب وہ نہ چھوٹے رائے کے مطلب کے رہے اور نہ ارن کے۔ لیکن اپنے اس احساس کا انھوں نے اظہار نہیں ہونے دیا۔

اب تک جتنی بہوئیں رائے خاندان میں آئی تھیں۔ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ارن کی بہو تھی۔ کالے بھی زیادہ۔ پردہ بھی پہلی بار اٹھا تھا۔ چھوٹے رائے نے پردہ اٹھانے کی خود ہی پیش کش کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے رائے خود پردہ کرنے لگے تھے۔ اگر کبھی چھوٹی بہو سامنے پڑ جاتی تو وہ پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاتے تھے اور اگر تولیہ ہوا تو تولیے کی اوٹ کر لیتے تھے۔ چھوٹی بہو ارن پر ہنستی تھی ـــــ تمھارے بڑے رائے تو زنانے ہیں۔ ارن اسے کبھی نہیں ٹوکتا تھا۔ چھوٹے رائے کے حصے سے زور زور سے ہنسنے کی آواز باہر تک آتی رہتی تھی۔ یہ بات درست تھی کہ چھوٹے رائے کا حصہ چھوٹی چاچی کی موت کے بعد اب کھلا تھا۔ جب بھی موقع ملتا چھوٹے رائے چھوٹی بہو کے پاس جا بیٹھتے۔ انھیں اس سے بات کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ وہ بچی بچی سب باتیں اسے بتاتے تھے۔ اپنی زندگی کے ان سب تاریک و روشن کونوں میں گھماتے تھے جن سے ہو کر وہ گزرے تھے۔ کبھی کبھی باتیں بڑے رائے اور مجھ پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔ بڑے رائے پر زیادہ۔ بڑے رائے نے اگر اس وقت کانگریس میں جانے سے نہ روکا ہوتا تو آج وہ وزیر ہوتے۔ بھاسکر نے ساری زمینوں کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر انھیں کاہل بنا دیا ہے۔ اگر وہ نہ بولے ہوتے تو ارن کے حصے کی زمین بک گئی ہوتی۔ وہی بولنا ان کا دشمن ہو گیا۔ بڑے رائے کے پاس جائے انھیں مہینوں ہو جاتے تھے۔ ملتے تو روز تھے لیکن بیٹھ کر بات کرنے والی بات نہیں رہ گئی تھی۔ حالانکہ بڑے رائے کو دل ہی دل میں یہ انتظار رہتا تھا کہ راگھوان کے پاس آئے گا، ارن آکر پوچھے گا "بابا کیسے ہیں؟" اپنا حال بتائے گا۔ اندر کا وہ انتظار ادھ مجھی پیاس میں بدلتا جا رہا تھا۔ سب کے درمیان بول چال میں کمی مسلسل بڑھ رہی تھی۔

ایکدن بڑے رائے نے چھوٹے رائے کو بلایا اور کہا "راگھو، تم لوگ مجھ سے ناراض

ہو؟"

"کیوں، بڑے بھیا؟"

ہنس کر بولے "ایسا لگتا ہے تم اور ارن جراحی کر کے کچا کاٹ رہے ہو۔ چاہے جتنا کچا کاٹو، نشان تو چھوڑو گے ہی۔ وہ نشان کبھی کبھی نظر بھی آئے گا اور اندر سے ہرا ہو گیا تو اس میں ٹیس بھی اٹھے گی۔"

چھوٹے رائے کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا "یہ کیا کہہ رہے ہیں، بڑے بھیا!"

"وہی جو محسوس کر رہا ہوں۔ کرشن رائے نے جو جھٹکے سے کیا تھا، تم دھیرے دھیرے کر رہے ہو۔"

"نہیں، نہیں۔"

"پھر چھوڑو، اگر میں یا بھابھی یا ارن کی بہو تمھیں پریشان کرتے ہوں اور تم آرام سے محروم رہتے ہو تو تم بھی کرشن رائے کی طرح راجا بے والی کوٹھی میں کیوں نہیں رہنے گئے؟ میں ہی چلا جاتا، لیکن اس خاندان کی روایت ہے کہ بڑا بیٹا دیوڑھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ مجھے تو مرنا ہی یہاں ہے۔"

چھوٹے رائے سنبھل گئے۔ انھوں نے فوراً کہا "آپ کہتے ہیں تو میں ارن سے پوچھ لوں گا۔"

"ہاں پوچھو اور چلے جاؤ۔ رشتے اگر سکھ نہ بن سکیں تو دکھ بھی نہیں بننے چاہئیں۔"

تقریباً ایک ہفتے کے اندر چھوٹے رائے اپنے بیٹے بہو کو لے کر راجا بے والی کوٹھی میں چلے گئے۔ وہ کوٹھی بہت عرصے سے غیر آباد پڑی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ بڑے رائے کے کہنے کا تو بہانہ تھا، وہ لوگ اسے کافی دنوں سے ٹھیک کرا رہے تھے۔ وہ کوٹھی چھوٹے رائے کی زمین میں ہی تھی لیکن چھوٹے رائے کی بڑے رائے سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ بڑے رائے نے خود کہہ کر ان کے سارے حجاب دور کر دیے تھے بھائی اور بیٹے کو اپنے سے الگ کرنے کی تہمت بھی اپنے سر پر لے لی تھی۔ منجھلے رائے کو لگا کہ انھوں نے بڑے رائے سے

بدلہ لے لیا۔ ان کی بات سچ ہو گئی۔ ان کا اپنا بیٹا ان سے دور ہو گیا جب سگا ناراض ہو جاتا ہے تو اپنوں کو بکھرتے دیکھنے کا سب سے زیادہ سکھ اسے ہی ہوتا ہے۔ یہ واقعہ بڑے رائے کے لیے اس لیے بھی افسوس ناک تھا۔

بہو جب حویلی چھوڑ گئی تو بڑے رائے کے پاؤں چھونے تک نہیں آئی۔ وہ اور سارا سامان بھی پیچھے کے دروازے سے چلے گئے۔ وہ انتظار کرتے رہے کہ بہو آئے گی تو وہ اسے سمجھائیں گے۔ آشیرواد دیں گے۔ چھوٹے رائے البتہ آئے۔ آکر بولے "بڑے بھیا، ہم کوٹھی میں رہنے جارہے ہیں۔۔۔ آپ کی رائے ارن کو بھی پسند آئی۔ وہ بولا جب بڑے رائے ہی کا مشورہ ہے تو ضرور جانا چاہیے۔"

بڑے رائے نے انھیں چشمے کے اوپر سے دیکھا اور بولے "تم لوگوں نے میری یہ رائے مان کر اچھا کام کیا۔"

چھوٹے رائے چار پل کھڑے رہے کہ شاید بڑے رائے کچھ کہیں۔ جب وہ نہیں بولے تو لوٹ گئے۔

حویلی کا ایک حصہ سونا ہو گیا تھا۔ حویلی ان کا دل تھی۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتے تھے جب تک ٹھاک دھڑکتا ہے تو سمجھو سب ٹھیک ہے لیکن اب انھیں لگنے لگا تھا کہ دل کے ایک حصے میں اب خون پہنچنا بند ہو گیا۔ وہاں کوئی حرکت ہی نہیں تھی۔ خون ادھر کیسے جاتا؟ وہ خون ایک بکھرے ہوئے سمندر کی طرح اوپر اٹھتا تھا اور وہیں کا وہیں پچھاڑ کھا کر بکھرا جاتا تھا۔ انھیں بار بار لگتا تھا کہ جس نظام میں اب تک زندگی گزاری وہ ڈھے کر بکھر رہا ہے۔ بس میں ہی بچا تھا جس نے انھیں اس طرح بکھرتے دیکھا تھا۔ انھوں نے جس شوق سے ارن کو پالا تھا، اس کے اردگرد اپنے سپنے بنے تھے ـــــ انھیں پورا کرنے کے لیے میری شخصیت ناکافی تھی۔ انھیں لگتا تھا کہ اگر ارن ان کے ساتھ رہتا تو انھیں یہ محسوس ہوتا کہ وہ ایک ایسے بیٹے کے باپ ہیں ـــــ جس کا مرتبہ کسی انگریز سے کم نہیں۔ ولایت میں پڑھا اتنا بڑا انجینئر! ان لوگوں کے ساتھ ان کا برابر کا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے جنھوں نے اس ملک پر حکومت کی ہے۔ اب بھی ان ہی افسروں کے پاؤں اس رکاب میں ہیں جن کے تب تھے، حالانکہ میں ان کی جی جان سے

خدمت کرتا تھا۔ میرے بچے ان کے تابع تھے۔ لیکن ان کا وہ سکھ جس کا انھوں نے سپنا دیکھا تھا، ان کی بے رخی کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا، اگر ان ہم لوگوں کی طرح ان کے تابع نہ بھی رہا ہوتا، الٹے انھیں ہی اس کی طرف دیکھنا پڑتا تب بھی اس کے ساتھ رہنے کا سکھ ان کی زندگی کو دو ہاتھ لمبا کر دیتا۔

میرا بیٹا رگھوبر بھی ان سے بہت زیادہ وابستہ تھا۔ اسے جو کمی اندر حویلی میں محسوس ہوتی تھی وہ بڑے رائے کی قربت میں پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے بڑے رائے کا پوتا ہونا اچھا لگتا تھا۔ حالانکہ بعد میں وہی سب اسے اپنی کمتری کا سبب بھی لگنے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایسے طبقے سے آیا ہے جس نے دوسروں کا استحصال کر کے اپنی شان و شوکت کو برقرار رکھا ہے۔ کام کیے بغیر سکھ بھوگا ہے۔ سکھ قسمت کی بات ہوتی ہے ـــــ وہ یہ بات ماننے سے انکار کرتا تھا، لیکن یہ بات ایک دم الگ ہے۔ اس وقت اتنا ہی کافی تھا کہ رگھوبر بڑی رائے کا پوتا ہے۔ خاندان کی ترجیحات اسی طرح طے ہوتی تھیں۔ باپ کا نام ہی کم ہی آتا تھا۔ آتا بھی تھا تو اسی طرح کہ اچھا تو یہ بڑی رائے کا پوتا اور بھاسکر رائے کا بیٹا ہے۔ تب یہ فخر کی بات تھی۔ بعد میں وہی توہین کی علامت بن گئی تھی۔ میرا ردعمل بالکل دوسرا ہوتا تھا۔ میں ان دونوں کے سامنے سمٹ جاتا تھا۔ سچ پوچھیے تو باپ اور بیٹا مجھے اپنے سے زیادہ خاص لگتے تھے۔ اس کا آدرش ایک زمانے تک بڑے رائے ہی رہے تھے۔ مجھے اپنے آدرش تعمیر کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔

رگھوبر میرے لیے کچھ ایسا ہوتا جا رہا تھا جیسے ٹوپی تو کسی کی ہو لیکن ہولی کے دنوں میں چندہ مانگنے والوں کی طرح اوپر سے کٹیا ڈال کر اڑا کوئی اور لے جائے۔ ان دنوں ہولی پر بچوں کا کٹیا لگا کر پیچھے سے ٹوپی اتار لینا اور تب تک نہ دینا جب تک چندہ وصول نہ ہو، ایک عام بات تھی۔ غلط جگہ کٹیا لگ جانے سے کئی بار پوری کی پوری گدی چر جاتی تھی۔ کئی بار مجھے ایسا بھی لگتا تھا۔

میں ان دونوں کے درمیان دھیرے دھیرے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بار یہ بھی سننے کو ملا کہ اس نے یہ سوچ کر کہ کسی کو کیا پتہ لگے گا، مجھے بیچ سے ہٹا دیا اور اپنے کو براہ راست بڑے رائے کا بیٹا بنا دیا تھا۔ اس بات سے مجھے پریشانی ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ لڑکپن

میں ہی کیا ہو۔ یہ بات کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے اور اپنے بچے کی شکایت کسی سے کروں۔ ارن نے تو کچھ بننے کے بعد ہی اپنے والد کو چھوڑا تھا لیکن رگھوبر نے تو کچھ ہوئے بغیر ولدیت بدل ڈالی تھی۔ رگھوبر ابھی صورت حال کو سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اپنے دادا کی شان و شوکت میں وہ ایک ایسی سچائی بھلائے دے رہا تھا جو کبھی بدلی نہیں جا سکتی تھی۔ جب اپنے آپ پر فخر کرنے کی بنیاد ہی غلط تعمیر ہو جاتی ہے تو وہ غلطی بار بار اسی طرح دوہرائی جاتی رہتی ہے جیسے حساب کے سوالوں میں کی گئی غلطی مشکل سے کرنے والے کی گرفت میں آتی ہے۔ سارنگا کو ایسے موقعوں پر مجھے اور میرے بیٹے رگھوبر کو نیچا دکھانے کا موقع مل جاتا تھا۔ بڑے رائے اس کے اندر پنپتی اس غلط انا کو دیکھ نہیں پاتے تھے۔ چھوٹے رائے تو اب بہت دور ہو چکے تھے۔ ہمارے دکھ درد میں ان کی حصہ داری قریب نہ کے برابر تھی۔ اگر ہوتی تو وہ سب کچھ ایک ہی نظر میں بھانپ جاتے۔ مجھے ایسے میں کئی بار ان کا خیال آتا تھا۔

وہ کبھی کبھی آتے بھی تھے۔ حال چال پوچھتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ حویلی کی کافی چھان بین کرتے تھے۔ حویلی کی مہک انھیں کھینچ لاتی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے بے چین ہو جاتے تھے جیسے حویلی انھیں پکار رہی ہے ــــــ اس میں گوبر سے لے کر آگے پیچھے کے سب ہی لوگوں کا پسینہ مہکتا ہے ــــــ وہ عطر بھی مہکتا ہے جو بڑے رائے دور دور سے منگوایا کرتے تھے اور خاص خاص موقعوں پر اپنے باقی سب لوگوں کے لگوایا کرتے تھے۔ اس خوشبو کا اندھڑ آ جاتا ہے اور مجھے وہاں سے اڑا کر یہاں لے آتا ہے۔ جن دنوں وہ ممبر تھے ان دنوں یہ ہی کہا کرتے تھے کہ اس ملک کی مٹی سے اٹھتی مہک میرے نتھنوں میں بھر جاتی ہے۔ جب کہیں کوئی گولی چلتی ہے، پولس ظلم کرتی ہے یا فساد ہوتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ اس مہک کو کوئی زہریلا بنا رہا ہے۔ بعد میں ناک اس مہک کے بارے میں بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس حویلی کے بارے میں بھی ہو جائے گی۔ کئی بار ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے تھے ــــــ زندگی کا کتنا بڑا حصہ میں نے یہاں گزارا ہے ــــــ بڑے بھیا قسمت والے ہیں کہ وہ اب بھی یہیں ہیں۔ ایسے نازک لمحات میں کئی بار میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان سے رگھوبر اور اپنے درمیان بنتی ہوئی اس تعدیل کا ذکر کروں لیکن پتہ نہیں کون سی جھجک مجھے ایسا کرنے

سے روک لیتی تھی۔ بیٹے کا موہ یا اپنی شرم؟ چھوٹے رائے کا بڑے رائے سے آمنا سامنا کم ہوتا تھا۔ دعا سلام یا چھوٹے رائے کا ان کے بارے میں پوچھ بھر لینا۔ ان کا ایک آدھ جملے میں جواب دینا اور چلے جانا۔

ایک بار چھوٹے رائے نے مجھ سے پوچھا "بھاسکر، کیا تو بھی رگھوبر کے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکتا ہے؟ بڑے رائے کتنے سنگدل ہیں؟ میں، تم یا ارن —— ہمارے درمیان رشتوں میں فرق ہو سکتا ہے لیکن ان کے لیے تو ہم سب ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ پھر وہ میرے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

میں چپ لگا گیا۔ یہ ہی سوال میں اپنی اولاد کے بارے میں بھی اپنے آپ سے پوچھنا چاہتا تھا۔

منجھلے رائے کا بیٹا رنجن اتنا فیل ہو چکا تھا کہ اس کے پاس ہونے کی ساری امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ لوگ اس کے بارے میں منہ اٹھا کر کہہ دیتے تھے کہ پتہ نہیں اس کے ماں باپ پڑھے بھی تھے یا نہیں۔ لیکن ہم تو اسی سوال کے گھیرے میں تھے۔ نہ کہی اتنا، لیکن رگھوبر بھی فیل نہیں ہوا تھا۔

رنجن کے داروغہ بننے کے امید پوری نہیں ہو پا رہی تھی۔ منجھلے رائے بھی اس بات سے دکھی تھے۔ منجھلی چاچی کا لاڈ پیار اس کے لیے زہر بنتا جا رہا تھا۔ بڑے رائے سے ان کا رابطہ پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ کیا پتہ رنجن نے اس دن منجھلے رائے سے جا کر کہا بھی تھا یا نہیں کہ انھیں بڑے رائے نے بلایا ہے۔ بڑے نے رائے یہ مان لیا تھا کہ اس نے کہا ہو گا کہ منجھلے رائے نہیں آئے۔ انسان جو چاہتا ہے مانتا ہے، جو نہیں چاہتا وہ نہیں مانتا۔ ماننے کے لیے اسے کسی جانچ پڑتال یا پوچھ تاچھ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ادھر یہ بھی سننے کو ملا تھا کہ رنجن کو کچھ عجیب و غریب عادتیں پڑتی جا رہی تھیں۔ وہ عورتوں کو دیکھ کر ننگا کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک دو بار جمعدارن نے سارنگا سے شکایت کی تھی کہ جب کبھی اس کی بیٹی کوٹھے پر کام کرنے جاتی ہے تو رنجن بابو موقع دیکھ کر اس کے سامنے ننگے کھڑے ہو جاتے ہیں —— ایک دن اس نے پنچہ بھی پھینک کر مارا تھا۔ میں نے اسے بہت ڈانٹا، مالک کے بچے پر ہاتھ اٹھاتی ہے! چاہے جو بھی

ہو ہے تو ان کی گدی پر۔ ویسے تو عزت ہماری بھی ہے ـــــ چودہ سال کی لڑکی اوپر سے رعایا ـــ اگر مالک لوگ ایسا کریں گے تو ہم کہاں جائیں گے۔

ہو سکتا ہے اس معاملے کی بھنک منجھلی چاچی کو مل گئی ہو۔ کردار اور آگ کو دکھانے کے لیے تارچ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خود نظر آتے ہیں۔ چاچی رنجن کی شادی کے لیے ہر وقت منجھلے چاچا کو کونچتی تھیں لیکن نہ چاچی کی ذات کا کوئی لڑکی ملتی تھی اور نہ منجھلے چاچا کی ـــــ یعنی ہماری ذات کی۔ جب سے پتہ چلا کہ رنجن لاوارث تھا، کرشن رائے نے گود لے لیا تو لوگ بیٹی کی شادی کی بات کرنے سے بدکتے تھے۔ لوگوں کو ذات پات کے سنسکار ایسا جھٹکا دیتے تھے کہ سنبھلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ منجھلے رائے کی سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ پھر بھی منجھلے رائے اور منجھلی چاچی اس صورت حال کا کافی ہمت سے سامنا کر رہے تھے۔ وہ بے لاگ ہو کر کہہ دیتے تھے کہ ـــــ بچے ایک سے ہوتے ہیں، ہمارا ہو یا کسی اور کا۔ میں نے اگر رنجن کو گود لیا تھا تو یہ سب سوچ کر گود لیا تھا کہ آگے چل کو میرے پورے خاندان کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں چاہتا تو کیا اتنی بڑی جائیداد کے لیے اپنی برادری یا خاندان کا بچہ گود لے سکتا تھا؟ لوگ تو اپنے بچے لیے میرے پیچھے پیچھے گھومتے تھے، میں نے جان بوجھ کر اس بچے کو گود لیا تھا۔ مجھے اس کا کوئی ملال بھی نہیں ـــــ کچھ لوگ براہِ راست سوال کر دیتے تھے کہ مان لیا ہم اپنی لڑکی کی شادی رنجن سے کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، کر بھی دیں ـــــ تو اس بات کا کیا یقین کہ آپ کے بھائی اور ان کے بچے جائیداد پر اپنا حق نہیں جتائیں گے؟ ان کی یہ بات لڑکی والوں کو ناکافی لگتی تھی کہ میں نے اپنی ساری جائیداد رنجن کے نام ابھی سے کر دی ہے۔ دوسرا سوال اٹھتا تھا کہ آپ کی اپنی جائیداد پر تو اس بات کا انطباق ہو سکتا ہے لیکن ددھیالی جائیداد تو ددھیالی ہوتی ہے۔ منجھلے رائے کو اس بات ایک ہی حل نظر آیا کہ وہ سب بھائیوں سے فارغ خطی لکھوالیں۔ سب سے پہلے منجھلے رائے بڑے رائے کے پاس آئے۔ انھیں آتے دیکھ کر بڑے رائے کو تعجب ہوا۔ آکر ان کے پاؤں چھوئے تو ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر اس درمیان اگر کبھی بڑے رائے سامنے پڑ بھی جاتے تو منجھلے رائے نظر بچا کر نکل جاتے تھے۔ پاؤں چھونے نے انھیں چونکا دیا تھا۔ کرشن رائے اگر آیا ہے اور پاؤں چھو رہا ہے تو یقیناً کوئی بڑا مطلب ہو گا ورنہ ویسے تو نہ وہ یہاں آتا اور نہ پاؤں چھوتا۔ انھوں نے ہاتھ تو اٹھا دیا لیکن فوراً ہی پوچھ لیا "کیوں

کوئی خاص بات ہے — بڑی رائے کی یاد کیسے آ گئی؟"

"پتہ نہیں، کئی دنوں سے دل بے چین تھا۔ بار بار خیال آ رہا تھا کہ بڑے بھائی کو کب سے نہیں دیکھا۔"

ہنس کر بولے "اتنی فکر مت کیا کرو — ابھی میں اتنی جلدی جانے والا نہیں۔ جب جاؤں تو تمھیں بلا بھیجوں گا۔ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"

منجھلے رائے کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ انھیں کہنا پڑا "بڑے بھیا، رنجن اب بڑا ہو گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی ہو جائے۔ میں نے اس وقت آپ کی بات نہیں مانی — اب مشکلیں سامنے آ رہی ہیں۔ رشتے والے ایک ہی سوال پوچھتے ہیں کہ اگر ہم اپنی بیٹی کی شادی کر بھی دیں تو اس بات کا کیا یقین کہ دوسرے بھائی اور ان کے ورثا اس جائیداد پر اپنا دعویٰ نہیں ٹھونکیں گے؟ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں۔ آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟"

"اس میں کرنا کیا ہے۔ تم نے تو اس لڑکے کو قانوناً گود لیا ہے۔ تمھاری جائیداد کا حق ہر حالت میں اسی کو پہنچتا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں، لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں آپ اپنے بھائیوں اور ان کے ورثا کے دستخط کرا دو۔"

بڑے رائے نے قلم اور کاغذ اٹھایا ایک منٹ سوچا اور پھر رکھ دیا۔ ان کے قلم رکھتے ہی منجھلے رائے کے چہرے پر جو رونق آئی تھی وہ اڑ گئی۔

وہ بولے "میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ بھاسکر، رگھوبر وغیرہ کبھی تمھاری جائیداد کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے، بھلے ہی ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج کیوں نہ ہو جائیں۔"

"میں یہ بات سمجھتا ہوں لیکن انھیں کیسے سمجھاؤں؟"

"اگر انھیں اس بات سے بھی اطمینان نہیں ہوا تو تم کیا کرو گے؟"

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔"

"جو تب دیکھو گے ابھی کیوں نہیں دیکھتے؟ جو لوگ یہ سوال اٹھا رہے ہیں وہ اپنی لڑکی کی شادی تمھارے بیٹے سے نہیں کر رہے بلکہ تمھاری زمین جائیداد سے کر رہے ہیں۔ نہ

انھیں تم پر بھروسہ ہے اور نہ تمھارے خاندان پر۔ میری بات مانو تو تم اپنے بیٹے کی کسی ایسے آدمی کے بیٹے سے شادی کرو جو تم پر اور تمھارے خاندان پر اعتماد کرتا ہو۔"

"لیکن۔۔۔"

"لیکن کچھ نہیں ــــ میں تمھیں لکھ کر دے دیتا لیکن مجھے لگا کہ تم اپنے بارے میں ان کی بے یقینی کو میرے بارے میں اپنی بے یقینی سے بدل رہے ہو۔ تم اپنے بیٹے کی شادی کرو ــــ شادی کے بعد میں پختہ فارغ خطی تمھارے یا تمھاری بہو کے پاس بھجوا دوں گا۔ اگر میں نے اب لکھ کر دیا تو مجھے لگے گا کہ میں نے اپنے بھائی کی عدم موجودگی پر مہر ثبت کر دی۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن اعتماد کا ٹوٹنا نہیں۔ حالانکہ ایسے رشتوں میں پہلا شکار وہی ہوتا ہے۔

پہلے تو منجھلے رائے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کریں۔ پھر وہ بولے "بڑے بھیا میں جانتا ہوں آپ رنجن سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ یہ نہیں چاہتے کہ وہ بے فکر ہو کر اپنا گھر بسا سکے۔ آپ میرے خاندان کے خلاف کینہ پروری کر رہے ہیں ــــ میں اب کبھی دیوڑھی پر قدم نہیں رکھوں گا۔"

بڑے رائے اٹھے اور اندر چلے گئے۔ جاتے ہوئے دروازے پر رک کر بولے "کرشن میں جانتا ہوں تم اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے۔ لیکن تمھاری عقل تمھارے ساتھ ہے اور میری سوچ میرے ساتھ۔ جب تم نے پہلی بہو کے مرنے کے بعد اپنی پسند کی شادی دوسری ذات میں کی، دوسری ذات کا بچہ گود لیا، تو بیٹے کی شادی کے لیے اپنی ذات میں کیوں لوٹنا چاہتے ہو؟"

منجھلے رائے سٹپٹا گئے۔ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان کے اندر چلے جانے کے بعد بھی وہ کچھ دیر برآمدے میں کھڑے رہے۔ انھیں لگ رہا تھا اجنبی ماحول اور سوال وزنی پتھروں کی طرح ان کے گلے میں لٹک گئے ہیں۔۔ باہر جانے میں جیسے انھیں گھنٹوں لگے۔

گرور کی پیدائش کے بعد سارنگا بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے۔ رات کو

سوتے سوتے اٹھ بیٹھتی تھی اور چلانے لگتی تھی۔ اس زمانے میں پپیالے والے حکیم کا نام کافی مشہور تھا۔ بہت بڑے نباض مانے جاتے تھے۔ کافی کراماتی قصے مشہور تھے۔ ایک طرح سے اپیل کی عدالت عالیہ سمجھے جاتے تھے، جب کہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا تو پپیالے والوں کے پاس شفا ملتی تھی۔ سارنگا کو بھی حکیم جی کو بلا کر دکھایا گیا۔ حویلی میں تب بھی پردہ تھا۔ بھلے ہی چھوٹے بہوئے منہ کھول لیا ہو لیکن سارنگا پردے کی پابند تھی۔ سارنگا نے پردے کے پیچھے بیٹھ کر ہاتھ بڑھا دیا۔ حکیم صاحب نے دو تین بار نبض دیکھی۔

بعد میں حکیم صاحب کا بھی عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ ان کا علاج زیادہ نہیں چل سکا۔ ایک صبح جب مریض ان کے مطب پہنچے تو گھر خالی تھا۔ وہ اپنا سامان لے کر کہیں کوچ کر گئے تھے۔ کہاں؟ یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔ یہ تک نہیں معلوم تھا کہ ان کے خاندان میں کون کون ہیں؟ بس کبھی کبھی ایک زنانی آواز سنائی دیتی تھی۔ کوئی کہتا تھا تو کرانی ہے، کوئی کہتا کہ بیگم ہے۔ لوگوں کو ان کے اس طرح خاموشی سے چلے جانے پر تعجب ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ حکیم صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں اکثر اس طرح کے قصے ہوتے تھے۔ کوئی مسلمان مکان بھی بدلتا تھا تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ پاکستان جانے کے لیے سامان لد رہا ہے۔ خیر۔

سارنگا کی نبض دیکھ کر حکیم صاحب نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ "یہ آپ کی پہلی بیوی ہیں، دوسری ہیں یا تیسری؟"

میں نے بتایا "تیسری"

"پہلی بیوی سے کوئی بچہ ہے؟"

"جی نہیں، دوسری سے دو ہیں، ایک بیٹا، دوسری بیٹی۔"

"ان سے ان کا مزاج ملتا ہے یا نہیں؟"

میں تھوڑا جھجکا۔ حکیم جی شاید بولے "کوئی بات نہیں۔ ان کی نبض سے تو کوئی خاص بات پتہ نہیں چلتی۔ کچھ طاقت کی دوائیں لکھ دیتا ہوں۔ لیکن آپ انھیں سمجھائیں۔ ان کے دماغی بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کیجیے ـــــ جسمانی بخارات تو ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن دماغی بخارات کے علاج میں مریض اور تیماردار دونوں کا تعاون مطلوب ہوتا ہے۔"

دوائیں تیار کرائی گئیں۔ کوٹ چھان کر ساری دوائیں سارنگا کے سپرد کر دی

گئیں۔ مہینے بھر میں دوا ختم ہو گئی لیکن فائدے کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ایک نئی بات اور پیدا ہو گئی تھی۔ سوتے سوتے اٹھ بیٹھتی اور رونا شروع کر دیتی۔ وہ بتاتی تھی کہ کوئی عورت اس کی گود سے بچہ چھین کر لے جا رہی ہے اور جلتی آگ میں بھون رہی ہے۔ جو حلیہ بتاتی تھی۔ وہ کلا سے ملتا جلتا تھا۔ تعجب اس بات کا تھا کہ اس نے کلا کو دیکھا تک نہیں تھا۔ تصویر کوئی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ کبھی کوئی لڑکی ہوتی تھی کبھی لڑکا۔ اس کی اس کہانی کے ساتھ جھاڑ پھونک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ جس شخص کو کبھی نہیں دیکھا وہ اس کا حلیہ کیسے بیان کر رہی ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ کلا کی آتما سارنگا کو تنگ کرتی ہے!

رگھوبر پر اس واقعہ کا ردعمل کافی شدید اور انوکھا تھا۔ اس نے اندر جانا بند کر دیا تھا۔ نوکروں میں سے شاید کسی نے یہ بتا دیا تھا کہ جس عورت کا ذکر بہو جی کرتی ہیں وہی اس کی آنجہانی ماں ہیں۔ سونا بھی اس بات سے بہت پریشان تھی۔ ان دنوں گھر میں دھونیاں لگ رہی تھیں۔ جمعرات کی رات کو ندی پر دھار چڑھائی جاتی۔ دیوالی پر بڑے بڑے مذہبی پروگرام کیے جاتے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ کس طرح اس عورت اور ان کے بچوں کو سارنگا کے خوابوں سے باہر کیا جائے۔ جھاڑ پھونک کے بعد وہ کچھ دن تک نہیں آتے تھے۔ جھاڑ پھونک والے مونچھوں پر تاؤ دینا شروع کر دیتے تھے —— میں اس عورت کو زمین میں گاڑ کر کیل دیا ہے —— کبھی نہیں نکل پائے گی —— اس کے بچوں کو بھیرو بابا کے کھپڑ میں ڈال دیا —— بھیرو بابا میری موجودگی میں انھیں کچر کچر چبا گئے۔ اب تک بھیرو بابا انھیں ہضم کر گئے ہوں گے۔ لیکن پھر ایک دن وہ عورت زمین سے نکل کر سارنگا کے سپنوں میں آ موجود ہوتی ہے اور اسے اور اس کے بچوں کو پیٹنا شروع کر دیتی۔ شروع میں وہ اکیلی ہوتی بعد میں اس کے بچے بھی بھیرو بابا کے معدے سے نکل کر اس کی مدد کو آ جاتے۔

گھر کا سکون پھر درہم برہم ہو جاتا۔

چونکہ سونا اکیلی تھی اس لیے چپ چاپ اکیلی دیکھتی رہتی تھی۔ ویسے بھی اب وہ بڑی ہو گئی تھی اس لیے کھل کر تو کچھ نہیں کہتی تھی اکیلے میں روتی رہتی۔ ہاتھ جوڑ کر کہتی —— ماں تو

دیکھ رہی ہے۔ تو مجھے اپنے پاس بلا لے۔ میں اس نرک میں کب تک پڑی رہوں گی۔ رگھوبر تو باہر رہتا ہے ـــ نئی ماں رات دن ہم لوگوں کو کوستی ہے۔ چھوٹی دیدی بھی نہیں ہیں ـــ وہ بھی کبھی آتی ہے۔ پہلے تو سونا کہہ بھی دیتی تھی ادھر اس نے کچھ بھی بتانا بند کر دیا تھا۔ نہ وہ سارنگا سے کچھ کہتی تھی اور نہ سارنگا کوئی بات مجھے بتاتی تھی۔ بس یہ ہی ایک غنیمت تھا۔ اس کو الگ سے ایک کمرہ مل گیا تھا۔ وہ اسی میں لکھتی پڑھتی تھی۔ سارنگا کو اس پر بھی کافی غصہ آتا تھا۔ میں نے سونا سے کئی بار پوچھا ـــ تمھاری ماں دوا کھاتی ہے یا نہیں ـــ حالانکہ اسے پتہ تھا کہ سارنگا دوا کھاتی نہیں پیچھے کابک میں پھینک دیتی ہے ـــ لیکن سونا چپ رہتی تھی۔ ہاں کرتی تھی نہ نہیں

ایک دن پتہ نہیں سارنگا کو کیا ہوا کہ اس نے سوتے سوتے گرور کو اپنے پلنگ سے نیچے دھکیل دیا۔ چوٹ تو زیادہ نہیں لگی۔ نیچے قالین بچھا تھا۔ لیکن وہ زور زور سے رونے لگا۔ میں چونک کر اٹھا تو دیکھا گرور نیچے گرا ہوا ہے۔ سونا بھی اپنے کمرے سے دوڑ کر آگئی۔ سارنگا عجیب قسم کی سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں پلٹے تھی۔ سونا نے گرور کو گود میں اٹھا لیا۔ میں نے اس کے منہ پر چھینٹے دیے۔ چھینٹے دینے سے پہلی بار میں ہی اسے ہوش آگیا۔ ہوش آتے ہی سب سے پہلے اس نے پوچھا میرا۔۔ بچہ ـــ!

سونا کو گود میں لیے دیکھ کر وہ ایک دم بپھر گئی "ایک اتنی ہی بڑی لڑکی اور وہ عورت مجھ سے بچہ چھینے لیے جارہی تھی۔ اس عورت نے اسے زمین پر پٹخ دیا ـــ اتنا دھواں سارے میں بھر گیا کہ آنکھیں کھولے رکھنا مشکل ہو گیا سونا نے سمجھاتے ہوئے کہا "نہیں چھوٹی ماں ـــ بھیا سوتے میں پلنگ سے گر گیا تھا ـــ رویا تو میں دوڑ کر آگئی۔

"نہیں، اسے اس عورت نے پٹخا ہے ـــ تو بھی اس کے ساتھ تھی۔"

سونا کا بدن لرز اٹھا۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ یہ نیچے گرا ہوا تھا۔"

وہ چلائے جارہی تھی "مجھے اور میرے بچے کو وہ عورت کھا جائے گی ـــ مار ڈالے گی ـــ اسے سامنے سے ہٹاؤ۔"

اس وقت تک بڑے رائے کو خبر لگ گئی تھی۔ جب سے بڑے رائی یعنی ہماری ماں نہیں رہی تھیں ، بڑے رائے رات کے وقت حویلی کے اندر نہیں آتے تھے۔ لیکن اس رات وہ آئے۔ انھوں نے سارنگا کی آواز سن لی تھی۔ کمرے کے باہر سے ہی پکارا ''بھا سکر کیا بات ہے؟''

''آج پھر سپنا دکھائی دیا'' وہ کہہ رہی تھی میرے بچے کو وہی عورت کھینچے لیے جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی ''سونا کا نام لے رہی تھی۔''

بڑے رائے بلند آواز میں بولے ''بہو کی حالت بگڑتی جا رہی ہے ـــــ اب یہ لحاظ بھی ختم ہو گیا کہ کس کے لیے کیا سوچے اور کیا کہے؟ تم کل رات کی گاڑی سے آگرہ چلے جاؤ اور وہاں بھرتی کرا دو۔ سول سرجن بتا رہے تھے کہ نہ یہ بیماری ہوتی ہے اور نہ بھوت پریت آتا ہے ـــــ آدمی اپنے آپ ہی تصور کرتا رہتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے ـــــ جب تک یہ چکر نہیں ٹوٹے گا بہو ٹھیک نہیں ہو گی۔ وہ لوگ بجلی کے جھٹکے دے کر اس چکر کو توڑتے ہیں۔''

یہ بات سارنگا نے بھی سنی تھی۔

ان کی بات سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ بڑے رائے مزید کچھ کہے سنے بغیر الٹے پیروں لوٹ گئے۔ سونا بچے کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ بھوانی اسے سمجھا رہا تھا۔ سارنگا مبہوت سی بیٹھی تھی۔ گرور کا رونا کم ہو گیا تھا۔

اس نے اندر آتے ہی پوچھا ''کیا بڑے رائے مجھے گھر سے نکال رہے ہیں؟''

''نہیں علاج کے لیے آگرہ بھیج رہے ہیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی!''

''لگتا ہے بڑے رائے نے سب انتظام کر دیا۔ ڈاکٹروں کی رائے لے لی۔ لگتا ہے اس بیماری کا علاج وہیں ہو سکتا ہے۔''

''میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی ـــــ وہی عورت مجھے میرے گھر سے نکال رہی ہے۔ تم سب اسی سے ملے ہو۔''

پتہ نہیں کیسے مجھے یکایک لگا کہ سارنگا اپنی حد پوری کر رہی ہے۔ میں بولا ''دیکھو سارنگا، اگر تم عورت عورت کا گانا بند نہیں کرو گی تو اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچے گا کہ تمھیں لے جا کر آگرہ کے پاگل خانے میں بھرتی کرا دوں۔ بچہ تمھارے ہاتھ سے گرا اور تم

سپنے میں دیکھی کسی عورت کی بات کر رہی ہو ـــــ یہ پاگل پن نہیں تو کیا ہے؟ وہاں رہے بغیر تمھارے دماغ سے عورت کا یہ بھوت نہیں نکلے گا۔ جس عورت کا تم ذکر کرتی ہو وہ بھی کسی بھگوان کو پیاری ہو چکی۔ تم نے آج سونا کو الٹا سیدھا بکا ہے، مجھے بھی کہا ہے ـــــ اگر حالت ایسی رہی تو ہمارے پاس یہی ایک راستہ بچے گا ـــــ"

سارنگا یکایک ٹوٹ گئی۔ وہ میرے پاؤں پکڑ کر زور زور سے ہچکیاں لینے لگی "مجھے وہاں نہ بھیجو۔ میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی ـــــ وہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

رگھوبر اب جوان ہو گیا تھا۔ اسے گھر میں اچھا نہیں لگتا تھا۔ سونا سے بھی اس کی زیادہ نہیں پٹتی تھی۔ سونا کو لگتا تھا کہ وہ باہر گھومتا رہتا ہے اور وہ حویلی میں بند پڑی رہتی ہے۔ اس کی کوئی خاص دوست بھی نہیں بن پائی تھی۔ اسکول میں زیادہ پڑھائی نہیں ہوتی۔ گھر میں جتنی پڑھائی ہوتی اس میں دوست بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات دونوں بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیتی تھی۔ یہاں تک کہ جب بھی کبھی رگھوبر اندر آتا تھا، کہا سنی ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ کبھی وہ کھانے کے بارے میں کچھ کہہ دیتا ـــــ تو میرے کھانے کو مت چھوا کر ـــــ وہ ناراض ہو جاتی۔ رگھوبر کی ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اس سلسلے میں رگھوبر کو کچھ کہے بغیر نہیں رہتی۔ رگھوبر اسے سخت سے سخت جواب دینے کی کوشش کرتا ـــــ تو کیوں چڑھتی ہے؟ گھر میں بند پڑی رہ۔ تجھے کیا لینا دینا۔

ان کے تعلقات میں کچھ دیر کے لیے تلخی آجاتی تھی لیکن دونوں الگ الگ ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے تھے۔ رگھوبر کو لگتا تھا اس کی ایک ہی بہن ہے۔ سب سے الگ تھلگ پڑی ہوئی ہے۔ نئی ماں سے بنتی نہیں۔ میرے آنے کا انتظار کرتی رہتی ہے اور میں ہوں کہ اس سے لڑ بیٹھتا ہوں۔ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ سونا کے من میں بھی اسی طرح کے سوال گھومتے رہتے۔ رگھوبر مجھ سے کیوں لڑتا ہے؟ میں اس کی کیوں نہیں برداشت کر پاتی؟ کیوں لڑنا شروع کر دیتی ہوں؟ کیا وہ میرا ماں جایا نہیں ہے؟ رگھوبر کے پیدا ہونے سے پہلے ماں کتنا چاہتی تھی کہ بیٹے کا منہ دیکھ لے۔ دیکھے بغیر مر گئی۔ میں ہی رہ گئی۔ کہیں میں اس سے

جلتی تو نہیں!؛ وہ بھی تو باہری لڑکی کے آگے پیچھے گھومتا پھرتا ہے، مجھ سے چڑ کر بات کرتا ہے۔ میں اس کی بہن ہوں۔ وہ کون ہوتی ہے؟ کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ سگی ہے؟ اس پرائے پن کو بھوت سوار تھا جو اسے اپنائیت سے بھٹکا رہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے بارے میں اپنے برتاؤ سے دل شکستہ ہوتے تھے لیکن ایک دوسرے پر چوٹ کرنے کے موقع سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اس صورت حال کی وجہ سے یا کسی اور سبب کی بناپر سارنگا نسبتاً پر سکون تھی۔ وہ گرور کو زیادہ سے زیادہ بچا کر رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ بڑے رائے بھی گرور کو پیار کرتے تھے۔ بس فرق اس وقت ابھرتا تھا جب رگھوبر کے لیے کوئی کپڑا بن جاتا تھا یا نیا جوتا آتا تھا اور گرور کے لیے نہیں آتا تھا۔ بڑے رائے اس طرح کی عورتوں والی باتیں بہت ناپسند کرتے تھے۔ سارنگا سمجھتی تھی کہ اس کے بچے کے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔

حویلی کا اندرونی مرکز جس میں سارنگا، سونا، رگھوبر، خاندان اور جزوی طور پر میں بھی تھا، رہ رہ کر بے چین ہوتا رہتا تھا۔ کبھی اس بے چینی کی لہریں باہر تک بھی آ پہنچتی تھیں۔ بڑے رائے ان لہروں کو محسوس کر کے رہ جاتے تھے۔ وہ اس وقت تک کچھ نہیں کہتے تھے جب تک بے چینی حد سے نہ گزر جائے۔ اب نہ چھوٹے رائے تھے نہ رحمت اللہ میں تھا، میں ان دونوں کے درمیان ایک پتھرے کی طرح پھنس جاتا تھا۔

رگھوبر میں ایک تبدیلی آ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے تمام چیزوں کے بارے میں اس کا نقطہ نگاہ منفی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی نفی کا سب سے پہلا شکار وہ ڈسپلن تھا جو اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ بڑے رائے بوڑھے ہو رہے تھے، رگھوبر جوان اور میں بیچ میں تھا۔ بیچ کا شخص یا تو خود دبتا چلا جاتا ہے یا پھر پھیلتے پھیلتے اتنا پھیل جاتا ہے کہ ارد گرد والوں کو دبا لیتا ہے۔ میری حالت پہلے والی تھی۔

گاندھی جی نہیں رہے تھے۔ ویسے تو لوگوں کا کہنا تھا کہ گاندھی جی کا قتل تو اسی دن ہو گیا تھا

جس دن ملک تقسیم ہوا تھا۔ ملک تقسیم کرنے والے بھی چاہتے ہے کم نہیں تھے۔ ہمارے یہاں بھی بڑے رائے دھیرے دھیرے کمزور ہو رہے تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے سب کچھ تقسیم ہو گیا تھا۔ گھر یا ملک، جب گھر کا بڑا چاہتا ہے کہ متحد رہیں اور سب کچھ بٹ جاتا ہے تو جینے یا مرنے کے بیچ کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔ ملک بٹ گیا تھا۔ گاندھی مر گئے تھے۔ حکومت میں بیٹھے لوگ حکومت کو دیسی آم کی طرح چوسنے میں مشغول تھے۔ جب گاندھی جی مرے تو اور تو اور بڑے رائے بہت روئے تھے۔ رگھوبر کو لگا تھا کہ ایک بوڑھا مرتا ہے تو وہ مرے بوڑھے کو بھی اپنا وقت سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ جتنا وہ بڑے رائے کی حسیت کا جزو تھا، بڑے رائے اس کے احساس کا حصہ تھے اتنا ہی وہ ان سے دور چھٹکتا جا رہا تھا۔ بڑے رائے اس کے اس برتاؤ سے پل پل ٹوٹ رہے تھے۔ جس بات کی انھوں نے اس سے امید کی تھی، اس بات کی توقع وہ رگھوبر سے کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بڑا ہو کر ان کا نام روشن کرے گا۔ اسے دیکھ کر لوگ سوچیں گے کہ یہ ہری رائے کا پوتا اور جماعنکر رائے کا بیٹا ہے۔ اس نے ڈوبتے خاندان کو بچا لیا تب انھیں اس گاندھی جی کا خیال آتا تھا جنھیں وہ زندگی بھر سر پھرا اور سنکی مانتے رہے تھے۔ یہ کہتے رہے تھے کہ کیا یہ گاندھی جی ہومیو کے لیپ کے ذریعہ بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، بکری کا دودھ پیتے ہیں ___ صرف چرخہ چلا کر انگریز جیسی طاقت سے ملک آزاد کرالیں گے؟! اب سوچتے تھے کہ میری طرح گاندھی جی کو یہی لگتا ہوگا کہ ان کے وارث ان کی لائی آزادی کو پروان چڑھائیں گے ___ ان کی ساکھ میں اضافہ کریں گے ___ لیکن انھی کے جیتے جی وہ سب تنکوں کی طرح تیرنے لگے۔ گاندھی جی جہاز کی طرح ڈوبنے لگے۔ انھیں اس سلسلے میں رگھوبر یاد آتا تھا۔ وہ میری بات کبھی نہیں سوچتے تھے۔ ان نے کیا کیا۔ یا رگھوبر کیا کرے گا ___ انھیں اس بات کی فکر تھی۔ گرور ابھی چھوٹا تھا۔ میں کچھ نہ کر سکتا تھا نہ کر پا رہا تھا حالانکہ گھر میں ہی رہا تھا۔ میں جن حالات میں وہ سن نباہ رہا تھا وہ حالات سابقہ حالات سے بالکل الگ تھے۔ تب مجھے بڑے رائے کے لیے کرنا پڑتا تھا۔ ان ہی کے پاؤں میں سب کا پاؤں تھا۔ وسائل کافی تھے۔ اب وسائل ختم ہو چکے تھے اور کرنا تین نسلوں کے لیے تھا۔ میں سارنگا اور گرور دونوں کے درمیان کہیں تھا۔

مجھے بھی ان کی اس تشویش سے بیزاری ہونے لگی تھی کہ رگھوبر ان کا نام چلا سکے گا یا نہیں۔ نام کا کیا، نام تو اندراج کی بات ہے۔ ریکارڈ میں تو میرا نام اس کی ولدیت کے خانے

میں کیا تھا۔ فکر مجھے ہونے چاہیے تھی۔ بڑے رائے تو میرے والد تھے۔ لیکن میں کیا تھا؟ صرف ایک کمزور پل جوان دونوں کناروں کو جوڑتا تھا۔ ایک چھلک رہا تھادوسرا گھٹ رہا تھا۔

رگھوبر تقسیم ملک، فسادات، آزادی سب کو پار کرتا ہوا ایسے مقام پر کھڑا تھا جہاں گھر، خاندان، چھوٹا بڑا ـــــ سب غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ گھر، سرائے اور گھر والے ـــــ اس سرائے میں رہنے والے بچھڑا ان پہچان مسافر ـــــ بس! وہ آتا تھا، کھاتا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل جاتا تھا۔ ہم اس کا آنا بھی دیکھتے تھے اور وہ ہمیں جاتا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ بڑے رائے ایک لمبی سانس لے کر چپ بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی کبھی پوچھتے تھے ـــــ یہ تم نے کیا رویہ اپنا رکھا ہے؟ آخر تم اپنی زندگی کو چوپٹ کرنے پر کیوں تلے ہو؟ وہ عموماً ان کا جواب دیتا نہیں تھا۔ دیتا تھا تو دو ایک لفظوں میں ـــــ ایسا کچھ نہیں ہے ـــــ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کا یہ جواب ان کے ہی نہیں، میرے سینے پر بھی سانپ کی طرح لوٹ جاتا تھا۔

رگھوبر کے پڑھنے لکھنے میں کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ رانی کبھی کبھی اس سے اس بات کے لیے لڑ بیٹھتی تھی۔ تب وہ اس سے دو تین دن کے بات کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ اس بے چاری کو ہی منانا پڑتا تھا۔ جب رگھوبر بڑا ہو رہا تھا تب میں نے محسوس کیا تھا کہ لڑکے ہی دن میں خواب نہیں دیکھتے، بوڑھے بھی دیکھتے ہیں۔ بڑے رائے اور میں بھی بیٹھے بیٹھے خوابوں میں گم ہو جاتے تھے ـــــ ہمیں کیا فکر ـــــ تھوڑے دن کی پریشانی ہے ـــــ رگھوبر بڑا ہوگا ـــــ ساری تکالیف ختم ہو جائیں گی۔ ارن بھلے ہی کتنا بڑا آدمی ہو گیا ہو ـــــ رگھوبر اس سے بھی بڑا ہوگا۔ ہو سکتا ہے ایک بار پھر سب مل جائیں ـــــ کم از کم ان میں منجھلے اور رنجن کو بھی شریک کر لیتا تھا ـــــ بڑے رائے چاہے نہ بھی کرتے ہوں۔ پھر سوچتا تھا ـــــ گاندھی بھی یہی سوچتے ہوں گے ـــــ سوچتے ہی نہیں دیکھتے ہوں گے ـــــ جو یہاں سے وہاں چلے گئے یا وہاں سے یہاں آ گئے ـــــ سب کو ملا دیں گے۔ موقع ہی کہاں آیا ـــــ ہم لوگوں نے ہی نہیں آنے دیا۔ لیکن میں خواب دیکھنا نہیں چھوڑتا تھا۔ جب سب مل جائیں گے تو پرانے دن لوٹ جائیں گے ـــــ پہلے لاٹ کھانے پر آتے تھے اب وزیر آیا

کریں گے۔

بڑے رائے کی خواہش جواہر لال جی سے ملنے کی تھی۔ ایک بار انھوں نے خط بھی لکھا تھا ـــــ ان کے سکریٹری کا جواب آیا تھا کہ وزیر اعظم کو آپ سے مل کر بہت خوشی ہوتی لیکن وہ ان دنوں بہت مصروف ہیں۔ وہ آپ کے ان جذبات کی قدر کرتے ہیں اور نیک خواہشات بھیجتے ہیں۔ انھیں لگا کہ ایسا تو کبھی انگریزوں نے بھی نہیں کیا۔ جب ملے ہی نہیں تو نیک خواہشات لے کر کیا چاٹوں گا؟ انھوں نے یہ سوچ کر کہ ملک آزاد ہے، رگھوبر سے ہندی میں خط لکھوایا تھا۔ جواب انگریزی میں آیا تھا۔

اس بات نے انھیں کئی دنوں تک سست بنائے رکھا تھا۔ ایک دن میں نے انھیں سمجھایا بھی کہ آپ جگن بابو کو لکھ کر دیکھیں ہو سکتا ہے وہ آپ کو ملا دیں۔ بڑے رائے نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب میں نے یہ بات دوہرائی تو وہ بولے نہیں۔ یہ بات ان کے جواب کے ساتھ ختم ہو گئی "تھوڑی دیر بعد بولے" دوسروں سے امید ہمیشہ اپنے برتاؤ کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہیے۔

میں سمجھ گیا۔ بڑے رائے ابھی بھولے نہیں۔ ان کی پتلیاں پارے کی دو گولیوں کی طرح ہو گئی تھیں ـــــ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، ڈھل ملتی ہوئی۔

رگھوبر تاڑ کی طرح لمبا ہو گیا تھا۔ اس کی اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ کدھر جانا ہے۔ پڑھنے میں اس کی طبیعت نہیں لگتی تھی۔ آزادی کے بعد اسکولوں کالجوں میں ایک نیا انقلاب آگیا تھا۔ آزادی کا اور حکومت کا۔ کالجوں میں کھلے چناؤ ہونے لگے تھے۔ یونین بننے لگی تھی۔ لڑکے عہدے دار چنے جاتے تھے۔ ان کی پارلیمنٹ ہوتی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ اپنے مسائل پر بحث کرتے تھے۔ پرنسپل کے سامنے مطالبات پیش کرتے تھے۔ اساتذہ بیچ سے ہٹ گئے تھے۔ اس لیے وہ دوسری طرح سے حصے داری کرنے لگے۔ رگھوبر کی دلچسپی بھی اس میں بڑھنے لگی تھی۔ چھوٹے چھوٹے انتخابات بھی لڑنے لگا تھا۔ پڑھنے میں طبیعت لگنا اور کم ہو گیا تھا۔ رنجن ایک کلاس میں تین تین چار چار بار فیل ہو کر کالج چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سایہ رگھوبر پر بھی موجود تھا۔

بڑے رائے کو یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ۔ وہ کہتے تھے کہ اگر لڑکوں کو ابھی سے سیاست میں ڈالا گیا تو وہ پڑھیں گے کیا؟! انگریز کیا احمق تھے؟! اگر کوئی فائدہ ہوتا تو کیا وہ سب نہ کرتے؟ وزیروں اور اسمبلیوں کے اراکین کو کھدر کے کپڑے پہنتے گھومتے دیکھ کر ان کا ذائقہ اور خراب ہو جاتا تھا۔ وہ بلاوجہ ان کا موازنہ برطانوی حکومت کے حکمرانوں سے کرنے لگتے تھے۔ حکومت ایسے ہی نہیں کی جاتی اس کے لیے حاکم بننا پڑتا ہے۔ حاکم بنے بغیر دبدبہ قائم نہیں ہوتا۔ دبدبے کے بغیر افسر اور بغیر آب کے موتی ـــــ ان دونوں میں زیادہ فرق نہیں۔ اس کے لیے قلم میں طاقت، آواز میں بلندی اور شخصیت میں دھمک ضروری ہے۔ وہ مایوس ہو گئے تھے۔ گاندھی جی تو انھیں لنگوٹی پوش لگتے تھے۔ وہ انھیں مہاتما سمجھ کر معاف کر دیتے تھے۔ لیکن ان سب کو کیا ہو گیا؟ وہ حاکموں کی طرح کیوں نہیں رہتے۔ ان کا سارا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ وزیروں کے بارے میں بھی۔ افسران کے بارے میں بھی۔ ایک بار وہ اپنے پرانے دوست شود سانی آئی۔ سی۔ ایس سے ملنے گئے تھے۔ وہ انھیں دیکھ کر متعجب ہوئے۔ شود سانی اپنا صاحبی لباس چھوڑ کر بند گلے کا باجے والوں کا کوٹ پہنے تھے۔ ان کی شخصیت کی ساری دھمک ختم ہو گئی تھی۔

شود سانی صاحب نے فوراً پوچھا "مسٹر بڑی رائے، یہ آپ کو کیا ہو گیا؟ آپ نے ہمارے سینیر بیر بہادر کی اتنی زبردست پیروی کی کہ وہ چھوٹ گئے۔"

بڑے رائے ہنس کر بولے "شود سانی صاحب، اب تو مجھ میں اپنی پیروی کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ لیکن آپ یہ سب کیا پہنے ہیں؟" وہ ہنس کر بولے "رائے صاحب، ہم سول سروینٹ ہیں۔ بے وجہ نہ اپنے دانت دکھاتے ہیں نہ ہاتھ! تب اس حکومت کے بندے تھے اب اس حکومت کے ہیں" پھر رک کر بولے "میں آپ کی تکلیف جانتا ہوں۔ آپ کے لیے بدلنا مشکل ہے کیونکہ آپ نے اپنی حدود میں رہ کر خود مختاری کی ہے۔"

شاید آزادی کے بعد ان کی کسی افسر دوست سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ ان کے پرانے دوست شہر میں آتے رہتے تھے لیکن وہ کبھی کسی سے ملنے نہیں جاتے تھے۔ نہ وہ آتے تھے اس بات کا انھیں افسوس تھا۔ جو لوگ تب دوڑ کر ملتے تھے اب وہ ادھر رخ ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کے دل میں ایک بات گھر کر گئی تھی وہ اب خالی برتن ہیں۔ بھرا ہو تو کتا بھی پاس آتا ہے نہ ہو تو دور سے ہی سونگھ کر چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات منہ سے کہنے میں انگی

وضعداری مانع تھی۔

اب وہ رگھوبر کے بارے میں سپنے نہیں دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی اگر سوال پیدا ہوتا تھا تو یہ ہی ہوتا تھا کہ زمینداری تو میری زندگی میں ہی ختم ہو گئی تھی ــــ رہی سہی بھی ختم ہو جائے گی ــــ کچھ دودھ والے جانور بچے تھے، گھوڑے مر چکے تھے ــــ حویلی کی جو دیواریں چھپائی رہتی تھیں ان سے پلوڑے جھڑنے لگے تھے ــــ اگر کبھی رگھوبر پیروں پر کھڑا ہوا تو کیا کرے گا؟ ہاں اور وہ افسر بھی بن گیا تو کیسا افسر بنے گا؟ نئے انداز کا یا پرانی ساکھ کا۔ پھر انھیں منجھلے راے کا خیال آجاتا ــــ افسر تو کرشن بھی بنا تھا؟ کبھی اس کے وزیر بننے کی بات بھی ذہن میں آتی تھی ــــ اس کے ماما پارٹی کی اہم ہستی ہیں لیکن انھیں وزیر بنتا ناپسند تھا۔ لیکن اس پر بھی بذاتِ خود سادگی کا بھوت سوار ہے۔ جب اس کی پڑھائی کے بارے میں سوچتے تھے تو ان کا بنا بنایا محل تاش کے پتوں کی طرح ڈھیر ہو جاتا تھا۔ ہمارا زمانہ دوسرا تھا۔ کم پڑھے لکھوں کو بھی خاندانی شرافت کی بنا پر قدر ہوتی تھی۔ وہ معیار اب بدل گیا۔ بس پڑھائی بچی ہے۔ جب سب کچھ جاتا نظر آتا تو وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی ڈانٹتے بھی تھے۔ دراصل انھوں نے اچھے سے اچھے دن دیکھے تھے۔ بڑے سے بڑے دنوں کے تصور میں گم رہنا ان کی عادت بن گئی تھی۔ میں اندر ہی اندر ان حالات سے نبرد آزما تھا اور الگ بھی تھا۔ تب دعوتوں کا بندوبست رہتا تھا۔ اب کھانے پینے اور باہر کی شان و شوکت بنائے رکھنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ میرے لیے بڑے دنوں کا تصور ڈراونا تو تھا لیکن اتنا نہیں، کیونکہ میں جانتا تھا کہ جب وقت کی مار پڑے گی تو وہ بھی سنبھلے گا جیسے میں سنبھل گیا۔

آسمان میں معلق گھر کا وہ ماحول، وسائل کی کمی اور رگھوبر کی بیکاری کی وجہ سے میں گیس رستے غبارے کی طرح دھیرے دھیرے نیچے آرہا تھا۔ گزر بسر کا ذریعہ کاشت تھی۔ کاشت کے سہارے ہی گھر کے سارے بچے کھچے خرچے چلتے تھے۔ میں سائیکل پر جاتا تھا۔ سائیکل چلاتے ہوئے مجھے اپنا وہ زمانہ یاد آتا تھا۔ تب سائیکل صرف میرے ہی پاس تھی۔ لوگ راستہ چھوڑ کر سائیکل کے گھومتے پہیے دیکھتے تھے اور اب مجھ جیسے بہت سے سائیکل سوار سڑک پر چلتے ہوتے تھے۔ شروع شروع میں اگر کسی کی گھوڑا گاڑی نظر آتی تھی تو میں چھپنے کی

کوشش کرتا تھا۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ کوئی کیا کہے گا کہ رائے خاندان کی حالت اتنی پتلی ہو گئی کہ ایک گھوڑا بھی میسر نہیں۔ کچھ دن بعد میں ان سائیکلوں کے بیچ پوری طرح سما گیا۔ دن بھر کھیتوں پر کھڑا ہو کر ہل چلواتا تھا، کبھی کبھی خود مجھے بھی چلانا پڑتا تھا ــــ شروع شروع میں لوگوں نے منع کیا ــــ مالک آپ ہل چلائیں گے؟ ــــ پھر انھیں بھی عادت پڑ گئی بلکہ الٹے مجھ سے امید کرنے لگے کہ بیچ بیچ میں ہل کا مٹھ پکڑوں۔ میں اگر پکڑتا تھا تو اپنی مرضی سے۔

ادھر گرور کے بارے میں سارنگا پریشان رہتی تھی اسے لگتا تھا کہ گھر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ رگھوبر کے لیے ہوتا ہے۔ بڑے رائے کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ ہی تھا کہ اگر کچھ کرے گا تو رگھوبر ہی کرے گا۔ پھر بھی یہ بات نہیں کہ گرور کے لیے کچھ نہ کرتے ہوں۔ رگھوبر کالج جاتا تھا۔ بڑے لوگوں سے ملتا جلتا تھا اس لیے کپڑے لتے، جوتے وغیرہ اسی کے زیادہ بنتے تھے۔ گرور کے بھی بنتے تھے لیکن کچھ کم۔ سارنگا کو جب غصہ آتا تھا تو گرور کو مارنے لگتی تھی یا گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گیا ــــ یہاں تیری کس کو ضرورت تھی؟ پیدا ہونا ہی تھا تو کسی اور کوکھ سے پیدا ہوتا۔ میری اس جلی کوکھ سے کیوں پیدا ہو گیا؟ لوگوں کے بچوں کا تو مرے پر بھی اڈیار ہوتا ہے ــــ میرے بچوں کو تو میرے جیتے جی بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ سونا ویسے تو چپ ہی رہتی تھی۔ کبھی جب اسے برا لگتا تھا تو بول بھی پڑتی تھی ــــ یہ سب کیوں کہتی ہیں ــــ گرور برا تھوڑا ہی ہے ــــ اس کے لیے بھی سب کچھ ہو گا۔ جب رگھوبر کے برابر ہو جائے گا تو اس کے لیے بھی وہی ہو گا جو رگھوبر کے لیے ہوتا ہے۔ اس بات سے وہ اور ناراض ہو جاتی تھی ــــ سونا کو بھی اول فول سنانے لگتی تھی ــــ تجھے کیا ــــ تو تو ہاتھ پیلے کر کے چلی جائے گی۔ جلنا تو مجھے اور اس کمبخت کو ہی ہے۔ تم سب تو میرے اندر جلتی آگ میں مٹی کا تیل ڈالنے والے ہو۔ سونا رونے لگتی۔

میں سارنگا کو بہت سمجھاتا تھا۔ بھید بھاؤ کی یہ باتیں چھوڑ دے۔ یہ تجھے کہیں نہیں لے جائیں گی۔ اس سے نہ گرور کو اپنا بنا سکو گی نہ رگھوبر کو۔ سب کو اپنا بنا کر چلنے کی سوچ۔ سونا تجھے ویسے ہی اچھی نہیں لگتی۔ لیکن اسے میری کوئی بات نہیں جچتی بس ایک ہی مثبت بات تھی کہ گرور سونا اور رگھوبر کو بہت مانتا تھا اور وہ اسے مانتے تھے۔

مجموعی طور پر ماحول کچھ ایسا بنتا جا رہا تھا جیسے مچھلیوں کے مرنے سے پہلے ندی کا

پانی رنگ بدلتا ہے اور پھر زہریلا ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر سب پر تھا۔ سب لڑ کھڑا رہے تھے جن کے کلیجے مضبوط تھے وہ سب کچھ چپ چاپ برداشت کر رہے تھے۔ بڑے راے سب سے زیادہ برداشت کرتے تھے۔ جیسے ہی ان کا جسم لاغر ہوتا جا رہا ہو۔

رگھوبر انٹر میں دوبار فیل ہو کر بی۔اے میں آیا تھا۔ یہ ایک جشن بھی اور مایوسی بھی۔ جشن اس لیے کہ وہ انٹر کی دہلیز پار کر گیا تھا اور ناامیدی اس بات کی کہ اگر یہ جلوس اسی طرح چلا تو کب اور کہاں پہنچے گا۔ وہ گھر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ صرف دو بار کھانے کے وقت آتا تھا باقی باہر۔ بڑے راے کو اب نہ باہر جانا ہوتا تھا اور نہ گھر میں کوئی کام۔ بس کبھی کبھی دو بچی زمینداری کے کاغذ دیکھتے ہوتے تھے یا کبھی کوئی اتفاقی مصیبت آ جاتی تھی تو کسی افسر یا متعلقہ سے ملنے جانا ہوتا تھا۔ اس سب کے باوجود انھیں دن بھر رگھوبر کا انتظار رہتا تھا۔

مجھے فارم سے لوٹنے پر کئی بار دیر ہو جاتی تھی۔ ان کے پیار کی آنچ مجھے تب ہی محسوس ہوتی تھی۔ وہ یا تو دروازے کی طرف تکتے رہتے تھے یا صحن میں ٹہلتے ملتے تھے۔ ان کے دماغ میں منجھلے راے کے ساتھ ہو چکا برسوں پہلے والا واقعہ تیزی سے گھومنے لگتا تھا۔ جیسے ہی میری سائیکل اندر داخل ہوتی ان کی چہل قدمی رک جاتی۔ کچھ دیر تک وہ مجھے اندر آتا ہوا دیکھتے رہتے۔ میری چال بھی دھیمی ہوتی جاتی۔ سائیکل کی کرکر بھی کم ہونے لگتی۔ رگھوبر ان سے ڈرتا ہو یا نہ ڈرتا ہو میں اب بھی ان سے ڈرتا تھا۔ میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ اندر چلے جاتے تھے۔ میں سمجھ جاتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ میں دل ہی دل میں طے کر لیتا تھا کہ خواہ کچھ بھی کہیں میں چپ رہوں گا۔ کئی بار میرا یہ ارادہ پورا ہو جاتا تھا اور کئی بار یہ تشنۂ تکمیل رہ جاتا تھا اور میں لب کشائی کر بیٹھتا تھا۔ اس دن نہ وہ کھاتے تھے اور نہ میں۔

وہ ہر بار یہی کہتے تھے "تم کیا وہاں سے گھنٹہ بھر پہلے نہیں چل سکتے؟ گھنٹے بھر میں وہاں کون سا کام ہو جاتا ہے۔ تم دونوں سمجھتے ہو بڑھاپا گل ہو گیا۔"

میں کہتا "نہیں آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟"

اس لیے سوچتا ہوں کیونکہ تم ایسا سمجھتے ہو ـــــ تمھارا طرزِ عمل یہی بتاتا ہے۔ میں تو مرنے کو بیٹھا ہوں ـــــ تمھیں کچھ ہو گیا تو کیا کروں گا؟" وہ پھر اسی سوال پر لوٹ

آتے "آخر تم گھنٹہ بھر پہلے کیوں نہیں چل سکتے؟ گاڑی کی بات اور تھی، سائیں اور چڑ کتا ساتھ رہتے تھے۔ سائیکل کا کیا؟"

رگھوبر ہوتا تھا تو اس قسم کے سوالوں کا جواب دے دیتا۔

میں ہر چند کوشش کرتا تھا کہ خاموش رہوں۔ زیادہ چپ رہنے پر بھی ان کی زبان تلخ ہو جاتی تھی "کیا تمھارے منہ میں زبان نہیں؟"

کبھی کبھی بات مجھے کھل جاتی تھی کہ میں اتنا تھکا ماندہ آیا ہوں کہ بڑے رائے مجھے مسلسل پھٹکار رہے ہیں۔ میں کہہ اٹھتا "کام بیچ میں کیسے چھوڑ دوں۔ آخر کسانوں کو بتانا پڑتا ہے، ان کی سننی پڑتی ہے ـــــ کام پورا نہیں ہوگا تو آخر اس گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟"

وہ بگڑ جاتے۔ اپنا سر پیٹ لیتے ـــــ میرے ہی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔"

یہ ان کی ایک نئی عادت پڑ گئی تھی یا تو زیادہ جذباتیت کے سبب یا پھر انھیں لگنے لگا تھا کہ وہ کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ زمانہ جب ان کے پیشاب سے چراغ جلتا تھا، اب ان کا منہ چڑانے لگا ہے۔ جو ان کے مادے سے پیدا ہوا وہی ان سے آنکھیں ملاتا ہے۔ یہی ان کا سب سے بڑا دکھ بنتا جا رہا تھا۔

رگھوبر کا سب سے بڑا دوست بھی بھوانی تھا اور دشمن بھی۔ دن بھر وقفے وقفے سے بڑے رائے رگھوبر کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ رگھوبر ابھی آیا یا نہیں؟ چونکہ زیادہ تر ان کے آس پاس رہتا تھا اس لیے ان کے سارے سوالوں کا مخاطب وہی ہوتا تھا۔ وہ رگھوبر سے خوش ہوتا تھا تو ٹال جاتا تھا۔ بہانہ بنا دیتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کتابیں لے کر کسی دوست کے پاس پڑھنے گئے ہیں۔ بڑے رائے ان کی طرف دیکھ کر چپ ہو جاتے تھے۔ ویسے انھوں نے دنیا دیکھی تھی۔ بہت سی باتیں بنا کہے سمجھ لیتے تھے۔ انھوں نے جس قدر، مستقبل کو مٹھی میں بند کر کے رکھا تھا اسی قدر حال اب ان کی مٹھی سے بالو کی طرح کھسک رہا تھا۔ وہ اس بات کو جاننے لگے تھے لیکن اس پر یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بھوانی جب کبھی رگھوبر سے ناراض ہوتا تھا یا بار بار کی جانے والی حکم عدولی سے غصہ ہوتا تھا تو کہہ بھی دیتا تھا کہ ـــــ ان کا کبھی پتہ رہتا ہے۔ بیٹھے ہوں گے کسی سنیما میں۔ سنیما کے نام پر بڑے رائے کو بہت غصہ آتا تھا۔

اس دن اس کے لیے در معافی بند ہو جاتا تھا۔ زبردست پھٹکار پڑتی تھی۔ وہ سمجھ جاتا تھا کہ یہ بھوانی کاکا کی کارستانی ہے۔ دو چار دن دونوں میں کشیدگی رہتی تھی لیکن رگھوبر کا کام بھوانی کے بغیر نہیں چل پاتا تھا۔ جب سے لوگ حویلی کی دیوانی سے بچے تھے تب سے سارا خرچ بھوانی کے ہاتھوں میں ہی ہوتا تھا۔ صبح اسے روپے دے دیے جاتے تھے، دن بھر اندر باہر کا سارا خرچ وہی کرتا تھا۔ شام کو حساب لکھوا دیتا تھا۔ رگھوبر، گرودر، سوما، سارنگا حتیٰ کہ مجھے بھی ضرورت ہوتی تھی تو اسی سے روپے مانگتے تھے۔ رگھوبر کے تو سارے کام اسی کی بدولت ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان کشیدگی جلد ختم ہو جاتی۔

بھوانی جانتا تھا کہ رگھوبر کے طرز عمل نے بڑے رائے کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ امید کی ایک کرن بھی کہیں سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ افق پر تاریکی ہی تاریکی ہے۔ ان کے ولایت سے لوٹنے پر ان کی دنیا میں جب اسی طرح بادل گھر آئے تھے اور اندھیرا چھا گیا تھا تو رگھوبر بھلے ہی چھوٹا رہا ہو، تارے کی طرح چمکتا تھا اور لگتا تھا وہی ان کا نام روشن کرے گا اور جو اندھیرا مسلط ہو گیا ہے، اسے کاٹ دے گا۔ اس وقت ان کے ذہنی افق پر جو اندھیرا ابھرا تھا وہ ان کی اسی سوچ سے منتشر ہو گیا تھا۔ لیکن اب؟ گرودر کے بارے میں وہ کبھی اس طرح سوچ نہیں پاتے تھے۔ ویسے بھی گرودر اتنا چھوٹا تھا کہ بڑے رائے اس کا عملی طلوع اپنی زندگی میں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جو کچھ تھوڑی بہت امید تھی وہ اب بھی رگھوبر سے ہی تھی۔ کیا پتہ کبھی کوئی ایسی کرامت ہو جائے اور وہ اندھیرا جو سب کو گھیرے ہے، روشنی سے بدل جائے!

میں کہتا نہیں تھا لیکن میں بھی اندر ہی اندر اپنی امیدوں کا مرکز رگھوبر کو ہی مانتا تھا۔ ایک تو وہ ذہانت میں جہاں پر تھا میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک قسم کی حساسیت تو تھی ہی کشادہ ذہنی بھی تھی۔ مجھے کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں امید کی ایک کرن نظر آتی تھی لیکن وہ دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتی تھی۔ گرودر اور رگھوبر کو جب میں ساتھ دیکھتا تھا تو اسے بھی میں رگھوبر کی طرف دیکھتا ہوا پاتا تھا۔ ہمیشہ دوسروں کی طرف دیکھنے والے کبھی اپنی طرف نہیں پاتے۔ یہ میں نے اپنے ہی تجربے سے سیکھا تھا۔ رگھوبر بھی اسے پیار کرتا تھا لیکن خاموش۔ مجھے یہ بھی شک ہوتا تھا کہ باپ ہونے کی وجہ سے ہی تو مجھے یہ سب محسوس نہیں ہوتا؟ میرا بہت زیادہ موہ تو اس کے پس پشت نہیں؟

ایک بات جو میں کبھی کسی سے نہیں کہتا تھا اور کبھی کہیں بھی نہیں، مجھے اس میں کلا کی شخصیت کی گہرائی نظر آتی تھی۔ کلا کی طرح وہ بھی کم باتونی تھا۔ سنتا زیادہ تھا۔ اس کی سی قوت متخیلہ اس میں بھی تھی۔ کلا نے سنا بھی تھا، سہا بھی تھا۔ اس لیے کبھی کبھی میں اپنے آپ سے پوچھتا تھا کہ کہیں میں رگھوبر کو اسی وجہ سے ترجیح تو نہیں دیتا؟ اس کی ماں نے زندگی بھر اپنے کو خشک کیا اور گھر والوں کو سینچا۔ یہ میں مانتا ہوں کہ اس زمانے میں سب ہی سہتے تھے۔ عورتیں خاص طور پر۔ اب زمانہ دوسرا تھا۔ مجھے ارن اور ارن کی گھروالی کی بات یاد آجاتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی "وہ زمانہ ختم ہو گیا جب عورت گھٹ گھٹ کر مر جاتی تھی —— اب سب کی اپنی اپنی زندگی ہے چاہے عورت یا مرد اس میں ہونے والی دخل اندازی کا اب کوئی مطلب نہیں۔"

حالانکہ ارن کی گھروالی کی یہ بات تب عجیب لگتی تھی۔ زیادہ ہوشیاری کا احساس کراتی تھی لیکن اب لگتا ہے وہ غلط نہیں تھی۔ سونا کی مثال بھی میرے سامنے تھی۔ سونا سارنگا کے ساتھ ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ اس نے اپنی ایک دنیا بنالی تھی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ اپنی اس دنیا میں بند رہے۔ کسی کو اس میں داخل نہ ہونے دے۔ بچے کبھی کبھی کود کر دوسرے کے پالے میں پہنچ جاتے ہیں۔ اگر پالا خالی ہو تو انھیں بڑبڑ کرتے ہوئے واپس لوٹ آنا پڑتا ہے۔ سونا بھی چاہتی تھی کہ سارنگا کے پالے میں جائے لیکن نہ جانے کیوں وہ اسے ہمیشہ اپنے لیے خالی ملا۔

رگھوبر اپنے معاملے میں زیادہ خاموش ہوتا جارہا تھا۔ اگر وہ بولتا تب بھی میرے لیے وہ ایک امتحان ہو گیا ہوتا اور اب چپ رہتا تھا تب بھی امتحان ہی تھا۔ جن دنوں میں میں چھٹی مناتا تھا یعنی فارم پر نہیں جاتا تھا تو اسے بلا کر پاس بٹھاتا تھا، باتیں کرتا تھا۔ نہ جانے کی وجہ بھلے ہی ناسازی طبع ہو یا چھٹی منانے کی خواہش حالانکہ کھیتی کا کام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں چھٹی کا مطلب ہر طرح کی چھٹی۔ اسے منانے یا اسے منانے کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ جاننا کہ آخر اس کی رضا کیا ہے؟ میرے ہر سوال کا جواب خاموشی تھا۔ خاموشی ایسا ہتھیار ہے کہ وہ چاہے کچھ اور کر سکے یا نہ کر سکے سامنے والے کو بے چارہ تو بنا ہی دیتا ہے۔ میں بھی جھنجھلانے،

ڈانٹ پھٹکار نے، پچکارنے کے بعد مکمل طور پر بے چارہ ہو جاتا تھا۔ جب بھی اپنے نظم و ضبط سے محروم ہو جاتا اور گنتی ناگنتی کہہ جاتا تھا تو مجھے بڑے رائے کے سامنے جانے کی کھلی پڑتی تھی۔ میں اب بھی اپنے آپ کو اسی نظم و ضبط میں محسوس کرتا تھا جس میں تب تھا۔ جب بڑے رائے بڑے رائے تھے۔ وہ مجھ سے ہی کہتے "بھاسکر تم نے چاہے جو بھی کہا ہو، بھی تم پر اس طرح ناراض ہوا؟! ناراض ہو کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھنا اپنے آپ میں کم ظرفی ہوتی ہے۔ خود اعتمادی کم ہوتی ہے۔ میں بھی تم پر ناراض ہو سکتا تھا، سخت سے سخت سزا دے سکتا تھا۔ رگھوبر چاہے جیسا بھی ہے ـــــ اب بڑا ہو گیا ہے۔ اسے اب پھیلنا چاہیے۔ جب پہاڑی جھرنا پہاڑی حد کے باہر ہو کر بہتا ہے تو اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے پہاڑ، پتھر اور زمین سب راستے چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں نہیں چھوڑتے وہ خود راستہ بنا لیتا ہے۔ مجھے ہی اسے کچھ عرصے کے لیے رکنا پڑے۔ ہمارے راستے اب بند ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری بڑھنے کی طاقت کم ہو گئی یا ختم ہو چکی۔ ہم جہاں ہی وہیں سے کافور کی طرح اڑ جائیں گے۔ تمھارے پاس تو ابھی پھر بھی وقت ہے۔ مجھے ہی تم اس کی طرح نہ ہو۔ تم اسے ابھی کافی دیر تک اوپر چڑھتے، نیچے اترتے، سپاٹ میدان میں دوڑتے یا چلتے ـــــ کاکاری مار کر بے تحاشہ دوڑ پڑنے والے بچوں کی طرح ہر موڑ پر دیکھو گے۔ انگلی کے اشارے سے لوگوں کو بتاؤ گے ـــــ وہ دیکھو ـــــ وہ میرا بیٹا ہے ـــــ میں تو بھی وہاں پہنچنے کے لیے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ سب باتیں بھی میں نے ان کے بارے میں سوچی تھیں لیکن جب وہ چوٹی پر پہنچا تو میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ پھر میں نے اپنی نگاہ کو رگھوبر کی طرف گھما دیا۔ میں جانتا ہوں وہ بھاسکر رائے کا بیٹا ہے ـــــ اس پر اسی کا حق ہے! میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے یہ سپنے تمھارے اندر بوؤں، بہت کم سپنے آنکھیں کھولتے ہیں، پھولتے پھلتے تو اس سے بھی کم ہیں۔ میں انھیں تمھاری آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں ـــــ کبھی کبھی لگتا ہے نہ تم دیکھ پاؤ گے نہ میں۔ لیکن پھر بھی آس باندھے ہیں۔ لیکن تم ہی اتنی جلدی آس کھو بیٹھے ہو! اس پر تمھارا بات بات پر ناراض ہونا ناامید ہو جانے کا ہی ثبوت ہے۔"

ان کی باتیں میرا دل توڑ دیتی تھیں۔ مجھے لگتا تھا، بہتر زخم کھایا ہوا ایک انسان ہے جو لت پت ہے اور کراہ رہا ہے۔ وہی سارے زخم مجھے اپنے جسم پر بھی لگے محسوس ہونے لگتے تھے۔ رانا سارنگا کی طرح اپنی سب تیاریوں کے باوجود وقت سے لڑ نہیں سکے تھے۔ کچھ وقت

نے اور کچھ خود انھوں نے اپنے کو اس بری طرح ہرایا تھا کہ اب ان کے پاس کراہنے اور تڑپتے رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ سب فرار ہو چکے تھے جو ان کی طاقت کا سرچشمہ تھے، جن کے بل بوتے پر انھوں نے زندگی بھر کی جنگ لڑی تھی۔ ایک میں بچا تھا جسے انھوں نے اپنے سپاہیوں میں شمار نہیں کیا تھا۔ دوسرا رگھوبر تھا۔ گرور چھوٹا تھا عورتوں میں سارنگا اور سونا تھے ــــ سونا کو بھی وہ دروازہ کھلنے کا انتظار تھا جہاں سے اس کا راستہ الگ ہو جانے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جس دن دروازہ کھلے گا وہ روئی کی طرح دھو دھو کر بڑھتی ہوئی دور نکل جائے گی۔

رگھوبر کی زندگی میں ایک اور موڑ آ گیا۔ اس کا ہمیں بہت بعد میں پتہ چلا۔ اس نے ہم سب کو بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ میرے ایک دوست تھے۔ نام تو تھا رام ویر لیکن رائے بابو کے نام سے مشہور تھے۔ رائے بابو کافی مدت کے بعد اپنے گھر لوٹے تھے۔ وہ کہیں باہر سرکاری ملازمت میں تھے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا میرے پاس ہی تھا۔ وہ کھانا کھا کر آتے تھے اور دس بجے تک جمتے تھے۔ گرمیوں میں تو اتنا نہیں کھلتا تھا۔ سردی کے دنوں میں کھل جاتا تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ ہونے کے بعد مجھے نیند آ جاتی تھی۔ وہ بات کرتے رہتے تھے اور میں 'ہوں'، 'ہاں' کرتا جاتا تھا۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی سیما۔ وہ قریب قریب رگھوبر کے برابر تھی۔ رگھوبر تھا تو شرمیلا لیکن دھیرے دھیرے اس کی آمد و رفت رائے بابو کے گھر ہو گئی تھی۔ چونکہ رائے بابو اچھی ملازمت میں تھے اس لیے ان کے یہاں اس طرح پرائے لڑکوں کا آنا جانا، ان کی بیٹی کے پاس اٹھنا بیٹھنا اور باتیں کرنا ممنوع نہیں تھا۔ شروع شروع میں تو رگھوبر ان کے یہاں ہفتے عشرے میں ایک آدھ بار جاتا تھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ سیما اس کے آنے سے خوش ہوتی ہے تو اس کے جانے میں اور اضافہ ہو گیا پھر تو ایسا ہوا کہ روز جانے لگا۔ جب رائے بابو ہمارے یہاں ہوتے تھے تو وہ سیما کے پاس بیٹھا ہوتا۔

اس واقعے نے اس کا طرز عمل ہی بدل دیا تھا۔ پہلے وہ دن بھر باہر رہتا تھا۔ اب وہ شام کو جلدی گھر لوٹ آتا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر بیٹھتا اور بات چیت کرتا تھا۔ پھر وہ تیار ہونے چلا جاتا، نہاتا دھوتا، کپڑے بدلتا، جوتے بدلتا ــــ یہ سب باتیں بڑے رائے کو اچھی

گئی تھیں — وہ ان لوگوں میں تھے جو یہ مانتے تھے کہ سنگیت ایک عبادت ہے — یا وہ تی
کچھ سے پہننا اور شام کو خوب تیار ہونا۔ جب وہ تھکتا تو بڑے راحت کو امید کی ایک کرن نظر آتی
کہ رگھوبر کی شخصیت میں ایک توازن آ رہا ہے۔ جب ایک گوشے میں توازن آتا ہے تو زندگی
کے دوسرے حصوں میں اپنے آپ آ جاتا ہے۔ حالانکہ ایسی ہم آہنگی تو جوانی آتے ہی ہر
انسان کے حصے میں آتی ہے — کچھ عرصے کے لیے۔ ایک دو بار انھوں نے اپنی اس
خواہش کا اظہار بھی کیا — بھگوان ہمارے رگھوبر کو سلیقہ آ جائے لیکن جیسے ہی انھیں پتہ
لگا کہ رگھوبر، راجے بابو کے گھر آتا ہے اور راجے بابو کے بیٹے سے اس کا میل جول بڑھ رہا
رہا ہے تو گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ سب سے پہلے یہ بات سونا نے بتائی۔ ادھر سونا نے بڑی
گہرائی سے محسوس کی تھی کہ جب بھی وہ سیما کے پاس جاتی تھی تو سیما کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر
رگھوبر کے بارے میں ضرور بات کرتی تھی۔ وہ کیا پڑھتا ہے؟ کیا چاہتا ہے یا نہیں؟ کس وقت
سوتا ہے؟ کس وقت جاگتا ہے؟ کھانے میں کیا پسند کرتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ رگھوبر کے بارے
میں بات کرنے کے دوران سیما کی آنکھوں میں ایک عجیب سا اشتیاق پیدا ہو جاتا تھا۔

رگھوبر بھی اکثر ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد سیما پر آ جاتا تھا۔ وہ اس کی
تعریف کرتا تھا کہ اسے پڑھنے کا کتنا شوق ہے۔ وہ ملائمت اور سلیقے سے بات کرتی
ہے — دوسرے انداز میں وہ مشورہ دیتا سونا سے کہتا تھا کہ تم اس جیسی کیوں نہیں؟ سونا اس
سے بڑی تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ کبھی تو وہ چپ لگا جاتی۔ کبھی ہوں ہاں کر کے ٹال
جاتی۔ ایک دو بار اس نے جھڑکا بھی۔ خاص طور پر جب وہ کہتا کہ سیما سلیقے سے بات کرتی
ہے۔ سونا اس پر جھپٹ پڑتی — رگھوبر تم مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔ جب میں اس کے پاس
جاتی ہوں تو وہ تیرے بارے میں بات کرتے نہیں تھکتی — اور تو جو میرے پاس پھٹکتا
نہیں تھا، مجھے آ آ کر بتاتا ہے کہ سیما کیسی ہے — جیسے میں بدسلیقہ ہوں۔ دنیا میں اکیلی وہی
باسلیقہ پیدا ہوئی ہے۔ رگھوبر چپ لگا جاتا یا ہنس کر ٹال دیتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ راز افشا ہو
لیکن کبھی کبھی وہ چڑ بھی جاتا — ”تو کیوں اس سے چڑتی ہے؟ تو سمجھتی ہے جیسے اس کی
تعریف کرتا ہوں یا اس کے گھر چلا جاتا ہوں تو میں تیری کاٹ کرتا ہوں؟“ ایک دن سونا سے
اس کی کافی کہا سنی ہو گئی تو اس نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس بات کو اس نے سارنگا سے کہا۔ اس واقعہ
نے سونا اور سارنگا کو قریب لا دیا تھا۔ دونوں کی ناراضگی اسی کے ساتھ تھی۔ بچپنے ہی سے

الگ الگ ہو۔

سونا کو ابھی تک یہ پتہ نہیں رہتا تھا کہ رگھوبر دن بھر کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے ـــــ لیکن اب وہ ہر بات کا پتہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ جب واپس آتا تھا تو سب کو سنا کر پوچھتی تھی "ہو آئے سیما کے یہاں، چلو کھانا کھالو۔"

رگھوبر کو کئی بار بھوک لگی ہوتی پھر بھی وہ کہہ دیتا "نہیں" وہ فوراً پوچھتی "سیما کے ہاتھ کا کھانا کھا کر آئے ہو کیا؟" اس بات سے وہ اور چڑ جاتا اور کہتا "ہاں ـــــ تو کیوں چڑتی ہے؟"

"میں کیوں چڑوں گی؟ لیکن تو اس کی ماں جایا تو ہے نہیں، میری ماں کا جایا ہے۔ میں نہیں کہوں گی تو اور کون کہے گا۔"

"پہلے تو کبھی نہیں کہا؟"

"پہلے موقع ہی کہاں آیا تھا؟"

وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور بھوکا ہی سو جاتا۔ سونا کا من کہتا ـ پتہ نہیں کھایا یا نہیں؟ اس کے آتے ہی اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ہے تو بھائی ہی، پتہ نہیں اسے دیکھ کر مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ لگتا ہے جیسے سیما رگھوبر کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں گھسی چلی آ رہی ہے اور مجھے پیچھے دھکیل رہی ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ سیما سونا کو دیدی کہتی تھی اور سار نگا کو تائی جی۔ میں اس کا تاؤ تھا۔ ہمارے پنڈت جی ہنس کر کہا کرتے تھے کہ اس ملک کے بہت سے جھگڑوں کی جڑ تاؤ ہے ـــــ بھیشم پتاما تاؤ، دھرم راشٹر تاؤ ـــــ ویاس تاؤ ـــــ!

کبھی کبھی جب فرصت ملتی تھی تو میں رائے بابو کے یہاں چلا جاتا تھا۔ سیما ایک بار نمسکار کرنے ضرور آتی تھی ـــــ یہ بھی پوچھتی تھی "رگھوبر کیسا ہے؟" وہ لوگ تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ لیکن ان کا یہ پوچھنا میری سماعت پر گراں گزرنے لگا تھا۔ وہ رگھوبر کے ساتھ بھیا یا کچھ اور کیوں نہیں لگاتی؟ صرف رگھوبر ہی کیوں کہتی ہے؟ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کئی بار میرے لبوں تک آ کر رہ جاتا تھا کہ روز تو تمھارے پاس آتا ہے، اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیا کرتیں۔ لیکن میں یہ سب کہہ نہیں پاتا تھا، یا تو چپ لگ جاتا تھا یا براہ راست جواب نہ دے کر یہ ہی کہہ دیتا تھا کہ ـــــ یہ تو وہی جانے ہمیں تو اس کا پتہ نہیں کہ وہ دن بھر کہاں رہتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے ہیما سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ فوراً کہتی "یہ بات تو اس کی غلط ہے اسے دل لگا کر پڑھنا چاہیے۔ میں بس دیتا تھا۔ وہ کیا پڑھے گا؟ —— اسے دنیا کے اور کاموں سے فرصت ملے تو پڑھے۔ پتہ نہیں رائے بابو کو کیوں غصّہ کم آتا تھا یا کیا بات تھی، وہ چپ رہتے تھے یا کہہ دیتے تھے "رگھوبر کے بارے میں آپ غلط سوچتے ہیں —— آپ دیکھیے گا کہ وہ بھی بہت نام کمائے گا۔ بچے سخت سست تو چلتے ہی رہتے ہیں لیکن وہ ان کی کل زندگی نہیں ہوتی۔"

ان کی بات مجھے ضرورت سے زیادہ وجہ کی ہوئی محسوس ہوتی۔ جیسے یہ سب کہہ کر اپنی کوئی غرض ثابت کرنا چاہ رہے ہوں۔ جواب لبوں تک آ کر رہ جاتا تھا کہ "آپ کیا جانیں، ہماری امیدوں پر تو پانی پھر گیا۔" یہ بھی لگتا کہ یہ سب کہنے سے کیا فائدہ! کبھی ہمت ہو بھی جاتی تو کہہ بھی دیتا "رائے بابو، جب اپنے ہی بچے اپنے آپ والدین کی امیدوں پر پانی پھیرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو دُر اوپر ہی نہیں رہتا، اندر پیوست ہو جاتا ہے۔"

رائے بابو دھیرے سے کہتے "عقل سے کام لیجیے اور انتظار کیجیے" "آپ بڑے رائے کے بارے میں سوچیے —— ان کے بارے میں انھوں نے کم انتظار کیا؟ کیا نتیجہ نکلا؟! ابھی تک صبر سے ہی کام لے رہے ہیں —— یہ مہاراج کہاں لے جا کر ڈبوتے ہیں اب تو یہی دیکھنا باقی ہے۔"

رائے بابو ہنستے "ہم اپنے بچوں پر اعتماد نہیں کرتے —— جیسے ہر نئے نوکر کو چور سمجھا جاتا ہے ویسے ہی ہر جوان ہوتا بچہ بھٹکا ہوا بے سمت جاندار لگتا ہے۔ آج سے ہی نہیں، ہمیشہ سے —— کیا ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوا؟ کئی بار تو ہمارا ایسا سوچنا ہی انھیں بھٹکا دیتا —— اگر ہم ہر موڑ پر لگام کھینچنا چھوڑ دیں تو ایسا نہیں ہے کہ وہ گڈھے میں ہی جا گریں! منزل پر بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر معلوم رہتا ہے کہ ہماری پشت پر ایک ہاتھ رکھا ہے یا ایک ڈھیلی سی لگام ہے جو کسی کے ہاتھ میں ہے، وہ کھینچ بھی سکتی ہے —— لگام کھینچنے کا ڈر سب سے بڑی لگام ہوتا ہے —— اچھا کوچوان کبھی لگام نہیں کھینچتا۔ صرف ہلاتا بھر ہے —— میں جتنا سمجھ سکا ہوں، رگھوبر اچھا لڑکا ہے۔ اسے لگام نہیں، احساس چاہیے۔"

ہمیں لگتا تھا کہ رائے بابو اپنی باتوں سے اسے شیشے میں اتار رہے ہیں۔ اس بات کا سونا اور

سارنگا پر گھر ارد تمل تھا۔ عورتوں میں بھی آپس کا آنا جانا تو تھا ہی۔ سونا چاہے کبھی یا نہ جے لیکن سارنگا کبھی بغیر نہیں رہتی تھی۔ وہاں جانے پر سیما حسب معمول رگھوبر کے بارے میں پوچھتی اور وہ گرمجوشی سے سیما سے کہتی "گھر میں رگھوبر کے علاوہ بڑے رائے سے لے کر چھوٹے رائے تک اور بھی کئی لوگ ہیں ـــــ اس میں ایسا کیا ہے بٹیا کہ تم اسی کے بارے میں پوچھتی ہو؟"

سیما یا تو چپ لگا جاتی تھی یا ٹال جاتی تھی ـــــ اگر بات لگ جاتی تو کہہ بھی دیتی "تائی جی برابر کے ہیں، ساتھ کھیلے ہیں ـــــ گھر میں کوئی اور تو ایسا ہے نہیں جس کے ساتھ کھیلے ہوں ـــــ سونا دیدی ہیں وہ عمر میں بڑی ہیں۔"

سارنگا کی زبان تو کترنی تھی۔ وہ فوراً کہتی "ساتھ کھیلے ہیں تو کیا آگے بھی ساتھ رہنے کا ارادہ ہے۔"

سیما کی ماں کو مداخلت کرنا پڑتی۔ یا تو ہنس کر ٹال دیتی اور اگر نہیں ٹال پاتی تو کہہ دیتی "دیدی، آپ رشتے میں بڑی ہیں، عمر میں بڑی ہیں ـــــ اس لیے کہتی ہوں کہ ان بچوں کے منہ کیا لگنا۔ نیا زمانہ ہے۔ جیسے ہم لوگ نئے نہیں ہو سکتے، یہ پرانے نہیں بن سکتے۔ ان کے طرز عمل میں ان کا نیاپن آئے گا، ہمارے برتاؤ میں ہمارا پرانا پن جھلکے گا۔"

سارنگا تو باتوں کی الٹ پلٹ پر دونوں طرح حملہ کرتی تھی فوراً کہتی "یہ بچے نہیں، ان کے پیٹ میں ہاتھ بھر کی داڑھی ہے۔ یہ ہمارا رگھوبر دنیا بھر میں ہنڈیا ئے گا ـــــ ماں اور بہن سے سیدھے منہ بات نہیں کرے گا۔ اوروں کی مائیں بھلی اور بیٹیاں بھی۔ برے تو ہم اور ہماری بیٹی۔ ہم تو دوسروں کی طرح تماشا نہیں دیکھتے۔ ہمیں تو اپنے بیٹے کی فکر ہے۔ آخر رائیوں کا بیٹا ہے۔"

سیما کی ماں بھی جب سنبھلتی تو ترکی بہ ترکی جواب دیتی "دیکھیے دیدی، جب لوگ تماشا دکھاتے ہیں تو دوسرے دیکھتے ہیں۔ آنکھیں بند کرلیں تب بھی کہنے والے یہ ہی کہیں گے کہ ہمارا کیا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ جہاں تک رگھوبر کی بات ہے میں تو یہ ہی جانتی ہوں کہ بچہ لاکھوں میں ایک ہے۔ آپ کو چاہے جو لگتا ہو آپ کا بچہ ٹھہرا۔ جہاں تک رائیوں کی بات ہے، ہم بھی کھاتے پیتے تو ہیں ہی ـــــ بھوکے تو ہم بھی نہیں مرتے۔"

سارنگا کو لگتا کہ پالا ایک ہاتھ سے جا رہا ہے تو وہ بکھر جاتی۔ تب وہی محاورہ یاد آتا کہ

نہ تو میری نہ میں تیری۔ وہ اٹھ کر چل دیتی اور گھر آ کر مجھ پر ٹوٹ پڑتی "تمھارے اس رگھوبر نے رایوں کے خاندان کو دھول چٹا دی میرا گرور تو ہوواں میں نہ ان ہووں میں، لیکن رگھوبر تو ہوتے ہوائے بھی ان بے شرموں سے مل کر عزت میں فلیتہ لگائے دے رہا ہے۔ پیار محبت تو سب ہی کرتے ہیں لیکن بچوں کے ساتھ ان کے ماں باپ ڈگڈگی بجا کر مداری نہیں بن جاتے۔"

سونا بھی اس بات میں سارنگا کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ وہ سیما کو دشمن کی نظر سے دیکھتی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب سونا سیما کی تعریف کیا کرتی تھی تو رگھوبر ہنسا کرتا تھا "اری ویدی لڑکیاں لڑکیاں ہوا کرتی ہیں ــــ ان میں اچھا برا کیا۔"

تب سونا چمک جاتی تھی "تم تو لڑکے ہو کر بھی لڑکے نہیں ہوتے ــــ سوکھے بانس کے ڈنڈے کی طرح اکڑے رہتے ہو۔"

لیکن اب حالت بدل گئی تھی۔ پالے اول بدل گئے تھے۔ اب وہ یہی کہتی تھی "اے دنیا سے کیا مطلب ــــ اب تو سیما کا گھر اچھا، سیما اچھی۔"

رگھوبر نے اس قسم کی باتوں کو اپنی طرح سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن بات بنی نہیں۔ اس نے دونوں سے پوچھا "آپ لوگوں کو سیما سے چڑ ہے یا میرے وہاں جانے سے؟ اگر مجھ سے ناراض ہو تو میرے خلاف کارروائی کرو۔ مجھے گھر سے نکال دو۔ جہاں تک تمھارا سیما سے ناراضگی کا سوال ہے ــــ تم نے اس سے اپنے تعلقات ختم کر لیے۔ اس سے اب تمھارا کیا واسطہ۔ میں اس کے پاس جاتا ہوں کیونکہ آپ لوگوں کی طرح میرا اس سے کوئی تنازعہ نہیں۔"

سونا اور زور زور سے رونا شروع کر دیتی جیسے اس کے دلائل کے سامنے وہ مجبور ہو گئی ہو۔ کیونکہ رونا دکھ کا ہی نہیں ہوتا مجبوری کا رونا بھی ہوتا ہے۔ نیم کی لکڑی کے دھوئیں کی طرح کسیلا۔

مجموعی طور پر رگھوبر اکیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس معاملے کی وجہ سے میرے اور بڑے رائے کے درمیان بات چیت بند کا سلسلہ بند کا ہو گیا تھا۔ ایک دو بار انھوں نے اتنا ضرور کہا تھا "نئی

روشنی میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے مجھے آنکھیں بند کر لینے دو" یہ بات میرے دل کی گہرائیوں میں چبھ گئی تھی۔

بڑے رائے بھی اب کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ رگھوبر ابھی تک کمرے میں ان ہی کے پاس سوتا تھا۔ ایک رات وہ سیڑھیوں سے گر گئے۔ میں سمجھتا ہوں رگھوبر کی آنکھ ضرور کھل گئی ہوگی لیکن وہ اٹھا نہیں۔ وہ خود ہی کسی طرح گھسٹ گھسٹا کر اپنے پلنگ تک پہنچے بڑے رائے کو اس بات سے بہت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے ایک روز مجھ سے کہا بھی ——— جب انسان میں گر کر اٹھنے کی طاقت ختم ہو جائے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا۔ حالانکہ اس واقعہ کو رگھوبر نے بہت بعد میں ایک بار تب بتایا تھا جب بڑے رائے نہیں رہے تھے۔ ان کی موت کے کچھ برسوں بعد ان کی وصیت کھولی گئی تھی۔ اس میں انھوں نے سب کے بارے میں لکھا تھا۔ جس بات نے رگھوبر کو بے چین کر دیا تھا وہ تھی کہ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ میں اپنے باندھے بندھن کو توڑ نہیں پایا اور نہ وقت کے ساتھ ہی بدل سکا۔ جن کی لچک ختم ہو جاتی ہے وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہر نئی نسل پرانی نسل سے زیادہ آزاد اور آگے ہوتی ہے ہم ہی اسے کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تو پیچھے کی طرف جھک نہیں پاتی ہم ہی اسے کھینچتے کھینچتے خود گر پڑتے ہیں تب کوئی اٹھانے والا نہیں ملتا ——— !

اس دن اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی تو ہم جیسے کسی تیز طوفانی جھونکے سے پیچھے دھکیل دیے گئے۔ اس بارے میں ہم سب بھول چکے تھے۔ خبر میں لکھا تھا کہ مسٹر بیر بہادر نے اپنے بنگلے پر خودکشی کر لی۔ خودکشی کے دن مسز بیر بہادر کہیں باہر گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر میں اکیلے تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے کافی بے چین رہتے تھے۔ انھوں نے آئی۔ سی۔ ایس میں سب سے اونچا مقام حاصل کیا تھا۔ ان کا قابل ترین افسروں میں شمار تھا۔ وہ ایک قتل کے الزام میں کئی برسوں معطل رہے لیکن بعد میں پریوی کونسل کے ذریعے باعزت بری کر دیے گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بڑے رائے کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔

وہ دیر سے دھیرے بڑبڑا رہے تھے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑے لوگ کتنے سکھی ہیں ——— سب کو ان کے اپنے اندرونی تضادات ہی برباد کرتے ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ وہ کبھی اس طرح اپنے آپ نہیں بولتے تھے۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ مجھے لگا کہ ایک خودکشی مایوسی کا کتنا کشادہ روپ تعمیر کر دیتی ہے۔ شاید ایٹم بم کے دھماکے سے بھی زیادہ۔ بڑے آدمی نے کی ہو تو اور بھی زیادہ۔

وہ بھی عمر کا طویل حصہ پار کر چکا تھا۔ مسز بہادر کا آج بھی وہی روپ میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ ان کا میرا کال چھونا ——— اور مسکرانا ——— مسکراہٹ آنے کو ہوئی تب ہی خیال آگیا کہ ان کے شوہر نے خودکشی کی ہے۔ یہ مسکرانے کا موقع نہیں ہے۔ بڑے رائے بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔

بیر بہادر کے والد مقدمے کے دوران ہی چل بسے تھے۔ ان دنوں بیر بہادر ضمانت پر باہر ہی تھے۔ انھوں نے کئی بار کوشش کی کہ بڑے رائے صاحب سے مل کر اپنے کیے پر اظہار ندامت کریں۔ معافی مانگیں۔ لیکن انھوں نے کہلا دیا ——— ہم اور تم ہمیشہ باپ بیٹے رہیں گے ——— ایشور نے چاہا تو اگلے جنم میں بھی باپ بیٹے ہی بنیں گے۔ یہ رشتہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ میں نے جب تمھیں آئی۔ سی۔ ایس بھیجا تب تم ایک روشن ستارے کی طرح تھے ——— اب اس پر دھبہ آگیا ہے۔ میری دعا اور ساری جائیداد تمھارے ساتھ ہے ——— لیکن میرے سامنے آکر مجھے اور چھوٹا نہ کرنا۔ میرے صبر کو نہ آزمانا۔ اگر تمھیں بچانے میں، میں خود اور میری ساری جائیداد بک جائیں تو ذرا بھی ملال نہ ہوگا لیکن میں تمھیں اس کلنک کے ساتھ نہیں دیکھ سکوں گا۔ تم نے ایک عورت کا خون کیا اور وہ بھی اس کا جو بے سہارا تھی ——— اس کا سہارا تم خود تھے۔ امانت میں خیانت کرنے کے بعد تم نے مجھے بہو کے سامنے منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ وہ جب مرے تو بیر بہادر دروازے تک گئے اور وہیں سے آداب کر کے لوٹ آئے۔

ان دنوں بچے ان ہی کے پاس گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مرنے سے دو دن پہلے بہو کو بلا کر کہا "دیکھو بہو، مجھے بیرو سے کوئی شکایت نہیں۔ جیسا کیا خود بھگتے گا، یہاں نہیں تو

وہاں۔ کوئی بھی انسان جس کا اپنے اوپر قابو نہ ہو ـــــ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کہو وہ میرا بیٹا ہے لیکن اس کی جس کمزوری نے پورے خاندان کو ڈبویا وہ مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ پہلے لوگ کہتے تھے وہ فلاں کا خاندان ہے ـــــ اب اس کا کیا بھی اس خاندان سے وابستہ ہو جائے گا۔۔۔ خیر، اب تو میرا وقت نزدیک آگیا ہے ـــــ میں اسے معاف کرنے کی حالت میں ہوں نہ سزا دینے کی، بس یہ ہی کہہ سکتا ہوں کہ بھگوان اس کی مصیبت کو آسان کرے۔" رک کر کہا "میرے دوست، ہری رائے جب تک ہے انھیں میری جگہ ہی سمجھنا۔ تم بلاتردد ان کے پاس جا سکتی ہو۔ میری تو اپنی انا تھی ـــــ اپنوں کے بارے میں سب کی انا ہوتی ہے ـــــ لیکن دوسروں کے بارے میں نیک نیتی میں بدل جاتی ہے ـــــ ہری رائے بیرو کے بارے میں سب کچھ کریں گے ـــــ بھلے ہی انھوں نے اپنے بھائی کے بارے میں کچھ نہ کیا ہو ـــــ تم پریشان نہ ہونا۔"

ان کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد بیر بہادر کو پریوی کونسل نے باعزت بری کر دیا تھا۔ وہاں ان کا کیس الہ آباد کے ایک بہت بڑے وکیل نے لڑا تھا۔ ان کا بیٹا بیمار تھا۔ ایک روز انھوں نے خواب دیکھا ـــــ اگر تو کسی کے مصیبت زدہ بیٹے کی مدد کرے گا تو تیرا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا اور بیر بہادر الہ آباد میں ساتھ ساتھ پڑھ چکے تھے۔ اگر پرانا زمانہ ہوتا تو شاید بڑے رائے اس کا فائدہ بھی اٹھاتے لیکن حکام پرستی سے ان کا سروکار کم ہو گیا تھا۔ صوبے کی آئی۔ سی۔ ایس برادری نے بھی اس معاملے میں اندر ہی اندر پوری مدد کی تھی، حتیٰ کہ ان لوگوں نے ایک ایسی فائل غائب کرا دی تھی جس سے بیر بہادر کا نقصان ہو سکتا تھا۔ چھوٹنے کے بعد ان کی پوسٹنگ لکھنؤ سکریٹریٹ میں کر دی گئی تھی۔ ہرجانہ، پورا بقایہ اور برتری سب انھیں جوں کی توں مل گئی تھیں۔ اس کے سال بھر بعد انھوں نے خودکشی کی تھی۔

اس خبر کے کئی دن بعد بڑے رائے کو ایک لفافہ ملا۔ دیکھتے ہی انھوں نے خط پہچان لیا۔ بیر بہادر کی تحریر تھی ـــــ اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے تین خط لکھے تھے ـــــ ایک اپنے والد کے کسی دوست کے نام اور دو اپنے دو بچوں کے نام ـــــ جو کہیں

بابر پڑھ رہے تھے۔ ایک نوٹ پولیس کے نام تھا۔ بڑے راجے نے خط کھولا۔ اس میں لکھا تھا:

محترم چاچا جی

عدالت کے فیصلے کے بعد میں نے کئی بار سوچا کہ آپ کے سامنے حاضر ہو کر اپنا جرم قبول کرلوں۔ بابا کے سامنے تو موقع ہی نہیں ملا۔ سزا مل گئی ہوتی تو شاید اس تکلیف سے نہ گزرنا پڑتا۔ نہ وہ ہو سکا اور نہ اس تکلیف سے نجات ہی حاصل کر سکا۔ آپ نے میرے والد کا حق بھی نبھایا اور والد کے دوست کا بھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں قتل کے اتنے سنگین جرم سے بری کر دیا گیا۔ اس کے باوجود میں برابر یہ سوچتا رہا کہ ہوں کہ میں اپنے خلاف کی اپنی عدالت میں اپنے کو بے گناہ ثابت کروں گا؟ وہاں تو جج بھی میں ہوں ___ ملزم بھی اور گواہ بھی۔ آنجہانی والد جب مجھ سے پوچھیں گے تو کیا میں عدالت کا فیصلہ دکھا کر اپنے آپ کو بے گناہ کہہ سکوں گا؟ میری بیوی اور میرے بچوں نے بھلے ہی زبان نہ کھولی ہو اور مجھے گنہگار کی نظر سے نہ دیکھا ہو لیکن کیا وہ سچائی نہیں جانتے؟ بچے چاہے نہ بھی جانتے ہوں لیکن بیوی سے کچھ چھپا نہیں۔ وہ میری رہائی سے بھلے ہی خوش ہوں ان کے دل میں یہ کانٹا تو لگاتار چبھتا ہوگا کہ ان کا شوہر ان کی ماں کے گھر سے جہیز میں آئی ایک باندی کا قاتل ہے۔ اس باندی کا جسے ہمارا سہارا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ عورتوں کو اپنے پیہر والوں سے کتنا لگاؤ ہوتا ہے۔ آپ بھی میرے گناہ کو جانتے ہوئے بغیر منہ کھولے میری رہائی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ حالانکہ ویسے نہ میں آپ کا بیٹا ہوں اور نہ بھائی۔ بلکہ آپ کے بھائی کو برخاست کرنے والا میں ہی تھا لیکن آپ مجھے پھانسی سے اتارنے والے بنے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ان حالات میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ میرے والد نے مجھے جو کچھ بنانا چاہا تھا وہ میں بن گیا لیکن ایک جھٹکے میں کچی مٹی کے کھلونے کی طرح بکھر گیا۔ شاید آنچ پوری نہیں لگ

پائی تھی۔ یہاں تو میرے والد نے مجھے اپنے سامنے حاضر ہو کر گناہوں کی معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں سمجھا۔ اب میں اپنی موت کے پانی سے وضو کر کے ان کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا۔ شاید معافی مانگنے کا موقع مل سکے۔ موت کی آگ بڑے بڑے گناہوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ نہ کوئی گناہگار رہتا ہے نہ کوئی پارسا۔ آپ بھی میرے لیے دعا کریں، ان بچوں پر اپنی نظر عنایت رکھیں۔

الوداع

آپ کا

بیر بہادر

بڑے رائے خط پڑھ کر سسک پڑے۔ ان کے ذہن میں بیر بہادر کی خودکشی اور ان کا خط کئی دنوں تک گھومتے رہے۔ بڑے رائے تیرھویں شمولیت کے لیے خود ہی گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ انھوں نے پہلے کبھی اکیلے سفر نہیں کیا تھا۔ ابتو ویسے بھی ان کے لیے آج کل سفر کرنا مشکل تھا۔ میں ہی جا سکتا تھا۔ میں بھابی کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ دو بیٹیاں تھیں جو ہو بہو ان کی شکل پر گئی تھیں۔ وہ خود بھی اب بھی اتنی ہی گوری تھیں۔ چہرہ مہرہ بھی ویسا ہی تھا۔ بس، عمر نے کچھ نشان چھوڑ دیے تھے ـــــ کچھ بال سفید ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے ارد گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔

مجھے دیکھ کر بولیں "آؤ بھیا، بیٹھو" پھر رک کر کہا "چاچا جی بھی کیا پاپڑ اس لیے بیلے تھے؟ جب سب کچھ ہو گیا تو دھوکہ دے کر چلتے بنے۔ اب میں انھیں کیا منہ دکھاؤں گی؟ جو سسر نے نہیں کیا وہ بڑے رائے نے کر دکھایا۔"

میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولیں "مجھے بڑے رائے کے پاس لے چلو، میں ان کے چرن چھو کر ان کی طرف سے معافی تو مانگ لوں۔ میں ہر کام میں ان کی برابر کی حصے دار ہوں۔ بدی ہو یا نیکی۔"

وہ اٹھیں اور آگے آگے ہو لیں۔ ان کی دونوں بیٹیاں جو باہر پڑھتی تھیں، انھیں ٹکر ٹکر دیکھتی جا رہی تھیں۔ وہ باہر آ کر بڑے رائے کے قدموں میں گر پڑیں۔ بڑے رائے کو

پہلے تو ان کے شانے پکڑ کر اٹھانے میں تردد ہوا پھر پکڑ کر اٹھایا اور ڈھارس بندھاتے ہوئے بولے "بیٹی تم میرے ہوتے فکر مت کرو۔ جیسا چھاکر اور رانی ویسی تم اور تمھاری دونوں بیٹیاں۔"

حالانکہ ان کا گھونگھٹ ماتھے تک تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی میری طرف گردن گھما کر بولیں "میں تو صرف آپ کے بھتیجے کی طرف سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ سسر جی سے تو زیادہ آپ کا ان پر حق تھا۔ اصلی حق اسی کا ہوتا ہے جو گناہوں کی کیچڑ میں سنے بچے کو اٹھا کر گلے لگا لیتا ہے۔ وہ آپ سے اجازت لیے بغیر چلے گئے! کس منہ سے آپ کو منہ دکھاتے۔ وہ خط لکھ کر مجھے اور میری بیٹیوں کو یہ ذمہ داری سونپ گئے ہیں کہ ہم ان کی طرف سے معافی مانگ لیں۔"

"نہیں بیٹی، غلطیاں ہم سب سے ہوتی ہیں۔ انھوں نے جان دے کر اپنے اعمال کا کفارہ ادا کر دیا۔ اب گناہ کاہے کا! انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ موت کی بھٹی سے گزرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا نہ نیکی نہ بدی۔ اس طرح بتا کر بہراوے کی سازش بھی اسی کی ہے۔"

ہم لوگ اسی رات واپس لوٹ آئے۔ اس لیے بھی کہ ایسے میں رات کو رکنا باعث نحوست مانا جاتا ہے۔ بڑے رائے کو راستے بھر یہی لگتا رہا کہ بیر بہادر ان کا تیسرا بیٹا تھا۔ مقدمے کے دوران انھیں کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ انھیں دیکھ کر کبھی نہیں سوچ سکے کہ گناہ انھوں نے ہی کیا تھا۔

ان کے دل کا ایک اور گوشہ خالی ہو گیا تھا۔

آزادی کے بعد لوگوں کے لیے ایک عجیب ماحول بن گیا تھا۔ جب کوئی نظام بدلتا ہے تو کچھ کو تو تبدیل شدہ نظام ہی بے معنی قرار دے دیتا ہے، کچھ خود اپنے آپ کو بے معنی مان لیتے ہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو بدلے ہوئے نظام کے ساتھ بدل کر اپنے آپ کو نیا مفہوم بخش دیتا ہے یا اس بات کی کوشش کرتا ہے۔ نظام کو اس طرح بدلتے دیکھنا صدیوں میں کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ چونکہ میں نے وہ دیکھا تھا اس لیے مجھے اب لگتا ہے کہ میں ایک خوش نصیب انسان تھا۔

جن لوگوں نے آزادی کے ساتھ چولا بدل لیا تھا اور ان ہی میں کھپ گئے تھے، خوش حال تھے۔ بڑے رائے میں نہ اتنی فعالیت تھی اور نہ ویسی سوجھ بوجھ۔ انھوں نے اپنی انا کی ایک فصیل اپنے ارد گرد تعمیر کر رکھی تھی۔ اپنے کو اسی حصار میں رکھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بدلاؤ کی اس لہر کا حصہ نہیں مان پا رہے تھے۔ انھیں لگ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہو وہ حاکمانہ اعلیٰ نسبی کے خلاف ہے۔ جن کا کل تک کوئی وجود نہ تھا وہ آج کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ دراصل اس دور میں کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ سماجی تبدیلی کے لیے اس طرح کی منجمد اعلیٰ نسبی کو توڑنا ضروری ہوتا ہے۔

میں بھی نہیں سوچ پاتا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بڑے بڑے وجود والے کبھی نہ کبھی اس طرح وجود سے محروم ہوتے ہیں۔ رگھوبر اس بات کو بار بار کہتا تھا۔ اعلیٰ بنانے والوں اور بننے والوں کا زمانہ ختم ہو چکا۔ جب تک ہم بھلاوے میں رہتے ہیں کہ ہم برتر ہیں تب تک نیا دور ہم سے دور بھاگتا ہے۔

بڑے رائے کو بار بار بیر بہادر کی خودکشی کا خیال آتا تھا۔ انھوں نے اسے نئے زمانے کے حوالے سے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ انھیں لگتا تھا کہ یہ زمانہ ایک خوددار شخص کے لیے جسمانی خودکشی کا نہ سہی لیکن سماجی طور پر اپنے آپ کو سمیٹ لینے کا ہے۔ کوئی کہاں تک اتنی حماقت برداشت کرے گا، کہاں تک عزت نفس کے پھاٹک کو بند رکھے گا؟

حالانکہ لوگ انھیں بھی مدعو کرتے تھے۔ چاہے زمانہ کتنا بھی بدل گیا ہو لیکن اب بھی ایک طبقہ ایسا تھا جو ان کے آنے سے اپنی عزت افزائی سمجھتا تھا۔ بڑے رائے اپنے آپ کو مسلسل خاص دھارا سے الگ کرتے جا رہے تھے جیسے کوئی مچھیرا دھار کو کاٹ کر ناؤ کو کنارے کی طرف موڑ رہا ہو۔ اثر ہم لوگوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ میں ان سے کہتا تھا کہ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے ہیں۔ وہ مسکرا کر ایک ہی بات کہتے تھے ــــــ اب میں بوڑھا ہو گیا۔ جب سکہ کھوٹا ہو جاتا ہے اسے واپس ٹکسال میں چلا جانا چاہیے ورنہ جس کے ہاتھ پڑتا ہے وہی اچھال کر دیکھتا ہے اور پھر پھینک دیتا ہے۔ ادھر میں ان کے سامنے بولنے لگا تھا۔ لیکن اتنا نہیں۔ بس کام چلاؤ۔ جب وہ یہ کہتے تھے تو میں بہت سے ایسے نام گنا دیتا تھا جو کھوٹے تو ہو گئے تھے لیکن ملمع چڑھا کر پھر چل رہے تھے۔ بڑے رائے اس عمر اور اس حالت میں بھی دوسروں کے ساتھ اپنی برابری پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ان کے دو ہی ردعمل ہوتے تھے ــــــ خاموشی

یا ناپسندیدگی۔ ناپسندیدگی کا اظہار وہ یہ کہہ کر کرتے تھے ـــــ میں نے کسی کو روکا تو نہیں ہے کہ وہ ملنگ نہ چڑھائے۔ میں جتنا چاہا چل سکا اس سے مطمئن ہوں۔ لوگوں کو آزادی ملی ہے ـــــ انھیں مبارک۔ تمھاری اس آزادی نے مجھے تو غلامی ہی دی۔ آزادی وہی ہوتی ہے جس میں انسان کی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے ـــــ میرے لیے تو اس میں کمی آئی ہے۔ میں جن نظریات سے وابستہ ہوں اب میں انھیں نہیں چھوڑوں گا اور شاید وہ مجھے نہ چھوڑیں۔ اس کے آگے بات کرنا ممکن نہیں رہتا تھا۔

البتہ کبھی کبھی رگھو بر ان سے الجھ جاتا تھا۔ اس نے ایم۔ اے پاس کر لیا تھا۔ آزادی کے بارے میں وہ بھی بہت خیالی پلاؤ پکاتا تھا۔ کہتا تھا کہ آزادی با مقصد ہونی چاہیے۔ مقصد کے بغیر آزادی غلامی سے بدتر ثابت ہوگی۔ اس کی باتیں اور بھی زیادہ بے تکی لگتی تھیں۔ وہ کہتا تھا "بابو، آپ داداجی کو نہیں بدل سکتے ان کے سامنے ایک مقصد تھا۔ وہ جاگیرداری کے اہم پرزے تھے ـــــ انھیں لگتا تھا کہ وہ اسے چلا رہے ہیں۔ لوگ آزادی کے اس کھلونے سے خوش ہیں۔ یہ آزادی کاندھی جی پسند کی آزادی نہیں ہے۔ یہ نیوفیوڈلس کی آزادی ہے جو بات کا من مانی کرتے ہیں لیکن اپنے آپ کو اصلی بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس اصلی بننے کا یہی طریقہ ہے۔"

وہ بڑے رائے کے پرانے لباس خطوط، پگڑیاں، پرانے سوٹ، چھتر، مسندیں نکلوا کر دیکھا کرتا تھا۔ بڑے رائے کو چھالگتا تھا۔ بڑے رائے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ پرانی روایات سے کٹ کر کوئی نیا نہیں ہوتا۔ نئے یعنی ماڈرن کے لیے وہ لفظ 'جدید' استعمال کرتے تھے۔ روایت ہی آگے دیکھنے کی نظر دیتی ہے۔ لیکن وہ بولے بغیر نہیں رہتا تھا "داداجی، آپ کی یہ دولت کس کام کی؟ یہ کبھی بھی برباد ہو سکتی ہے۔ نئی پتیاں تب ہی آتی ہیں جب پرانی گر جاتی ہیں۔ اس پرانے کو گرنا ہے بس تنارہ جائے گا۔ اسے روایت کہہ سکتے ہیں۔ میں اسے تناہی کہوں گا ـــــ نئی پتیوں کے آنے کی جگہ۔"

بڑے رائے اس کی ان باتوں کو سیما سے جوڑتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ رامے کی بیٹی سیما کے دباؤ میں اس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ ایسے میں انسان جس کے خلاف ہوتا ہے، جائز نا جائز

ساری خوبیاں خامیاں اسی سے منسوب کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ مان چکے تھے کہ ان کی جاہ و حشمت اور بچی کھچی شان و شوکت کے چکر میں رامے بابو ان کے پوتے کو پھنسا رہے ہیں۔ دراصل برتری حاصل کر چکنے والے لوگ نہ اپنی سوچ کو غلط سمجھتے ہیں اور نہ اپنے طور طریقوں کو۔ قصور بھی ہمیشہ دوسروں کا ہی ہوتا ہے۔

ایک دن بڑے رائے نے رگھوبر سے کہا" رگھوبر، مجھے لگتا ہے رامے بابو اور ان کے گھر والوں نے تمھارے ارد گرد گھیرا ڈال دیا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر کچھ نہیں کیا سوائے جی حضوری کے ـــــ ان کی نظر تم پر ہے۔ ہمارے اور ان کے خاندان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بھلے ہی ہمارے اور ان کے خاندان کے درمیان قدیم تعلقات رہے ہوں۔"

رگھوبر گستاخ ہو گیا تھا۔ اس طرح کی گستاخی نئے زمانے کے لوگوں میں اکثر نظر آنے لگی تھی۔ بڑے رائے آزادی کو اس کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اسی آزادی نے انھیں گستاخ ہونے کی آزادی دی تھی۔ وہ ان کی اس طرح کی بات سن کر توجہ دیے بغیر یا تو باہر نکل جاتا تھا یا پھر کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دیتا تھا۔ نہ تو کبھی کسی نے ان کے ساتھ گستاخی کی تھی اور نہ وہ برداشت کرتے تھے۔ لیکن اب کرنی پڑتی تھی۔ ایک تو حالات، دوسرے پوتے کا موہ۔ وہ بولا" داداجی، رامے چاچا مجھے بلانے نہیں آتے۔ میں خود وہاں جاتا ہوں۔ وہاں جانا مجھے اچھا لگتا ہے۔ ان میں نہ احساسِ کمتری ہے اور نہ برتر ہونے کا غرور۔ میں آج سے نہیں بچپن سے وہاں جاتا رہا ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو آپ سوچتے ہیں، وہی وہ بھی سوچتے ہوں۔"

بڑے رائے کو اس دن اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا" اب بچے نہیں ہو، بڑے ہو گئے ہو۔ بچپن میں ہر کام اس وقت کی معصومیت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ جوانی میں وہ سب کرنا مشکل نہیں ہوتا جو بچپن میں کیا جاتا ہے۔ ہمارا خاندان بے داغ ہے ـــــ ہمیشہ غلط راستے سے بچ کر چلا ہے۔ کیا اب تمھاری وجہ سے داغ لگے گا؟

ایسے موقعوں پر میں ہوتا تھا تو بات رفع دفع کر دیتا تھا جب نہیں ہوتا تھا تو وہ بولنے سے نہیں چوکتا تھا۔ رگھوبر بولا" داداجی، اعلیٰ ہونا بھی اپنے آپ میں ایک داغ ہے جو دور سے ہی چمکتا ہے اور دوسروں کو دہشت زدہ کرتا ہے۔ اپنے کو اعلیٰ سمجھنا اور دوسروں کو گرا ہوا اور چھوٹا ماننا ـــــ اس ذہنیت کی سب سے بڑی علامت ہے جیسے تیمور لنگ کو اس کے

ظلم سے جانا جاتا ہے اسی طرح ساہوکاروں کو اذیت اور استحصال کا ذریعہ مانا جاتا ہے۔ وہ زمانہ اب ختم ہو گیا جب فرد کے سامنے معاشرہ حقیر ہوتا تھا۔ اب فرد معاشرے کا حصہ ہے۔ وہ اس قسم کی باتیں کر کے معاشرے کی بے عزتی نہیں کر سکتے۔

بڑے رائے کو اس دن لگا تھا کہ رگھوبر ان کے بنائے ہوئے سہارے کے ہوتے گھروندے کو پانی کی لہر کی طرح روند ڈالنے کو تڑپ اٹھے تھے۔ انھیں پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ ان کے پر کاٹ ڈالے گئے ہیں۔ وہ وقت کے پنجرے میں بند بوڑھے شیر ہیں۔ اگر ایسے ہوتے تو اپنے اس گستاخ پوتے کو سزا دیے بغیر نہ رہتے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اس طرح کی نوک جھونک کے بعد دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے نہیں بولتا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ نہیں چل پاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی موقع آتا اور دادا پوتے میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ حالانکہ انھیں اپنے بیٹے ارن اور منجھلے بھائی سے بولے زمانہ ہو گئے تھے۔ چھوٹے بھائی راگھو تو کبھی کبھار آ کر حال چال پوچھ جاتے تھے۔ راگھو پر دادی معیار لاگو کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ دونوں کی انگلیاں ایک دوسرے کی کمزوریوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ رگھوبر کی ضروریات پوری کرنے والے وہی تھے۔ میں منع کرتا تھا تو تکمیل ان ہی سے یہاں ہوتی تھی۔ میں کچھ بھی کہوں ان کا فیصلہ میرے خلاف اور اس کے حق میں جاتا تھا۔ انھیں اب بھی اس میں رائے خاندان کا مستقبل نظر آتا تھا۔

یہ رگھوبر کا باغیانہ روپ تھا۔ ویسا باغی نہیں جس کی بندوق کی نال سے گولی نکلتی ہے۔ بلکہ جو کچھ ہے اس کے بارے میں انکار! بیزاری! اس کی کئی وجوہ تھیں۔ کچھ انفرادی اور بدلتا زمانہ۔ انفرادی وجوہات میں سارنگا، سونا اور میں۔ بڑے رائے بھی تھے۔ وہ جینے کا ایک اپنا طریقہ بنانا چاہتا تھا۔ سونا اپنے وجود سے اس میں مداخلت کرتی تھی۔ سارنگا کمزوری کی وجہ سے اس کے راستے میں حائل ہوتی تھی خواہ اس کے لیے دادا کا لاڈ پیار ہو، یا کبھی کبھار اس کے لیے نئے کپڑے لتے بنانا یا جیب خرچ۔ بڑے رائے کے پیار کا زیادہ ہونا کہیں نہ کہیں سد راہ تھا۔ ہر بات میں مداخلت! کہاں گئے تھے؟ کھانا کیوں نہیں کھایا؟ کپڑے ٹھیک سے کیوں نہیں بدلے؟ فلاں سے کیوں ملے؟ وقت پر کیوں نہیں آئے؟ رامے بابو کی بٹیا کے ساتھ کیوں آتے جاتے

ہو سونا کے لیے یہ ماحسد کا سوال تھی تو بڑے رائے کے لیے عزت کا۔ جہاں تک میرا سوال تھا میں اس کی توقعات کے مطابق نہیں تھا۔ وسائل فراہم کرنے کے نقطہ نگاہ سے میں بھی دن بہ دن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ غریبی کا سایہ لمبا ہونے لگا تھا۔ امیری سے غریبی میں لوٹنا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تکلیف دہ سے زیادہ شرمناک۔ حالانکہ غریبی کا شرمناک لگنا بھی شرمناک ہے۔ یہ بات میں نے تب سمجھی جب تنگدستی نے مجھے گھیر لیا۔ حالانکہ وہ تنگدستی تنگدستی ہی تھی، وہ غریبی نہیں جو موت کا مترادف ہوتی ہے۔

اصطبل خالی تھے۔ فٹن کوچ، اکّا، تانگے کھڑے کھڑے کھاد ہو رہے تھے۔ ان پر کپڑے ڈھکے تھے۔ دیوان خانے میں کارندوں کے کٹ گھرے نظر آنے لگے تھے اور ان کے اندر پڑی گدیوں پر کتے لوٹتے تھے۔ وہ پھٹ کر چیتھڑا چیتھڑا ہو گئی تھیں۔ بڑے دیوان جی کی گدی تخت پر لگی تھی۔ اس کے نیچے ایک کتیا نے بچے دے دیے تھے۔ زمینداری میں بے ڈیرے گاؤں کے کاشتکار خرید رہے تھے جو کبھی ڈیرے کی دیواروں کے سائے میں بیٹھ کر اپنی تپش کے دن گزارتے تھے لیکن وقت نے انھیں آگے بڑھا دیا اور ہمیں گرا دیا تھا۔ وہاں کھڑے بیل اور رتھ بھی انھوں نے خرید لیے تھے۔ بیچ بیچ میں اپنے ہل کے نیچے کی زمین بھی بکتی رہتی تھی۔ جیسے ہی اخراجات کا دباؤ بڑھا ویسے ہی زمین نکال دی۔ اب لگتا ہے دھرتی کی جتنی بے عزتی زمینداروں نے کی اتنی شاید لٹیروں نے بھی نہ کی ہو۔ دھرتی نہ ماں تھی اور نہ معاشی وسیلہ۔ صرف روپیہ یا رقم بن گئی تھی۔ اب تو دھرتی کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ استعمال کی شے بن کر رہ گئی ہے۔ دھرتی کا جذبہ ختم ہو گیا۔ حویلی پر بس دودھ کے جانور بچے تھے۔ بڑے رائے کو اگر کسی بات کا ملال تھا تو گھوڑے نہ ہونے کا۔ گھوڑا خرید بھی لیا جاتا لیکن اسے نباہنا مشکل تھا۔ گھاس، برسیم، چنی وغیرہ تو سیر سے آجاتے لیکن کوچوان اور چرکٹے کا خرچ کون اٹھاتا۔ حالانکہ کالے سائیس کا بھتیجہ فتو ابھی تک ہمارے یہاں تھا۔ جب سے گھوڑے مرے تھے وہ کھیتی کا کام دیکھنے لگا تھا۔ وہ بھی یہی کہتا رہتا تھا کہ بڑے مالک کو گھوڑے کے بغیر تکلیف ہوتی ہے ـــــ ایک گھوڑ خرید لیجیے باقی سب دیکھ بھال میں کر لوں گا۔ میں چپ ہو جاتا تھا۔ رگھوبر اس بات سے ناراض ہوتا تھا۔ اس کا کہنا تھا ـــــ کیا دنیا کے سارے

لوگ گھوڑا گاڑی پر ہی چلتے ہیں؟ پھر ہمیں ہی کیا دقت ہے؟ حالانکہ میں سائیکل پر چلتا تھا لیکن اس کی یہ دلیل میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اگر ہمارے پاس وسائل ہوں تو ہمیں کون روک سکتا ہے۔ بڑے رائے سنتے تھے تو سن رہ جاتے تھے ـــــ یہ لڑکا اب ہماری برابری ایک سے کرنے لگا۔ ہمارے کیے دھرے پر پانی پھیرے دے رہا ہے۔ برتری سے محرومیت کی طرف آنے کا عمل سانس گھٹنے کی طرح ہوتا ہے۔

آج کے مقابلے جیسے تب سونا سستا تھا اس سے زیادہ زمین سستی تھی۔ تب غلے کے نرخ سے ہی چیزوں کے بھاؤ طے ہوتے تھے لیکن آج کل خرید و فروخت میں سب کا اپنا اپنا بھاؤ ہے۔ الٹے غلے کا نرخ باقی چیزیں طے کرتی ہیں۔ خیر، بزار کا ادھار اور قرض کی ادائگی کے لیے کچھ زمین فروخت کرنی پڑی تھی۔ جب زمین بہت تھی، اتنی کہ کاغذات سے ہی پتہ چل پاتا تھا کہ، تب زمین کی فکر کس کو تھی۔ ان دنوں زمین رہن رکھنا عام بات تھی۔ قرض لینا بھی خوش حالی کی علامت مانی جاتی تھی لیکن اب زمین فروخت اتنا ہی کھلتا تھا جتنا اپنی روٹی سے ٹکڑا توڑ کر دینا۔ حالانکہ روٹی اب بھی بڑی تھی لیکن کب تک رہتی؟

زمین کے بیچنے سے ہی جو روپیہ آیا اس میں پہلے تو لین دین نمٹا جو بچا اسے خرچ کرنے کے منصوبے بننے شروع ہو گئے۔ سونا کے لیے زیور بننا چاہیے۔ زیور بن گیا۔ رگھوبر کے لیے سوٹ سلوایا جائے۔ سوٹ بننے دے دیا گیا۔ بڑے رائے اور میری اچکنیں بنیں۔ سارنگا کی ساڑی خریدی گئی۔ گرور کے لیے کرتہ پاجامہ اور کوٹ سلا۔ ایک جوڑی جوتہ خرید آ گیا۔ حویلی کی پتائی ہوئی۔ حویلی کی پتائی میں مہینوں لگتے تھے۔ ہزاروں روپے خرچ آتا تھا۔ شاید حویلی کی وہی آخری آرائش تھی۔ بچے کھچے نوکروں کو کپڑے لا دیے گئے تھے۔ بڑے رائے کا کہنا تھا کہ گاڑیوں کو رنگوا دیا جائے ورنہ گھن لگ جائے گا۔ اس بات پر کافی بدمزگی ہوئی۔ گاڑیاں رنگوائیں یا بیٹ کے جالے جھاڑیں؟ رگھوبر سوچے سمجھے بغیر کچھ بھی کہہ دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سامنتی دور کی نشانی ان گاڑیوں کو چروا کر چولہا جلانے کے کام میں لے آؤ۔ اب ان میں کون بیٹھے گا؟ جو بیٹھے گا اسے دیکھ کر لوگ ہنسیں گے۔ بڑے رائے کو اس کا یہ کہنا ایسا لگا جیسے ان کے سامنے کسی عزیز کو کوسا گیا ہو۔

دوسری بات رگھوبر کے سوٹ کے بارے میں ہوئی۔ حالانکہ یہ پہلا واقعہ نہیں تھا۔ جب بھی رگھوبر کے اچھے کپڑے سلتے تھے تب ہی سارنگا کا پارہ آسمان چھونے لگتا تھا۔ اس

بار سونا کے زیور کا معاملہ بجی تھی۔ اس روز تو سار نگا نے حد ہی کر دی۔ وہ آس پاٹی لے کر پوری طرح کوپ بھون (مغلوب الغضب ہیروئن کے بیٹھنے کا کمرہ) میں چلی گئی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے اور میرے بیٹے کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ میں تو باندی ہوں ہی۔ میرا بیٹا بھی زندگی بھر ان سب کی تابعداری کرے گا۔ میرے بچے کو نوکروں کی طرح کرتہ پاجامہ اور رگھوبر کو شہزادوں کی طرح سوٹ بوٹ۔ اپنی بیٹی کو سونے کے زیور اور مجھے باملیوں کی طرح دھوتی۔ میں نوکرانی بن کر نہیں رہوں گی۔ لوگوں کے برتن مانجھ لوں گی لیکن ان حالات میں اس گھر کی بہو ہونے کا نام نہیں دھراؤں گی۔

سب کے تیور مجھے جھیلنے پڑتے تھے۔ چھوٹی چاچی جب تک رہیں کچھ سمجھا بجھا کر کچھ سخت سست کہہ کر معاملات سنبھال لیتی تھیں۔ لیکن اب میں براہ راست توپ کے دہانے پر تھا۔ دن بھر تو میں باہر رہا۔ رات کو جب حویلی کے اندر گیا تو سار نگا نے اپنی ساڑی اور گرور کے کپڑے میرے اوپر پھینک دیے۔ غنیمت تھا کہ گرور کا جوتا نہیں پھینکا ـــــ مجھے نہیں چاہیے یہ بخشش۔ جسے دینا ہو اسے دو۔ میں باندی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اتنی کھلی بغاوت پہلی بار ہوئی تھی۔ میرا بیٹا کم عقل ہی سہی، لیکن کسی کی تابعداری نہیں کرے گا۔ اپنی بیٹی کو سونے کے زیور اور مجھے دھوتی میں نے اسے بہت سمجھایا ـــــ دیکھو اب سونا بڑی ہو رہی ہے ـــــ ابھی سے اس کے لیے زیور نہیں بنائیں گے تو شادی کے وقت ایک دم کہاں سے آئیں گے۔ تمھارے پاس تو اب بھی کافی زیور ہیں اور رائے خاندان کا خزانہ ہوتا تو ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ رات بھر یہی سمجھانا بجھانا چلتا رہا لیکن سار نگا کے ماتھے کے بل ذرا بھی کم نہ ہوئے۔ یہ شاید کم عمر بیوی ہونے کی بد دعا تھی۔

اگلے دن رگھوبر کے کانوں میں بھنک پڑی تو اس نے بھوانی سے پوچھا۔ بھوانی نے بتایا کہ چھوٹی بہو نے کل سے کھانا نہیں کھایا نہ گرور کو کھیلنے کے لیے کہیں جانے دیا۔ سونا سے پوچھا تو اس نے پوری بات بتا دی۔ وہ بولی۔ "مجھے نہیں چاہیے زیور۔ میں انھیں چھوؤں گی بھی نہیں۔ اماں مر گئی تو کیا اتنی گری پڑی ہو گئی کہ کوئی کچھ بھی کہہ دے"۔ رگھوبر نے سمجھا بجھا کر شانت کیا۔ وہ سید حماد درزی کے یہاں گیا اور اس سے بولا کہ سوٹ کے کپڑے کا گرور کا سوٹ بنا دو۔ وہ رائے خاندان کا پرانا درزی تھا۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا "یہ کیا کہتے ہو بھیا، بڑے رائے نے کپڑا تمھارے لیے بہت شوق سے خریدا ہے۔"

"ماسٹر صاحب، وہ میرا چھوٹا بھائی ہے —— اس کو ایک سوٹ چاہیے۔ مجھے ضرورت ہوگی تو دوسرا سوٹ سلواؤں گا۔ ویسے بھی یہ رنگ مجھے پسند نہیں۔"

"لیکن بڑے رائے کا حکم ہے۔"

"سچ پوچھیے تو میں نے طے کیا ہے کہ اب میں سوٹ نہیں پہنوں گا۔ تب کی بات اور تھی —— اب ملک آزاد ہو گیا۔ سوٹ پہننا مجھے ایسے لوگوں کا مذاق اڑانے جیسا لگتا ہے جو پہنتے نہیں یا پہن نہیں سکتے۔"

ماسٹر بولا "یہ رایوں کی شان کے خلاف ہے۔ رائے لوگ سینکڑوں سال سے ایک سے ایک لاجواب کپڑے پہنتے آ رہے ہیں۔ انگریز تک ان کے کپڑوں سے رشک کرتے تھے۔"

انگریز باہر کی آدمی تھے۔ انھیں دکھانے کے لیے اچھے اچھے کپڑے پہننا ضروری تھا۔ اب تو سب اپنے ہیں۔ آپس میں دکھانا! ہم گھر میں جاتے ہیں تو جیسا ملتا ہے ویسا ہی پہن لیتے ہیں باہر والا جاتا ہے تو کپڑے بدل کر سامنے آتے ہیں۔ آج یہ بھی ختم ہونا چاہیے۔ کپڑوں سے بھی بھید بھاؤ بڑھتا ہے۔"

رگھوبر کی بات ماسٹر کی سمجھ میں ذرا بھی نہیں آئی۔ رگھوبر آخری شکل میں گرودر کا سوٹ بنانے کی بات کہہ کر چلا آیا۔

دو دن بعد محمد عمر سوٹ سی کر لایا۔ سوٹ رگھوبر کی جگہ گرودر کے فٹ آیا تو بڑے رائے آپے سے باہر ہو گئے۔ محمد عمر نے دھیرے سے کہا "حضور، رگھوبر بابو نے ہی یہ سوٹ گرودر بابو کی ناپ کا سلوایا ہے۔ اتفاق سے رگھوبر اس وقت گھر پر ہی تھا۔ اسے بلا کر پوچھا گیا تو اس نے 'ہاں' کر دی ورنہ اس کی آفت آجاتی۔ بڑے رائے نے پوچھا 'کیوں؟'"

"مجھے سوٹ پہننا اچھا نہیں لگتا۔ میں سوٹ پہننا چھوڑ رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"انگریزوں کا پہناوا انگریزوں کے ساتھ چلا گیا۔"

بڑے رائے جھنجھلا گئے "تم یہ سب کیا سوچا کرتے ہو انگریزوں نے تو اپنا سب کچھ چھوڑا ہے، کیا اس میں سے کچھ بھی استعمال نہیں کرو گے ریل پر نہیں بیٹھو گے، لاری میں نہیں چلو گے؟ اتنے لوگ کوٹ پتلون پہنتے ہیں کیا وہ ہندوستانی نہیں؟"

"میں اپنی بات کہہ رہا ہوں ـــــ جس لباس کے پہننے سے دوسرے کے من میں احساس کمتری پیدا ہو اسے پہن کو میں کیا کروں گا؟ جہاں تک ریل کا سوال ہے اس میں سب بیٹھتے ہیں ـــــ سوٹ سب نہیں پہنتے۔"

بڑے رائے کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ تب تک باہر نکل گیا تھا۔

رگھوبر واقعات کا مرکز بنتا جارہا تھا۔ چاہے بڑے رائے یا میں یا سونا یا گرور ـــــ سب کی نظر گرور پر رہتی تھی ـــــ وہ کیا کہتا ہے، کیا کھاتا ہے، کیا پڑھتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ رگھوبر اور سیما کے درمیان خط و کتابت ہونے لگی تھی۔ یہ بات سونا کو معلوم تھی۔ وہ اس چکر میں رہتی تھی کہ کسی طرح وہ خطوط اس کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ رگھوبر کو اپنی بے عزتی کا مزہ چکھائے۔ اس بات کا اندازہ رگھوبر کو بھی رہا ہوگا۔ اسی لیے وہ خطوط کو سنبھال کر مقفل رکھتا تھا۔ ایک دن وہ نہانے گیا تو چابی پلنگ پر ہی چھوڑ گیا۔ سونا کسی کام سے آئی اس کی نظر الماری کی چابی پر پڑی۔ اس نے فوراً تالا کھولا جلدی جلدی سے الا۔ اخروٹ کی لکڑی کے نقاشی دار ڈبے میں وہ سارے خطوط قرینے سے رکھے تھے۔ ڈبہ وہیں چھوڑا۔ خطوط اٹھائے اور چلتی بنی۔ تالا پہلے کی طرح بند کر دیا۔

وہ نہا دھو کر تیار ہوا۔ پہلے دن جو خط آیا تھا اسے دوبار پڑھا۔ الماری کھول کر خط رکھنے لگا تو سارے خط غائب تھے۔ اس نے بھوانی کو پکارا۔ بھوانی آیا۔ بھوانی اس کے چہرے کی وحشت دیکھ کر ڈر گیا۔ بھوانی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ پوچھنے پر منع کر دیا لیکن وہ سمجھ گیا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی سونا اس کے کمرے میں آئی تھی۔

بھوانی سیدھا سونا کے پاس گیا۔ سونا کمرہ بند کر کے وہ خط پڑھ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو خط بستر کے نیچے کھسکا دیے اور پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں۔ دیوا، جلدی کمرہ کھولو ارگھوبر بھیا بہت ناراض ہیں" وہ سونا کو پیار سے دیوا کہتا تھا۔ شاید اس نے دیوا، دیوی سے گڑھ لیا تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

"لاؤ مجھے دے دو۔ ورنہ رحمو بھیا آ کر پٹائی کرائیں گے۔"

"میرے پاس کہاں ہیں؟"

"جھوٹ، ابھی پہلے ہی تو تم ان کے کمرے میں گئی تھیں۔"

"ہاں گئی تھی تو کیا ہوا؟"

"دیکھو دیدی میں تمہیں سمجھا رہا ہوں تم خط دے دو نہیں تو غضب ہو جائے گا۔"

"نہیں دیتی۔ پیما کے خط آتے ہیں۔ اس چڑیل کو میرے بھیا کو خط لکھتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میں اس کی بڑی بہن ہوں وہ مجھے اس کے پاسنگ بھی نہیں سمجھتا۔ میں یہ خط سب کو پڑھواؤں گی۔"

"نہیں ایسا مت کرو۔ اگر بھیا احمد میاں آ کر بیٹھے تو سارے خاندان برباد ہو جائے گا۔ میں سب باتیں اپنے اوپر لے لوں گا۔"

تب رحمو بھیا آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی اتنا ہی خونخوار تھا۔ اسے دیکھ کر منو کو بھی ذرا لگا لیکن وہ ڈٹی رہی۔ رحمو نے جھوانی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ چپ رہا۔ رحمو نے یکایک منو کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان تھی۔ اس نے اس پر نظر گھماتے ہوئے کہا "لاؤ۔"

"کیا؟"

"خط"

"کیسے خط؟"

"جو تم میری الماری کا تالا توڑ کر لائی ہو۔"

اس کے منہ سے فوراً نکلا "الماری کھلی تھی۔۔۔" حالانکہ یہ بھی جھوٹ ہی تھا۔ وہ زور سے چلایا "کھلی تھی یا بند مجھے خط چاہئیں۔"

"میرے پاس تمہارا کوئی خط نہیں ہے۔"

وہ کمرے کے اندر گھس گیا اور سامان اٹھا کر ادھر ادھر پھینکنے لگا۔ گدے کے نیچے اس کے خط ویسے کے ویسے رکھے تھے۔

وہ غصے سے تھرتھرانے لگا "تم میری بڑی بہن ہو۔ تم نے چھوٹے بھائی کے ذاتی خط چوری کیے۔"

"ہاں کہو۔ تیرا ایما سے کیا تعلق ؟ وہ تجھے خط کیوں لکھتی ہے۔ ہم لوگوں سے تم سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے اس سے ملتے بھی ہو اور خط و کتابت بھی کرو گے۔ وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"وہ میری کچھ بھی لگتی ہو — تمہیں مطلب! تم اس لیے جلتی ہو — کیونکہ تمہیں کوئی لکھتا نہیں۔"

"میں اس کی طرح بدچلن اور چھچھوری نہیں" سونا کی آنکھیں چھلچھلا آئیں۔ اس توہین نے اسے اندر تک مسل ڈالا۔

وہ زور سے گرجا "خبردار تم نے جو اسے کچھ کہا۔ وہ بدچلن ہے تو دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی لڑکی ہو جو بدچلن نہ ہو۔"

بھوانی بیچ میں ہی بولا "چھوٹے بھیا، یہ کیا بول رہے ہو۔ سونا تمہاری بڑی بہن ہے۔"

اس نے ڈپٹ دیا "بھوانی کاکا، تم مت بولو — تمہیں پتہ تھا تم نے بتایا نہیں؟ تم کس منہ سے بولتے ہو!"

بھوانی کا چہرہ ایک منٹ کو تمتمایا پھر ایک درد سا ابھرا وہ ضبط کر کے بولا "ایسا مت کہو۔ میں تو صرف پتہ لگانے آیا تھا" رگھوبر اور زور سے گرجا "تم اس سے ملے ہو" بھوانی ایک لمحے کو رکا۔ پھر بولا "غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا — میں نے ہی دیوا کو خط لا کر دیے تھے۔"

سونا بھوانی کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ رگھوبر تیر کی طرح چلا گیا۔

بھوانی دھیرے سے بولا "یہ بات کبھی کسی سے نہ کہنا — میں جانتا ہوں رگھوبر بھیا اب مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔"

یہ ہی ہوا اور رگھوبر سب سے کٹ گیا۔ اس کا بولنا چالنا اتنا کم ہوتا گیا جیسے وہ باہری آدمی ہو اور کسی پردیسی کی طرح وہاں رہ رہا ہو۔ بس غنیمت یہ ہوا کہ سونا نے بھوانی کی بات مان کر اس دن کے واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ رگھوبر سونا سے تو بولتا ہی نہیں تھا، بھوانی سے بھی بولنا بند

کر دیا تھا۔ رگھوبیر کو اس بات سے دشواری ہوتی تھی۔ جودی کو بھی دل ہی دل میں بہت صدمہ تھا۔ جودی اس کے اس طرز عمل سے ناراض ہونے کے بجائے اس کا زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ بڑے راے بھی کسی طرح دور رگھوبیر کو بھی سنبھال رہا تھا۔ اس بات کا احساس کرائے بغیر کہ اس کو سہارا کام وہی کر رہا ہے۔ رگھوبیر کسی سے بولتا تھا تو صرف گردھر سے۔ وہ اب بڑا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے لیے ہر ناک تک سے لڑ بیٹھتا تھا۔

بڑے راے زیادہ چل پھر نہیں پاتے تھے۔ رگھوبیر کو اکثر بلایا کرتے تھے۔ وہ ان کے پاس جا کر چپ چاپ بیٹھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس سے گیتا سننے کو کہتے تھے۔ وہ سنا دیتا تھا۔ اس کا سنسکرت کا تلفظ اچھا تھا۔ تشریح بھی اچھی کرتا تھا۔ وہ اکثر اس سے پوچھتے تھے "تمھیں کوئی تکلیف ہے ـــــ؟" "وہ نہیں" بولا دیتا۔

"تو پھر تم اتنے خاموش کیوں رہتے ہو؟"

"نہیں تو ـــــ" کہہ کر وہ چپ ہو جاتا۔

بڑے راے میں غصہ تھا۔ زہر جیسا خاموش اور مستقل۔ لیکن رگھوبیر کے معاملے میں ان کے غصے کی فطرت بدل جاتی تھی۔ وہ ہمدردی کے ساتھ کہتے "رگھوبیر، میں چند دنوں کا مہمان ہوں ـــــ تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو؟ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں تم مجھ سے بچتے ہو۔ میں بستر پر پڑا پڑا بھی تمھارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں ـــــ تم مجھے دکھ دینے کے نئے نئے طریقے نکالتے رہتے ہو۔ میں جانتا ہوں تم مجھے پسند نہیں کرتے ـــــ لیکن میں تمھارا مستقبل نہیں، ماضی ہوں ـــــ پسند کرو یا نہ کرو، لیکن اسے قبول کرنا ہر ایک کی مجبوری ہے۔ میں تو سوچتا تھا کہ تم میرے ان زخموں پر مرہم لگاؤ گے جو مجھے زندگی کی اس لڑائی میں جگہ جگہ کھانے پڑے ہیں ـــــ لیکن مجھے لگتا ہے ایک لاوارث زخمی سپاہی کی طرح مجھے اپنے ان زخموں کی وجہ سے ہی اوپر جانا پڑے گا۔"

رگھوبیر کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے دادا بہت پیچھے چھوٹ گئے۔ ان کی آواز وہیں سے آرہی ہے جہاں چھوٹے ہوئے ہیں۔ جب کبھی بڑے راے خوش ہوتے تھے تو اسے پانڈووں کی مہایاترا کی کتھا سنایا کرتے تھے۔ کیسے پہلے دروپدی گری، پھر نکل، سہدیو گرے، پھر ارجن اور بھیم ـــــ سب ایک دوسرے کے بارے میں پوچھتے گئے... فلاں کیوں گرا... یدھشٹر بتاتے گئے۔ کتا ساتھ تھا۔ سماج کتے کو حقیر اور

مگر وہ مخلوق کی طرح دیکھتا تھا ـــــ جسے سب نے دھتکارا ـــــ اس کی جینے کی چاہ وہاں تک لے گئی ـــــ لیکن وہ خود کیا ہے؟ وہ بھی حقیر ہی ہے۔ ہر زمانے کے مخصوص لوگ اسی طرح گر کر وقت کی برف جیسی چٹان کے نیچے دب جاتے ہیں ـــــ پھر نئے مخصوص لوگ بنتے ہیں۔ اسے پتہ تھا کہ وہ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا! وہ ایسے بد قسمت لکڑ ہارے کی طرح ہے جسے دیکھ کر ایندھن دینے والے پیڑ تک اپنے کو سمیٹ لیتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں ـــــ

سیما اس کے لیے ایک ایسی مورتی کی طرح ہوتی جارہی تھی جسے لوگ جس قدر اکھاڑ کر پھینکنا چاہتے تھے، وہ اتنی ہی اندر دھنستی جاتی تھی۔ اس کے من میں سونا اور بھوانی کے واقعہ کے بارے میں ملال تھا۔ وہ بھلا نہیں پاتا تھا کہ اس کے خطوط کو انھوں نے چرایا جنھیں وہ اعتماد سے دیکھا کرتا تھا کم از کم بھائی پر سے اس کا اعتماد بالکل اٹھ گیا تھا۔ حالات میں جتنی تبدیلی آتی تھی سیما کے ساتھ اس کے رشتوں کی شکل اتنی ہی بدلتی تھی۔ اس طرح کے تعلقات میں جو ایک دھندلا پن شروع میں رہتا ہے وہ دور ہوتا جارہا تھا۔ اس کے من میں جو ایک گرہ تھی کہ وہ نامنظوری کا شکار ہے، سیما اسے کھولنے میں مدد کررہی تھی۔ حالانکہ اس کے دل میں میرے اور بڑے رائے کے لیے اب بھی گنجائش تھی لیکن ویسی نسبت نہیں بیٹھ پاتی تھی جیسی بٹھانا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جذباتیت اور خاندان پرستی ان کے کسی بھی قدم کو قبول نہیں کرپاتی۔ چاہے وہ رشتہ ہو یا فلسفہ حیات۔

سونا کی شادی ہوئی تو یکایک احساس ہوا کہ وہ اکیلا رہ گیا۔ سونا اور اس کے درمیان کی وہ دوری یکایک مر گئی۔ حالانکہ شادی کا تام جھام رانی والا نہیں تھا۔ پھر بھی اپنے نام کے مطابق موجودہ وسائل سے جتنا کم ہو سکا تھا وہ سب کچھ کیا تھا۔ وہ لوگ بھی اتنے بڑے آدمی نہیں تھے۔ جتنا کہا گیا وہ اس سے غیر مطمئن نہیں لگے۔ رگھوبر اس شادی میں ایک طرح سے مر مٹا۔ ہر کام میں رگھوبر، ہر جگہ رگھوبر۔ سونا نے رخصت ہونے سے پہلے رگھوبر کو بلوایا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ وہ بولی "رگھوبر، تو مجھ سے ناراض ہے، میں تجھ سے ناراض

ہوں ـــــ تو نے اپنی زندگی میں مجھے کبھی بھی ذرا سا حصہ دار نہیں بنایا۔ ہم تو دو ہی تو اس گھر میں سگے تھے ـــــ بیگانوں کی طرح کیوں رہے؟ ہم شاید انتظار کرتے رہے کہ کون اپنی انا کا شمن ریکھا پھاند کر آئے۔ کوئی نہیں آیا۔ اب میرے جانے کا وقت آ گیا! ایک بات پوچھوں؟ تو مجھے بھی پیار نہیں کر سکا ـــــ اپنی بہن کو ـــــ تو یہ سب اے کیسے کر لیا؟ میں تو تجھے منسی کرنے کے چکر میں ہمیشہ دکھی کرتی چلی گئی۔ اسی چکر میں، میں نے تیرے خط چرائے تھے کہ تو میرے پاس آئے گا، میری منت سماجت کرے گا ـــــ مجھے ہمراز بنائے گا لیکن پانسہ الٹا پڑ گیا۔ چوری میں نے کی اور ذمہ داری بھوانی بھیا نے اپنے سر لے لی ـــــ تو کہہ تو مجھ سے کچھ نہ کہے۔ وہ تیری ناراضگی سے بہت دکھی ہے۔ اسے اور دکھی مت کر" وہ رو پڑی۔

رگھوبر کو لگا جیسے سب کا قصوروار وہی ہے۔ وہ سب کچھ سمجھنے کے گھمنڈ میں ہر ایک کے خلاف بے انصافی کرتا رہا۔ کہیں چھوٹی ماں بھی یہی نہ سوچتی ہوں کہ میں ان کے پاس جا کر کہوں کہ تم میری ماں ہو۔ لیکن کیسے کہتا؟ ماں کا تصور اس کے سامنے کبھی صاف ہی نہیں تھا۔ ایک جذباتی چیز تھی جیسے ایشور!

سونا کی رخصتی کے بعد وہ کئی دنوں تک وہ اندر ہی اندر سونا کو تلاش کرتا رہا۔ جب وہ سونا کو لینے اس کی سسرال گیا تو اسے یکایک احساس ہوا کہ اب وہ اس پر اپنا سارا اختیار کھو چکا ہے۔ بس فقط رشتہ ہے جیسے تحریر کردہ حروف۔

سونا کی شادی میں چھوٹے رائے تو ضرور آئے تھے لیکن ارن باہری مہمانوں کی طرح ایک دن شریک ہوا تھا۔ حالانکہ شہر کے لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ چھوٹے رائے اور ارن سونا کی شادی میں ہر طرح سے ہاتھ بٹائیں گے۔ کہیں نہ کہیں یہ بات میرے من میں بھی تھی۔ پھر بھی ہم لوگوں نے شادی کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ ایک پرانا باغ تھا جس میں بڑے رائے نے دور دور سے پھل کے درخت منگوا کر لگائے تھے۔ رات رات بھر جاگ کر اس باغ کو بھروایا تھا۔ جہاں پتہ چلتا تھا کہ فلاں پھل بڑھیا ہے وہیں سے قلم یا پودا لا کر لگوا دیتے تھے۔ وہ باغ خاندان کے افراد کی طرح تھا۔ جب گھوڑا گاڑیاں تھیں تب مہینے میں ایک بار وہاں جا کر تازہ

پھلوں کی دعوت ہوتی تھی۔ تخمی، دسہری، مالدہ، لنگڑا، فضلی، گلاب پسند، بادشاہ پسند، طوطا پری، سفیدہ ـــــ نہ جانے آم کی کتنی قسمیں تھیں۔ اس باغ کا سفید امرود دور دور تک مشہور تھا۔ لوکاٹ، سنگترے، نارنگی، ناسپاتی، مالٹا، فالسے، آڑو، آلو بخارا، پلم وغیرہ کوئی پھل ایسا نہیں تھا جو وہاں نہ ہوتا ہو۔ وہاں سے نمٹتے تھے تو جاڑے کے دنوں میں گرم گڑ کھانے کولہو پہنچ جاتے تھے جو یار دوست ساتھ تھے ان کے ساتھ گڑ، اندرکی وغیرہ باندھ دیے جاتے تھے۔ اس باغ میں ایک پیر بھی تھا۔ اس پر ریاست کی طرف سے روز چراغ جلتا تھا۔ کوئی بھی بچہ کبھی بیمار ہوتا تھا تو وہیں منت مانگنے جاتے تھے۔ جب منت پوری ہوتی تھی تو شیرینی چڑھتی تھی۔ ایک خدمتگار روز اس مزار کی جھاڑ پونچھ کرتا تھا۔

زمینداری کے دنوں میں ایک بار باغ سے نکلتے ہوئے کچھ لوگوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ اس دن میرے پاس وصولی کا کچھ روپیہ تھا۔ حالانکہ ہمیشہ دیوان جی ہی وصول کرتے تھے اس دن نہ جانے کیسے میں نے روپیہ اپنے ساتھ لے لیا۔ کوئی ساتھ بھی نہیں تھا۔ میں اکیلا ہی تھا۔ گاڑی بھی سڑک پر کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہیں یہ لوگ میرا بھی منجھلے رائے والا حال نہ کر ڈالیں۔ میں اکیلا لڑتا بھی تو کہاں تک: چاروں ہتھیار بند تھے۔ میں نے اسی طرح آنکھیں بند کرلیں جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کرلیتا ہے اور سمجھتا ہے بلی چلی گئی لیکن یکایک مجھے لگا کہ مزار سے ایک روشنی نکلی اور سارے میں پھیل گئی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ جب آنکھیں کھولیں شام ہونے کو تھی۔ پرندے زور زور سے چہچہاتے ہوئے لوٹ رہے تھے اور ان لوگوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ سب کو یہ ہی لگا کہ اس پیر کی کرامات ہے حالانکہ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ آخر وہ سب کیسے ہوا؟

سونا کی شادی کے لیے وہ باغ بیچا گیا تھا۔ باغ کے ساتھ ہی وہ پیر بھی چلا گیا لکھت پڑھت کرنے سے پہلے ہم سب لوگ پیر سے معافی مانگنے گئے تھے۔ چادر چڑھا کر کہا تھا کہ ہمیں معاف کرنا، ہم تیری خدمت نہیں کر سکے۔ نہ بیچیں تو بیٹی کی شادی کیسے کریں۔ اسی دن رات کو بڑے رائے کو سفید براق کپڑوں میں ایک باریش بوڑھا نظر آیا۔ وہ آکر ان کے پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا اور انھیں غور سے دیکھتا رہا۔ بڑے رائے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ گہرا سناٹا تھا۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ بڑے رائے دیر تک سوچتے رہے ـــــ یہ کون تھا؟ کیا پیر تھا؟ پھر وہ باغ کے بارے میں سوچنے لگے جتنے دام مل رہے ہیں ـــــ درختوں کے بھی دام

تھیں۔ اگلے دن جب بیع نامے پر دستخط کیے تو انھیں لگا کہ وہ رات والا بوڑھا ان کے پاس کھڑا پریشان نظر سے دیکھ رہا ہے۔ گھوم کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ گھر آ کر وہ اس دن دوسری بار روئے۔ دستخط کرنے کے دوران انھیں بار بار یہ لگ رہا تھا کہ ان کے ہاتھوں کوئی قتل ہو رہا ہے۔ زمینیں تو بہت سی بکی تھیں لیکن اس باغ کا بکنا سب کو اندر سے خالی کر گیا تھا۔

سونا کی شادی زیادہ نہیں چلی۔ دو سال بعد ایک دن سونا کے شوہر سونا کو لا کر کھڑے ہو گئے۔ بڑے رائے کے لیے کیا، پورے گھر کے لیے یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ وہ آئے۔ سونا اندر حویلی میں چلی گئی۔ اس کے شوہر اور سسر یہ کہہ کر چلتے بنے کہ ہم ضروری کام کر کے ابھی آتے ہیں۔ ان کے پیچھے جانے کے بعد سونا رو پڑی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سونا کو یکایک کیا ہو گیا، وہ اس طرح کیوں رو رہی ہے، کچھ دیر بعد ہی وہ یہ بتا سکی کہ وہ لوگ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ فوراً اسٹیشن اور ہر جگہ آدمی دوڑائے گئے لیکن نہ وہ اسٹیشن پر ملے اور نہ بس اڈے پر۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جا کر اپنے کسی تاجر دوست کے یہاں ٹھہر گئے تھے۔ اگلے دن صبح ہوتے ہی کسی کی موٹر کار سے نکل گئے۔ یہ واقعہ ایسا واقعہ تھا کہ اس نے بچے کھچے رائے خاندان کو دو گز نیچے گاڑ دیا تھا۔ اس سے اوپر آنے کا کوئی طریقہ نہیں بچا تھا۔ ہم کئی لوگ ان لوگوں کے پاس گئے، ان کی منتیں کیں لیکن وہ رضامند نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا۔ شاید انھوں نے یہ سمجھ کر شادی کی تھی کہ اتنے بڑے گھر میں شادی ہو رہی ہے، پتہ نہیں کتنا دھن برسے گا یا دیواریں سونے کے پتروں سے جڑ دی جائیں گی۔ وہ لوگ کاروباری تھے۔ سچی بات انھوں نے منہ سے نہیں نکالی۔ جب بہت پوچھا تو صرف اتنا ہی کہا کہ دو سال شادی کو ہو گئے —— بچہ نہیں ہوا اور نہ ہونے کی امید ہے۔" ہم نے کہا "چلیے دونوں کی ڈاکٹری جانچ کرا لیں" وہ بولے "ہمیں نہ کسی کی جانچ کرانی ہے اور نہ آپ کی بیٹی کو رکھنا ہے۔ آپ چاہیں تو دوسری جگہ شادی کر دیں" معلوم نہیں کیوں منجھلی چچی والا واقعہ میرے دماغ میں یکایک کوند گیا۔ گزشتہ دن اپنے آپ کو کس طرح دوہراتے ہیں۔

بڑے رائے نے مکمل طور پر کھاٹ پکڑلی تھی۔ میں اکیلا پڑ گیا تھا۔ بس رگھو بر تھا۔ وہ بھی کیا کرتا۔ سونا کو دیکھتا تھا اور کھنتا تھا۔ وہ بھی بیچ بیچ میں یہ کہہ دیتی تھی ـــــ رگھو بر میں نے تجھے تنگ کیا بھگوان مجھے اس کی سزا دے رہا ہے۔

رگھو بر سے اور کچھ تو ہوتا نہیں تھا، بس ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیتا تھا۔ ایسا مت کہو دیدی۔ سارنگا خاموش تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرے؟ گرو ہر وقت سونا کے آگے پیچھے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ کچھ دن تو سونا خاموش رہی پھر اس نے اپنا رول طے کیا۔ وہ گھر کا سارا کام خود دیکھنے لگی۔ ہم لوگوں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ مانی نہیں۔ بڑے رائے کو معلوم ہوا تو اسے روکنے کے بجائے بولے ''کیا کرے بے چاری ـــــ مجھ پر اب آکر وقت نے دھاوا بولا ہے۔ اس بے چاری کو تو آنکھیں کھولتے ہی دبوچ لیا۔ گردن تک اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔''

جب وقت تھا تو سونا نے پڑھا نہیں۔ اب جب وقت نکل گیا تو اس نے رگھو بر کی مدد سے پڑھنا شروع کیا۔ کام بھی کرنا اور پڑھنا بھی۔ لیکن پڑھنا بھی مشق کی چیز ہوتی ہے۔ اس کی مشق کبھی کی چھوٹ چکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کائی پر دوڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ادھر سارنگا کو بھی لگنے لگا تھا کہ زیادہ دنوں تک سونا کے ساتھ اس کی چول نہیں بیٹھ سکے گی۔ ایک آدھ بار سارنگا نے اس کی سسرال والوں کو کوسا بھی۔ وہ خاموش رہی۔ ایک دن اس کے شوہر کے لیے کہہ دیا ''کیسا مرد ہے اپنی بیوی کو گھر والوں کے کہنے میں آکر یہاں چھوڑ گیا۔ ایسا تو رام نے بھی نہیں کیا تھا۔ لعنت ہے ایسے مرد پر۔''

سونا شاید اپنے شوہر سے اتنا ہی پیار کرتی تھی جتنا کوئی بھی وفاشعار عورت کرتی ہے۔ اس کے منہ سے نکل گیا ''چھوٹی ماں! انھیں کچھ نہ کہو۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں ان کوئی خطا نہیں۔''

سارنگا کی زبان ہی سب کی دشمن تھی۔ اپنی بھی اور باقی سب لوگوں کی بھی۔ وہ بولی ''جس نے تمھیں دھتکار کر نکال دیا اب بھی تم اسی کے نام کی مالا جپتی ہو ـــــ ہم جو تمھیں سینے پر چٹان کی طرح رکھ کر سانس لے رہے ہیں، ہم اتنا بھی نہیں کہہ سکتے۔''

سونا کا دل اندر تک دکھ گیا۔ کچھ دن بعد وہ ضد کر کے بڑے گھر چلی گئی۔ وہیں اس نے پڑھا اور بعد میں وہیں ملازمت بھی کر لی۔ حالانکہ ملازمت کرنے سے پہلے کئی بار اس کے من میں کشمکش ہوئی کہ بڑے رائے کی بیٹی ہو کر نوکری کیسے کرے ـــــ لیکن اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جینا ہے تو اپنے زور بازو پہ۔ اپنا کام اپنے آپ کر کے کام سے ہی عزت کی روٹی ملتی ہے۔

ہر بات اب بڑے رائے پر ہی بھاری پڑتی تھی۔

جب کبھی سوتے سوتے رات کو آنکھ کھل جاتی تھی تو احساس ہوتا تھا جیسے کوئی پہاڑ کو دھکیلتا ہوا سینے پہ اڑ رہا ہے۔ جن مسائل کا کوئی حل نہیں ہوتا یا حل نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا انھیں انسان یا تو کھیل کی طرح کھیلتا ہے یا پھر موت کی طرح دیکھتا ہے۔ میں ان مسائل میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس لیے میں یا تو چاہ کر بھی کھیل کی طرح کھیل نہیں پاتا تھا۔ میں رائے خاندان کے ذریعہ ایک بڑے جہاز کا ڈوبنا بھوگ رہا تھا۔ شاید میں کبھی جہاز کا ڈوبنا سمجھ نہیں پاتا۔ بڑے رائے کے ایک دوست جان کے کمرے میں ایک پینٹنگ لگی تھی۔ بہت بڑا بحری جہاز غرق ہو رہا تھا اور بوڑھے بچے چوہوں کی طرح کود کود کر سمندر میں گر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ کبھی کبھی سامنے واضح موت کے مقابلے کچھ فاصلے پر کھڑی موت بھی محافظ نظر آنے لگتی ہے۔ ہم اسی کی جانب لپک پڑتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ موت موت میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ہم کود بھی نہیں سکتے تھے۔ بڑے رائے لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ ان کا کھانا پینا دن بہ دن کم ہوتا جا رہا تھا۔ پانی پیتے وقت انھیں لگتا تھا کہ جیسے گلے میں کانٹے اگ آئے ہیں۔ جسم میں گرمی کی ایک لہر سی دوڑتی رہتی تھی۔ بڑے رائے کو کہیں نہ کہیں یہ لگنے لگا تھا کہ اس سب کے وہی ذمہ دار ہیں، وہ نہیں جس کے ہاتھ میں ڈوبتے کا ڈیک۔ وہ کھیل بے لینی ہیں۔

اس رات میں نے رگھوبر کو بلا کر کہا "دیکھو، اب میں اکیلا اس وزن کو نہیں اٹھا سکتا۔ اگر یہ گھر ڈوبنے سے بچانا ہے تو تمھیں بھی حصہ بٹانا ہوگا۔ جب تک تم بڑے رائے کے پوتے تھے، تب تک تھے۔ اب تم بھاسکر رائے جیسے معمولی آدمی کے بیٹے ہو۔ میں اکیلا

اس بوجھ کو زیادہ دنوں تک نہیں اٹھا پاؤں گا۔ اب تمھیں ایک بڑے زمیندار کی سرپرستی کی جگہ ایک کاشتکار کی ولدیت قبول کرنی ہوگی۔ میں پہلے بھی کاشتکار ہی تھا تب اس کا احساس نہیں تھا ـــــ جو آخر میں ہاتھ لگتا ہے وہی اصلیت ہوتی ہے ـــــ ہل کا مٹھ پکڑنا یا دھوپ میں کھڑے رہنا ہی وراثت میں ملا ہے۔ مجھے تمھارے بارے میں بھی اپنی ذمہ داری نبھانی ہے، تمھاری ماں اور تمھارے بھائی اور بہن کے بارے میں بھی ـــــ اپنے والد کے بارے میں بھی۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ رگھوبر اتنی گستاخی پر اتر آئے گا۔ وہ بولا "بابوجی آپ اپنی ذمہ داری اپنے بزرگوں کے بارے میں نبھایئے ـــــ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ مجھے نہ بڑے رائے سے کچھ چاہیے جن کی آپ کو اتنی فکر ہے، اور نہ آپ سے ـــــ آپ مجھے بھول ہی جایئے تو بہتر ہے۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے جو سہارا دیکھا تھا اور جس کے لیے اسے بلا کر یہ سب کہا تھا، سب ستیاناس ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیسے سمجھاؤں، کیا کہوں۔ میں نے اس سے کہا "میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔" "میرا مطلب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ سوائے روٹی کپڑے کے جو آپ مجھے دیتے رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں آپ دونوں کو اپنے کام سے مطمئن نہیں کر سکا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا نہیں۔ رات دن مجھے اپنے اندر سے ایک بو سی آتی محسوس ہوتی ہے ـــــ جسے میں نے شاید وراثت میں پایا ہے۔ میں نے پڑھا ہے، اس طرح کی بو ان آدم خور درختوں سے بھی آتی ہے جو آدمی کو اپنی گنجلک میں بند کر لیتے ہیں، اور پھر دھیرے دھیرے اس کا خون چوستے رہتے ہیں۔ اس لیے مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے کہ اتنی بڑی جائیداد غارت ہو گئی ـــــ آج ہوئی ہوتی تب بھی شاید وہ میرے کسی مطلب کی نہ ہوتی کیونکہ میں ایک ویسا ہی درخت بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔"

میرے منہ سے یہ ہی نکلا "اگر جائیداد ہوتی تو کیا تم اس کے وارث نہ بنتے؟"

"ہرگز نہیں" وہ کچھ زور سے بولا پھر اس نے آواز کم کرتے ہوئے کہا "جو اپنی محنت اور ایمانداری سے نہ کمایا جائے ـــــ اس پر کسی کا حق بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیا یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ وہ اب نہیں رہی؟"

''نہیں، اس میں پچھتاوا بھی باقی ہے!''

مجھے خیال آیا کہ اس کی گستاخی کے پس پشت کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔ میرا خیال بھی اب دوڑ کر رائے بابو اور ان کی بیٹی کی جانب جانے لگا تھا۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بڑے رائے میری تمام گستاخیوں کے لیے کشن بابو کو ذمہ دار ٹھہرایا کرتے تھے۔ میں تو کیا اس دور میں کوئی بھی اپنے والد کے سامنے نہیں بول پاتا تھا۔ خواہ والد بزرگوار بڑی سے بڑی زیادتی ہی کیوں نہ کر دیں۔ میں دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ بڑے رائے سے کہوں کہ آپ کشن بابو پر جھوٹا الزام نہ لگائیں۔ تمہیں سوچ کر ہی رہ جاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ باپ، باپ ہوتا ہے۔ سب کچھ اس کے حق کی حدود میں ہی آتا ہے۔ بڑے رائے کے سامنے بھی گردن تک نہ اٹھا سکا۔ رگھوبر کے لیے ایسی کوئی بندش نہ تھی۔ اس میں ہر بات کہنے کی ہمت تھی۔ میں سوچتا ہی رہ جاتا تھا کہ باپ بیٹے کا رشتہ اتنا کیسے بدل گیا۔

بڑے رائے کا انتقال ہو گیا تھا۔

بڑے رائے کی وفات کم از کم میرے لیے ایک ایسی تاریکی تھی جس میں ہو کر گزرنے کا راستہ کم از کم مجھے معلوم نہیں تھا۔ بڑے رائے اگرچہ کئی برسوں سے صاحب فراش تھے لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑے اندھیرا پار کرا رہے ہیں۔ رگھوبر کے سامنے ایسی کوئی صورتِ حال نہیں تھی۔ اس کے لیے اس موت کا مطلب ایک ماضی کے ختم ہو جانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا بلکہ ان کے ہٹنے سے رکی ہوئی روشنی اندر آنے کا احساس ہوا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

جب کوئی رائے مرتا تھا تو کئی مضحکہ خیز رسمیں ہوتی تھیں۔ یہ اب لگتا ہے۔ تب تو شاید وہی ٹھیک لگا ہو۔ چاندی سونے کی ایک کرسی تہہ خانے سے نکالی جاتی تھی۔ اسی کرسی پر نئے رائے کی تاجپوشی یا گدی نشینی ہوتی تھی (بعد میں تو وہ بھی بک گئی۔) دوسرے چھوٹے زمیندار نذرانہ پیش کرتے تھے۔ آنجہانی رائے کے جتنے چھوٹے بھائی ہوتے تھے ان کی

موجودگی اور نئے رائے کے اقتدار کی قبولیت ضروری تھی جو رائے شریک نہیں ہوتا تھا، اسے جائیداد کا حصہ تو مل جاتا تھا لیکن خزانے سے کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ نقدی تو تھی ہی نہیں تھی۔ بزرگ رائے کے قبضے میں رہتی تھی۔ اب ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ چھوٹے رائے بھلے ہی آجائیں اور کوئی نہیں آئے گا۔ نہ ارن، نہ منجھلے رائے اور نہ ان کا بیٹا۔ دور پار کے رائے تو آئیں گے ہی نہیں۔ ارن تو ویسے بھی ناراض تھا جب بڑے رائے کا جسم پورے ہونے کا وقت آیا اور ارن کی طرف بڑھا تو بڑے رائے نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ الٹے پاؤں لوٹ گیا تھا۔

گدی نشینی اپنے آپ میں ایک بہت بڑی فضول خرچی تھی۔ نذرانوں کا انتظام بھی خود ہی کرنا تھا۔ کپڑے بانٹنے اور خاندان کے افراد کو خلعتیں بخشنے کی رسم بھی نباہنی ضروری تھی۔ حالانکہ کچھ لوگوں کا مشورہ تھا ـــــ ایک ایک صافہ دینا کافی ہوگا۔ رگھوبر اس کے حق میں بالکل نہیں تھا۔ وہ بولا "راج تلک کا مطلب ہی کیا ہے؟ کاہے کا راج تلک اور کاہے کی گدی نشینی۔ اس سڑی ہوئی رسی کو اپنے اور باقی سب لوگوں کے گلے میں آخر کیوں ڈالنا چاہتے ہیں؟"

حالانکہ میں بھی یہ بات دل ہی دل میں محسوس کر رہا تھا۔ میرے سنسکاروں نے اس بات کی چوٹ اندر تک محسوس کی۔ میرے منہ سے نکلا۔ "یہ رایوں کے خاندان کی رسم ہے۔"

"اس روایت کا کیا مطلب جو بدبو دے رہی ہو۔ برسوں بھوکا مرنے کی قیمت پر گدی نشینی کا یہ بناوٹی جشن کروا کر رسم ہمیں کیا دے گی؟ بقول آپ کے ہل کا مٹھ آپ کی وراثت میں ملا پھر یہ راجہ بننے کا ڈھونگ کس کے لیے کر رہے ہیں؟"

رگھوبر کی مخالفت میرے اوپر بھاری پڑ رہی تھی۔ کسی زمانے میں اگر کوئی رائے سے اس طرح کی باتیں کرتا تھا تو اس کے ہاتھ پیر توڑ دیے جاتے تھے۔ اس کے جانور بندوا دیے جاتے تھے لیکن اب یہ سب سوچنا بھی مضحکہ خیز تھا۔ یہ بات میرے دل میں بار بار آرہی تھی کہ میں کوئی راجہ نہیں۔ ایک عام حالات میں جینے والا آدمی ہوں پھر اس سب ناٹک کی میرے لیے کیا موزونیت ہو سکتی ہے؟ کیا رسم کے نام پر سوانگ کھیلنا مناسب ہوگا؟ صرف ایک جوکر کے فضول رول کے علاوہ یہ کچھ نہیں اگر رگھوبر نے اتنا سخت رخ نہ اپنایا ہوتا

تو شاید میں اس رسم کو نبھا کر فخر محسوس کرتا۔ مجھے ہی قرضوں کے اتنے بڑے گڈھے میں جا گرا ہوتا جس کی کوئی حد نہ ہو۔ قرض اتارنے کے لیے بھی اب کچھ نہیں بچا تھا۔ جتنی زمین تھی وہ فقط روٹی کا ٹکڑا بھر تھی ایک بات میں کافی گہرائی کے ساتھ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس پریشان حالی نے ہی مجھے ان موضوعات پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ پہلے ہم سب عجیب انداز میں حد کے اندر اور لامحدود پیچھے پڑے تھے۔ اب سمٹ کر نقطوں پر آنے لگے تھے۔

سونا کے نوکری کرنے سے رائے خاندان میں کافی ہلچل تھی۔ رایوں کی بیٹی نوکری کرے۔ یہ بات لوگوں کے دلوں میں بھی نہ ہو لیکن ہونٹوں پر ضرور تھی۔ لیکن سونا پر تھوڑے کے دماغ میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ تھی۔ سونا کے سامنے اپنی بوا۔ دادیوں کی مثال تھی ان میں سے ایک 'بال ودھوا' (نو عمری میں بیوہ) تھیں۔ وہ زندگی بھر سر منڈائے ایک نوکر ساتھ لیے تیرتھ یاترائیں کرتی رہیں۔ سادھو سنتوں کے دیدار کر کے مسرور ہوتی رہیں۔ اپنے بیوہ ہونے کے گناہ کو ان کے دیدار سے ثواب میں بدلتی رہیں۔ وہ سر بھی کسی نائی والی سے نہیں منڈواتی تھیں۔ قینچی لے کر سامنے بڑا سا آئینہ رکھ کر یا تو خود مونڈ لیتی تھیں یا نائن وغیرہ کسی عورت کو بلوا کر منڈوا لیتی تھیں۔ جب اپنے آپ کاٹتی تھیں تو بالوں میں بلائیاں پڑ جاتی تھیں۔ مالا جپنا اس کی برائی اس سے اور اس کی برائی اس سے کرنا۔ جب کچھ کھاتی تھیں تو منہ چلنے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک آنکھ بڑی ہوتی رہتی، دوسری چھوٹی ـــــ اگر کوئی ان کی کہی بات پکڑ لیتا تو فوراً بدل دیتی تھیں ـــــ میں یوں تھوڑے کہوں تھیں، میں تو یوں کہوں تھیں چونکہ وہ بڑے رائے کی سگی بہن تھیں اس لیے وہ ان کا پورا دھیان رکھتے تھے۔ ویسے بھی اور ان کی جملہ ضروریات کی تکمیل کرکے بھی۔ حالانکہ ان کے شوہر کی دولت بھی تھی لیکن بڑے رائے اپنی طرف سے بھی دیتے رہتے تھے۔ ان کی موت پیٹ کے کینسر سے ہوئی تھی۔ جہنم میں رہ کر۔ نہ سادھو کام آئے نہ دان پن۔ حالانکہ تب کینسر کا چلن نہیں تھا یا اسے کوئی پہچانتا نہیں تھا۔ لیٹے لیٹے ہر دس منٹ میں فضلہ نکل جاتا تھا یا تو گھر کی عورتیں دھوتی تھیں یا نوکرانی رکھی ہوئی تھی۔ بعد میں تو ان کا پلنگ کاٹ دیا گیا تھا۔ اس سے فضلہ نیچے گرتا رہتا تھا۔

دوسری بوا پاگل ہو کر مریں۔ وہ بڑے رائے کے ان ہی چاچا کی بیٹی تھیں جن کی جائیداد کے بارے میں منجھلے چچا بتایا کرتے تھے کہ ان کے والد نے انھیں پاگل قرار دے کر خود ہڑپ لی تھی۔ وہ اس بات کی پچول بڑے رائے سے بجھاتے تھے۔ ان بوا کی شادی کافی دولت مند شخص سے ہوئی تھی۔ شوہر کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا چونکہ وہ زیادہ عمر کے تھے اس لیے جلدی اوپر چلے گئے۔ اپنی جوانی میں وہ کافی خوب صورت تھیں۔ دولت بے پناہ تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد ان کی ایک منشی سے آشنائی ہو گئی تھی —— اور وہی ان کی ساری دولت کھا گیا۔ آخری دنوں میں زنانی حویلی کے صحن میں قید لباس سے آزاد گھومتی تھیں اور زور زور سے چلاتی تھیں —— میری آگ بجھاؤ —— میں جل رہی ہوں۔ بھلا کون بجھاتا؟

اب یہ سوال اٹھا کہ سونا ملازمت کیوں کرتی ہے تو اس کا جواب رگھوبیر نے دیا۔ اس گھر کی بیٹیوں کا جو حشر ہوا ہے —— سونا ویسے مرنا نہیں چاہتی۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دو۔ لوگوں کے من میں بہت سے اندیشے تھے۔ حتیٰ کہ چھوٹے رائے جو ایک زمانے میں صنف نازک کی آزادی کی بات کیا کرتے تھے اور گاندھی جی کا نام جپا کرتے تھے، اس مسئلے پر کافی اعتراض کر رہے تھے۔ سونا کو خود اپنے دفاع میں بولنا پڑا "چھوٹے دادا میں تقریباً معدوم رائے خاندان کی بیٹی نہیں ہوں —— ایک آزاد شخصیت بھی ہوں۔ میرے مستقبل کے بارے میں وہ غلط ثابت ہوا۔ آپ مجھے خود فیصلہ کرنے دیجیے! میں اپنی شخصیت کو اپنے والد یا شوہر کے نام پر مٹی میں نہیں ملانا چاہتی۔"

جب سونا دوسرے شہر میں ملازمت کرنے گئی تو مجھے بھی لگا تھا کہ میں اس اندھے راجا کی طرح ہوں جو اپنی اولاد کو موت کے منہ میں جاتے دیکھتا رہا، بچانے کے لیے سوائے بات کرنے اور بددعا دینے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ لیکن بعد میں میری سمجھ میں آیا کہ اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ جس بات کو میں باپ بن کر سوچ سکا —— اس پر سونا اور رگھوبیر نے کسی پس و پیش کے بغیر فیصلہ کیا۔ اگر وہ اس وقت اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہوئی ہوتی تو اس چوراسی سال کی عمر میں میرے دل پر کبھی نہ ہٹنے والا ایک ایسا بارِ گراں ہوتا جس کے نیچے سے میں کبھی نکل نہ پاتا۔ خود ترحمی کی کیچڑ میں کیڑے کی طرح یہ سوچ سوچ کر بجبجاتا رہتا کہ میں نے اپنی بیٹی کی

زندگی برباد ہو جاتی۔

ابھی چند برس قبل سونا ملازمت سے ریٹائر ہونے والی تھی یا ہو گئی تھی کہ ایک دن کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس کا اپنا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ گروہ بھی بال بچوں والا ہو گیا تھا۔ اس کی ایک بیٹی کو سونا نے رکھ لیا تھا۔ لیکن اس دن وہ خود ہی دروازہ کھولنے گئی۔ وہ کچھ دیر تک نوواردہ کو پہچان نہ سکی ایک بوڑھا اور لاغر انسان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جب اس نے پوچھا کہ آپ کو کس سے ملنا ہے تو وہ بولا "آپ سے۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

آواز سنتے ہی وہ جذبات سے مغلوب ہو گئی "ارے آپ!" اس نے سر جھکا کر فوراً پاؤں چھوئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کہاں اٹھائے کہاں بٹھائے۔ وہ سونا کا شوہر تھا تقریباً چالیس برس بعد لوٹا تھا۔ بیمار اور اپنے گھر والوں سے عاجز۔ وہ بولا "مجھے تمھارے پاس آنے کا کوئی حق نہیں۔ جب میں صحیح سلامت تھا اور تم زندگی کی شکستہ کشتی پر سوار تھیں تو میں نے تمھاری طرف دیکھا تک نہیں۔ اب میں شکستہ حال ہوں تو تمھارے سامنے کھڑا ہوں ـــــ صرف اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے واسطے۔"

سونا نے اسے اپنی رحم دلی میں ڈبو دیا۔ اپنے لمس سے اسے نوازا۔ صاف ٹھنڈے پانی کی طرح اسے آسودہ کیا۔ شاندار گھر کے دروازے کی طرح دل کھول کر اس کا استقبال کیا۔ جب بھی میں گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو وہ زندگی دنیا بھر کی ضروریات زندگی کی اشیا سے بھری پری اور پھیلی لگتی تھی، بہت محدود اور اپنی ذات پر مرکوز ہو گئی تھی۔ جتنی وہ دا تھی اتنی ہی وہ وزنی اور گہری تھی۔ جیسے جیسے میرا وقت نزدیک آتا جا رہا ہے مجھے گرو اور اس کے بچوں کا موہ ستاتا ہے۔ ان کا کیا ہوگا؟! قریب قریب سب ہی کچھ بک چکا تھا۔ راج خاندان میں آخری راجے ـــــ اتنا ہی مجبور اور محکوم ـــــ جتنا کوئی بھی بوڑھا اور عام آدمی ہو سکتا ہے۔ کاش میں جوانی میں یہ بات سمجھ پاتا۔

اس پورے قصے کا کوئی خاتمہ نہیں ہے۔ ہری لا محدود ہے، ہری کی داستان لا متناہی ہے۔ اب

اسے سمیٹنا بھی ہے۔

رگھوبر کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ میں جانتا ہوں کہ رگھوبر کے پاس ایک بھرپور دل ہے۔ اس میں سب کے لیے جگہ ہے۔ چاہے وہ اپنا ہو یا پرایا۔ ہم لوگوں کے ساتھ سیما بھی اسی دل میں تھی لیکن ہمیں وہاں دیکھنے سے گریز تھا۔ جب جذبات لطافت کی جانب مائل ہوتے ہیں تو جسم غیر حاضر ہونے لگتا ہے۔ یہ میں نے ان ہی دونوں سے سیکھا۔ رگھوبر سنیاسی ہو گیا تھا ـــــ سیلانی، گھمکڑ۔ سیما اور رگھوبر کے تعلقات کے بارے میں دونوں ہی خاندانوں کو اپنے اپنے اندیشے تھے لیکن ہم لوگوں کو اندیشوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جہاں جگہ ملتی، سو جاتا، جو کچھ ملتا اسے 'بھکشا' کی طرح لے لیتا۔ کپڑوں کی بھی اسے فکر نہیں تھی۔

بھوانی ہی میرا اکیلا ساتھی رہ گیا تھا۔ جسے کبھی کبھی رگھوبر کے بارے میں اپنی 'چنتاؤں' میں شریک کر لیتا تھا۔

بھوانی شاید رگھوبر کو مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ جب بھی ایسی صورت حال درپیش ہوتی تو وہ یہ کہتا تھا ـــــ رگھوبر بھیا جب بھی کہیں جائیں گے ـــــ یا کچھ کہیں گے ـــــ تو نہ چھپ کر جائیں گے، اور نہ چھپ کر کریں گے۔ آپ ان پر اعتماد کیجئے۔ "اگر باپ اولاد پر بھروسہ کر لے تو کہنا ہی کیا ـــــ بے یقینی میں ہی اس کی ذمہ داری مضمر ہوتی ہے۔

کبھی جب دیر ہو جاتی اور بے چینی بڑھ جاتی تو میں اسے رامے بابو کے گھر ڈھونڈنے چلا جاتا تھا۔ شاید وہاں ہو۔!

ایک دن رگھوبر دیر تک واپس نہیں آیا۔ سارنگا مجھے مسلسل ستا رہی تھی کہ میں نے لڑکے کو بیچ دیا۔ شاید وہ کھونا چاہ رہی تھی۔ میں رامے بابو کے گھر گیا تو سیما نے دروازہ کھولا۔ رات کافی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گئی اور بولی "آپ، اس وقت؟"

"ہاں، رگھوبر ہے؟"

"آیئے تو۔"

"نہیں چلوں گا، بہت دیر ہو گئی۔ رگھوبر ابھی تک گھر نہیں پہنچا۔"

تب تک رامے بابو آ گئے۔ وہ فوراً بولے "بھائی صاحب، رگھوبر آپ کا بیٹا ہے،

آپ اسے سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اس کے ذہن میں ہزاروں سوال ہیں ان سوالوں سے الگ الگ جالے بنے ہیں۔ وہ سوالوں کو چٹاکا ہوا گھومتا ہے ان کے جواب ڈھونڈنے کے لیے۔ ہماری نسل نے نہ سوال کرنا سیکھا نہ انھیں سننا اور نہ جواب دینا۔ سوال کرنا سیکھے بغیر، جواب دیا کیسے سیکھتی؟ ہم جب گلاب دیکھتے ہیں تو اس کی گلاب کی طرح ہی تعریف کرتے ہیں۔ گلاب دیکھنے اور تعریف کرنے کا معیار گلاب والا ہی ہوتا ہے۔ چنبیلی یا گیندے کے پھول والا نہیں۔ ہم گلاب کی تعریف کسی اور پھول کے معیاروں سے نہیں کر سکتے تب شاید ہم اسے پھول ہی نہ کہہ سکیں۔ اسی طرح بچوں کے بارے میں ہمارے کوئی معیار نہیں۔"

میں نے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

"وہ یہیں ہے۔ سو گیا۔ اپنے سوالوں جواب کی تلاش میں گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ہم لوگوں نے بہت مشکل سے اسے روکا۔"

"ایسے کون سے سوالات ہیں جن کا جواب گھر چھوڑ کر ہی مل سکتا ہے؟"

"ہر نوجوان —— جو ایک مہذب دور سے دوسرے مہذب دور میں داخل ہوتا ہے اس کے دماغ میں پچھلا دور الگ ادھورا ہو کر صرف سوال ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے سوال ہی میری زندگی ہے۔ میں انھیں بہتے رہنے دینا چاہتا ہوں ورنہ یہ بھی اسی طرح بدبو دینے لگیں گے جیسے پہلے والا زمانہ ٹھہرے ہوئے پانی کا تال بن کر بدبو دینے لگتا تھا۔"

"لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔"

بیمار گھوبر کو بلا لائی تھی۔

میں نے کہا "چلو گھر —— بہت دیر ہو گئی۔"

وہ بولا "میں اس بدبو کو دور کرنا چاہتا ہوں جو گزشتہ کوئی برسوں سے میری ناک میں گھسی ہوئی ہے۔ جاگیردارانہ نظام کا مکڑ جال ہمیں بہت ڈھیلے پن سے چھانے ہوئے تھا اب زیادہ کس رہا ہے۔ میں اسے توڑ کر باہر آنا چاہتا ہوں لیکن اب وہ باہر سے اندر چلا گیا۔ اسے توڑنا اور بھی مشکل ہو گیا۔"

میرے منہ سے یکایک نکلا "کیا یہ زندگی کی اصلیت نہیں کہ ایک لہر جو آ کر چلی گئی —— ہمیں کنارے پر پڑا چھوڑ گئی ہے۔"

"میرا اس لہر سے نہ کوئی سروکار تھا اور نہ میں اسے پہچانتا ہوں۔ وہ آپ کا ساحل ہے جہاں آپ پڑے ہیں۔ اس لہر کا چھوٹا ملبہ میرے احساس کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ میں منجدھار میں ہوں ـــــ میں ہی کیا میرے جیسے سب۔"

سیما نے دخل اندازی کی "رگھوبر تمھیں تاؤ جی سے اس طرح نہیں بولنا چاہیے!"

میں جانتا ہوں ـــــ لیکن جیسے میں کبھی اپنی حیثیت کا حصہ نہیں بنا سکا، جو ہمیشہ میرے لیے اجنبی رہا ـــ اس کی ذمہ داری میں اپنے اوپر کیسے لوں؟ بڑے رائے کا سارا تجربہ اور ان کا سارا جلال بابوجی کے حصے میں آیا میں بابوجی کی اس ذہنی کمزوری کو جو انھوں نے زندگی بھر ڈھوئی ہے، اپنے تجربے کا حصہ کیسے بنالوں؟ ہر باپ یہی کیوں چاہتا ہے کہ اس کی اولاد اس کے سکھ دکھ کو اپنا سکھ دکھ سمجھے اور اپنے سکھوں دکھوں کو غیر متعین ـــــ اگلی نسل کو سونپ دے اور اپنے آپ کو بہت بڑے سماج سے جوڑ کر اسی کو اپنے سارے سکھ دکھ دینا چاہتا ہوں اور میں ان کے رنج و خوشی کا حصہ بننا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ مجھے اپنا حصہ نہیں بنانا چاہتا ـــــ کیونکہ میں ناقابل اعتماد ہوں، باسٹرڈ ہوں۔ جب میرے والد نے مجھ سے اپنی ذمہ داریوں میں حصہ بنانے کی دعوت دی تو میں سوچتا تھا کیا میرے اندر اتنا تحمل ہے؟ کیا میں بے انصافی کو اس حد تک برداشت کرتا رہ سکوں گا۔ کا میں اتنا مخلص رہ سکوں گا جتنا میرے والد اپنے والد کے بارے میں تھے؟ میں وراثت کے اس اندھے کنویں سے نکل کر ـ جو شخص سے شخص کو منتقل ہوتی رہی ہے ـــــ جسے ہم اپنی تساہلی اور غیروں پر انحصار کی وجہ سے ڈھوتے رہے ہیں ـــــ اس بڑے تالاب میں جانا چاہتا ہوں جو کسی کی وراثت نہیں۔ اپنے کیے کا خود ذمہ دار بننا چاہتا ہوں اور اس سماج کو بنانا چاہتا ہوں جس کی اکائی میں ہوں۔"

میں ان پڑھ کسی برگد کے سائے میں پچی دوب کی مانند پلا ـــــ اس کے سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ مجھے یہ ضرور احساس ہوا کہ وہ اس پوری وراثت سے انکار کر رہا ہے جسے پاکر میں، میرے والد، ان کے والد سب فخر محسوس کرتے رہے ہیں۔ اس نے بھی اسی سے جنم لیا ہے لیکن وہ اسی درخت کو کاٹ کر پھلنا پھولنا چاہتا ہے۔ یہ کیسے ہوگا؟ میں نے جو کچھ بھی اپنے والد کے لیے کیا کیا وہ سب غلط تھا؟ میں نے اپنی طرح اپنے سوالوں کا جواب تلاش کیا تھا ـــــ شاید میں اتنا عقلمند نہیں تھا۔ رگھوبر ان سوالوں کو اپنی طرح سوچتا ہے ـــ ہو سکتا ہے کہ تب نہ ہو کر اب ہوا ہو تا میرے سامنے والے بھی وہی سوال ہوتے

جو رگھوبر کے سامنے ہیں۔

مجھے ایک ہی سوال سوجھا "کیا اب گھر نہیں چلو گے؟"

میرے سامنے مایوسی تھی۔ والد اگرچہ مجھ پر منحصر رہے تھے لیکن میں زندگی بھر اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو ان پر منحصر سمجھتا رہا تھا۔ اب جبکہ میں اپنے بیٹے کے وسیلے سے خود کفیل ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا تو وہ آزاد ہونے کی جستجو میں تھا۔ میں حسب معمول اپنی آزادی اس کی غلامی میں کھوج رہا تھا۔

وہ بولا "گھر چلنے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں وہیں پلا بڑھا ہوں لیکن وہ گھر آپ کا ہے۔ مجھے چار دیواری میں محدود ہونے سے پہلے ایک کھلا آسمان چاہیے۔ میں نے ابھی تک اتنا ہی کھلا آسمان دیکھا ہے جتنا صدیوں سے اس حویلی کی اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ـــــ اوپر... اتار کھا نظر آتا ہے! میں اپنے بارے میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا مجھے دادا جی نے، آپ نے، سونا نے، بھوانی نے اور نئی ماں نے بتایا ہے۔ تھوڑا بہت ادھر ادھر سے جانا! اس کے علاوہ میں کیا ہوں وہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں۔ کیا میں اس سے الگ بھی کچھ ہوں؟"

رائے بابو چپ بیٹھے تھے۔ سیما اسے حیران آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

سیما نے ہی پوچھا "کیا یہ جوش کی زیادتی نہ ہوگی؟"

رائے بابو نے گردن ہلائی "ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

میں چپ رہا۔ کیونکہ اس طرح کے سوال میرے سامنے کبھی نہیں آئے تھے۔ شاید بڑے رائے کے سامنے بھی نہ آئے ہوں۔ چھوٹے رائے، منجھلے رائے کے سامنے آئے ہوں تو معلوم نہیں۔ کیونکہ خود غرضی بھی آدمی کو سوچنا سکھاتی ہے۔

رگھوبر نے کہا "یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ زیادہ ہے یا نہیں۔ اب سوال جوش کا ہے تو میں نے ابھی تک کسی میں کوئی جوش نہیں دیکھا۔ لگتا ہے یہ صرف لغت میں ہی ہے ـــ میں اسے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

"کئی بار انسان بھٹک جاتا ہے اسے نہ لوٹتے بنتا ہے نہ سنبھلتے" رائے بابو نے شاید

میری طرف سے کہا تھا۔

"لیکن کب تک میں کھنچی ہوئی لائنوں کے بیچ چلتا رہوں گا؟ پھر بھی اگر مجھے لگا کہ میں اتنا تھک گیا ہوں کہ کہیں کوئی راستہ نہیں تو لوٹ آنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کروں گا۔ جیت کر تو لوٹنا ہی جاتا ہے، ہار کر لوٹنا بھی لوٹنا ہی کہلاتا ہے۔ بھلے لائق استقبال نہ ہو، لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ باعزت نہیں۔"

سیما نے گردن ہلا کر رگھوبر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس دن پہلی بار مجھے لگا کہ سیما دوسری لڑکیوں سے کچھ مختلف ہے۔

اس رات رگھوبر میرے ساتھ لوٹ آیا تھا۔ میں نے سارنگا سے کہا کہ وہ رگھوبر سے کچھ نہ کہے۔ یہ بات اسے پسند نہیں آئی۔ وہ کروٹ لے کر سو گئی۔ اگر میں رگھوبر سے اتنا جڑا نہ ہوتا، اسے سمجھنے کی کوشش نہ کرتا ہوتا تو اتنا ہی سمجھ پاتا جتنا سمجھ رہا تھا۔

بڑے راے والا پورا کمرہ اب رگھوبر کا ہی تھا لیکن اس کمرے سے بڑے راے کا ساز و سامان ایک دوسرے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ اب وہ ایک بہت معمولی کمرہ تھا۔ جب رگھوبر نہیں ہوتا تھا تو بھوانی اس کمرے میں لیٹتا تھا۔ جب رگھوبر کمرے میں آیا تو بھوانی وہیں تھا۔ وہ ہنس کر بولا "بھوانی کاکا، آرام سے سو جانا۔ میری چوکیداری کے چکر میں جاگتے نہ رہنا ــــــ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

بھوانی کے دانت گر گئے تھے۔ ہنستے ہوئے وہ بہت سہج ہو جاتا تھا۔ وہ بولا "رگھوبر بھیا، جب تم چھوٹے تھے میں تمھیں سنبھالتے ہوئے تمھارے پیچھے پیچھے گھوما کرتا تھا۔ رحمت اللہ تو تمھیں یاد نہیں ہوگا۔ شاید تم تو ہوئے بھی نہ ہو۔ ارن بابو تو ان سے بہت ہلے تھے۔ تمھیں کنویں جھانکنے کا بہت شوق تھا ــــــ اس میں ہلتا پانی ــــــ منہ ڈال کر پکارنا اور پکار کا گونج کر واپس لوٹ آنا ــــــ تمھیں اچھا لگتا تھا۔ میں تمھیں روکتا تھا۔ نہیں مانتے تھے تو تم جھانکتے تھے۔ میں تمھیں پکڑے رہتا تھا۔ ایک بار میرا پیر پھسل گیا تھا تو ہم تم دونوں اندر جاتے جاتے بچ گئے تھے ــــــ میں کیا تم اتم دونوں بھائی بہن لڑتے تھے تو میں ہی بیچ میں پڑتا تھا۔ کبھی تمھارے لیے جھوٹ بولتا تھا کبھی دیوا کے لیے جب تک زندہ ہوں تب تک میں یہ

ہی گرتا رہوں گا۔ یہی میرا لکھا تب تھا یہی اب ہے۔"

"لیکن اب میں کون سے کنویں میں جھانکنے جا رہا ہوں؟"

وہ کچھ کہے بغیر ہنس دیا، پھر بولا "تم نے ایک ہی طرح کا کنواں دیکھا ہے۔ میرے دادا میر منشی تھے —— یعنی وائسرائے کو اردو پڑھاتے تھے۔ میرے والد بچپن میں ہی طاعون میں چل بسے تھے۔ میری ماں میری پیدائش کے کچھ دن بعد ہی کوچ کر گئی تھیں۔ بڑا بھائی موہن لال بچہ تھا۔ ہمارے دادا نے ہی ہمیں پالا۔ دادا ایک ہاتھ سے میری انگلی پکڑ لیتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے موہن لال کی۔ سویرے سویرے انگریزی پڑھاتے۔ انگریزی کی گنتی بول بول کر یاد کراتے ہوئے میلوں نکل جاتے تھے۔ اس عمر میں ان کا اتنا چل لینا سب ہی کے لیے حیرت کی بات تھی۔ موہن لال بیچ بیچ میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا تو وہ کہتے تھے —— موہن تو زندگی میں کیا کرے گا —— دیکھ بھائی کو، ایک بار میں یاد کر لیتا ہے۔ راستے میں کوئی صاحب مل جاتے تو کہتا —— ویل ویر مل —— تم نے برٹش سرکار کا بہت پنشن کھایا۔ وہ ہنس کر کہتے —— سر عیسیٰ مسیح کی مہربانی رہی تو ابھی اور کھاؤں گا۔ دادا مر گئے تو موہن لال کو حکومت مل گئی۔ اس کا اپنا کیا تھا —— سب بابا کا تھا۔ رات دن پینے لگا اور اڑانے لگا۔ بابا کے کئی مکان تھے۔ جب سب کچھ بک گیا —— مکان تک بک گئے تو وہ روز مجھے شراب کی دوکان پر شراب لینے بھیجتا تھا۔ قرض اتنا ہو گیا تھا کہ ٹھیکے دار نے ادھار دینا بند کر دیا تھا۔ وہ کہتا موہن لال سے جا کر کہو پہلا حساب چکتا کر دے تو آگے شراب منگائے۔ میرا بھائی مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ ایسے مارتا تھا جیسے میں ہی قصوروار ہوں۔ میری بھابی بچانے کے لیے بیچ میں آتی تھی تو اسے بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ میں تو پٹ لیتا تھا۔ بھابی پٹنا نہیں سہا جاتا تھا۔ وہ اتنی سیدھی اور خوب صورت تھیں کہ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کا قصوروار ہوتا جا رہا ہوں۔ جب برداشت نہ ہو سکا تو میں بھاگ نکلا۔ اتنی بڑی دنیا میں کہیں تو سر چھپانے کے لیے جگہ ملے گی۔ جہاں میں پہنچا وہ ندی کا کنارہ تھا اور وہاں کہاروں کی اچھی بستی تھی۔ کہار ہی ملاح کا کام بھی کرتے تھے۔ ان کے پاس چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں تھیں۔ ان ہی پر سواریاں پار اترا کرتی تھیں۔ میں بھی ان ہی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ مجھے ایک چونی روز ملتی تھی۔ چونی ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کے لیے بہت ہوتی تھی۔ چاندی کی چونی چلتی تھی۔

تم نے بچپن میں سنا ہوگا جب سوراجیوں کا جلوس نکلتا تھا تو وہ گایا کرتے تھے "ایک

چونی چاندی کی جے بولو مہاتما گاندھی جی" لیکن چند ایک دن میں ہی میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ کام میرے لائق نہیں۔ اس کے بعد حویلی پر آیا تھا۔ وہ الگ قصہ ہے لیکن وہاں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا تھا۔

ایک لڑکا تھا۔ اچھی ناؤ کھیتا تھا۔ اور دوسرے گھنٹے بھر میں پار لگاتے تھے تو وہ آدھے گھنٹے میں کنارے لگا دیتا تھا۔ لیکن اسے ایک خبط تھا۔ جب وہ ناؤ لے کر بیچوں بیچ میں پہنچتا تھا تو پانی میں چھلانگ لگا دیتا تھا ــــ ناؤ ڈولنے لگتی تھی۔ سواریاں ڈر کر چلانے لگتی تھیں ــــ بچے اور عورتیں رونے لگتے تھے۔ اسے بہت مزہ آتا تھا۔ جنھیں معلوم ہو گیا تھا وہ اس کی ناؤ میں بیٹھتے ہی نہیں تھے۔ نئے لوگ ضرور بیٹھ جاتے تھے۔ وہ اپنی ناؤ پر ماچم رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پانی سے نکل کر پھر ناؤ کھینے لگتا تھا ــــ وہ ان خوفزدہ لوگوں کو دیکھ کر خوب ہنستا تھا۔ ایک دن اس نے ویسے ہی ڈبکی لگائی۔ سواریاں سمجھیں ہنسی کر رہا ہے ــــ لیکن وہ کبھی واپس نہیں آیا۔ کوئی کہتا ہے مگرمچھ اتر آیا تھا وہ کھا گیا۔ کوئی کہتا ہے بھنور میں پھنس گیا۔ کسی میں کل پھانسی ہو گئی۔

"میں سمجھا نہیں۔" رگھوبر بولا۔

"تمھاری تو یہ پرانی عادت ہے۔ جب چھوٹے تھے تو کہانی سنے بغیر سوتے نہیں تھے۔ سن لیتے تھے تو پوچھتے تھے یہ کیسے ہوا؟ فلاں کا کیا ہوا؟ چلو وہ تو کہانی ہوتی تھی۔ کہیں سنی، کہیں سنائی۔ لیکن یہ تو اصل واقعہ تھا۔ اب اس کا کیا سمجھاؤں۔ کئی بار انسان اپنی جڑوں سے ایسے کٹ جاتا ہے کہ پھر لوٹ نہیں پاتا۔ جیسے وہ لڑکا اور میں" کہہ کر پھر ہنس دیا۔

رگھوبر تھوڑا سوچ کر بولا "اس کی ناؤ میں تو آدمی تھے ــــ لیکن میری ناؤ میں تو اینٹ پتھر ہیں۔ وہ تو پانی کا آدمی تھا پانی میں ہی سما گیا ــــ ہمارا کیا پتہ ــــ؟

بھوانی نے گاندھی جی کی بات شروع کر دی "انگریزوں کے زمانے میں ایک بار گاندھی جی اسی کمپنی باغ میں آئے تھے۔ خلقت پل پڑی تھی۔ ہمارے جی میں آیا، مہاتما گاندھی باغ میں اترے ہیں ــــ چلو، کب موقع ملتا ہے دیدار کرنے کا۔ ہم بھی چل دیے۔ بڑے رائے ڈرتے ڈرتے محلے والوں کے ساتھ کمپنی باغ جا پہنچے۔ اتنا ہجوم پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مہاتما گاندھی کہہ رہے تھے ــــ یہ ملک بہت بڑا جہاز ہے۔ جہاز جانتے ہو، سمندر میں چلتا ہے ــــ اس میں سینکڑوں آدمی بیٹھتے ہیں ــــ خلاصی سے لے کر صاحب لوگ

تک۔ سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات سب کچھ جہاز میں ڈھویا جاتا ہے۔ ہمارے اس جہاز میں بھی سب کچھ بھرا تھا۔ غیر ملکیوں نے سارا لوٹ لیا اور ہمیں اپنا غلام بنالیا۔ ملک کو آزاد کرنا ہے ـــــ ملک ہی وہ جہاز ہے جسے غیر ملکیوں کے قبضے سے چھڑانا ہے۔ ورنہ جو کچھ بچا ہے وہ بھی لوٹ لے جائیں گے۔ آزادی ملنے پر ہمیں پھر اس جہاز کو اپنی محنت سے بھرنا ہوگا۔ ورنہ ہم محنت کرتے رہیں گے، اور گھر ان کا بھرتا رہے گا۔

بھوانی خراٹے بھرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ اکثر یہی ہوتا تھا۔ جب اس کی بات ختم ہونے لگتی تھی تو وہ سو جاتا تھا۔ بھوانی کے سونے کے بعد رگھوبر کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ بھوانی نے جس طرح کی باتیں کی تھیں انھیں سن کر اسے کتوں والا بابا یاد آرہا تھا۔ وہ بابا تو بولتا نہیں تھا۔ بولتا تھا تو بے ربط باتیں۔ گھوڑوں کی طرح دو دو کتے ساتھ لے کر چلتا تھا۔ سٹے باز پیچھے لگے رہتے تھے۔ وہ بولا نہیں کہ انھوں نے سٹے کا نمبر پھیلایا نہیں۔ ویسے بھی وہ خطرناک آدمی تھا۔ کسی کو بھی مار بیٹھتا تھا۔ پولس والے تک اس سے ڈرتے تھے۔ سٹے والے مارے بھی نمبر پھیلا لیتے تھے جتنے ڈنڈے مارے سو ہیں سے گھٹا کر یا بڑھا کر یا اس کے دوگنے کرکے ـــــ معلوم نہیں کیا کیا حساب لگاتے تھے۔۔۔ نمبر نکال لیتے تھے۔ وہ بابا ریشم کا انگرکھا پہنتا تھا، نئے نئے شو پہنتا تھا، سولا ہیٹ لگاتا تھا اور ٹھیک ایک بجے کتے لے کر ماتگنے نکلتا تھا۔ جس دروازے پر من ہوا اس پر رکا اور 'الکھ نرنجن' کی آواز لگادی۔ لوگ انتظار میں رہتے تھے ـــــ بابا آئے تو بھیک دیں۔ گھر میں اجازت کے بغیر کسی کو گھسنے نہیں دیتا۔ گھس جائے تو سر پھوڑ دے۔ جتنی 'بھکشا' ملی اس میں خود کھایا اور اسی میں سے آخر دس کتوں کو بھی کھلایا۔

اسے لگ رہا تھا کہ بھوانی نے جتنی بھی باتیں کیں ان کا ضرور کوئی مطلب رہا ہوگا، لیکن وہ سمجھ نہیں پارہا تھا۔

رگھوبر ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں سے اسے اپنے لیے ایک راستہ کھوجنا تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس آکر بولا "میں جگن ماما کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ میرے ذہن میں آزادی کے بارے میں بہت سے سوالات ہیں ـــــ وہ مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ آخر انھوں نے

آزادی کی جنگ کیوں لڑی؟ آزادی کیوں ضروری تھی؟ کیا ہم آزاد ہو گئے؟ ان کے پاس کوئی نہ کوئی جواب ضرور ہوگا۔"

مجھے اس کے یہ سارے سوالات اوٹ پٹانگ لگے۔ اب ان سوالات کا کیا مطلب۔ ملک تو آزاد ہو چکا۔ جب کبھی میں یہ بات رگھوبر سے کہہ دیتا تھا تو وہ کافی جلی کٹی سناتا تھا۔ ہمارے ملک کے لوگوں میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں۔ جب لوگوں نے کہہ دیا کہ ملک غلام ہے تو غلام مان کر لڑنے لگے ـــــ اب بتا دیا کہ ملک آزاد ہو گیا تو آزادی کے ترانے گانے لگے اور مطمئن ہو کر پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس کی باتوں کا مجھے فوری طور پر کوئی جواب نہیں سوجھا تھا حالانکہ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ اگر غلام ہوتا تو کیا انگریز پہلے کی طرح گھومتے نظر آتے؟ اگر بڑے رائے ہوتے تو ان کے پاس ان سوالات کا زیادہ تیز ہوتا۔ وہ شاید یہ ہی کہتے کہ گھوڑے کی لگی نال، مینڈکی نے بھی ٹانگ اٹھا دی ـــــ انگریز راجہ تھے انھوں نے حکومت حاصل کی تھی ـــــ اب یہ گاندھی جی بھی راجہ بننے کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے۔ خیر، میں نے چپ چاپ ہاں کر دی۔ جاؤ، روپے بھی دے دیے۔ لیکن اس نے سو روپے ہی لیے حالانکہ اس زمانے میں سو روپے بھی بہت ہوتے تھے۔ لیکن مجھے ایک بات میں تذبذب تھا ـــــ ہمارے گھر جگن بابو کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا اسے بھی ابھی تک بھلا نہیں پایا تھا۔ رگھوبر کو اس کے فیصلے میں تبدیلی کرانا مشکل تھا۔

ایک اور بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اسے رشتے کا کیسے پتہ چلا؟ اسے اتنا تو معلوم تھا کہ جگن بابو نامی ایک شخص جو اب کانگریس میں اعلیٰ عہدے پر ہیں ہمارے رشتے داروں میں ہیں۔ بڑے رائے کے زمانے میں تو کوئی جگن بابو کا نام تک نہیں لے سکتا تھا۔ یہ کوئی مشتہر پابندی نہ تھی لیکن گھر کا ہر فرد بڑے رائے کی نظر پہچانتا تھا اور اپنے آپ ہی ضابطے میں رہتا تھا۔ جسے اب جاگیرداری نظام کہتے ہیں اس کا یہ ہی مطلب تھا کہ ان کہی بات بھی سمجھ میں آنی چاہیے۔ تب لوگوں کو اس قسم کی بات سمجھنے کی مشق بھی تھی۔ بھوانی ہی جگن بابو کے رشتے کو جانتا تھا۔ اس نے ہی اسے پوری بات بتائی ہوگی ـــــ جگن بابو تمھاری ماں کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ جنگ آزادی کے دنوں میں انھیں چھپنے کی ضرورت پڑی تو پناہ لینے یہاں آئے تھے۔ بڑے رائے نے واپس کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ بڑے رائے کے پاس آئے بھی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی بہن سے آس لگائی تھی لیکن بہن تو دوسروں کے دست نگر

تھی۔ وہ صورت حال بھانپ گئے اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔

میں نے جگن بابو کو شاید اپنی شادی کے وقت ہی دیکھا تھا۔ اس کے بعد جب وہ گھر پر آئے تھے تو میں زمینداری میں تھا۔ تیسری بار جب وہ وزیر تھے تو میری مزاج پرسی کے لیے آئے تھے۔ میری شادی کے دن بھی وہ چھپ کر شامل ہوئے تھے۔ نئے نئے ولایت سے لوٹے تھے اور آزادی کے ویسے ہی دیوانے تھے جیسے بچپن میں دیکھی کسی حسینہ کے عاشق بن کر، پرانے زمانے کے شہزادے جنگل جنگل بھٹکا کرتے تھے اور مر کھپ جاتے تھے۔ شاید کلا بھی ان سے ایک بار ملی تھی۔ رگھوبر کے دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

ہو سکتا ہے اسی واقعہ نے کور رگھوبر بڑے رائے سے آخری دنوں میں روگرداں ہو گیا ہو۔ جن بچوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی دھوم دھام دیکھی تھی ان کے اوپر آزادی اور ان کے ہیروؤں کا گہرا اثر تھا۔ جواہر لال، پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، راجیندر بابو، راجگوپال آچاریہ —— گاندھی جی نام تو بہت لیا جاتا تھا لیکن تب گاندھی جی وہاں کہیں تھے۔ رگھوبر اس وقت آٹھ دس سال کا رہا ہوگا لیکن آزادی کے بعد پیدا ہونے والے بچوں کے لیے اس آزادی کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ تب ملک سے بھاگے ہوئے لوگ وطن لوٹ رہے تھے۔ اب ملک کے لوگ باہر جا کر بس رہے ہیں۔

رگھوبر کو یہ معلوم تھا کہ جگن بابو نے حویلی سے مایوس ہو کر رحمت اللہ کے گھر میں پناہ لی تھی۔ سارے بڑے جیلوں میں تھے۔ انھوں نے ان کی عدم موجودگی میں وہیں سے تحریک چلائی تھی۔ اس بات سے اس کے دل میں رحمت اللہ کے لیے اور بھی جگہ بن گئی تھی۔ جگن بابو کو جو مقام تھا وہ تو تھا ہی۔ اس کی گھروالی کچھ ہی سال مری تھی حالانکہ وہ ہندو تھی لیکن اس کی بات چیت کا انداز مکمل طور پر مسلمان جیسا ہو گیا تھا۔ رحمت اللہ کا ذکر آتا تو وہ دعا مانگنے کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر پھیلا کر کہتی تھی —— ”اے جی، زندگی میں ایک ہی فرشتہ آیا تھا —— جب تک رہا بہت خوشیاں لوٹیں جب وہ گیا تو میری جھولی اپنی یادوں اور مہربانیوں سے بھر گیا۔ اللہ اس کی روح کو چین دے“ اسی طرح وہ بڑے رائے کا، کشن بابو کا، چھوٹے رائے کا، میرا، رگھوبر اور گرور کا نام لے کر دعا دیا کرتی تھی۔

رگھوبر کو اسے چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اس سے پوچھا کرتا تھا ''تائی ماں، تم تو ہندو ہو ـــــ یہ اللہ اللہ کیا کیا کرتی ہو؟'' وہ ہنستی 'ارے بیٹے، ایک حال کے بعد انسان انسان ہو جاتا ہے، مسلمان یا ہندو نہیں رہتا۔ اللہ بھگوان ہو جاتا ہے۔ بھگوان اللہ جو رہبر مل گیا اسی کی راہ پکڑ لی۔ کیچڑ میں پھنسی ہوئی میری ناؤ دو آدمیوں نے کھینچ کر کنارے لگائی تھی ـــــ انھوں نے اور کشن بابو نے ـــــ ایک میرا مالک دوسرا میرا مہربان''

رگھوبر تو رگھوبر خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ رحمت اللہ کی یہ معمولی پڑھی لکھی گھر والی گہری باتیں کیسے کر لیتی ہے۔ شاید یہ سب اس کی جدوجہد نے اسے سکھایا تھا۔ جدوجہد ہی تجربے کی فصل اگاتی ہے، وہی اس کی کاشت کار ہے۔ ہاں، ایک بات اور ہوئی تھی۔ رحمت اللہ کی گھر والی نے اس کی موت کے بعد اپنا نام اللہ رکھی رکھ لیا تھا۔ لیکن نہ اس نے تلسا جی کے مندر میں جل چڑھانا اور دیا جلانا چھوڑا اور نہ برت رکھنا۔ مرنے سے پہلے اس نے نماز جنازہ پڑھنے کی ہدایت کی تھی اور کہا تھا کہ اس کے بعد لڑکیوں کو سونپ دیا جائے۔ اس بات سے دونوں طبقے ناراض ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ جھگڑے فساد کی نوبت آ گئی تھی۔ ضلع انتظامیہ نے بیچ میں پڑ کر جھگڑے کا تصفیہ کیا تھا۔ آخر میں وہ شاید دفنائی گئی تھی۔ حالانکہ اس کے لیے دفنانے کا کوئی مطلب تھا نہ جلانے کا۔

دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس طرح کی قصہ گوئی میں یہ ہی ہوتا ہے جو یاد آ جائے کہتے جاؤ۔ کہنے کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ مجھ جیسے خالی آدمی کے پاس کہنے کے علاوہ ہے بھی کیا؟ اس کے بعد تو شاید کتے کی دی ہوئی عمر شروع ہو جاتی ہے۔ بس بولتے جاؤ۔ یہ ہی میں کر رہا ہوں۔ رگھوبر کی بات بیچ میں رہ گئی تھی۔ ہاں تو رگھوبر جگن بابو کے پاس جانے کے لیے سو روپے گھر سے لے کر نکلا تھا۔ یہ بات وہ اب بھی کہتا ہے کہ میں تو جو کچھ بھی ہوں ان ہی سو روپے کی بدولت ہوں۔ مجھے رایوں کی دولت سے کیا واسطہ! اب وہ کافی اونچے عہدے پر ہے۔ کبھی کبھی ان دنوں کے اس کے وہ سوال اسے اب بھی پریشان کرتے ہیں لیکن یہ بات الگ ہے۔ جس دن گھر سے نکلا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ باہر ہی باہر گھومتا رہا۔ کبھی نوکری کی کبھی چھوڑ دی، کبھی چھوٹ گئی۔ کبھی فری لانسنگ کی بعد میں جا کر وہ ہی اس گھر کی ناک بھی

بنا۔اس کی مثال ناک سے ہی دی جاتی تھی تو بس کہ یہ ہی کہتا تھا ـــــ ہاں، ناک ضرور ہوں لیکن کٹی ہوئی! خیر یہ ایک لمبا قصہ ہے۔

ان دنوں جگن بابو نینی تال میں تھے۔ اس وقت تک انگریزوں والی رسم جاری تھی۔ گرمیوں میں پوری سرکار کا لکھنؤ جانا بند ہو گیا تھا لیکن وزرا، چلے جاتے تھے۔ ان کی کوٹھیاں برقرار تھیں۔ دلی حکومت کا شملہ جانا مکمل طور پر بند ہو گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کا ایک خط سیما کے نام آیا تھا اور دوسرا میرے۔ سیما بھی اس کا کئی سال تک انتظار کرتی رہی، پھر اس کی شادی ہو گئی۔ بعد میں رگھوبر کی شادی ہوئی۔ بچے بھی ہوئے۔ خیر، سیما کی تو مجھے معلوم نہیں لیکن اس نے میرے خط میں لکھا تھا ـــــ ''آجکل یہاں بھیڑ ہے۔ سرکاری محکموں اور ضرورت مند لوگوں کی وجہ سے یہاں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ بڑے لوگ بھی ہیں لیکن وہی لوگ ہیں جن کی اپنی یا سرکاری کوٹھیاں ہیں۔ باقی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان ہی آنے جانے والوں سے یہاں کے لوگوں کا سال بھر کا خرچ چلتا ہے۔ پہاڑوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کنارے کھڑے ہی جھیل میں غوطے لگاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ درخت اونچے اونچے کندھوں پر سوار بچوں کی طرح تالی بجا کر یہ کہتے ہوئے سے لگتے ہیں ـــــ ہم تم سے بھی بڑے! آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ نینی تال میں ہماری بھی ایک کوٹھی تھی۔ انگریزوں سے دوستی بڑھانے میں کوٹھی بڑے رائے کی مدد کرتی ہوگی۔ اچھا ہوا بک گئی۔ وہ ہوتی تو معلوم نہیں مجھے کیسا لگتا؟

جگن بابو کے بنگلے کی طرف اوپر جاتے ہوئے راستے میں ایک کوٹھی پڑتی ہے ایسا دیکھتے ہی مجھے لگا کہیں وہی تو ہماری کوٹھی نہیں؟ میں نے قریب جا کر دیکھا تو اس پر مٹ میلا سا پتھر لگا تھا۔ اس پر لکھا تھا 'رائے ولا' ـــــ وہیں ایک بوڑھا رہتا تھا اس سے پوچھا تو اس نے بڑے رائے کا نام بتایا ـــــ میں سن کر چلا آیا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں کون ہوں۔ وہاں سے جب بھی گزرتا ہوں تو سوچتا ہوں یہ ہی تھی ہماری کوٹھی۔ ملکیت کا جذبہ کبھی کبھی کتنا غیر مدلل ہوتا ہے۔ جو اپنا ہے وہ تو اپنا ہے ہی۔ جو اپنا نہیں رہا ـــــ اس پر بھی ملکیت کا احساس ـــــ ہمارا تھا! جو نہیں ہے ـــــ اس کے بارے میں لگتا ہے شاید کبھی ہمارا ہو جائے! اف یہ ہمارا ـــــ ہمارا ـــــ کیسا ہمارا! بنائے کوئی، کمائے کوئی ـــــ ہو جائے ہمارا، کیا آپ سوچتے ہیں، جو لوگ ہمیں آزاد کر گئے ہیں یا جن سے ہم آزاد ہوئے ہیں ـــــ وہ بھی میری

طرح نہیں سوچتے ہوں گے کہ یہ ملک ہمارا تھا۔ یہ لوگ ہماری پر جاتھے؟ اور اب جو صاحب اقتدار ہیں وہ کیا ان سے الگ سوچتے ہیں؟ ہنسی آتی ہے۔

رگھوبر کسی چھوٹے سے ہوٹل میں رکا تھا۔ کمرے کا کرایہ شاید پانچ روپے یومیہ تھا۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔ کہاں اپنی کوٹھی تھی کہاں رگھوبر ایک پانچ روپے یومیہ والے، شاید سیلن زدہ کمرے میں پڑا رہا ہوگا۔ حالانکہ جس دن وہ وہاں پہنچا اسی دن شام کو وہ اس ڈربے سے نکل آیا تھا۔ فلیٹ پر گھومتے ہوئے نینی مندر کے پاس اس نے ایک لمبی سی گاڑی دیکھی۔ سیزن کے دنوں میں گاڑیوں کا اندر آنا بند کر دیا جاتا تھا۔ صرف وزراء اور مخصوص لوگوں کی گاڑیوں کی آمدورفت ہو سکتی تھی۔ باقی سب گاڑیاں تلی تال پر روک دی جاتی تھیں۔

رگھوبر نے جا کر اس کار کے ڈرائیور سے پوچھا "یہ کس کی گاڑی ہے؟"

وہ بولا "وزیر داخلہ صاحب کی!"

"کون ہیں وزیر داخلہ؟"

"جگن بابو۔"

"کیا وہ آئے ہیں؟"

"ہاں، مندر گئے ہیں۔"

رگھوبر کے دماغ میں ایک سوال کوندا "کیا ان لوگوں کو بھی مندر جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟" وہ مندر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ مندر جھیل کے کنارے، سیڑھیاں اتر کر، نیچے ہے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر نیچے آئے تو اس نے نمسکار کیا۔ اس وقت زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ انھوں نے رگھوبر کی طرف دیکھا حالانکہ ایسے لوگوں کے لیے کسی کا اس طرح نمسکار کرنا ایک عام بات ہے۔ ہزاروں کرتے ہوں گے۔ پھر بھی انھوں نے پوچھا "میں نے تمھیں پہچانا نہیں؟"

"میں رگھوبر رائے ہوں" رائے کہہ کر اسے عجیب سا لگا جیسے وہ کھوٹ سکہ چلا رہا ہو۔

انھیں کچھ یاد آیا "کیا تم رائے خاندان سے ہو؟"

"جی۔"

"کلا کے بیٹے؟ تمھاری شکل کلا سے بہت ملتی ہے" فوراً ہی پوچھا "کب آئے؟

کہاں ٹھہرے ہو؟"

رگھوبر کی بات سے پہلے ہی وہ بولے "ہمارے ساتھ چلو" وہ اسے ساتھ ہی لیتے گئے۔ بعد میں گاڑی بھیج کر سامان منگا لیا۔ ان کی بیوی خود سیاست میں تھیں۔ کرانتی عرف بنتی بہن ان سے تعارف کرایا "یہ کالا کے بیٹے ہیں۔ کالا سے تم شاید بیسوں برس پہلے اسٹیشن پر ملی تھیں۔ مجھے فلیٹ پر مل گئے۔ میں لے آیا۔"

بنتی بہن نے کوئی خاص توجہ نہیں دی وہ پہلے کی طرح لوگوں سے باتیں کرتی رہیں جو لوگ بیٹھے تھے انھیں وہیں بیٹھا چھوڑ کر وہ اسے اندر لے گئے۔ بڑے رائے کی وفات کے بارے میں اظہار افسوس کیا۔

چھوٹے رائے کے بارے میں ان کی رائے بہت اچھی تھی۔ الگ ہو کر ان کے ساتھ رہنے والی بات پر انھوں نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ جیسے انھیں ان سب باتوں کا اندازہ ہو۔ میرے بارے میں پوچھا، گھر کی حالت کے بارے میں معلوم کر کے ان کے منہ سے یہی نکلا "کتنا بڑا خاندان تھا" رگھوبر کو لگا وہ ان پر بھی مسلط ہے

یہ سب باتیں مجھے اس کے اسی خط سے معلوم ہوئی تھیں۔

وہاں رہتے ہوئے رگھوبر کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات گونج رہے تھے۔ خیالات کے گونجنے کی بات پر بھوانی کا سنایا ہوا ایک قصہ یاد آرہا تھا حالانکہ اس کا یاد آنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ قصوں کا جنم بہت عجیب انداز میں ہوتا ہے اور وہ یاد بھی اسی طرح آتے ہیں۔ ان کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ بھوانی حکیموں کے بہت سے قصے سنایا کرتا تھا۔ اس نے ایک بار قصہ سنایا۔ وہ اپنے آپ ہی کرداروں کے نام بھی رکھ لیتا تھا۔ اس حکیم کا نام اس نے حکیم جالینوس رکھا تھا۔ ایک بار ایک نواب صاحب کے سر میں درد رہنے لگا۔ انھوں نے بہت سے علاج کرائے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ درد بڑھتا ہی گیا۔ نواب صاحب حکیم جالینوس کے پاس پہنچے۔ حکیم صاحب نے انھیں مطب میں گھستے دیکھ لیا تھا کہ نواب صاحب آرہے ہیں۔ وہ نہ کھڑے ہوئے اور نہ کوئی توجہ ہی دی۔ مریض دیکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ نواب صاحب پہلے تو کھڑے رہے اور پھر اپنے آپ بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب مریضوں کو دیکھنے میں مصروف تھے جو

مریض نواب صاحب کے بعد آئے تھے ان کا بھی نمبر آچکا تھا۔ نواب صاحب کے سر کا درد اور تیز ہو گیا۔ آخر انھوں نے کہا ـــــ حکیم صاحب میں اتنی دیر سے بیٹھا ہوں ـــــ آپ میری طرف توجہ ہی نہیں دے رہے۔ میں یہاں کا نواب ہوں!"

حکیم صاحب بولے "مجھے معلوم ہے لیکن میرے لیے سب مریض برابر ہیں جس کا مرض زیادہ اس کا نمبر پہلے۔"

"میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔"

"جی، مجھے معلوم ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر مریضوں کو دیکھنے لگے۔ بیچ بیچ حکیم صاحب ان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ نواب صاحب سمجھتے تھے کہ وہ انھیں نیچا دکھانے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ ان کا غصہ اور تیز ہوتا گیا۔ انھوں نے کچھ دیر اور انتظار کیا پھر بولے "میاں آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟"

"معاف کیجیے، میں حضور کو بلانے تو نہیں گیا تھا!"

بس وہ تیزی سے اٹھے اور دو قدم تیزی سے چلے ہوں گے کہ ایک تیز الٹی ہوئی۔ حکیم صاحب نے اوپر سے ایک اور فقرہ کسا۔ "حضور نے تو میرا مطب بھی خراب کر دیا۔ ایسا تو چھوٹے اور ناخواندہ لوگ بھی نہیں کرتے!"

وہ پھر تیزی سے چلے۔ پھر الٹی ہوئی۔ اس بار گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی نکلے۔ ان گوشت کے ٹکڑوں پر چیچڑیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ چمٹی ہوئی تھیں یا نہیں یہ اللہ جانے۔ اس کی کہانی میں تو وہ تھیں حکیم صاحب بولے "حضور معاف کیجیے۔ آپ اب ٹھیک ہو گئے۔ آپ کا یہ ہی علاج تھا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اسے مرچیں کھلانے پڑتیں ـــــ آپ کے اندر پہلے سے ہی غرور کی اتنی مرچیں تھیں کہ بس جوش دلانے کی ضرورت تھی۔ جوش دے کر اس سارے وبال کو باہر لایا جا سکتا تھا۔"

رگھوبر کو یہ ہی لگتا تھا کہ اس کے دماغ کے چھوٹے سے حصے میں الٹے سیدھے گھمنڈ کی چیچڑیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ وہ گگن بابو کو حکیم صاحب سمجھ کر ہی ان کے پاس آیا تھا۔

جگن بابو کو ذرا بھی وقت ملتا تو وہ ان کے پاس پہنچ جاتا تھا — اس امید سے کہ شاید کوئی بات بن جائے۔ جگن بابو کی سے شدہ کرسی تھی — کھادی کے غلاف والی۔ برابر میں دو تین تختیاں تھیں۔ ایک بجتی تھی تو چپراسی جمعدار آتا تھا، دوسری بجتی تھی تو پی۔ اے۔ کئی فون رکھے ہوئے تھے۔ جو چپراسی جمعدار آتا تھا وہ لال مخمل کی ویسٹ والا لمبا انگرکھا نما کوٹ پہنتا تھا۔ سینے پر زری سے اتر پردیش کا سرکاری نشان بنا ہوا تھا جس میں کھڑی مچھلیاں کاڑھی گئی تھیں۔ یہ سوال اس کے ذہن میں بار بار انگڑائیاں لیتا تھا کہ مچھلیوں کا سرکاری نشان تو سمندری ساحل والے صوبے کا ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو زرعی اتر پردیش ہے۔ یہ نشان کیسے الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ ویسے کالا ہوتی سینے پر بنی مچھلیاں خوبصورت لگتی تھیں۔ وہ بات خاص یو پی میں کہاں سے آئی۔ انگریزوں کی جمالیاتی حس کافی بلند تھی۔ ان لوگوں کے لیے اس پر سوالیہ نشان لگانا دشوار تھا۔ بعد میں چپراسیوں اور جمعداروں کے لیے کھادی کی شرٹ، پینٹ اور ٹوپی طے کر دی گئی تھی۔ اب تو خیر کوئی ڈریس ہی نہیں رہا۔ ہر ایک ہر ڈریس پہنتا ہے۔ البتہ سرکاری نشان میں کوئی تبدیلی نہیں۔ جو تب تھا وہ اب بھی ہے۔

ایک میز پر گاندھی جی کا دعائیہ انداز والا فوٹو لگا ہوا تھا۔ اس میں گاندھی جی آنکھ بند کیے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ اس پر گاندھی جی ہاتھ سے لکھا تھا — جگن کو باپو کی آشیرواد۔ دستخط کی جگہ باپو ہی لکھا تھا۔ بعد میں شاید ان کے دستخط نہیں رہے تھے۔ عکس رہ گیا تھا۔

کمرہ بڑا تھا۔ اس میں ایک سے ایک نایاب صوفے بچھے تھے۔ دیوار تا دیوار قالین بچھا تھا۔ نظر نہ آنے والی روشنیاں تھیں۔ خاص خاص لوگوں سے وہیں ملتے تھے۔ وہ سب برطانوی حکومت کے سامان کی سجاوٹ تھی۔ بس انھوں نے اپنی کرسی پر کھادی کے کور چڑھوا لیے تھے۔ باقی لوگوں سے باہر ملتے تھے۔ ٹھیک نو بجے وہ باہر لان میں آجاتے تھے۔ لوگ اپنی عرضیاں لیے کھڑے ہوتے تھے۔ اپنی پریشانی بیان کرتے تھے۔ بٹوارے میں کسی کی لڑکی ماری گئی تھی — کسی کے خاوند کا پتہ نہیں چلا — کسی کے گھر پر لوگوں نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ دنیا بھر کی پریشانیاں بیان کرتے رہتے تھے۔ جگن بابو تحمل سے سنتے تھے۔ ان کی درخواست لیتے تھے اور ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پی۔ اے۔ کو دیتے تھے۔ فرق اتنا

ہی تھا کہ صاحب لوگ باہر آکر نہیں ملتے تھے۔ چپٹی میں درخواست ڈلوا دیتے تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ایک بار میں کافی بیمار ہوا تو جگن بابو مجھے حویلی پر دیکھنے آئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک قافلہ تھا اور مسلح سپاہی تھے۔ معلوم نہیں کیوں میری نظروں کے سامنے نواب چھتاری والا برسوں پرانا منظر گھوم گیا تھا۔

انہیں ان سب کو نمٹانے میں گھنٹے بھر سے زیادہ کا وقت نہیں لگتا تھا۔ لوگوں کو یہ سکون ملتا ہی تھا کہ اتنی دور جانا بیکار نہیں گیا۔ وزیر صاحب سے اپنی بات کہہ لی۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ خود بھی مصیبت کے دن دیکھے ہیں۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب وزیر پاک صاف سمجھا جاتا تھا۔ دس سے بارہ بجے تک فائلیں دیکھتے تھے۔ پی۔ اے فائلیں دکھاتا تھا۔ وہ بتاتا جاتا تھا کس معاملے میں کس کی کیا سفارش ہے۔ وہ یہ طے کرتے تھے کس کی سفارش ماننی ہے کس کی نہیں۔ انگریزی ہی میں نوٹنگ ہوتی تھی اور انگریزی ہی میں حکم۔ تب تک انتظامیہ میں ولایت سے پاس شدہ آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ مرکز اور صوبوں میں بھی تب کئی وزیر ولایت پلٹ تھے۔ فطری طور پر ان کی زبان الگ تھی۔ وہ خود بھی ولایت میں پڑھے تھے۔ رگھوبر کے دماغ میں ایک سوال کا اضافہ ہو گیا تھا کہ عام آدمی کے پاس انتظامیہ کی بات پہنچتی بھی ہے یا نہیں؟ پہنچتی ہے تو کیسے؟

جگن بابو رگھوبر کو ساتھ رکھتے تھے۔ چاہے وہ الموڑہ جائیں یا رانی کھیت۔ بنتی بہن یعنی مامی کا رخ اس کی طرف رحمی ہی تھا۔ حالانکہ وہ اپنی پسند کے لوگوں سے کافی ہنستی بولتی تھیں۔ شاید رگھوبر کچھ زیادہ ہی سوچتا تھا۔ وہ اس سوال کے بارے میں بھی کافی پریشان تھا۔ جنگ آزادی کے آوے میں پک کر آئے ہوئے حضرات کے دماغ میں بھی کیا اتنا ہی اپنا پرایا ہے جتنا اس کی نئی ماں یا سونا بہن کے من میں تھا؟ اس نے ایک بار دعائیہ مجلس میں گاندھی جی جھلک دیکھی تھی۔ یہ سب باتیں اسے گاندھی جی سے جوڑ دیتی تھیں۔ کیا یہ بھی گاندھی جی ہی کی سیکھ ہے یا یہ سب بگڑے ہوئے اسکولی بچوں کی طرح سبق یاد کرنے کا ناٹک کرتے رہے

تھے؟ باہر نکلے تو سمجھایا پڑھا ہو سب ختم ہے۔ اکثر اچھی اچھی حسین عورتیں اور وزیر صاحب سے ملنے آتی تھیں۔ جگن صاحب انھیں فوقیت دیتے تھے۔ کئی بار وہ ان سے دیر تک باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی بات کرنے کے لیے الگ کمرے میں چلے جاتے تھے۔ ان کے اور بڑی بہن کے درمیان اس سلسلے میں کہا سنی بھی ہوتی تھی۔ جگن بابو چپ لگا جاتے تھے پیشنس کھیلنے بیٹھ جاتے تھے۔

کبھی کبھی جگن بابو خود جا کر رگھوبر سے بات کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ رگھوبر ان کی بہن کا بیٹا ہے۔ وہ کہتے بھی تھے "کملا سے میری بہت پٹتی تھی۔ میں اسے بہت پیٹتا تھا" پھر ہنس کر کہتے "گاندھی جی والی تو میں ولایت سے لوٹ کر بنا ——— وہ بھی جب انھوں نے مجھے بلا کر میرے سر پر اپنی جادوئی چھڑی گھمائی۔ گاندھی جی بڑے بڑے تیس مار خاں کو پالتو بنا لیتے تھے۔ پالتو یعنی اپنا مقلد" اسے ان کی باتیں کچھ عجیب سی لگتی تھیں۔ کیا یہ سب اسی طرح جادو سے بنے انقلابی ہیں جیسے لوک کتھاؤں میں جادو کے ذریعے آدمی سے مکھی اور چوہے سے آدمی بن جاتے تھے؟ جادو گر مرا اور وہ پھر چوہے بن گئے۔

پھر کہتے "تمھیں دیکھ کر مجھے کملا کی بہت یاد آتی ہے۔ بے چاری بہت جلدی چلی گئی۔ تب میں جیل میں تھا۔ باہر بھی ہوتا تو معلوم نہیں اسے دیکھ پاتا یا نہیں؟ اگر تمھاری مونچھیں نہ نکلی ہوتیں تو تم ساڑی پہن کر ایک دم کملا لگتے" وہ اچھا مذاق کر لیتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں میں ان کی مونچھوں کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔

رگھوبر کا اپنا ماضی اس کے جی کا جنجال بنا ہوا تھا۔ کئی بار وہ جگن بابو کے حال کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتا تھا۔ سنسکار کھونٹے کی طرح ہوتے ہیں ——— چاہے جہاں تک گھوم آیئے، بندھے اسی سے رہنا پڑتا ہے۔ دوسرے جہاں یکسانیت ملی وہیں گھریلوپن قائم ہوا۔ یہی باتیں اسے ایک عجیب الجھن میں ڈال رہی تھیں۔ وہ نہ اس میں رچ پا رہا تھا، نہ سہہ پا رہا تھا اور نہ باہر نکل پا رہا تھا۔ وہ ان ہی تضادوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اور اپنے کو دھو کر چمکانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اس کے اندر ایک حرارت تھی۔ وہ حرارت بجھتے ہی اس کی شخصیت میں کوئی اضافہ نہ کر پا رہی ہو البتہ اسے اپنے اندر، کچھ ممنوعات سے ٹکرا ضرور رہا تھا۔ اس کی پوری

جو وہ خود اپنے اندر کی انسانیت پسندی سے نپٹنے کی تھی۔

جگن بابو کو پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ ہر لمحے کتاب سامنے رکھتے تھے۔ جب لوگوں سے ملتے تھے تب بھی ــــ بھی مُنی ان کی اس بات سے ناراض تھیں۔ خود سیاست داں ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے شوہر کو صرف شوہر کی شکل میں چاہتی تھیں۔ بیوی ہونے کا جذبہ کبھی کبھی انھیں ضرورت سے زیادہ حقوق کا لالچی اور باتونی بنا دیتا تھا۔ تب اسے سارنگا یاد آنے لگتی تھی۔ ابظاہر بات بالکل مختلف تھی۔ وہ وطن کے لیے زندگی قربان کرنے والے وطن پرست کی شکل میں دیکھے جاتے تھے۔ ایسے بھی بہت لوگ تھے جن میں کسی قسم کی خود غرضی نہیں تھی۔ وہ سب ان وطن پرستوں کا دیدار کرکے مسرت حاصل کرنے کے آتے تھے۔ پاؤں چھوتے تھے۔ ہار پہناتے تھے اور جیسے کے تیسے لوٹ جاتے تھے۔ وہ انھیں ایسے جواں مرد سمجھتے تھے جنھوں نے انگریزوں کو وطن سے نکالا لیکن رگھوبر کا لگتا تھا کہ وہ سب دھیرے دھیرے ان کی ذاتی ملکیت بنتے جارہے ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک عجیب و غریب سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حالانکہ اب اس کا کوئی موقع و محل نہیں رہ گیا تھا۔ کیا جگن بابو اب رحمت اللہ کے یہاں جاکر رہ سکتے ہیں؟ جگن بابو کی بات سے لگتا تھا کہ انھیں بڑے رائے کا وہ طرزِ عمل آج بھی یاد ہے۔ کیا اسی طرح انھیں رحمت اللہ کا سلوک بھی یاد ہوگا؟ جس خطرے کو اپنے زمانے میں بڑے رائے جیسے صاحب اقتدار جاگیر دار اٹھانے سے ڈر رہے تھے وہ رحمت اللہ درزی نے نڈر ہوکر اٹھایا تھا۔ جگن بابو نے ایک بار ضرور ذکر کیا تھا ــــ کیا نام تھا اس درزی کا ــــ ہاں رحمت اللہ ــــ اس کی بیوی شاید ہندو تھی ــــ بہت باہمت لوگ تھے! اتنی غریبی کی حالت میں بھی انھوں نے مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی" اس سے زیادہ انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ بڑے رائے بھی رحمت اللہ کے شکر گزار تھے۔ وہ جاگیر دار تھے اسلیے اظہار تشکر کے طور پر انھوں نے کچھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ بھلے ہی رحمت اللہ نے اس شکل میں قبول نہ کیا ہو۔ جگن بابو کو یاد کر لینا ہی کافی تھا۔ آزادی کی جنگ انھوں نے ایسے ہی لوگوں کے لیے لڑی تھی۔

ایک دن جگن بابو نے رگھوبر سے پوچھا "تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا؟ شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔ تمھیں جلد از جلد زندگی میں 'سینسل' ہو جانا چاہیے۔ 'آئیڈیلزم' میں کچھ نہیں رکھا۔ یہ سارے سوال جو تم پر مسلط ہیں انسان کو نان پریکٹیکل اور آئیڈیلسٹ بنا دیتے ہیں۔ تب آئیڈیلزم ایک قدر تھا، اب حماقت ہے۔ اب ملک کو آئیڈیلزم کی ضرورت نہیں، صحیح موقع کی ضرورت ہے۔"

رگھوبر کی سمجھ میں نہ جگن بابو کو وہ سوال ہی آیا اور نہ اسے جواب ہی سوجھا۔ وہ سارے سوال جو اس کے ذہن میں تھے اور زیادہ الٹ پلٹ گئے بلکہ اسے لگا کہ اس کے سامنے بڑے رائے آکھڑے ہوئے۔ انھوں نے بھی اس سے ایک بار کہا تھا ـــــ پڑھ لکھ لو ابھی تو میں بیٹھا ہوں ـــــ جہاں جا کھڑا ہوں گا لوگ یکبارگی سوچیں گے برطانوی حکومت میں بھی رائے کچھ کر سکنے کی صلاحیت رکھتا تھا، وہ سوالی بن کر آج ہمارے دروازے پر آیا ہے۔ اسے مایوس نہ لوٹاؤ۔ ہیں تو سب وہی لوگ۔ ڈھیرے ڈھیرے پورا کا پورا یہ نیا ماحول اسی ماحول میں بدل جاتا تھا۔ جگن بابو کی وہ سرکاری کوٹھی حویلی میں بدل گئی۔ موٹریں ـــــ گھوڑا گاڑیوں بدل گئیں ـــــ موٹر ڈرائیور کالے اور فتو سائیس نظر آنے لگے۔ بڑے رائے کے خاکی وردی والے چپراسیوں نے ـــــ ان لال مخملی ڈریس والے چپراسیوں کی جگہ لے لی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا؟ ان میں وہ کہاں ہے؟ جو سب سے زیادہ حیرت انگیز لگا وہ تھا ـــــ جگن بابو کی جگہ بڑے رائے کا کھڑا ہونا۔ بڑے رائے جاگیردار تھے اور جگن بابو آزادی کے دیوانے۔ دونوں میں یکایک اتنی یکسانیت کیسے ہو گئی۔

ڈر کی وجہ سے اس کا گلا سوکھ گیا۔ وہ جگن بابو کو کیا کہہ کر مخاطب کرے؟ اسے لگا اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس کے اندر کھد بداتے وہ سارے سوال دوبارہ چھچھڑیاں بن کر اس کے داغ کی اندرونی پرتوں سے جا چپکے تھے اور گوشت کچوٹ کچوٹ کر کھا رہے تھے۔

وہ وہاں سے اٹھا۔ اپنا سامان اکٹھا کیا۔ شام ہوتے ہوتے نیچے اتر گیا۔ نیچے روشنی ہو گئی تھی۔

تب روشنیاں اتنی جھلمل والی نہیں ہوتی تھیں۔ اتنی مدھم تھیں کہ اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نیم روشنی میں کچھ نوجوان جوڑے ناچتے ہوئے چل رہے تھے۔ کچھ بوڑھے پہاڑی ڈرے ہوئے سے ایک طرف کھڑے تھے۔ کچھ سواریاں پونیوں پر سوار تھیں اور سائیس نما ان کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ تلّی تال تک پہنچتے پہنچتے سارا پہاڑ، وہ جھیل جو دن بھر چاندی کی طرح چمکتی تھی وہ درخت جو ذرا سے جھونکے سے بچوں کی طرح کھلکھلاتے تھے، اندھیرے میں ڈوب گئے۔ گاندھی جی کی وہ تصویر جو جگن بابو کے برابر میں رکھی رہتی تھی اسے اپنی جگہ سے غائب نظر آئی۔ یکایک کہاں چلی گئی؟ یہ ایک اور سوال ناحق دماغ میں آگھسا تھا۔

میں بھاسکر رائے —— اب بستر کے سپرد ہوں۔ شاید اب کبھی نہ اٹھ پاؤں۔ گرور زیادہ کچھ نہیں کر سکا۔ وہ ہر ایک کی جانب ملتجیانہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اب مجھے اس کی فکر ہے۔ سونا کا شوہر مر گیا۔ اب اس نے سہاگ کے تمام نشانات اتار کر مکمل طور پر بیوگی اختیار کر لی۔ سارنگا کو کم نظر آنے لگا۔ رگھوبر ایک اچھے عہدے پر ہے۔ وہ اپنے سوالوں کے جواب حاصل نہیں کر سکا۔ ہمیشہ برقرار رہنے اور چھوڑ جانے کے درمیان جھولتا رہا۔ اب وہ کہتا ہے کہ یہ ہی ہماری نسل کا مقدر ہے۔ ہم اس 'بے یقینی' کے سانپ کو نہ مار سکتے ہیں اور نہ پال سکتے ہیں۔ ہمارے اندر پلتا یہ بھوکا سانپ —— اپنی چری ہوئی زبان سے اندر سے اندر مسلسل چاٹ رہا ہے —— اب زیادہ وقت نہیں۔۔۔ یہ چاٹ جائے گا اور ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔ ویسے ہم سب کے لیے رگھوبر ہی خاندان کی شان ہے۔ اسے 'شان' کے لفظ سے چڑ ہے جب اسے یہ بات کہو تو وہ دل شکستہ ہو کر کہتا ہے —— یہ شان نہیں شرم ہے۔

مجھے رہ رہ کر لگتا رہتا ہے کہیں یہ کانچ کا برتن چیخ نہ جائے اور اس کے اندر گھٹتا ہوا غصہ بارود بن کر پھٹ نہ پڑے۔ کبھی کبھی اس پر جنون سوار ہوتا ہے —— وہ زور زور سے بکتا ہے —— گاندھی جی مر گئے —— لیکن بڑے رائے زندہ ہو گئے —— انھوں نے آبِ حیات پی لیا۔ میں ان ہی کا بیج ہوں —— پہچان سکو تو پہچان لو۔۔ سانپ اور سنپولے میں زیادہ فرق نہیں ہوتا، ایک مرے گا —— دس اور پیدا ہو جائیں گے۔

میں یعنی بھاسکر رائے پسر ہری رائے ـــــ اپنے بیٹے رگھو بر کی باتیں سنتا ہوں، کچھ کہہ نہیں پاتا۔ ایک تو میرے سر کے اوپر سے نکل جاتی ہیں۔ دوسرے کبھی کچھ کہا ہو تو اب کہوں۔ جب پسر تھا تو کچھ کہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اب باپ ہوں تو بھاسکر رائے ہونے سے ابھر نہیں پاتا۔ باپ والی بات بیٹے پر لاگو کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ رشتہ بدلنے سے کیا آدمی بدل جاتا ہے؟ بھاسکر رائے باپ ہو جائے یا بیٹا رہے ـــــ در حقیقت تو بھاسکر رائے ہی ہے۔ ملک آزاد ہوا لیکن لوگ تو وہی رہے ـــــ بھلے ہی برطانوی شہنشاہیت کی پوجا سے آزادی کے خالق یا کاتب تقدیر بننے کا سفر طے کر چکے ہوں! تب بھی داروغہ آکر ڈنڈیا دیتا تھا، اب بھی ڈنڈیا دیتا ہے ـــــ بس فرق اتنا ہی ہے کہ تب وہ تاج کا نوکر تھا، اس سے کچھ کہتے نہیں بنتا تھا، اب آزادی کا یعنی ہمارا تمہارا نوکر ہے ـــــ کہو تو سنتا نہیں۔ تب بچے انگریزوں کے اسکول میں ان کی زبان پڑھتے تھے اب اپنے اسکولوں میں پڑھتے ہیں! یہ میں ہی نہیں کہتا رگھو بر بھی کہتا ہے ـــــ پوشاک بدل لینے سے ذہنیت یعنی شخص نہیں بدلتا! بھلے ہی رگھو بر اس لیے کہتا ہو کہ وہ سوچتا ہے، دیکھتا ہے ـــــ میں اس لیے کہتا ہوں کیونکہ میں بھاسکر رائے ہوں اور تب بھی بھوگتا تھا، اب بھی بھوگ رہا ہوں۔ تب سے اب تک یہی سمجھ کر بیل گاڑی کے نیچے چل رہا ہوں کہ گاڑی کا چلانے والا میں ہی ہوں ـــــ تب جتنا تھا اب ہانکتا ہوں ـــــ ہنسی آتی ہے ہانکنے کی بات سوچ کر۔ حالانکہ کبھی کبھی لگتا ہے کہ کندھے خالی نہیں، جوا پہلے کی طرح رکھا ہے۔ لیکن ایک بات کہوں، کہیں نہ کہیں رائے ہونے کی ٹھسک باقی ہے ـــــ جی چاہتا ہے سفید ہ کی طرح دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر ہنہنانے لگوں ـــــ اسے انھوں نے مارا تھا ـــــ یہ مجھے ماردیں گے ـــــ کیا فرق پڑتا ہے۔ ان کی طاقت ان سے کم تھوڑے ہی ہے۔ میں تو کمزور ہی ہوا ہوں ـــــ لیکن اس بھاسکر راج کو کہاں لے جاؤں گا جو دونوں ہاتھوں سے راس کھینچے بیٹھا ہے۔

جہاں تک رگھوبر کی بات ہے ــــ کبھی کبھی ہنہناتا ہے، دوڑتا ہے ــــ پھر اس کے رسے اُسے جکڑ لیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کم از کم وہ تو انھیں ایک نہ ایک دن توڑے گا ــــ وہ نہیں تو آگے والے۔۔۔ کبھی نہ کبھی تو پرجا ہونے کے احساس سے اور جمہوریہ کا کاتبِ تقدیر بننے کے جرم سے سب آزاد ہوں گے۔

سوال یہ ہی ہے، کب؟"

'ڈھائی گھر' ناول شمالی ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کے ٹوٹنے کی داستان پیش کرتا ہے۔ یہ ناول اونچے طبقے کے ایک رئیس گھرانے کی تیسری پشت کے سماجی زوال اور ذہنی تجربات کی نہایت ہمدردانہ اور موثر انداز میں عکاسی کرتا ہے۔

ناول نگار آزادی سے قبل کے ہندوستان میں، ایک ایسے ماحول میں لے جاتا ہے جہاں کسی زمانے میں حویلیاں سربلند کیے کھڑی تھیں جو آج کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ وہ ریزہ ریزہ بکھرے جاگیردارانہ معاشرے کی دل سوز داستان بڑے المناک انداز میں منظر عام پر لاتا ہے۔ جیسے ایک وسیع حویلی میں کئی کمرے ہوتے ہیں، ویسے ہی اس ناول کی داستان میں کئی کہانیاں، کہانی در کہانی چلتی ہیں۔ ناول نگار کا فنی اور بیانیہ اسلوب قاری کو سحر زدہ کر دیتا ہے، اور وہ پشت در پشت چلی آ رہی لڑائی، بدلتے سماجی رشتوں کا تضاد، ڈرامائی انداز میں شروع سے آخر تک قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ زبان اور محاورے کی خوبصورتی کے اعتبار سے 'ڈھائی گھر' ناول، گری راج کشور کی ہندی ادب کو ایک بے مثال سوغات ہے۔

گری راج کشور، بحیثیت ایک ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور ناقد ہندی ادبی دنیا میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ۱۳ ناول، افسانوں کے ۱۱ مجموعے، ۷ پورے ڈرامے اور ایک ایکٹ کے چار ڈراموں کا ایک مجموعہ، تنقیدی مضامین کے ۴ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں، ہندوستان کی دیگر زبانوں کے علاوہ، جرمن، فرانسیسی اور چند دوسری غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو کر، مقبول ہو چکی ہیں۔

زیرِ نظر ناول کا اردو ترجمہ، اردو کے معروف مترجم حیدر جعفری سید نے بڑی خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے کیا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے حیدر جعفری سید اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی، عربی اور فارسی زبانیں جانتے ہیں۔ اردو میں افسانوں کے علاوہ وہ مضامین بھی لکھتے ہیں اور انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ انھوں نے 'ڈار سے بچھڑی' (کرشنا سوبتی)، 'پیڑوں پر چاندنی' (نرمل ورما)، 'مہا بھوج' (منو بھنڈاری)، 'چائے کے باغات' اور 'گردشِ رنگ چمن' (قرۃ العین حیدر)، 'اس کا بچپن' (کرشن بلدیو وید)، 'کرو کرو سوا ہا' (منوہر شیام جوشی) وغیرہ کتابیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ کرشنا سوبتی کے مشہور ہندی ناول 'زندگی نامہ۔ زندہ رخ' کے اردو ترجمہ کے لیے آپ کو ساہتیہ اکادمی نے ۱۹۹۹ء کے ترجمہ انعام سے نوازا ہے۔